منٹو خاکے
مرتبہ
ڈاکٹر مظہر احمد

ڈاکٹر مظہر احمد

ایسوسی ایٹ پروفیسر

شعبۂ اُردو، ذاکر حسین پوسٹ گریجویٹ ایونگ کالج

جواہر لعل نہرو مارگ، نئی دہلی۔۲

Ph: 09212089910, 011-23271991

مرتب کی دیگر کتابیں:

۱ جدید اُردو شاعری اور خلیل الرحمٰن اعظمی ۱۹۸۹ء

۲ پیروڈی (دو ایڈیشن)

۳ ورطۂ خیال (تنقیدی مضامین)

۴ مشتاق احمد یوسفی (تین ایڈیشن)

۵ تحریکِ آزادی کے ترانے ۱۹۹۷ء

۶ آزادی کے بعد اردو شاعری میں طنز و مزاح ۱۹۹۵ء، ۲۰۱۲ء

۷ تلمیحات ۲۰۰۷ء

۸ مرزا محمد رفیع سودا ۲۰۰۷ء

۹ عزیزن ۲۰۰۸ء

۱۰ انتخاب کلیاتِ پروین شاکر (تین ایڈیشن)

۱۱ اُردو کے مزاحیہ افسانے ۲۰۰۹ء

۱۲ تاریخ یوسفی المعروف بہ عجائبات فرنگ ۲۰۱۲ء

منٹو خاکے

مرتبہ

ڈاکٹر مظہر احمد

ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز، نئی دہلی

کتاب : منٹو خاکے

مرتبہ : ڈاکٹر مظہر احمد

مطبع : ایچ ایس آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی۔

ناشر : ایم۔آر۔پبلی کیشنز

10 میٹروپول مارکیٹ، 2724-25 کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی

Manto Khakey

Compiled by

Dr. Mazhar Ahmed

Cell: 09212089910 E-mail: mazhar_talat@yahoo.co.in

ISBN: 978-93-83282-55-5

First Edition :2014

Price: ₹ **400/-**

Library Edition: ₹. 575/-

Printed & Published by

M. R. Publications

Printers, Publishers, Book Sellers & Distributors of Literary Books

 # 10 Metropole Market, 2724-25 First Floor
Kucha Chelan, Daryaganj, New Delhi-110002

Cell: 09810784549, 09873156910 E-mail: abdus26@hotmail.com

سعادت حسن منٹو کے پرستار اور نقاد

ڈاکٹر خالد اشرف

(ایسوسی ایٹ پروفیسر، کروڑی مل کالج، دہلی یونیورسٹی)

کے لیے

Our Distributors

Delhi/New Delhi
Kutub Khana Anjuman Taraqqi Urdu, 011-23276526
Maktaba Jamia Ltd., 011-23260668
Ahluwalia Book Depot, 09818441306
Al-Balagh Publications, 09971477664

Ahmedabad
Amreen Book Agency, 08401010786, 09898102956

Aurangabad
Mirza World Book House, 0932503227

Nagpur
Haneef Book Depot, 0712-2722546, 09823237556

Aligarh
Educational Book House, 09358251117
Maktaba Jamia Ltd., 0571-2706142

Mumbai
Maktaba Jamia Ltd., 022-23774857
Kitab Daar, 022-23411854 09869321477
Saifi Book Agency, 09820480292
Siddiqui Book Depot, 022-23455652
Aqsa Book Depot, 022-23454730
Abdus Salam Qasmi, 09322603836

Hyderabad
Huda Book Distributors, 09849330850, 040-24514892

Kolkata
Usamania Book Depot, 09433050634, 09433050635

Srinagar, J & K
Maktaba Ilm-o-Adab 09419407522, 0191-2482371

Allahabad
Shabkhoon Kitab Ghar
0532-3295063, 09450615881

فہرست

مقدمہ

سعادت حسن منٹو نے اپنے خاکوں کے مجموعے کا دیباچہ تحریر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''اس کتاب میں جو فرشتہ بھی آیا ہے اُس کا مونڈن ہوا ہے اور یہ رسم میں نے بڑے سلیقے سے ادا کی ہے۔'' اور غالباً اسی لئے انہوں نے خاکوں کے مذکورہ مجموعے کا عنوان '' گنجے فرشتے'' رکھا تھا۔ اس کتاب کے بیشتر خاکے فلمی ہستیوں سے متعلق ہیں اور ہم سب جانتے ہیں کہ فلمی دنیا کی چکا چوند کے پس پشت ایک گھناؤنی اور ناگفتہ بہ دنیا ہمیشہ سرگرم عمل رہی ہے چنانچہ منٹو کا سفاک، بے باک اور حقیقت پسند قلم اس کی پرتیں اُتارتا چلا جاتا ہے۔ اُس کی نظرِ انتخاب غالباً ایسے ہی کرداروں پر جا ٹھہرتی ہے کہ جن کی زندگیاں فریبوں کی زد میں رہی ہیں۔ سو وہ اُن کے نقابوں کو اپنے نوکیلے اور تیز ناخنوں سے نوچتا جاتا ہے اور انہیں برہنہ کر کے اک ذرا فاصلہ پر کھڑا ہو کر دیکھتا اور ہمیں دکھاتا ہے۔ ایسا کرتے ہوئے وہ ہمیں خاصا سفاک اور ظالم نظر آتا ہے۔ مگر ہم بھول جاتے ہیں کہ یہ وہ نام نہاد ''فرشتے'' ہیں جنھیں ہم عقیدت کی نگاہ سے دیکھنے کے عادی ہیں اور وہ ان فرشتوں کا منڈن کر کے ان کے اصل چہرے ہمارے روبرو پیش کر رہا ہے۔

منٹو اردو کا منفرد متنازع اور ہر دلعزیز افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب خاکہ نگار بھی ہے اور منٹو کی شخصیت اور کردار کو مرکز بنا کر بڑی تعداد میں خاکے اور شخصی مضامین بھی اہلِ قلم حضرات نے تحریر کئے یں۔ منٹو اپنی شخصیت کی رنگارنگی اور ہر دلعزیزی کی وجہ سے ہر اس شخص کا موضوع بنا ہے جو اس کی زندگی کے کسی ایک حصے کا بھی چشم دید رہا۔ چنانچہ اس کے خاکہ نویسوں میں اس کی پرستش کرنے والوں کے ساتھ ساتھ اس کا مونڈن کرنے والے بھی شامل رہے ہیں۔ اس کی ابتدائی زندگی کی جدو جہد، امرتسر، دہلی، بمبئی اور لاہور کے حالات، ادبی، فلمی، خانگی سرگرمیوں کے علاوہ ادباء اور ساتھیوں نیز خرد و کلاں سے اس کے تعلقات، اس کی باضابطگیاں اور بے راہ رویاں، اس کے گھریلو

سلیقوں اور بلانوشیوں کا تذکرہ اُس کے ہم عصروں نے خوب خوب کیا ہے۔ منٹو کی خوش نصیبی یہ تھی کہ اسے عمر کے ہر دور میں مخلص اور جانباز دوست میسّر آئے۔ جو اس کے لئے فکر مند بھی تھے اور اس کے دکھ درد کے ساتھی بھی۔ وہ اس کے ہر ہر جملے کو سنبھال کر بھی رکھتے تھے اور اکثر اس کی زیادتیوں کو برداشت بھی کرتے تھے۔ اس کی شخصیت میں کچھ ایسی جاذبیت اور کشش تھی کہ منٹو کا دشمن بھی اس کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ چنانچہ اوپندر ناتھ اشک ''منٹو میرا دشمن'' میں بے اختیار اس کی تعریف بھی کر جاتا ہے۔ لاہور میں اس کے خاص دوست، ایڈیٹر حضرات اور دیگر کرم فرما اس کی بے راہ رویوں کے باوجود اس سے محبت کرنے کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں اور شاید اس لئے کہ وہ منٹو کی انسان دوستی، وسیع المشربی اور خلوص کے قائل ہیں اور حقیقتاً اس کے دکھ درد کے ساتھی۔ مرزا غالبؔ سے متعلق یہ قول مشہور ہے کہ اگر ان کی سوانح موجود نہ ہوتی تو خطوط غالبؔ کے ذریعے ان کی سوانح ترتیب دی جا سکتی تھی۔ اسی طرح منٹو کے خاکہ نگاروں نے منٹو کی زندگی کے تمام تر نشیب و فراز مع تفصیلات قلم بند کر کے آنے والی نسلوں کے لئے اس کی شخصیت اور کردار کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا ہے۔ ہم ان خاکوں کی مدد سے منٹو کو نہایت قریب سے دیکھ سکتے ہیں اور اس کی بعض نفسیاتی گتھیوں کو سلجھا سکتے ہیں۔ ان خاکوں میں ہم عصروں سے اس کے تعلقات، چشمکیں، ادبی موشگافیاں، بحث و مباحث، نشست و برخاست، گفتگو، محفل آرائی، بے تکلف لطیفہ بازی، خورد و نوش کے ساتھ ساتھ خانگی زندگی کی تفصیلات، بچوں سے محبت کے علاوہ اس کے پسندیدہ موضوعات یعنی طوائف، بے بسوا عورتوں سے متعلق اس کی آرا اور مباحث تفصیل کے ساتھ در آئی ہیں۔ ہم ان خاکوں سے سعادت حسن منٹو کی تحلیل نفسی بھی کر سکتے ہیں اور اس کی پیچیدہ مگر دلچسپ زندگی کا قریب سے مطالعہ بھی کر سکتے ہیں۔

منٹو کے خاکہ نگار اس کے دوست بھی ہیں اور دشمن بھی، بزرگ بھی ہیں اور شاگرد بھی، رشتے دار بھی ہیں اور ہم عصر ادیب بھی۔ وہ اس کی شخصی خوبیوں کا تذکرہ بھی کرتے ہیں اور اس کی کمزوریوں پر بے لاگ رائے بھی دیتے ہیں۔ بطورِ خاص اس کی بلانوشی، لاہور کے دورِ قیام میں اس کی بے راہ روی اور بے اعتدالی، اس کی سیمابی کیفیت اور شراب کے لئے اس کی تڑپ کا تذکرہ کرتے ہوئے ان خاکہ نگاروں کا قلم تلخ بھی ہو جاتا ہے۔ مگر اس سب کے پس منظر میں منٹو سے ان کی محبت ہی عیاں ہوتی ہے۔

منٹو اپنے ہمعصروں سے اُلجھتا ہے، انھیں ستاتا ہے۔ انہیں پریشان کر کے اسے تسکین ملتی ہے۔ اس کی بڑھی ہوئی انانیت اسے احساس برتری میں مبتلا رکھتی ہے۔ چنانچہ وہ اپنے آگے کسی کا چراغ جلنے نہیں دیتا۔ بلکہ مخالفت کی بادِ تند سے انھیں ہمیشہ کے لئے بجھا دینا چاہتا ہے۔ مگر جس سے محبت کرتا ہے اس کے لئے کچھ بھی کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی سے محبت کرتا ہے تو اوپندر ناتھ اشک سے اسے نفرت ہے۔ چنانچہ اسے چین سے نہیں رہنے دیتا۔ قاسمی کے لئے سفارشیں کرتا ہے۔ وہ بمبئی کے فلم سازوں اور اداکاروں کا نبض شناس ہے۔ ان سے منٹو کے بے تکلف تعلقات ہیں مگر جب وہ غیض و غضب کا شکار ہوتا ہے تو ان کے شخصیت و کردار کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیتا ہے۔ لاہور کے اپنے دوستوں اور شاگردوں (ایسے نوجوان جو بکثرت منٹو کے گھر آتے تھے اور ان سے افسانہ نگاری کے رموز سے آگاہی چاہتے تھے) کا بے حد احترام کرتا ہے اور ان کے ادنیٰ سے کاموں کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتا ہے۔ اسے اپنے بچوں سے بے پناہ محبت ہے بطور خاص لڑکے کی ناگہانی موت پر اس کا دل آنسو بہاتا ہے اور وہ تڑپ اُٹھتا ہے۔ شراب کی بڑھتی ہوئی لت اُسے زندگی کے آخری دنوں میں کسی حد تک مجبور و بے بس بنا دیتی ہے۔ ہر صبح اٹھ کر افسانہ لکھنا، اسے مدیروں کے حوالے کر کے معمولی اُجرت حاصل کرنا اور پھر شراب کا بندوبست۔ کبھی پیسہ بچ گیا تو گھر کے اخراجات بھی پورے ہوئے ورنہ اللہ اللہ خیر سلا۔

یہ اور اس طرح کی دیگر معلومات ہمیں ان خاکوں کے ذریعے ہی ملتی ہیں۔ حالانکہ منٹو نے متعدد مضامین میں اپنی زندگی کے حوالے سے بیشتر معلومات بہم پہنچا دی تھیں۔ مگر پھر بھی ان خاکوں کی اپنی اہمیت ہے کہ کسی شخصیت کی تحلیل نفسی کے لئے اسے ذرا فاصلے سے اور دوسروں کی نظر سے دیکھنا بے حد ضروری ہے۔

یہ خاکے منٹو کی شخصیت سے متعلق بہت سی غلط فہمیاں بھی دور کرتے ہیں۔ بلکہ ہم تو یہاں تک کہہ سکتے ہیں کہ منٹو سے نفرت کرنے والے ان خاکوں کے مطالعے سے اپنی سوچ بدل سکتے ہیں اور اس سے قربت کا احساس ان کے دل کے نہاں خانوں میں پیدا ہو سکتا ہے اور منٹو سے محبت کرنے والے بلکہ آنکھ بند کر کے محبت کرنے والے اس کی انسانی کمزوریوں پر غیر جانبداری کی نگاہ بھی ڈال سکتے ہیں کہ عقیدت کی نگاہ اکثر کمزوریوں سے صرفِ نظر کرتی ہے۔

ہمارے انتخاب میں شامل خاکوں میں منٹو کی شخصیت و کردار اور اس کے فن کے بارے میں چند اہم اور وقیع حوالے بھی موجود ہیں۔ ان میں سے اکثر ہمارے ناقدین کے حوالوں کا حصہ ہیں اور چند

ایسے ہیں کہ جو شاید پہلی بات اس کتاب کے ذریعہ منظر عام پر آرہے ہیں انھیں میں سے چند اقتباسات پر یہاں گفتگو کی جاتی ہے۔

کرشن چندر نے دہلی اور بمبئی میں منٹو کے ساتھ اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ نہ صرف ساتھ گزارا بلکہ ان کا شمار منٹو کے مخلص دوستوں میں ہوتا ہے۔ ہماری کتاب میں اسی رعایت سے ان کے ایک کے بجائے دو مضامین شامل ہیں جن میں انہوں نے منٹو کی شخصیت کے مختلف و متضاد پہلوؤں پر رائے زنی کی ہے۔ چنانچہ ان کے دو اقتباس یہاں نقل کئے جاتے ہیں:۔

''منٹو نے زندگی کے مشاہدے میں اپنے آپ کو ایک مومی شمع کی طرح پگھلایا ہے۔ وہ اردو ادب کا واحد شنکر ہے جس نے زندگی کے زہر کو خود گھول کر پیا ہے اور پھر اس کے ذائقے کو اس کے رنگ کو کھول کھول کے بیان کیا ہے۔''

''اس کی دوستی، بے باکی اور تلخی ایک قسم کا خول ہے جو اس نے اپنی نرم شخصیت کے تحفظ کی خاطر اپنے اوپر چڑھا رکھا ہے۔ اپنے آپ کو دوسروں سے قطعاً مختلف دکھانے کی خواہش دراصل اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ اندر سے بالکل ہمارے جیسا ہے۔''

کرشن چندر کے مندرجہ بالا اقتباسات منٹو کی شخصیت اور اس کی پرت در پرت نفسیاتی پیچیدگیوں کی طرف بامعنی اشارے کرتے ہیں، زہر کے ذائقے کو کھول کھول کر بیان کرنا آسان کام نہیں ہے۔ مگر منٹو تو شنکر ہے جس نے ساری دنیا کا زہر خود پی لیا تھا۔ اس کی قسمت میں تلخ نوائی ہی تھی۔ اس تلخی اور درشتی کو کرشن چندر نے دوسرے اقتباس میں ایک خول سے تعبیر کیا ہے جو منٹو نے اپنی نرم شخصیت کو چھپانے کے لئے اپنے وجود پر چڑھا لیا ہے۔ اُس کی اس نرم دلی کی متعدد نشانیاں ہمارے منتخب خاکوں میں جگہ بہ جگہ موجود ہیں۔

صاحب طرز ادیبہ عصمت چغتائی نے منٹو پر ایک مشہور و معروف مضمون تحریر کیا ہے۔ ''منٹو میرا دوست میرا دشمن''، میں عصمت منٹو کی فحش نگاری اور زبان و قلم کی بے باکی پر بے لاگ تبصرے کرتی ہیں۔ بطورِ خاص طوائف کے موضوع پر منٹو کو گھیرنے کی کوشش کرتی ہیں نیز منٹو کی بلانوشی پر بھی اظہارِ خیال کرتی ہیں۔ ان

کے مضمون سے یہ اقتباسات منٹو کی شخصیت اور فن پر خاصے کی چیز ہیں:۔

''یہ مجھے کبھی نہ معلوم ہو سکا کہ منٹو پی کر بہکتا ہے یا بہک کر پیتا ہے۔
میں نے اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ یا زبان میں لکنت نہ پائی، مجھے تو کبھی کوئی
فرق ہی نہیں محسوس ہوا۔''

''یہ منٹو کا میدان ہے وہ دنیا کی ٹھکرائی، گھورے پہ پھینکی ہوئی غلاظت میں
سے موتی چن کر نکال لاتا ہے۔ گھورا کریدنے کا اسے شوق ہے کیونکہ دنیا کے
سنوارنے والوں پر اُسے بھروسہ نہیں۔''

پہلے اقتباس میں منٹو کی شراب نوشی کا تذکرہ ہے۔ جس میں منٹو کے ظرف کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ منٹو تو زندگی کی تلخیوں کا شناور تھا چنانچہ شراب تو اس کے لئے اک گونہ بے خودی طاری کرنے کا بہانہ تھی۔ بقول غالبؔ

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہئے

عصمت چغتائی کا مذکورہ مضمون منٹو کے قیام بمبئی کی یادوں پر مشتمل ہے۔ یہ منٹو کے آسائش زدہ ایام تھے۔ ادبی نیز معاشی سطح پر منٹو ایک بہتر زندگی گزار رہا تھا۔ چنانچہ اس کے قول و عمل میں اعتدال بھی تھا۔ یہی اعتدال شراب نوشی میں بھی تھا۔ مگر یہ اعتدال قائم نہ رہ سکا اور آہستہ آہستہ شراب منٹو کی کمزوری بن گئی۔ شراب پی کر بہکنا، گالیاں دینا اور ہوش و حواس میں نہ رہنا منٹو کی پاکستانی زندگی کا معمول بن گیا تھا۔ ابتداً ایک گونہ بے خودی کی تلاش منٹو کو مے خانے لے گئی۔ اور اس نے آشوب آگہی کے لیے جس نشے کا انتخاب کیا وہی نشہ اس کی بربادی کی وجہ بن گیا۔

عصمت چغتائی نے دوسرے اقتباس میں منٹو کے فن پر تبصرہ کیا ہے کہ وہ غلاظت میں سے موتی چن کر نکال لاتا ہے۔ منٹو کے فن کا خاصہ ہی یہی ہے کہ وہ اچھوں میں بُرائی اور بُروں میں اچھائی تلاش کر کے انھیں زمانے کے سامنے لا کھڑا کرتا ہے خود بھی ایسے کرداروں سے نفرت یا محبت کرتا ہے اور قاری کو بھی ایسا کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ عصمت چغتائی نے اپنے خاکے میں منٹو کی شخصیت کی کئی

پرتوں کو نہ صرف یہ کہ اُتارا ہے بلکہ ان کی توضیح بھی کی ہے۔

اوپندر ناتھ اشک سے منٹو کا رشتہ دوستی سے زیادہ دشمنی کا تھا چنانچہ منٹو پر خاکہ لکھنے کے لئے انہیں جو عنوان سوجھا وہ بھی اس مخصوص رشتے کی غمازی کرتا ہے۔ ''منٹو میرا دشمن'' میں اشک نے اپنے اور منٹو کے درمیان تیز و تلخ رشتوں پر روشنی ڈالی ہے۔ اس مضمون کے مطالعے سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ اشک منٹو کی شخصیت کے ساتھ قدرے ناانصافی بھی کر رہے ہیں۔ دونوں ایک ہی جگہ ملازم تھے (ریڈیو) ایک ہی زبان میں لکھتے تھے۔ دونوں افسانہ نویس تھے اور دونوں کے مزاج بھی گرم تھے۔ چنانچہ ٹکراؤ لازمی تھا۔ اس ٹکراؤ کے تذکرے منٹو نے بھی کئے اور اشک نے بھی۔ منٹو کے مزاج کی تیزی و ترشی پر اظہار خیال کرتے ہوئے اشک بباطن ان کی افسانہ نگاری کی تعریف بھی کر جاتے ہیں مگر اس خاکے کا سارا تاثر منفی ہی رہتا ہے۔ منٹو کی زبان سے متعلق اشک لکھتے ہیں:۔

''منٹو کو گالی دینے کا بہت شوق تھا۔ اس بات کی اُسے خواہش رہتی تھی کہ وہ کرشن کو ایک آدھ غلیظ گالی دے۔ (سالے والے تو کہتا ہی رہتا تھا)۔''

دوستوں کی بے تکلف گفتگو میں اکثر گالیوں کی شمولیت عام بات ہے اور کرشن چندر اور منٹو کی دوستی اظہر من الشمس تھی۔ ہوسکتا ہے کہ گالی کے پس پست جو محبت کارفرما تھی (اور جو اکثر دوستوں کے مابین ہوتی ہے) وہ اشک کو گراں گزرتی ہو یا وہ گالی کی پس منظر میں پوشیدہ دوستی کو دیکھ ہی نہ پاتے ہوں۔

منٹو کے متعدد تکیہ کلام تھے، جنہیں انہوں نے زندگی کے مختلف ادوار میں اپنایا بھی اور پھر چھوڑ بھی دیا۔ انہوں نے اپنے یہ تکیہ کلام اپنے افسانوں کے کرداروں کو عطا کردیئے اور چند ایک کا تذکرہ اپنے مضامین میں بھی کیا۔ منٹو کے خاکہ نگاروں نے بھی ان کے ایسے تکیہ کلاموں کی طرف اشارے کئے ہیں۔ شاہد احمد دہلوی منٹو کے دیرینہ محسن تھے اور منٹو کے کئی افسانوں کے ایڈیٹر بھی۔ انہوں نے اپنے مضمون ''منٹو'' میں منٹو کی اس خاص صفت کا تذکرہ یوں کیا ہے:۔

''منٹو کی زبان پر ''فراڈ'' کا لفظ بہت چڑھا ہوا تھا...... میراجی کے ہاتھ میں دو لوہے کے گولے رہتے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا۔ ان کا مصرف کیا ہے؟ منٹو نے کہا۔ ''فراڈ ہے۔'' میراجی نے سیویوں کے مزعفر میں سالن ڈال کر کھانا شروع کردیا میں نے کہا۔ آپ کیا کر رہے ہیں؟ منٹو نے کہا'' فراڈ''

......اوپندر ناتھ اشک نے کوئی چیز لکھی، منٹو نے کہا ''فراڈ ہے۔'' اس نے کچھ

چیں چیں کی تو کہا ''تو خود ایک فراڈ ہے۔''

یہ اقتباس منٹو کی انانیت اور خود پسندی کی مثال بھی ہے اور اس کی شخصیت کی نفسیاتی گتھیوں کو سلجھانے میں معاون بھی۔ منٹو اپنے مقابل کسی کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا لہٰذا اسے ہر شخص فراڈ نظر آتا تھا۔ حالانکہ منٹو خود ایک بڑا فراڈ تھا۔ جس کی تفصیل ان خاکوں کے علاوہ اس کے اپنے تصنیف کردہ مضامین میں بکھری پڑی ہے۔ اس کی سیماب صفت زندگی، فطری بے چینی اور اضطراب اور سادگی و پرکاری، بے خودی و ہشیاری اس کے جرأت آزما ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہے اور یہ جرأت انسان کو کسی حد تک فراڈ بھی بنا دیتی ہے۔ (برسبیل تذکرہ عرض ہے کہ ہم نے اس کتاب کا عنوان ''فراڈ'' ہی تجویز کیا تھا مگر ہمارے چند کرم فرماؤں نے ہمیں ایسا کرنے سے باز رکھا کہ اس سے کتاب پر منفی اثر پڑے گا۔)

منٹو کے منہ پھٹ ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شاہد احمد دہلوی لکھتے ہیں کہ:۔

''دراصل منٹو کو بناوٹ سے چڑ تھی، خود منٹو کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ اس لئے لگی لپٹی نہ رکھتا تھا۔ جو کچھ کہنا ہوتا صاف کہہ دیتا۔ بلکہ منٹو بدتمیزی کی حد تک منہ پھٹ تھا۔''

بے شک منٹو منہ پھٹ اور تلخ کلام تھا۔ اس کے اندازِ بیان و تکلم میں تیزی و ترشی تھی مگر اس کی وجوہ کیا تھیں، کرشن چندر تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

''اس کی زبان بے حد تلخ تھی انداز بیان تھا تو کسیلا اور خاردار، نشتر کی طرح تیز اور بے رحم۔ لیکن آپ اس کی گالی کو اس کی تلخ کلامی کو، اس کے تیز نوکیلے خاردار الفاظ کو ذرا سا کھرچ کر تو دیکھیے اندر سے زندگی کا میٹھا رس نکلنے لگے گا۔ اس کی نفرت میں محبت تھی۔ عریانی میں ستر پوشی، آبرو باختہ عورتوں کی داستان میں اس کے ادب کی عفت پنہاں تھی۔''

کتاب میں شامل مضامین میں سے چنندہ اقتباسات پر ایک نظر ڈال لیں۔ جن میں منٹو کے خاکہ نویسوں نے منٹو کی زندگی، اس کی شخصیت اور اس کے فن کے حوالے سے بامعنی اور اہم باتیں رقم کی ہیں:۔

''منٹو کے ہاتھ میں یہ سماج سڑی ہوئی پیاز کی گانٹھ کی طرح تھا۔ جس کے چھلکے وہ بڑی نزاکت اور چابکدستی سے اُتارتا جاتا تھا اور یہ کہہ کہہ کر ہنستا جاتا تھا کہ دیکھو تمہارا سماج پیاز کے بدبودار چھلکوں کے ڈھیر سے زیادہ کچھ نہیں۔''

علی سردار جعفری

''منٹو کی روح میں عجیب ویرانگی تھی۔ وہ رنڈیوں کی دنیا میں رہتا ہوا بے تعلق تھا۔ مگر وہ ان چکلوں میں چھپی ہوئی انسانیت اور رنڈی کے دل میں بسی عورت کو دیکھتا تھا۔ عورت میں رنڈی اور رنڈی میں عورت دیکھتا تھا۔
جسم کی منڈی میں وہ روح کا پجاری تھا۔''

بلونت گارگی

''جرم وعصیاں کے آتش کدوں سے وہ ان قدیم عورتوں کی طرح جو ریل کی پٹریوں سے ایندھن اکٹھا کرتی ہیں۔ یاس وحرمان کی راکھ میں لپٹی ہوئی محبت کی چنگاریاں چن چن کر اپنی کانگڑی بھرتا رہا تا کہ رسوم وقیود کے پالے کی ماری ہوئی روحیں اپنا سینہ گرم کرسکیں۔''

ابوسعید قریشی

''وہ سیڑھیوں اور سہاروں کا کبھی قائل نہیں تھا۔ رحم کی التجا کرنے والوں سے اسے نفرت تھی۔ وہ زندگی بھر پتنگ اُڑاتا رہا اور اسی طرح کودتا رہا۔ ایسے میں کئی بار وہ لوگوں کے سروں پر بھی آن گرا۔ لوگ بھنّائے، جھلّائے، گالیاں دیں، قانون کو مدد کے لئے پکارا، لیکن منٹو نے کہا مجھے بھی پتنگ اُڑانے کا حق ہے۔ آسمان کی وسعتوں پر کسی کا اجارہ نہیں۔ جو مجھے گرانے کی کوشش کرے گا میں اس کے سر پہ کود جاؤں گا۔''

ابوسعید قریشی

''منٹو ادبی دنیا میں ایک تہلکہ مچانا چاہتا تھا۔ وہ ایک بہت ہی لمبی چھلانگ لگانا چاہتا تھا۔ اس کے سینے میں بغاوت کا آتش فشاں کروٹیں بدل

رہا تھا۔ وہ دنیا کا رنگ روپ بدل دینا چاہتا تھا۔ وہ سچے اور پُر خلوص انسانوں کی بستیاں بسانا چاہتا تھا۔ وہ دھوکے کی ٹٹیوں میں آگ لگانا چاہتا تھا۔ وہ اپنے ہر افسانے کو ایک آئینہ بنانا چاہتا تھا اور ان آئینوں سے ایک آئینہ خانہ بنا نا چاہتا تھا اور پھر وہ یہ چاہتا تھا کہ سوسائٹی کو اس آئینہ خانے میں لائے تا کہ چاروں طرف سے وہ اپنی اصلی حالت، شکل وصورت اور وضع قطع دیکھ سکے اور دیکھ کر شرما سکے۔"

نصر اللہ خاں

"منٹو مومن کی طرح سوچتا اور کافر کی طرح لکھتا ہے۔"

شورش کاشمیری

"منٹو سے قریب رہنے کے دوران میں نے بڑی شدت کے ساتھ یہ محسوس کیا کہ وہ غلط قسم کے احساس برتری میں مبتلا تھا۔ وہ ہمیشہ اٹھتے، بیٹھتے، چلتے پھرتے اور لکھتے کوئی ایسی بات کہتا اور لکھتا اور کوئی ایسی حرکت کرنا ضروری سمجھتا تھا جس سے اس کے اردگرد کے لوگ ایک دم چونک پڑیں اور اس کو اپنے سے مختلف اعلیٰ اور افضل تصور کریں۔"

ابراہیم جلیس

مندرجہ بالا اقتباسات میں منٹو کی شخصیت اور فن سے متعلق اہم اشارے ملتے ہیں۔ علی سردار جعفری منٹو کے ادب کی سماجی توجیح کرتے ہیں اور اسے بے باک بلکہ سفاک حقیقت نگار مانتے ہیں۔ بلونت گارگی منٹو کی روح میں بسی ویرانی کا ذکر کرتے ہیں کہ وہ جس دنیا میں رہتا تھا اسی سے بے تعلق رہتا تھا اور وہ عورت میں رنڈی اور رنڈی میں عورت دیکھتا تھا۔ بلونت گارگی کا یہ بیان مبنی بر حقیقت ہے۔ ان کا آخری جملہ بھی غور طلب ہے۔ ابوسعید قریشی نے بھی بلونت گارگی کی بات کو نئے پیرائے میں ادا کیا ہے۔ نئے تلازمات کا سہارا لیتے ہوئے قریشی منٹو کی افسانہ نگاری کی باریکیوں پر رطب اللسان ہیں۔ ابوسعید قریشی اپنے دوسرے اقتباس میں منٹو کی خود ساختہ و پرداختہ زندگی اور طرزِ زندگی کی طرف اشارے کرتے ہوئے ان کی جرأت اور بے باکی پر اظہار خیال کرتے ہیں۔

نصر اللہ خاں منٹو کی باغیانہ روش پر اظہارِ خیال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دھوکے اور فریب کی دنیا کو نیست و نابود کر کے وہ پرخلوص انسانوں کی دنیا بسانے کا متمنی تھا۔ اس کا ہر افسانہ ایک آئینہ تھا اور وہ اپنے افسانوں کا ایک ایسا آئینہ خانہ بنانا چاہتا تھا جس میں سماج و معاشرہ اپنی مکروہ صورت دیکھ کر شرما سکے۔

شورش کاشمیری اپنے مخصوص انداز میں منٹو کی شخصیت کی پرت یہ کہہ کر اُتارتے ہیں کہ وہ سوچتا مومن کی طرح اور لکھتا کافر کی طرح تھا۔ بلاغت وایمائیت سے بھرپور یہ جملہ منٹو کے فن کی تحلیل کرنے میں کامیاب نظر آتا ہے۔ ابراہیم جلیس منٹو کی بڑھتی ہوئی انانیت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ احساسِ برتری کی وجہ سے ہی وہ کوئی ایسی بات کرنا چاہتا تھا کہ جس سے فرد وسماج چونک اٹھے اور اس کی برتری (بحیثیت ادیب اور انسان) کا لوہا مان سکے۔

احمد ندیم قاسمی منٹو کے یارِ غار تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے محسن بھی تھے اور مشفق ومحترم دوست بھی۔ ان کی آپسی اخوت کی مثالیں وہ خطوط ہیں جو انہوں نے ایک دوسرے کو لکھے۔ ہمارے انتخاب میں قاسمی کے دو اہم خاکے شامل ہیں۔ ان خاکوں میں منٹو سے قاسمی کی عقیدت ومحبت عیاں ہے۔ منٹو کے کئی افسانوں کی تخلیق کی باریکیوں سے وہ واقف تھے۔ اور ان کے فن کے مزاج داں بھی تھے۔ چنانچہ منٹو کے تخلیقی رویے اور کردار سازی پر ان کی یہ رائے غور طلب ہے کہ:۔

> ''جب وہ کسی کردار میں اپنی کوئی کہانی چھپی ہوئی دیکھتا ہے تو اس کے ساتھ تعلقات بڑھاتا ہے اور جب وہ اس کے شب و روز سے اچھی طرح باخبر ہو جاتا ہے تو اس کردار کے گرد اپنا افسانہ تعمیر کر لیتا ہے۔ پھر اگر اس کردار کو علم ہو جائے کہ منٹو نے اسے موضوع بنایا ہے تو منٹو اس سے یا وہ منٹو سے تعلقات منقطع کر لیتا ہے۔''

منٹو اپنے کرداروں کی تخلیق میں جس سفاکی اور سختی کا رویہ اختیار کرتا ہے وہ اس اقتباس سے عیاں ہے۔ یہاں منٹو ایک چالاک بلکہ مکار تخلیق کار کی حیثیت سے ابھرتا ہے کہ وہ اکثر اپنے کرداروں (افسانے اور خاکے دونوں کے) کا مونڈن کر کے ہی باز آتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی اپنے مضمون میں منٹو کا ایک جملہ نقل کرتے ہیں، جس میں منٹو اپنے اور قاسمی کے افسانوں کے پس منظر میں ایک پتے کی بات کہہ جاتے ہیں۔ پہلے وہ جملہ ملاحظہ فرمائیں:۔

''سوائے احمد ندیم قاسمی۔ بات یہ ہے کہ تم ادب کے وزیر خارجہ ہو اور ہم

ادب کے وزیر داخلہ ہیں۔''

بظاہر یہ جملہ خود ستائی کی مثال ہے مگر اس میں بباطن منٹو نے اپنے اور احمد ندیم قاسمی کے فن کے حوالے سے ایک اہم بات کہہ دی ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کا محور و مرکز دیہات اور اس کی زندگی تھی جبکہ منٹو اپنے افسانوں کے کرداروں کی نفسیاتی الجھنوں کا نبض شناس تھا، چنانچہ منٹو کا خود کو ادب کا وزیرِ داخلہ کہنا نامناسب معلوم نہیں ہوتا۔

محمد اسد اللہ نے اپنی کتاب ''منٹو میرا دوست'' میں منٹو سے اپنے تعلقات کے ساتھ ساتھ منٹو کی زندگی سے متعلق کئی اہم معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ نیز منٹو کی زندگی کے آخری دن جو نہایت کسمپرسی اور بے بسی میں بسر ہوئے کہ شراب کی لت انتہا کو پہنچ گئی تھی اور ایسے میں وہ اپنے افسانے اونے پونے فروخت کر کے اپنی ضروریات پوری کر رہے تھے یہ اور ایسی تمام تفصیلات بھی اس کتاب میں شامل ہیں۔ ہم نے اس پوری کتاب کو ''منٹو خاکے'' میں ضم کر دیا ہے۔ زندگی کے آخری ایام میں منٹو سے لوگ اپنی غرض کے کام کیسے کروا لیتے تھے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے منٹو کی شخصیت کے ایک مثبت پہلو پر محمد اسد اللہ یوں روشنی ڈالتے ہیں:۔

''منٹو اپنی ذات سے تو بے حد بافیض آدمی تھے۔ بارہا میں نے دیکھا ہے

کہ بے شمار لوگ منٹو کے یہاں آتے اور اپنی غرض پوری کر کے چلے جاتے رہے

ہیں۔''

منٹو کے بیشتر خاکہ نگاروں نے اس کی شراب نوشی کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ شراب نوشی عمر کے آخری ایام میں ان کے لئے وبال جان ہو گئی تھی اور کثرتِ شراب نوشی نے ہی بالآخر منٹو کی جان بھی لے لی۔ منٹو کے بھانجے حامد جلال نے اپنے مضمون ''منٹو ماموں کی موت'' میں منٹو کے ان آخری ایام کا تذکرہ کیا ہے۔ منٹو کی فحش نگاری اور عورتوں سے متعلق ان کے خیالات وجذبات پر سینکڑوں ہزاروں صفحات سیاہ کئے جا چکے ہیں۔ جن میں انھیں بُرا بھلا بھی کہا گیا ہے۔ مگر ان کے خاکہ نگاروں نے عورت سے متعلق ان کے نظریات اور عزت وعفت سے متعلق ان کے خیالات پر قلم اُٹھایا ہے اور بتایا ہے کہ وہ عورت کی عزت کرتے اور اس کی شرم وحیا کے قائل تھے۔ نیز عورتوں کی بے حرمتی سے انھیں سخت تکلیف پہنچتی تھی۔ حامد

جلال منٹو کی آخری دو خواہشوں میں سے ایک کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ اُس بے یار و مدد گار عورت کی موت پر ایک افسانہ لکھنا چاہتے تھے جس کی برہنہ لاش گجرات (پاکستان) کی سڑک پر پائی گئی تھی اور چھ لوگوں نے اس کی عصمت دری کی تھی، نیز کڑکڑاتی ہوئی سردی میں اسے برہنہ چھوڑ دیا تھا۔ اس عورت کے ساتھ اس کی ایک ننھی سی بچی بھی تھی۔ صبح تک دونوں نے دم توڑ دیا تھا۔ اس خبر نے منٹو کو بے چین کر دیا تھا اور بقول حامد جلال کہ "میرا خیال ہے کہ اس کے بعد منٹو ماموں نے معمول سے زیادہ شراب پی لی ہوگی جو ان کے لئے مہلک ثابت ہوئی۔" اگر اس واقعے میں کسی حد تک بھی سچائی ہے تو یہ منٹو کی انسان دوستی، عورتوں کے تئیں اس کے جذبہ واحترام اور حساس ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ وہ ایک عورت کی بے حرمتی کی تاب نہ لا سکا اور خود کو شراب اور بالآخر موت کے حوالے کر دیا۔

کتاب میں شامل خاکوں میں منٹو کی زندگی کے شب و روز، نشیب و فراز، ادبی و شخصی اختلافات، ادبی چشم کیس، جھگڑے، منٹو کے افسانوں پر تبصرے، مقدموں کی روداد، فحش نگاری کا جواز، طوائف اور دلالوں کا بطور کردار انتخاب، کوٹھوں تک رسائی یا عدم رسائی، بیگم سے محبت، بچے کی وفات پر گریہ وزاری، بچیوں سے محبت، بمبئی، دہلی اور لاہور کی ادبی فضا اور محفلیں، منٹو کی تلخ کلامی، خندہ زنی، نشست و برخاست، بزرگوں کا احترام، دوستوں سے بے تکلفی کے معاملات، خوردوں سے شفقت و محبت، شراب نوشی کی لت، اُدھار، افسانوں کی فروخت، مزاج کی تیزی و تندی، ہمعصروں سے جھگڑے، چھیڑ خانی، گالی گلوج، تانگے کی سواری، نفاست پسندی، صفائی پسندی غرض حیاتِ منٹو کے عام اور خاص تمام پہلوؤں کی نہایت عمدگی سے عکاسی کی گئی ہے۔

کتاب کی تیاری کے دوران ۲۰۱۳ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس سے ایک کتاب بعنوان "سعادت حسن منٹو" (ذاتی یادداشتوں پر مبنی اوراق) شائع ہوئی جو ابوالحسن نغمی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ اس کتاب کی بنیاد نغمی صاحب کی ڈائری کے ایک صفحہ پر رکھی گئی ہے جس میں انہوں نے منٹو کی وفات کا اندراج کیا ہے۔ اس صفحے کا عکس کتاب میں موجود ہے۔ نغمی صاحب نے اپنی یادوں کے اوراق الٹتے ہوئے نہایت جذباتی انداز میں منٹو کی زندگی کے آخری دنوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کے مطابق منٹو کی وفات کی خبر سننے کے بعد بھی ادبائے لاہور پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا تھا بلکہ وہ ایک فحش طرحی مشاعرے میں دادِ عیش دے رہے تھے۔ منٹو کی موت پر ادیبوں کی یہ بے حسی قابلِ عبرت بھی ہے اور افسوس ناک بھی۔

خیر اس کتاب میں نغمی صاحب نے ان خود غرض، مکار اور عیاش لوگوں کا تذکرہ بھی کیا ہے جو منٹو کی شراب نوشی کی بڑھی ہوئی عادت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان سے چندہ (بھیک) بھی منگوا لیتے تھے۔ اور یوں اپنی شراب نوشی کے لیے سرمائے کا انتظام کرلیا کرتے تھے۔ محمد اسد اللہ نے بھی اپنی کتاب میں اشارتاً اس کا ذکر کیا ہے۔ نغمی صاحب کے منٹو سے تعلقات اور کتاب میں شامل قابلِ ذکر واقعات کی افادیت کے تحت ہم نے اس کی تلخیص منٹو خاکے میں شامل کردی ہے۔

کتاب میں شامل مضامین کی ترتیب میں یہ خیال رکھا گیا ہے کہ منٹو کے بچپن سے لے کر آخری ایام تک کے حالات بتدریج روشن ہو جائیں۔ لہٰذا تقدیم و تاخیر سے صرفِ نظر کر کے مضامین ترتیب دیئے گئے ہیں۔

۲۰۱۲ء میں نہایت جوش و خروش اور علمی و ادبی انہماک کے ساتھ منٹو صدی (پیدائش کے سو سال مکمل ہونے کی وجہ سے) منائی گئی۔ اس سلسلے میں برِ صغیر ہندو پاک میں متعدد سمینار وغیرہ منعقد کئے گئے۔ سرکاری اداروں نے بڑھ چڑھ کر اس میں حصہ لیا۔ ایک مدت بعد (اس سے قبل پہلی جنگِ آزادی کے ڈیڑھ سو سال مکمل ہونے پر ایسی ہی رونق اور جوش و خروش نظر آیا تھا۔) تقریباً پورے سال منٹو شناسی کے نئے در وا کئے گئے۔ منٹو کے فکر و فن پر کئی اہم اور معتبر کتابیں بھی زیورِ طبع سے آراستہ ہوئیں۔ منٹو کی تخلیقات کی اشاعت پر بھی توجہ صرف کی گئی اور اس حوالے سے بھی کئی کتابیں منظرِ عام پر آئیں۔ راقم الحروف نے بھی ''ظرافت اور منٹو'' کے عنوان سے ایک مضمون شائع کرایا۔ جو عام طور پر پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ اسی دوران محترم ڈاکٹر خالد اشرف (ایسوسی ایٹ پروفیسر کروڑی مل کالج، دہلی یونیورسٹی) نے مشورہ دیا کہ میں منٹو پر تحریر کئے گئے خاکوں اور مضامین کو یکجا کر کے شائع کرادوں تاکہ منٹو پر آئندہ کام کرنے والوں کو آسانیاں میسّر آجائیں۔ ڈاکٹر خالد اشرف خود بھی منٹو کے عاشق اور نقاد ہیں اور منٹو پر ان کی دو اہم کتابیں اہلِ نظر سے دادِ تحسین حاصل کر رہی ہیں۔ ابتداً میں نے ان کے مشورے کو سنجیدگی سے نہیں لیا اور بات آئی گئی ہوگئی۔ مگر وہ کہاں ماننے والے تھے۔ کچھ دن بعد انہوں نے مضامین کی فراہمی کا کام شروع کردیا اور پھر ایک دن اس موضوع پر تفصیل سے بات چیت کر کے کئی اہم اور معتبر حوالوں کی نشاندہی بھی کی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کی تیاری اور تکمیل میں ڈاکٹر خالد اشرف کی مدد شاملِ حال رہی ہے۔ اور اگر وہ ضد نہ کرتے اور بار بار تقاضا نہ کرتے تو شاید میں ہمت ہار کے بیٹھ جاتا۔ وہ میرے سینئر بھی ہیں اور

کرم فرما بھی۔ ادبی کاموں کے لئے دوستوں کو اکسانا اور انہیں تیار کرنا کوئی ان سے سیکھے۔ میں صمیمِ قلب سے ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور یہ کتاب انہی کے نام معنون کرتا ہوں۔

پروفیسر شمس الحق عثمانی صاحب اردو فکشن کے نامور و معتبر نقاد ہیں اور ان دنوں منٹو کے کلیات کی تدوین کر رہے ہیں۔ منٹو صدی کے دوران قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے ادبی رسالے میں اُن کا ایک اسمبلاژ ''منٹو بقلم خود'' شائع ہوا تھا۔ اس کی سوانحی حیثیت کے پیشِ نظر فیصلہ کیا کہ اسے بھی کتاب میں شامل کیا جائے۔ اسی دوران شمس الحق عثمانی صاحب نے اُس پر نظرِ ثانی کی اور اسے نئے عنوان کی زینت سے بھی آراستہ کیا۔ ترمیم و اضافے کی بعد اس کی اہمیت و افادیت میں قابلِ قدر اضافہ ہوگیا۔ چنانچہ ہماری کتاب میں یہ اسمبلاژ ''منکہ سعادت حسن منٹو'' کے عنوان سے شائع ہو رہا ہے۔ اپنی مخصوص انفرادیت (منٹو کی سوانح انہی کے قلم سے مرتب کی گئی ہے) کی وجہ سے اسے کتاب کے آخیر میں جگہ دی گئی ہے۔ مگر اس سے اس مضمون کی اہمیت و افادیت کم نہیں ہوتی۔ پروفیسر شمس الحق عثمانی صاحب نے بیشتر مضامین و ماخذ کی نشاندہی کی اور کتاب کی رفتار کے سلسلے میں بھی باز پرس کرتے رہے۔ میں ان کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

پروفیسر شمس الحق عثمانی صاحب نے منٹو کے ایک ایسے خاکے کی نشاندہی بھی کی تھی جو اب تقریباً ناپید ہو گیا ہے۔ اس خاکے کی ایک فوٹو اسٹیٹ کاپی اُن کے پاس موجود تھی مگر وہ ان معنوں میں ناقص تھی، کہ فوٹو اسٹیٹ کے دوران کئی جگہ سے سطریں غائب ہو گئی تھیں۔ یہ خاکہ بلونت گارگی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے اور ان کے خاکوں کی کتاب ''حسین چہرے'' میں شامل ہے۔ یہ کتاب بیسویں صدی کے چھٹے دہے میں اشاعت پذیر ہوئی تھی اور اب اس کی دستیابی مشکل ہی نہیں ناممکن ہو گئی ہے۔ راقم الحروف نے دہلی کے کتب خانوں میں تلاش کیا۔ چند اساتذہ سے تذکرہ کیا مگر کتاب دستیاب نہ ہو سکی۔ بالآخر فیصلہ کیا کہ مضمون کے ان حصوں کو حذف کر کے شائع کر دیا جائے کہ ایک روز کالج (ذاکر حسین ایوننگ کالج) کے اسٹاف روم میں عبدالغنی مرحوم (پروپرائٹر ساقی بک ڈپو) کے صاحبزادے منصور احمد کے سامنے اس مضمون کا ذکر آیا تو انہوں نے یہ خوشخبری سنائی کہ یہ مضمون ان کے پاس موجود ہے اور اگلی ہی ملاقات میں انہوں نے یہ قیمتی مضمون میرے حوالے کر دیا۔ اطہر پرویز کی کتاب ''منٹو کے بہترین افسانے'' کے جعلی پاکستانی ایڈیشن میں یہ خاکہ اطہر پرویز کے پیش لفظ سے پہلے چسپاں کر دیا گیا ہے اور اس کا حوالہ کتاب کے سرورق

پر بھی دیا گیا ہے۔ یہاں برسبیل تذکرہ یہ بتادوں کہ کتاب کی تلاش کے دوران ساہتیہ اکیڈمی لائبریری میں بلونت گارگی کی کتابوں کی فہرست پر نظر ڈالی تو ان کی پنجابی زبان کی کتابوں میں ''حسین چہرے'' نام کی کتاب پر نظر گئی۔ چونکہ میں پنجابی زبان سے ناواقف ہوں لہٰذا اس کتاب کے مشمولات پر کچھ اظہارِ خیال کرنے سے لاچار ہوں مگر اندازہ یہی ہے کہ بلونت گارگی نے اپنی اردو کی کتاب کو پنجابی زبان کا قالب عطا کردیا ہے۔ خیر منصور احمد صاحب کی اس عنایت نے ایک ناقص خاکے کو مکمل کردیا۔ میں دل کی گہرائیوں سے ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ایسے میں ان کے والد صاحب کی یادیں تازہ ہورہی ہے۔ وہ میرے کرم فرماؤں میں سے تھے۔ اللہ ان کے درجات بلند فرمائے اور منصور احمد کو زندگی میں کامیابی اور شادمانی نصیب ہو آمین۔

''منٹو میرا دوست'' کے عنوان سے ۱۹۵۵ء میں اسد اللہ کی کتاب شائع ہوئی تھی۔ ڈاکٹر خالد اشرف صاحب کے پاس اس کی فوٹو اسٹیٹ کاپی موجود تھی مگر بہ اتفاق اس کے دو صفحات فوٹو اسٹیٹ ہونے سے رہ گئے تھے چنانچہ اس کی حیثیت بھی ''ناقص'' تھی۔ یہ کتاب لاہور سے اشاعت پذیر ہوئی اور زیرِ نظر ایڈیشن ۱۹۹۱ء کا ہے۔ بہ تلاشِ بسیار یہ کتاب بھی دستیاب نہ ہوسکی۔ پھر انٹرنیٹ کی طرف توجہ کی مگر یہ کتاب وہاں بھی نظر نہ آئی۔ پھر خیال آیا کہ کیوں نہ پاکستان میں مقیم اپنے رشتہ داروں سے رجوع کرکے کتاب یا کم از کم وہ صفحات ہی حاصل کرلوں جو غائب ہیں، چنانچہ اپنے ہم زلف کے بیٹے نعمان شاہد سے فیس بک پر بات کی انھیں پورا حوالہ دیا اور انہوں نے نہایت سعادت مندی اور محنت سے وہ کتاب حاصل کی اور متعلقہ صفحات اسکین کرا کے مجھے ای میل کئے اور یوں وہ ناقص کتاب بھی مکمل ہوگئی۔ یہ پورا خاندان یعنی شاہد جمیل صاحب (ہم زلف) ان کی اہلیہ نکہت گل صاحبہ ان کے توام صاحبزادگان سلمان شاہد اور نعمان شاہد اور صاحبزادیاں برسوں میری اور میری اہلیہ کے علم کی پیاس یوں بجھاتے رہے ہیں کہ اکثر پاکستانی کتابیں بھیجتے رہتے ہیں اور ہمیشہ میری فرمائشوں کے لئے سرگرداں رہتے ہیں۔ نعمان نے لاہور یونیورسٹی سے کتاب حاصل کرکے اور اس کے گم شدہ صفحات فراہم کرکے ایک ناممکن کام کو ممکن بنادیا۔ میں اس پورے خاندان اور بطور خاص سلمان، نعمان کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں اور زندگی میں کامیابی و شادمانی کے لئے دعا گو ہوں۔

اس کتاب کی تیاری میں دہلی کی مختلف لائبریریوں سے مدد لی گئی۔ ساہتیہ اکیڈمی لائبریری، دہلی

یونیورسٹی لائبریری، کالج لائبریری کے علاوہ داراشکوہ لائبریری اردو اکادمی سے استفادہ کیا گیا۔ نزہت مہدی رضوی لائبریرین داراشکوہ لائبریری کا بطور خاص شکریہ کہ انہوں نے بہت ہی اہم اور قیمتی کتابوں اور رسائل کی فراہمی میں میری مدد کی۔ لائبریری کے دیگر اراکین بھی میرے شکریہ کے حق دار ہیں کہ ہمیشہ مجھ سے محبت اور شفقت کا رشتہ قائم رکھتے ہیں۔

اُستاد محترم ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی کا شکریہ ادا کرنا یوں بھی فرض ہے کہ وہ میرے کاموں پر نظر بھی رکھتے ہیں اور حتی المقدور مدد بھی فرماتے ہیں۔ اللہ انہیں صحت کے ساتھ طویل زندگی عطا فرمائے آمین۔

اہلیہ طلعت گل اور بچوں (ایمن گل اور اطیب ظفر) کا شکریہ یوں کہ اکثر میری ذمہ داریوں کا بوجھ وہ اپنے کاندھوں پر لے لیتے ہیں اور مجھے فرصت کے لمحات عطا کر دیتے ہیں۔

عبدالصمد پروپرائٹر ایم۔ آر پبلی کیشنز میرے شاگرد بھی ہیں اور ناشر بھی، خوبصورت اور عمدہ کتابوں کی اشاعت اب ان کا معمول بن گیا ہے۔ میں اللہ سے ان کی ترقی اور کامیابی کے لئے دست بدعا ہوں۔

اگست ۲۰۱۴ء

ڈاکٹر مظہر احمد

سعادت حسن منٹو

اس مضمون کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ منٹو کی وفات کے فوراً بعد لکھا گیا اور دوسرا حصہ اس کے تقریباً پندرہ برس بعد، دوسرے حصے میں بعض باتوں کی تکرار کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

(۱)

دُبلا پتلا، گورا چٹا، لمبا تڑنگا، بڑی بڑی غضب کی شریر آنکھیں۔ اور پھر ان شریر آنکھوں میں بلا کی ذہانت و فطانت۔ ڈھیلی ڈھالی بنگالی وضع قطع کی قمیض، بڑی موری کا پاجامہ۔ پُورا لباس کھدر کا، جو منٹو کے گورے چِٹے رنگ جیسا صاف شفاف اُجلا ورق۔ طالب علمی کے زمانے میں میں نے منٹو کو جب بھی دیکھا تو کچھ اس طرح سے دیکھا کہ اس کی بغل میں ناول کا تھیلا ہے۔ ایک ہاتھ میں کسی پیٹنٹ دوا کی بوتل ہے تو دوسرے میں ایک ٹوکری میں چند مالٹے ہیں اور چند سیب۔ اور پھر کچھ مدّت گزرنے کے بعد دیکھنے والوں نے اس کی بغل میں اور دونوں ہاتھوں میں شراب کی بوتلیں دیکھیں اور یہ بوتلیں مَرتے دم تک اس کے ہاتھوں ہی میں رہیں لیکن یہ شراب بدلتی رہی۔ شیمپین سے پورٹ بنی اور پھر پورٹ سے ٹھرّا۔ اور پھر بدلتی ہوئی شراب نے منٹو کو بھی بدلنا شروع کر دیا۔ اور جب زیادہ بدلنے کی اس میں سکت نہ رہی تو قدرت کا لمبا ہاتھ بڑھا اور اس نے ان سب شراب کی بوتلوں کو توڑ دیا۔ اس کشمکش میں منٹو کی زندگی کا ساغر بھی ٹوٹ گیا۔ اور اس طرح برصغیر کے اس عظیم پایہ افسانہ نویس کی زندگی کا افسانہ ختم ہوگیا۔ اس افسانے کا انجام کیا ہوا؟ المیہ یا طربیہ! اس کا جواب مُلک کے افسانہ نویس دیں گے۔ اور یا وہ لوگ دیں گے جو سعادت کو جانتے تھے۔ جو منٹو سے واقف تھے۔ میرے لئے تو وہ منٹو مر گیا جو میرے اسکول کا ساتھی تھا۔ جو خود میرے لئے ایک زمانے میں چلتا پھرا افسانہ تھا۔ میں نے ہمیشہ اسے کتابوں اور دواؤں

سے لدا پھندا دیکھا۔ سینکڑوں نسخے اس کی نوک زبان تھے۔ جب دیکھو خرز خوں، خرز خوں بلغم تھوکتا۔ ظاہری آنکھ سے دیکھئے، خرد بین سے، یہ بلغم خالص بلغم تھا لیکن منٹو کی آنکھوں کو اس بلغم میں سینکڑوں افسانوی حقیقتیں نظر آتیں کبھی تو وہ اس میں پھیپھڑوں کے خون کی آمیزش پاتا اور کبھی دِق کا کوئی شاہکار کہ جیسے وہ بچپن ہی سے اپنے لئے موت ڈھونڈ رہا تھا۔ کچھ تو سچ مچ وہ بیمار رہتا تھا اور کچھ وہ بیمار بننے کا شوقین بھی تھا۔ بچپن میں وہ بڑا دھان پان تھا۔ بے پناہ لاغر وضعیف، لیکن شریر ایسا کہ جیسے بجلیاں کوٹ کوٹ کر اس کے جسم میں بھر دی گئی ہوں۔

منٹو کے بارے میں اس کے ہم جماعتوں کی رائے میں بڑے اختلافات تھے۔ لکھنے پڑھنے والے اور سیدھے سادے لڑکے اُسے بدمعاش سمجھتے تھے اور بدمعاش مظلوم۔ یہی وجہ ہے کہ منٹو سب میں رہ کر سب سے علیحدہ نظر آتا تھا۔ اس کے مذاق میں اور اس کی شرارتوں میں اور اس کے لکھنے پڑھنے کے طریقوں میں ایک نیا پن محسوس ہوتا تھا۔

اسکول کے رجسٹر میں روزانہ اس کی غیر حاضری لگتی لیکن وہ نہایت پابندی سے اسکول آتا۔ یا تو کسی نئے لڑکے سے دوستی گانٹھنے اور یا کسی کو "آلو چھولے" کھلا کر الیگزینڈر ڈوماز کے کسی ناول کا پلاٹ سُنا کر فخر محسوس کرنے۔ وہ جب کسی ناول کا پلاٹ سُناتا تو اس طرح سُناتا کہ جیسے وہ خود ناول کا مصنّف ہے۔ ہفتے عشرے میں ایک بار منٹو جماعت میں بھی نظر آ جاتا۔ بڑا سا بستہ سامنے میز پر رکھا ہے اور منٹو مطالعہ میں مستغرق ہے۔ بستہ میں اُوپر کی کتاب سوہن لال کا جغرافیہ ہے اور بیچ میں چارلس گاردس کے دو چار ناول ہیں۔ مولوی صاحب دینیات پڑھا رہے ہیں اور منٹو صاحب "ریٹرن آف شی" پڑھ رہے ہیں۔ اور لطف تو یہ کہ دونوں اپنی اپنی جگہ خوش ہیں طالب علمی کے زمانے میں یہ ناول اور یہ افسانوں کی کتابیں منٹو کا اوڑھنا بچھونا بن گئیں۔ ناول اور افسانوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ ناول کے سیکڑوں پلاٹ اس کے ذہن میں الجھ کر رہ گئے۔ اس کی زندگی بے شمار پلاٹوں کا جال بن گئی اور اس کا کردار ناولوں کے سینکڑوں کرداروں کا ایک مرقع بن گیا۔ یاد رہے کہ منٹو نے ابھی قلم نہیں اٹھایا تھا۔ کیوں کہ اس کی عملی زندگی میں بے شمار افسانے پھوٹ رہے تھے اور اس کی زندگی ایک افسانوی زندگی بن گئی تھی، اس کی ہر حرکت ایک پلاٹ، اُس کی ہنسی سس پنس اور اس کے آنسو کلائمکس، جو بات کرتا چونکا دینے والی۔ انگریزی بولتا تو بے تکان بولتا۔ لیکن خالص اور ناولانہ انگریزی اور وہ بھی کسی چوٹی والے

ناول کی، ایسے ناول کی جو اُسے جیب خرچ کے پیسوں سے آسانی سے مل جاتا۔ اور چوں کہ بے خود و بے اختیار ہو کر خاص خاص جوش و خروش کے موقع پر وہ بے سوچے بولتا تو اس کی انگریزی خالص ''ٹامیانہ'' انگریزی بن جاتی۔ اسی باعث اس کے ہم مکتب ایک تو اس کے ٹامیانہ رنگ و روپ کی وجہ سے اور دوسرے اُس کی ٹامیانہ انگریزی کی وجہ سے اسے ٹامی کہتے ہیں۔ ٹامی عمر میں مجھ سے پانچ چھ سال بڑا تھا۔ میں ساتویں درجے میں پڑھتا تھا اور وہ نویں میں۔ اگر چہ اچھے بچے اس کے پاس سے گزرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے لیکن میرا جی یہ چاہتا کہ میں دن رات اس کے پاس بیٹھا رہوں اور اس کی عجیب و غریب باتیں اس کے خاص انداز اور خاص لہجے میں سنتا رہوں اور اس کی حرکتیں دیکھتا رہوں۔ امتحان کا زمانہ آتا اور گزر جاتا۔ لڑکے دن رات پڑھنے لکھنے میں مصروف رہتے۔ منٹو بھی دن رات کتاب کے مطالعے میں غرق رہتا۔ لیکن کتاب نصاب سے باہر کوئی سنسنی خیز ناول ہوتا۔ یہ سنسنی خیزی منٹو کو بھی خاصا سنسنی خیز بنا گئی۔

میرے والد محمد عمر خاں مسلم ہائی اسکول امرتسر کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ وہ منٹو کے استاد بھی تھے اور دوست بھی۔ منٹو ایسی منفرد شخصیتوں کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا اور ان سے کام لینے کا سلیقہ کچھ اُنھی کو آتا تھا۔ اور یہ اُنھی کا دم تھا کہ منٹو نے سینکڑوں مشغلوں اور مصروفیتوں کے باوجود میٹرک پاس کرلیا۔ وہ ریاضی میں بھی پاس ہو گیا۔ امتحان سے دو مہینے پہلے اس نے بڑی سنجیدگی سے محنت کی۔ ورنہ شروع سال میں تو اُسے اس کے سنسنی خیز منصوبوں کی تکمیل اور ناولوں کے مطالعہ ہی سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ وہ اپنی والدہ کے پیسے چُراتا اور ناول خریدتا۔ رشتہ داروں اور دوستوں سے قرض لیتا اور ناول خریدتا۔ والد سے فیس اور جرمانوں اور پک نک اور مختلف تقریبوں کے نام سے پیسے لیتا اور ناول خریدتا۔ دوستوں کے والدین سے دوستی گانٹھتا، رشتے نکالتا، کسی کو ماموں جان کہتا اور کسی کو چچا میاں۔ اور ذرا ان کی نظر چوکی اور منٹو انھیں چچا بنا کر چھوڑتا۔ کوئی کتاب اُڑائی اور چمپت۔ وہیلر کی دکان پر تو ایک مرتبہ وہ پکڑا بھی گیا جب پولس کے سپاہی اُسے تھانے لے جانے لگے تو اُس نے انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگایا۔ لوگ سمجھے سیاسی ملزم ہے۔ وہ کتابوں کا عاشق تھا۔ لیکن اس کے ذوق و شوق کے مطابق اسے کتابیں نہیں ملتی تھیں۔ ایک طالب علم کا جیب خرچ ہی کیا۔ زیادہ سے زیادہ دو چار کتابیں خرید لیتا جو ایک دن اور رات میں ختم کر لیتا۔ وہ بے شمار کتابیں پڑھنا چاہتا تھا اور بقول اس کے وہ بے تحاشا کتابیں پڑھتا تھا۔

میرے والد نادانستہ طور پر منٹو کی اس چوری میں برابر کے شریک تھے۔ وہ کتاب چُرا کر لاتا۔ پہلے خود پڑھتا پھر ابّا کو دیتا۔ جب ابّا پڑھ لیتے تو وہ اور ابّا ناول کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرتے۔ پھر ابّا اُس سے کہتے کہ وہ اس ناول کے پلاٹ کو اپنی انگریزی میں لکھ کر دکھائے۔ وہ اپنی انگریزی میں ناول کے پلاٹ کو بالاختصار قلم بند کرتا اور ابّا اصلاح کرتے۔ اِس طرح ایک غیر محسوس طریقے پر منٹو کی انگریزی کی اصلاح ہوتی رہی۔ تھوڑی دنوں بعد میں نے ابّا کو یہ کہتے سُنا کہ منٹو کی انگریزی پر کسی انگریزی مصنف کی تحریر کا گمان ہوتا ہے۔ منٹو کی انگریزی تحریر میں بلا کی روانی تھی۔ بزرگوں کا اندازہ تھا کہ یہ بڑا اگر صحیح راستہ پر پڑ گیا تو انگریزی زبان کا بے مثل مصنّف ہوگا۔ اور اگر خدا نا خواستہ بھٹک گیا تو کم از کم اخبار نویس تو بن ہی جائے گا۔ انگریزی زبان کے اعتبار سے اب منٹو ''ثامیت'' کی حدود سے گزر چکا تھا اور اب وہ اردو زبان میں ثامیت اختیار کر رہا تھا۔ اِنٹرنیس کے امتحان میں اُردو ایک لازمی مضمون ہے۔ پھر اسکول میں منٹو کو کچھ ایسے بزرگ بھی مل گئے تھے جو اردو کے شیدائی تھے۔ شاعر اور ادیب تھے۔ اُردو کے استاد رانا مبارک مند خاں سالک صہبائی نے منٹو کو اُردو کا چسکا لگایا۔ اس کا خط بڑا پاکیزہ تھا۔ دسویں جماعت میں سالک صاحب اُسے روزانہ املا لکھواتے۔ لیکن ہوتا یہ کہ سالک صاحب کو خود سارا املا لکھنا پڑتا۔ ایک لفظ بھی صحیح نہ ہوتا۔ منٹو اور سالک صاحب میں دوستی بڑھنے لگی۔ سالک صاحب بھی اپنی وضع کے ایک ہی بزرگ تھے۔ وہ شاعر بھی تھے اور ادیب بھی۔ بلا کے ذہین انسان۔ صاحبِ طرز ادیب۔ خوب لکھتے تھے۔ بڑا وسیع مطالعہ تھا۔ مسجد کے صحن اور مکتب کی چٹائی پر بیٹھ کر پڑھا تھا۔ بڑے وضع دار انسان تھے۔ گوشہ نشین اور درویش۔ پنجابی اور دیہاتی۔ کھوئے کھوئے سے رہتے تھے۔ کچھ تو قدرتی طور پر کھوئے ہوئے سے رہتے تھے اور کچھ کھوئے رہنے کا اہتمام بھی کرتے تھے۔ آنکھوں میں لال ڈورے۔ اگر ذرا بن سنور کر رہتے تو یہ ڈورے غضب ڈھانے لگتے۔ سالک صاحب اردو ادب کی دنیا میں ایک کھویا ہوا امریکا تھے جو ادب کے کولمبسوں کی نظروں سے اوجھل رہا۔ سالک صاحب نے منٹو کے مطالعہ کا رُخ بدل دیا۔ اب وہ اعلیٰ معیار کے ناول پڑھنے لگا۔ اچھے اچھے مصنفوں سے روشناس ہوا۔ منٹو نے دو تین مہینے میں اُردو میں میٹرک پاس کرنے کی قابلیت پیدا کر لی تھی۔ میٹرک کا امتحان قریب آ رہا تھا لیکن منٹو بہت دُور جا رہا تھا۔ اس کے والد غلام حسین صاحب مرحوم جو منصف غلام حسین کے نام سے مشہور تھے، اپنے بوڑھے دل میں بس ایک آرزو رکھتے تھے اور وہ یہ کہ منٹو کسی طرح سے میٹرک پاس کر لے اور

پھر بی اے، ایم اے کر لے۔ آئی سی ایس بن جائے یا بیرسٹری کا امتحان پاس کر لے۔ ان کی نظر میں منٹو کی ترقی کی بس یہی معراج تھی۔ منصف صاحب ایسا کیوں نہ سوچتے۔ ان کے خاندان کا ہر فرد بیرسٹر یا وکیل تھا۔ وہ جس گلی میں رہتے تھے وہ گلی بھی وکیلوں والی گلی کہلاتی تھی۔ منٹو کے باپ (پرانے زمانے کے جج) ایک بہنوئی میاں حفیظ اللہ مرحوم وکیل اور رئیس شہر، دوسرے بہنوئی ڈاکٹر کچلو۔ پھر منصف صاحب یہ کیوں نہ چاہتے کہ منٹو بھی وکیل یا بیرسٹر بنے۔ ہاں تو امتحان قریب تھا۔ منٹو کے والد صبح ہی صبح ہمارے گھر آتے۔ خدا بخشے بڑی کڑاکے کی آواز تھی۔ چلّا کر آواز دیتے۔ ابا باہر آتے، برخوردار کی روزانہ کی تعلیمی حالت پر تبصرہ ہوتا۔ دونوں مل کر کوئی پلاٹ بناتے۔ لیکن منٹو ایک زقند بھرتا اور یہ گھروندے اپنی جگہ رہ جاتے اور برخوردار یہ جادہ جا۔ وہ دُور کھڑا ہو کر بزرگوں کے منصوبوں پر مُسکراتا۔

ایک دن منصف صاحب حسبِ معمول صبح ہی صبح ہمارے گھر آئے۔ ابّا سے ملاقات ہوئی، کہنے لگے۔ ''فرمایئے۔ کیا حال ہے سعادت کا؟ اب تو خوب پڑھتا ہوگا۔ رات دن آپ کے پاس رہتا ہے؟ ابّا بہت چکرائے۔'' ارے صاحب پندرہ دن سے میں نے اس بدبخت کی شکل تک نہیں دیکھی۔'' بس پھر کیا تھا۔ دونوں بزرگ فی البدیہہ منٹو کی مدحت میں بے شمار قصیدے کہہ گئے۔ کچھ دنوں بعد معلوم ہوا کہ منٹو بمبئی میں تشریف فرما ہیں۔ بہر حال بلوائے گئے۔ منٹو نے ابّا کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا۔ چند گم نام اشخاص کے نام سے ایک اشتہار چھاپا اور اسے شہر کے کوچہ و بازار میں لگایا۔ اشتہار کا مضمون کچھ اس طرح تھا...... محمد عمر خان ہیڈ ماسٹر مسلم ہائی اسکول کو فوراً ملازمت سے علیحدہ نہیں کیا گیا تو سارے طالب علم اور ان کے ماں باپ بغاوت کر دیں گے...... اس اشتہار کو جس نے پڑھا، ہنس دیا۔ ابّا نے بھی بہت لطف اٹھایا۔ جب سعادت پر کچھ اور پابندیاں عائد کی گئیں تو اُس نے ابا کے خلاف چند ہم جماعتوں کے ساتھ حسن بن صباح کمیٹی کی داغ بیل ڈالی۔ ابّا کے نام دھمکیوں کے خط آنے لگے۔ ان خطوں میں یہ لکھا جاتا تھا کہ اگر تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے تو تمہیں قتل کر دیا جائے گا۔ ذرا قاتل کی ہمت اور جرأت تو دیکھیے، صبح ہی صبح ہمارے گھر آتا اور خط ڈال کر چلا جاتا۔ ابّا اپنے قاتل سے خود ملنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ایک دن قاتل ان کی گرفت میں آ ہی گیا اور بُری طرح مجروح ہوا۔ ''حسن بن صباح'' کمیٹی درہم برہم ہوگئی۔ اس کمیٹی کا دفتر نہ جانے کہاں تھا۔ مگر کہیں نہ کہیں تھا ضرور۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ایک دن جب ابا منٹو کی کلاس کو پڑھا رہے تھے کہ ایک سردار صاحب آئے اور کلاس رُوم کے سامنے کھڑے

ہو گئے۔ سردار صاحب کرایہ پر فرنیچر اور خیمے دیا کرتے تھے۔ ابّا نے سردار جی سے ان کے آنے کی وجہ پوچھی۔ کہنے لگے۔ ''وہ دری واپس نہیں ملی۔ اور نہ اُس کا کرایہ ہی ملا ہے۔'' ابّا نے پوچھا۔ ''کون سی دری اور کیسا کرایہ؟'' کہنے لگے۔ ''وہ جو آپ نے اپنے بڑے لڑکے کی شادی پر منگائی تھی۔ اور جو آپ کا چھوٹا لڑکا میری دکان سے لایا تھا۔'' ابّا اس معمے پر غور ہی کر رہے تھے کہ سردار جی کی نظر منٹو پر جا پڑی جو سردار جی کو دیکھ کر دبک رہا تھا۔ سردار جی نے چلاّ کر کہا۔ ''دیکھئے وہ لائے تھے۔'' ابّا مسکرا دیئے۔ سردار جی کو تو انھوں نے کسی طرح سے رخصت کر دیا، دَری کا کیا ہوا، مجھے معلوم نہیں۔ جب امتحان بالکل قریب آ گیا تو سعادت نے بڑی سنجیدگی سے محنت کرنا شروع کر دی۔ ممکن ہے اُس نے ضد سے ایسا کیا ہو۔ اور شاید وہ ہار گیا ہو۔ بہر حال چند دنوں کی محنت کا یہ نتیجہ نکلا کہ وہ دُوسرے دَرجے میں کامیاب ہو گیا جس نے سنا یہی کہا کہ یہ کسی بزرگ کی کرامت ہے۔

میٹرک کے امتحان سے فارغ ہو کر منٹو علی گڑھ چلا گیا۔ چند مہینوں بعد جیسے گیا تھا ویسے ہی واپس آ گیا۔ البتہ اس کے ذاتی کتب خانے میں بے شمار ناولوں اور افسانوں کی کتابوں کا اضافہ ہو گیا۔ اپنے ساتھ ایک گھونگریالے بالوں والے ایک صاحب زادے کو بھی لیتا آیا جس کا نام شاہد لطیف تھا۔

غازی عبدالرحمٰن نے امرت سر سے ''مساوات'' کے نام سے ایک اخبار نکالا۔ ''مساوات'' کے ادارۂ تحریر میں باری (علیگ) اور حاجی لق لق بھی تھے۔ منٹو بھی مساوات کے مترجموں میں شامل ہو گیا۔ باری اور منٹو کے تعلقات بڑھنے لگے۔ وہ ہم نوالہ و ہم پیالہ ہو گئے (وہ ہم نوالہ سے زیادہ ہم پیالہ ہوئے)۔ اُردو کا ذوق بڑھا۔ انگریزی افسانوں کے اُردو میں ترجمے ہونے لگے۔ اب منٹو نے انگریزی کو مطالعہ تک محدود کیا اور اُردو کو اظہار کا ذریعہ بنایا۔ باری کی نگرانی میں منٹو نے دنیا کے مشہور مصنفوں کی شہرۂ آفاق تصانیف کا مطالعہ کیا۔ اور باری نے منٹو کے قلم کو اُردو کے میدان میں پاؤں پاؤں چلنا سکھایا اور وہ بھی ترجمے کے محدود میدان میں۔ انہیں دنوں منٹو نے وکٹر ہیوگو کے مشہور ناول "Last days of the Condemend" کا ترجمہ ''سرگزشتِ اسیر'' کے نام سے کیا۔ منٹو اس چندی کو لے کر تصنیف و تالیف کے بزار خانے میں آیا۔ سالک صہبائی سے تصنیف و تالیف کا ادارہ کھلوایا جس کا نام ''حُسنِ خیال بک ڈپو'' رکھا گیا۔ اس ادارے کی پہلی اور آخری تصنیف منٹو کے دو ڈرامے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد جب سالک صاحب کو یہ احساس ہوا کہ جس ادارے کو وہ ''حُسنِ خیال'' سمجھ رہے تھے

وہ ''حسنِ خیالِ یار'' نکلا تو انھوں نے اُسے بند کر دیا۔

امرتسر کا ایم اے او کالج اچھا خاصا ادبی مرکز بن رہا تھا۔ اُس کے پرنسپل ڈاکٹر تاثیر مرحوم تھے۔ اب یہاں علم وادب کا ذوق وشوق رکھنے والے بہت سے جواں سال پروفیسروں کا جمگھٹا رہنے لگا۔ صاحب زادہ محمود الظفر خاں اس کالج کے وائس پرنسپل تھے۔ ان کی بیگم ڈاکٹر رشید جہاں بھی ادبی محفلوں میں شریک ہونے لگیں۔ کالج کے پروفیسروں میں فیض احمد فیض بھی شامل تھے۔ فیض کی عمر اس وقت بیس بائیس سال ہوگی۔ اب تو کافی بھاری بھرکم ہوگئے ہیں۔ اس زمانے میں بالکل دھان پان تھے۔ آنکھوں میں نشیلی انکھڑیاں تھیں۔ وہ خود اپنی غزل تھے۔

منٹو ادبی دُنیا میں ایک تہلکہ مچانا چاہتا تھا۔ وہ ایک بہت ہی لمبی چھلانگ لگانا چاہتا تھا۔ اس کے سینے میں بغاوت کا آتش فشاں کروٹیں بدل رہا تھا۔ وہ دُنیا کا رنگ رُوپ بدل دینا چاہتا تھا۔ وہ سچے اور پُرخلوص انسانوں کی بستیاں بسانا چاہتا تھا۔ وہ دھوکے کی ٹٹیوں میں آگ لگانا چاہتا تھا۔ وہ اپنے ہر افسانے کو ایک آئینہ بنانا چاہتا تھا، اور ان آئینوں سے ایک آئینہ خانہ بنانا چاہتا تھا۔ اور پھر وہ یہ چاہتا تھا کہ سوسائٹی کو اس آئینہ خانہ میں لائے تاکہ چاروں طرف سے وہ اپنی اصلی حالت، شکل وصورت، اور وضع قطع دیکھ سکے، اور دیکھ کر شرما سکے۔ ہاں تو اب منٹو نے اُردو میں طبع زاد افسانے لکھنے شروع کئے۔ یہ ابتدائی افسانے مجذوب کی بڑ معلوم ہوتے تھے۔ منٹو کا ذہن غیر زبانوں کے بے شمار افسانوں اور ناولوں کو جذب کرتے کرتے افسانوں کی مشین بن گیا۔ شروع شروع میں منٹو کا اسلوب اور اس کا اندازِ فکر غیر زبانوں کے مصنفوں کے اندازِ فکر وطرزِ تحریر سے ایسا اثر پذیر ہوا کہ گنجلک بن گیا۔ اگر منٹو ان مصنفین سے راست اثر قبول کرتا تو کوئی بات بھی تھی۔ اس کی تحریر غیر زبانوں کے مصنفوں کی آئینہ دار ہو جاتی، لیکن منٹو کی گرہ میں بھی تو اپنا بہت کچھ تھا۔ اس لئے ان اثرات کا (جو اس نے قبول کئے) جب اس کے ذاتی خیالات سے تصادم ہوا تو ایک دُھندسی پیدا ہوگئی۔ پھر اس پہ ایک اور مشکل آپڑی، منٹو مواد کو سمیٹ نہ سکا۔ اس کے افسانے ایک مُدّت تک اُردو کے خزانے میں غیر ملکی سکوں یا پرائے مال کی طرح ایک کونے میں پڑے رہے۔ اُردو ادب کے دامن میں یہ نیا پیوند کچھ بے تکا سا لگتا تھا۔ کسے خبر تھی کہ ایک دن پورا دامن اسی پیوند سے چمک اٹھے گا اور اردو ادب اپنے جیب ودامن پر ایسے بیسیوں پیوند لگا کر سربلند ہوگا۔ منٹو کے کپڑوں سے زیادہ اُجلے اوراق کی ایک کاپی اور ایک کاپنگ پنسل ہمیشہ اُس کے ساتھ رہتی

تھی۔ جہاں بیٹھتا دو چار افسانے لکھ کر اٹھتا۔ وہ افسانوں کی چلتی پھرتی مشین بن گیا۔ وہ شام کو میرے ہاں آتا اور دو چار افسانے سنا جاتا۔ شروع شروع کے افسانوں میں کچھ یوں محسوس ہوتا کہ جیسے وہ کوئی بات، کوئی چونکا دینے والی بات کہنا چاہتا ہے۔ لیکن کہہ نہیں سکتا۔ کیونکہ زبان پر اسے اب تک قدرت حاصل نہیں تھی۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد اس نے اسی زبان میں سے ایک ایسی زبان نکالی جو اس کے مفاہیم ومطالب کے قامت پر راست آئی۔

منٹو ادب کے میدان میں بڑے دھوم دھڑ کے اور باجے گاجے سے آیا۔ اِدھر حامد علی خاں سے ملا اور "ہمایوں" کا رُوسی نمبر نکال دیا۔ اُدھر شاہد صاحب سے ملاقات کی اور "ساقی" کا فرانسیسی نمبر چھاپ مارا۔ کبھی ظفر علی خاں سے جا ٹکرایا اور کبھی آغا حشر سے پنجہ کشی کی۔ آج ریڈیو میں ہے تو کل فلم میں۔ کچھ دنوں بعد میں نے سنا کہ سعادت صاحب بمبئی جا پہنچے ہیں اور ایک ہفتہ وار اخبار "مصوّر" کے ایڈیٹر ہو گئے ہیں۔ مصوّر کو سعادت نے اپنی شہرت کا ڈھنڈورا بنایا اور ایک طوفان مچا دیا۔ ایک سنسنی پھیلا دی۔ فاختہ خانم کے خلیل خاں سر بگریباں نگار خانوں کے لکھن ہاروں کو روٹیوں کے لالے پڑ گئے۔ نگار خانوں، نے سعادت کے لئے اپنے دروازے چوپٹ کھول دیے۔ سعادت نے امرتسر سے آغا خلش کاشمیری کے نام ایک تار بھیجا اور اسے مصوّر کی ایڈیٹری پیش کی۔ خلش سمجھ گیا کہ سعادت کو اُس کی ضرورت ہے۔ تار کے جواب میں وہ خود جا پہنچا۔ خلش کی ساری عمر میدانِ جنگ میں گزری ہے۔ بلا کا پھکیت تھا۔ بگڑے دلوں میں سرِفہرست اُس کا نام آتا ہے۔ خلش بدیہہ گوئی میں اپنے وقت کا انشا اور ظفر علی خاں تھا۔ اس کا اشہب خیال سنگلاخ زمینوں میں دوڑنے کا خوگر تھا کڈھب قافیوں میں نور وسُرور بھر دیتا۔ اس کی ساری عمر کا مشغلہ رہا ہے اکڑی ہوئی گردنوں میں استرخار پیدا کرنا، اور ادب کے فرعونوں کی تصانیف وتالیف کو تنقید کے سیلِ عزم میں ڈبونا۔ سعادت کے لئے خلش ایک آہنی دیوار بن گیا۔ سعادت کے دشمنوں کے وجود کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لئے ایک تند وتیز طوفان...... اب کیا تھا۔ سعادت کو پناہ مل گئی تھی۔ دشمنوں سے نپٹنے کے لئے خلش اور راپنا رستہ بنانے کے لئے سعادت، خلش نے بمبئی میں سعادت کی قابلیت اور صلاحیت کا قرنا پھونکا۔ سعادت کو تخلیق کا موقع مل گیا۔ جھاڑ وجھنکار دُور ہوئے اور راستہ صاف ہوا۔ اور اب منٹو کے لئے تخلیق کا زمانہ آ گیا۔

سعادت کی سدا کی بے چین رُوح، اُس کی منتشر اور دُکھی ہوئی زندگی جب اس کے افسانوں میں

بکھر بکھر کر سمٹنے لگی۔ اور سمٹ سمٹ کر بڑھنے لگی تو پھر اتنی بڑھی کہ اس کے ہم عصروں کے لئے اس کے سائے کو پار کرنا مشکل ہو گیا۔ افسانے کی دُنیا میں اس کے افسانے دیوارِ چین بن گئے۔ سعادت نے بڑے بڑے بُتوں کو توڑا۔ پُرانی روشوں کو پامال کیا اور خیالات کی گھٹن کو اُس نے وسعتیں بخشیں۔ اَدب کو ڈرائنگ روم سے نکال کر وہ فٹ پاتھ تک لایا۔ لکھنؤ کی پُر تکلف محفلوں سے جو اس نے پردہ اٹھایا تو ان محفلوں کی وسعت میں بمبئی کا بھنڈی بازار اور لاہور کا موچی دروازہ بھی سمٹ آیا۔ لکھنؤ کے البیلے چھبیلے نواب جمن بمبئی کے احمد بھائی اور موچی دروازے کے نانبائی اللہ دتا کے سنگی ساتھی بن گئے۔

سعادت ساری زندگی پیاسا رہا۔ پنجاب کے پانچ دریاؤں کا پانی اور پھر پورا بحیرۂ عرب اُس کی پیاس نہ بجھا سکا۔ سارے سمندروں کا پانی پی جانے کے بعد وہ پانی کے ایک ایک قطرے کو ترستا رہا۔ یہ کیسی پیاس تھی؟ وہ ساری دُنیا پر چھا جانا چاہتا تھا۔ وہ ایک ضدّی بچے کی طرح یہ چاہتا تھا کہ ساری کائنات ایک کھلونا بن جائے اور وہ اپنی خواہش کے مطابق اس سے کھیلے، اسے توڑے پھوڑے، اسے بنائے اور بگاڑے۔ اگر چہ یہ ستم ظریف دُنیا ایسے ضدّی لوگوں کو خود اپنا کھلونا بنا لیتی ہے لیکن سعادت کے معاملے میں وہ ناکام ہوئی۔ کھلونا بننے کے بجائے سعادت اسی دُنیا کے دھڑکتے ہوئے دل پر ایک بھاری بھرکم پتھر بن کر رہا۔ ہاں تو دُنیا اور سعادت کے اس باہمی تنازعے اور عمل اور ردِ عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ سعادت کے قلم سے شعلے نکلنے لگے۔ اور اس کے پیار میں بلا کا بس بھر گیا۔ ماں باپ نے اُسے نافرمان کہا، دوستوں نے طوطا چشم، اُستادوں نے اسے آوارہ اور بدقماش اور ادیبوں نے اس پر طفل خود معاملہ کی پھبتی کسی۔ حکومت نے اُس پر فحش نگاری کے الزام میں مقدمے چلائے۔ لیکن یہ سب الزامات ہیں اور یکسر غلط ہیں۔ سعادت تو بڑا معصوم تھا۔ ناکردہ کار، وہ ماں باپ کا لاڈلا تھا۔ سدا کا روگی۔ ذہنی اور جسمانی طور پر بیمار۔ تیمارداروں نے اس کے لاڈ اٹھائے۔ وہ ایک کھاتے پیتے گھر کا لڑکا تھا۔ روپیہ پیسہ سے اس کے چاؤ پورے ہوئے۔ اب سعادت اس مقام پر پہنچ گیا تھا جہاں معاشرہ اس کی ماں کا آغوش، اس کے باپ کا لاڈ اور اس کے گھر بار کی پونجی بن گیا تھا۔ اب سعادت اس معاشرہ کا لاڈلا بن گیا تھا! یہی وجہ ہے کہ وہ گستاخ بھی تھا اور مُنہ پھٹ بھی۔ وہ جب جھنجھلا جاتا تھا تو گالی بکنے سے بھی نہیں چوکتا تھا۔ جو کچھ دیکھتا بلا کم وکاست زبان پر لاتا۔ اب چاہے اسے عریانی سمجھو چاہے فحش نگاری۔ کیا وہ اس فحش نگاری سے لذت حاصل کرتا تھا؟ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ وہ دُنیا کی تمام لذّتوں سے بے نیاز ہو چکا تھا جہاں تک میں سعادت کو

جانتا ہوں وہ ایک پاک باز شرابی تھا۔ اس کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا۔ وہ گستاخ تھا۔ مُنھ پھٹ تھا۔ لیکن انتہائی بے ضرر انسان۔ افسوس اس دُنیا سے ایک انسان رخصت ہوگیا۔

(۲)

جب میں نے منٹو کو دیکھا تو وہ چودہ پندرہ برس کا لڑکا تھا۔ آنکھوں پر چوڑے شیشوں کا چشمہ، سیاہ فریم، بال بکھرے ہوئے، رنگ گورا، قد درمیانہ، دُبلا پتلا، آواز میں کشش، نئی بات کہتا، نئی بات سوچتا۔ انگریزی فراٹے سے بولتا، فراٹے سے لکھتا۔ میرے والد نے اُس کا نام ٹامی رکھا تھا۔ کیوں رکھا تھا، اس کا سبب بتا چکا ہوں۔ وہ تمام ہم جماعتوں میں ٹامی ہی کے نام سے مشہور ہوگیا تھا۔ اسے انگریزی ناول پڑھنے کا بہت شوق تھا اور نصاب کی کتابوں سے انتہائی نفرت۔ وہ ایم اے او اسکول سے نکال دیا گیا تھا۔ میرے والد خواجہ محمد عمر مُسلم ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے اور فنِ درس و تدریس میں اپنے وقت کے بڑے آرٹسٹ تھے۔ درس و تدریس ان کا پیشہ نہیں تھا، مشغلہ تھا۔ شہر کے ان تمام نوجوانوں کو جن میں بے پناہ بگاڑ ہوتا اور جن سے دوسرے اسکولوں کے ماسٹر اور ہیڈ ماسٹر پریشان ہوجاتے، وہ انھیں اپنے اسکول میں داخل کر لیتے۔ اور پھر انھیں اپنا دوست بنا کر اُن پر محنت کرتے۔ اور جس طرف ان کا میلان ہوتا، ان کی رہنمائی کرتے۔ ایسے لڑکوں کو وہ اپنے گھر لے آتے۔ ان کو پڑھاتے اور ان کی نگرانی کرتے۔ مشہور افسانہ نگار ابوسعید قریشی نے جو منٹو کے شریک کار تھے، ان کا ذکر اپنے ایک افسانے میں کیا ہے۔ اور ان کے بارے میں لکھا ہے کہ بگڑے ہوئے نوجوانوں کو بنانے میں ان کا رول سرکس کے رنگ ماسٹر کا ہے جو اپنے طالب علموں سے پیار بھی کرتا اور انھیں مارتا بھی ہے۔ منٹو بھی ان کا ایک ایسا ہی شاگرد تھا۔

منٹو کا خط بہت پاکیزہ تھا۔ وہ انگریزی میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرتا تھا۔ لیکن اُردو اور ریاضی میں ہمیشہ فیل ہوتا۔

منٹو کو افسانہ لکھنے کا تو شروع ہی سے شوق تھا۔ اس نے سب سے پہلے انگریزی میں افسانے لکھے جو ہمارے اسکول کے میگزین اور دوسرے رسالوں میں شائع ہوئے۔ میرے والد یہ چاہتے تھے کہ منٹو انگریزی زبان کا صحافی یا ادیب بنے۔ لیکن ہمارے اُردو کے استاد خدا انھیں کروٹ کروٹ جنت الفردوس نصیب کرے۔ رانا مبارک مند خاں سالک صہبائی نے اس میں اُردو ادب کا ذوق پیدا کیا۔ سالک صاحب درویش صفت انسان تھے۔ ان کے گھر کے دروازے اُن کے شاگردوں اور دوست

احباب کے لئے کھلے رہتے۔ اُن کی صحبت میں ان کی باتیں سن کر اٹھوتو یوں لگتا جیسے سینکڑوں کتابیں پڑھ کر اُٹھے ہیں۔ جب منٹو کو یہ احساس ہوا کہ اُردو تہی دامن ہے اور یہ ملک کے عوام کی زبان ہے اور مختصر افسانہ نام کی یہاں اگر کوئی چیز ہے تو وہ بے جان سی ہے اور اس میں بھرپور زندگی نہیں ہے تو منٹو نے سالک صاحب کے مشورے سے مختصر افسانے سے ابتدا کی پھر اس نے بے شمار ڈرامے بھی لکھے۔

اپنے اسکول کے زمانے میں جب وہ درجہ نہم کا طالب علم تھا تو وہ انگریزی زبان کے ناول اس طرح پڑھا کرتا تھا کہ آج صبح جو ناول شروع کیا تو کل صبح اسے ختم کر ڈالا۔ پھر اُس ناول کا پلاٹ اپنے دوستوں کو سناتا۔ میرے والد اس کی حوصلہ افزائی کرتے اور اس سے یہ کہتے تھے کہ جو ناول تم نے ختم کیا ہے اس کا پلاٹ انگریزی میں لکھ کر دو تا کہ میں بھی پڑھ لوں۔ منٹو دو چار صفحات میں پلاٹ لکھ ڈالتا اور پھر والد اصلاح کرتے۔ اور اس طرح منٹو کی انگریزی زبان کی تعلیم جاری رہتی۔ منٹو نے نویں اور دسویں درجے میں چارلس گاردس، ڈوماز اور ہارڈی کے سارے ناول پڑھ ڈالے تھے۔ اور ان سب کے خلاصے بھی تیار کر چکا تھا۔

منٹو قلم اور کتب چور تھا۔ اگر اُس کی جیب میں کتاب خریدنے کے لئے پیسے نہ ہوتے تو وہ پڑھنے کے لئے ناول مانگتا اور اگر پھر بھی اسے ناول نہ ملتا تو وہ چوری کرتا۔ طالب علمی کے زمانے میں وہ اچھا قلم اور اچھی کتاب جہاں بھی دیکھتا اُڑا لیتا۔

ریلوے اسٹیشنوں پر ڈبلیو ایچ ویلر کے اسٹال ہوا کرتے تھے۔ منٹو اکثر ریلوے اسٹیشن پر جاتا، اور ایک دو کتابیں دس بارہ آنے میں خرید لاتا۔ اور دکان دار کی نظر بچا کر وہ اپنی پسند کی ایک آدھ کتاب پار بھی کر لیتا۔ ایک مرتبہ موصوف پکڑے گئے۔ کھدر کے کپڑے تو پہنتے ہی تھے۔ جب پولس نے پکڑا تو ''کرتی دَل'' زندہ باد اور انقلاب زندہ باد کے نعرے لگانے لگے۔ تھانے پہنچا تو دوست احباب بھی پہنچ گئے اور چھڑا لائے۔

میرے والد شام کے وقت اسکول کی عمارت میں ایکسٹرا کلاس لیا کرتے تھے اور اس میں پابندی لازمی تھی۔ منٹو نے ایک پارٹی بنائی اور اس کا نام ''حسن بن صباح پارٹی'' رکھا۔ اس پارٹی کا کام گپ ہانکنا، ناول پڑھنا اور نت نئی افواہیں پھیلانا تھا۔ منٹو کی پارٹی والد صاحب کو پہلے تو گم نام خطوں کے ذریعے ڈراتی رہی کہ اگر انھوں نے بچوں پر ظلم کرنا نہ چھوڑا تو ان کا مکان جلا دیا جائے گا۔ اور پھر اس

پارٹی کی جانب سے شہر کی دیواروں پر پوسٹر لگائے گئے جس کا مضمون یہ تھا:

''ہیڈ ماسٹر محمد عمر خاں''

ملّت اسلامیہ کے ہونہار فرزندوں کا قاتل ہے۔ وہ ہر وقت طالب علموں کو پڑھا کر انھیں برباد کرنا چاہتا ہے۔ اگر اسے جلد از جلد ہیڈ ماسٹری سے علیحدہ نہ کیا گیا تو انجمن اسلامیہ کے خلاف تحریک چلائی جائے گی۔

کارکنان انجمن حسن بن صباح

جس نے بھی یہ اشتہار پڑھا وہ ہنس دیا۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ اسکولوں کی انتظامیہ کے صدر خود منٹو کے بہنوئی میاں حفیظ اللہ تھے۔ اور وہ منٹو صاحب سے خوب واقف تھے۔ والد صاحب سے اُن کے بہت پرانے تعلقات تھے۔ منٹو کے والد اور میرے والد میں گہرے مراسم تھے۔ ان کا نام غلام حسن تھا اور یہ عدالت خفیفہ میں مُنصف تھے، اور منصف غلام حُسن کے نام سے مشہور تھے۔ اُن کو منٹو کی تعلیم کی بہت فکر تھی۔ وہ روزانہ صبح ہمارے گھر آتے اور ابھی میرے والد چائے پی رہے ہوتے تو ان کی گرج دار آواز آتی جو آج بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہے:

''خواجہ صاحب۔''

میرے والد باہر آتے اور دونوں میں اس طرح باتیں ہوتی:

''خواجہ صاحب آپ نے بہت اچھا کیا کہ سعادت کا بستر اپنے گھر منگوالیا۔ اور اسے اپنی نگرانی میں رکھا ہے۔ میں نے اسے پچھلے دس دن سے نہیں دیکھا تو سوچا اُس بد بخت کو دیکھ آؤں۔ کیا کروں' دل سے مجبور ہوں۔''

ابّا نے کہا: میں نے تو اس کی شکل پچھلے مہینے سے نہیں دیکھی۔

منصف صاحب نے پوچھا، تو پھر وہ کہاں گیا؟''

غرض کہ جب پوچھ گچھ ہوئی تو پتا چلا کہ موصوف اپنی والدہ کا زیور بیچ کر سیر سپاٹے کے لئے بمبئی نکل گئے ہیں۔ ایک مرتبہ والد صاحب منٹو کی جماعت میں انگریزی پڑھا رہے تھے کہ ایک سردار جی دروازے کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔ ابا کی ان پر نظر پڑی تو پوچھا۔ '' کہئے سردار جی کیسے آنا ہوا؟''

سردار جی نے کہا۔ ''کیا دری کی اب بھی ضرورت ہے۔

ابا نے پوچھا۔ ''کون سی دری؟''

کہا۔ ''آپ کے صاحب زادے میری دکان پر تشریف لائے تھے۔ کہنے لگے کہ پرسوں بڑے بھائی صاحب کی شادی ہے، ابا نے دری منگوائی ہے۔ سواس بات کو ایک مہینہ ہو گیا ہے۔

منٹو صاحب سردار جی کو دیکھ کر اور ابّا سے آنکھیں چُرا کر جماعت سے نکلنے ہی والے تھے کہ ابّا نے منٹو کی طرف اشارہ کر کے سردار جی سے پوچھا۔ ''کیا وہ لڑکا یہ تو نہیں۔'' منٹو کو دیکھ کر سردار جی کی باچھیں کھل گئیں اور کہا۔ ''جی ہاں یہی تھے۔'' معلوم ہوا کہ منٹو صاحب حسن بن صباح کمیٹی کے دفتر کے لئے دری لائے تھے۔

منٹو کا ذکر آیا تو سالک صہبائی صاحب سے ملتے چلیے۔ ہوشیار پور کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے اتنا لکھا نہیں جتنا پڑھا تھا۔ اور لکھا تو بہت ہی تھوڑا لیکن جو لکھا خوب لکھا۔ اور جواب ضائع ہو چکا ہے۔ یہ اُردو اور فارسی کے شاعر تھے۔ اپنی ساری تنخواہیں کتابیں اور رسالے خریدنے میں صرف کر دیتے۔ ساری عمر اپنی لائبریری بنانے میں گزار دی۔ رسالے خرید کر لاتے۔ ان میں سے اشتہار نکال دیتے باقی جو بچتا اُس کی جلد بنوا لیتے۔ ہر رسالے کے بارہ پرچوں کی ایک جلد ان کے یہاں تیار ملتی۔ حُقہ پیتے اور کتاب پڑھتے یا پھر بھنگ گھوٹتے اور پیتے پلاتے۔ دوسرا کوئی شغل نہ تھا۔

یکے بعد دیگرے کئی شادیاں کیں۔ بچے بھی پیدا ہوئے لیکن کوئی بیوی اور کوئی بچہ دو دو سال سے زیادہ زندہ نہیں رہا۔ اگر بھنگ پی کر غم غلط نہ کرتے تو بے چارے اور کیا کرتے۔ اُن کی صحبت میں ہم نے بہت سیکھا۔ جو کتاب پڑھتے اس پر تبصرہ کرتے۔ اور کتابیں پڑھنے کا شوق دلاتے۔ منٹو، حسن عباس، آغا خلش کاشمیری اور راقم السطور ان کے ہاں جاتے۔ گھنٹوں بیٹھتے اور اُس فقیر کی دہلیز سے بہت کچھ لے کر اُٹھتے۔

منٹو اور حسن عباس روزنامہ ''مساوات'' سے منسلک ہو گئے تھے اور نئے افسانہ نگاروں کی ایک ٹیم بن گئی تھی۔ منٹو نے سوچا کہ کیوں نہ اُردو کے ادیبوں کو مختصر عالمی افسانوں سے شناسا کرایا جائے چنانچہ ''ساقی''، ''ہمایوں'' اور ''عالم گیر'' کے رُوسی اور فرانسیسی افسانہ نمبروں کی تیاری کا کام منٹو کے مکان میں جو وکیلوں کی گلی میں تھا۔ شروع ہوا۔ میں بھی ان محفلوں میں شریک ہوا ہوں...... بے شمار رُوسی اور فرانسیسی افسانوں کے مجموعوں سے افسانوں کے اوراق نکال کر تقسیم کر دیے جاتے تھے۔ دو چار دن کے

بعد ترجموں کے لئے تقاضے شروع ہو جاتے۔ عصمت چغتائی کے شوہر مرحوم شاہد لطیف بھی اس سلسلے میں علی گڑھ سے آئے تھے اور منٹو کے مہمان تھے۔ مترجمین کی اس ٹیم میں منٹو کے شرکائے کار حسن عباس اور ابو سعید قریشی تھے۔ ویسے ترجمے سالک صہبائی نے بھی کئے، رشید جہاں نے بھی، فیض نے بھی، فیض صاحب نے تو گورکی کی تصانیف پر سیر حاصل تبصرہ بھی کیا تھا۔

آغا خلش کاشمیری نے مختصر اور طویل افسانوں کا اُردو میں منظوم ترجمہ کیا۔ جو منٹو کے نام سے شائع ہوا تھا۔

پطرس بخاری نے غلام عباس صاحب کو امریکہ سے خط لکھا کہ بہت سے امریکی منٹو کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ وہ شاعر تھا۔ یہ بات غلام عباس صاحب نے مجھ سے کہی تو میں نے انھیں حقیقتِ حال بتائی۔

ان ترجموں سے منٹو نے اُردو افسانہ نگاروں اور نئے لکھنے والوں کو ایک نئے راستے پر ڈال دیا۔ اُردو میں مختصر افسانوں میں نئی وسعتیں پیدا ہوگئی۔ خود منٹو جدید اُردو افسانے کا خالق ہے۔ اور اس کے ہم عصروں نے منٹو کی جُرات سے حوصلہ پایا اور ایک کھیپ کی کھیپ نئے افسانہ نگاروں کی مُلک میں ابھر آئی۔

منٹو نے اپنے اُستاد رانا مبارک مند خاں سالک صہبائی کو ایک پبلشنگ ہاؤس کھولنے پر آمادہ کیا۔ اس کا نام حسنِ خیال بک ڈپو رکھا گیا۔ اس ادارے نے منٹو کے دو ڈرامے کتابی صورت میں شائع کئے۔ اس کتاب کا نام ''دو ڈرامے'' تھا۔ کتاب تو چھپ گئی لیکن حسنِ خیال بک ڈپو کا کباڑا ہو گیا۔ میں نے سالک صاحب سے پوچھا کہ حسنِ خیال بک ڈپو کا کیا حال ہے تو فرمایا۔ حسنِ خیال تو منٹو صاحب لے گئے اور یہ ناچیز تو خالی بک ڈپو اٹھائے پھر رہا ہے۔

جب منٹو نے افسانے لکھنے شروع کئے تو وہ اپنی زبانی اپنے دوستوں کو اپنے افسانے سُنایا کرتا تھا کہ یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ اس افسانے سے گزر رہا ہے۔ افسانے کے ہر کردار کا رُوپ دھار کر وہ کردار کی اداکاری اس کی زبان اور اس کے لہجے میں کرتا اور اس طرح وہ افسانے کو ڈراما بنا دیتا۔ اور یوں بھی اس کے افسانوں میں ڈرامائیت کا عنصر خاصا ہے۔

منٹو ایک ہی نشست میں یا زیادہ سے زیادہ دو تین نشستوں میں ڈراما یا افسانہ لکھ ڈالتا اور وہ لکھ کر کاٹا نہیں کرتا تھا۔ وہ عمدہ کاغذ پر پنسل سے لکھتا تھا۔ اس کا خط صاف ستھرا اور پاکیزہ تھا۔

آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت کے دوران اس نے اُردو کا ٹائپ رائیٹر خرید لیا تھا۔ وہ افسانہ ہو یا

ڈراما اس نے ٹائپ رائٹر پر کاغذ چڑھایا اور ایک آدھ گھنٹے میں لکھ ڈالا۔ اس کے خیالات اور اس کے اظہار خیال میں کوئی الجھن نہیں تھی۔ اس کو بیماریاں پالنے کا بہت شوق تھا۔ ضرورت سے زیادہ سگریٹ پینے کے باعث اس کا گلا اکثر خراب ہو جاتا۔ اگر کبھی تھوک میں خون آ جاتا تو کہتا مجھے تھائی سس (تپ دق) ہے۔ ایک آدھ دوا کی شیشی اس کے ہاتھ میں ضرور ہوتی۔ وہ اکثر ٹانک بھی استعمال کرتا تھا۔ وہ پھل بہت شوق سے کھاتا تھا۔ وہ اپنا علاج خود کر لیتا تھا اسے پینسلین کا انجکشن لگانے کا بہت شوق تھا۔ اگر ذرا سی تکلیف ہوتی تو خود اپنے ہاتھ سے پینسلین کا انجکشن لگا لیتا۔

ایک مرتبہ منٹو کو یہ پتہ چلا کہ آغا حشر کاشمیری امرت سر سے لاہور جا رہے ہیں۔ منٹو نے کوشش کر کے اسی کمپارٹمنٹ کا ٹکٹ حاصل کر لیا اور ایک نہایت گھٹیا ڈرامے کی کتاب لے کر آغا صاحب کے بالمقابل بیٹھ گیا۔ آغا صاحب نے دُور سے ڈرامے کا نام پڑھ لیا۔ جب منٹو نے کتاب سے نظر اٹھا کر آغا صاحب کو دیکھا تو آغا صاحب نے پوچھا، کیا تم ڈرامے شوق سے پڑھتے ہو؟ منٹو نے اثبات میں سر ہلایا۔ آغا صاحب نے کہا''تمہارے خیال میں اس ملک میں سب سے بڑا ڈراما نویس کون ہوا ہے''؟ منٹو نے کہا'' امانت، احسن، بے تاب، ماسٹر رحمت، غلام علی دیوانہ۔'' آغا صاحب نے کہا۔ ''کیا تم نے آغا حشر کاشمیری کا نام نہیں سُنا''؟ منٹو نے کہا۔''وہ کیا کرتے ہیں؟''

بس پھر اللہ دے اور بندہ لے۔ آغا صاحب برس پڑے۔ اور منٹو بھی کم نہیں تھا۔ جب لاہور کا اسٹیشن قریب آیا تو منٹو نے آغا صاحب سے کہا کہ قبلہ! آپ سے متعارف ہونے اور باتیں کرنے کے لئے میں نے یہ ڈراما کھیلا تھا۔

باری علیگ کو اللہ تعالیٰ کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے، منٹو اور ان کے جواں سال ساتھیوں کی ذہنی، علمی اور اَدبی تربیت میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ وہ ان کے استاد بھی تھے اور دوست بھی۔ ساتھ اٹھتے بیٹھتے اور ساتھ چلتے پھرتے۔ افسانے باری صاحب نے بھی لکھے ہیں لیکن قدرت کو یہ منظور تھا کہ افسانہ نویس بننے کے بجائے وہ افسانہ نگاروں کی تربیت کریں۔

منٹو بے پَر کی اڑانے میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ اُس کی اُڑائی ہوئی بات سارے ہندوستان میں گھوم کر اُس کے پاس پہنچ جاتی۔ تاج محل کو امریکہ اٹھا لے جانے کی افواہ تو آپ سن ہی چکے ہوں گے۔ یہ منٹو نے اُڑائی تھی۔

منٹو شروع ہی سے بیمار رہتا تھا اور موت کا خوف اس پر ہمیشہ طاری رہا۔ جلیانوالہ باغ کی چنگاریاں اس نے اپنے سینے میں دبا رکھی تھی۔ کبھی یہ چنگاریاں بجھ جاتیں اور کبھی سلگ اُٹھتیں۔ اس کے افسانے کے کینوس پر پورا معاشرہ پھیلا ہوا تھا۔ اس کے کردار جیتے جاگتے انسان تھے جو روزانہ ہمارے قریب سے گزرتے ہیں۔ یہ ہم میں رہتے سہتے ہیں۔ لیکن منٹو کی حیثیت تماشائی کی ہوتی۔ منٹو نے معاشرے کی تصویر کشی کچھ اس طرح کی ہے کہ جتنے چوروں نے شہنشاہوں کے لبادے پہنے تھے اس نے انھیں تار تار کر ڈالا۔ منٹو نے معاشرے کے رستے ہوئے ناسوروں کو نہیں چھپایا بلکہ بڑی جرأت سے ان کی نمائش کی۔ اس نے جرم کرنے والوں کے جرم کے پس منظر کو اپنے افسانے کی اساس بنایا۔ منٹو گناہ گاروں کا وکیل تھا۔ اچھائی اور نیکی کا بہروپ بھرنے والوں کا دشمن تھا۔ اُس کا دِل انسانی دُکھوں سے پھوڑا بن چکا تھا۔ اس کے افسانوں میں اس کی چیخیں بھی ہیں اور اس کا زہر خند بھی۔ وہ بڑا جذباتی بھی تھا اور حساس بھی۔ اس کی روشن اور بڑی بڑی آنکھیں۔ معاشرے میں بکھرے ہوئے اس کی پسند کے افسانوی کرداروں کو ڈھونڈنے میں کھوئی کھوئی رہتیں۔ اسے زندہ کرداروں کے یہ افسانے بھی گلی کوچوں اور تنگ و تاریک گھٹے ہوئے مکانوں میں ملتے۔

میں نے منٹو کو ایسے لوگوں میں اٹھتے بیٹھتے دیکھا کہ جن سے کوئی بھی ملنا گوارا نہ کرتا۔ شہر کے اُچکوں، گرہ کٹوں اور غنڈوں سے اس کی دوستی تھی۔

اُس نے امرتسر میں جو افسانے لکھے وہ اتنے جان دار نہیں ہیں جتنی جان اس کے بمبئی کے افسانوں میں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بمبئی میں اس پر اتنی اخلاقی پابندیاں نہیں تھیں۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے وہ اپنے کرداروں کی تلاش میں بمبئی اٹھ آیا تھا۔ پھر بمبئی میں معاشرے کا ہر طبقہ تھا۔ ہر نمونے کا شخص اُسے مل جاتا۔

جب پاکستان بنا تو منٹو پاکستان چلا آیا۔ شاید یہاں اُس کی موت اور اُس کے فن کی موت اُسے لے آئی تھی۔ اور یہ عظیم فن کار یہاں آ کر پہلے تو پاگل ہو گیا اور پھر جب ہوش و حواس میں آیا تو موت نے اس کی مشکل آسان کر دی۔

☆☆☆

رحمدل دہشت پسند

آزادی کی تقریب سعید پر امرتسر میں جب پہلا فساد ہوا تو میں لاہور میں تھا۔ سعادت بمبئی میں۔ غلاموں نے آزادی کی خوشی میں اپنے ہمسایوں کے گھروں کو آگ لگا لگا کر چراغاں کیا۔ اس اعلان سے قبل کہ امرتسر پاکستان میں شامل ہوگا یا ہندوستان میں، آدھا شہر ملبے کا ڈھیر ہو گیا۔ اس جشن کے ناٹک کا جب پہلا سین ختم ہوا تو میری بیوی نے کہا کہ جاؤ اور جو کچھ لا سکتے ہو لے آؤ۔ لیکن جب میں امرتسر پہنچا تو میرے عزیزوں نے مجھے چوک فرید میں ہی روک لیا۔ یہ مسلمانوں کا چوک تھا اور میرا گھر ہندوؤں کے علاقے میں تھا۔ مجھ سے کہا گیا ''وہاں جانا خطرناک ہے۔ اغلب یہی ہے کہ تم راستے میں دھر لئے جاؤ گے۔ ہاں اگر مسلم لیگ کی لاری آ گئی تو شاید کچھ ادھر کا بندوبست ہو سکے۔'' لیکن مسلم لیگ نہ آئی۔ میں نے اپنے عزیزوں سے پوچھا۔ ''کیا کٹرہ جیمل سنگھ تک بھی نہیں جا سکتا؟'' جواب ملا ''صرف شہابے شیر فروش کی دکان تک!'' اس کے آگے ہندوؤں کا راج تھا۔ میں نے یقین دلایا کہ شہابے کی دکان سے اِدھر ہی رہوں گا، اُدھر نہیں جاؤں گا۔ کٹرہ جیمل سنگھ دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے پر برلن کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ شہابے کی دکان سے اِدھر کوچہ وکیلاں کے سامنے ملبے کا ایک پہاڑ کھڑا تھا۔ اس گلی میں۔ منٹو کا مکان تھا۔ گلی کے دہانے پر ملبے کا ڈھیر مجھے اپنے ماضی اور حال کے درمیان آئرن کرٹن کی طرح آویزاں نظر آیا۔ جس کے اس پار دیکھنا محال تھا۔ لیکن میرا دوست زندہ تھا۔ دل نے کہا۔ ''یار زندہ صحبت باقی''۔ میں نے اینٹ پتھر کے اس انبار کی طرف سے منہ پھیر لیا، جو کوچہ وکیلاں کی ناکہ بندی کئے ہوئے تھا۔ اور اپنے ساتھیوں سے کہا آؤ چلیں۔ لیکن آج کہ میرا دوست دُنیا میں نہیں ہے۔ ملبے کا وہ ڈھیر آپ سے آپ اٹھ گیا ہے۔

کوچہ وکیلاں، منٹوؤں کا محلہ تھا۔ سعادت کہا کرتا کہ منٹ کشمیری زبان میں ترازو کو کہتے ہیں۔

کشمیر میں ہمارے اب وجد کے یہاں دولت ترازو سے تُلتی تھی۔اس رعایت سے ہم منٹو کہلائے۔
میں نے منٹو کے اس بیان کی تصدیق نہیں کی۔ دوستوں کو آدمی کچہریوں اور تھانوں میں نہیں لئے پھرتا۔ بعینہٖ جس طرح چاہنے والا محبوب کے خدوخال کو کتابی معیاروں کے مطابق مسطروں سے نہیں ناپتا۔ لیونارڈو نے اگر مونا لیزا کے ہونٹوں کو شیشۂ محدّب سے دیکھا ہوتا تو مصوری کی دُنیا اپنی حسین ترین مسکراہٹ سے محروم ہو جاتی۔ ہاں تو کوچہ وکیلاں منٹوؤں کا محلہ تھا۔ گلی میں قدم رکھتے ہی دائیں طرف مسعود پرویز کے والد خواجہ حفیظ اللہ وکیل کا مکان تھا۔اس کے باہر ایک چھوٹا سا کنواں تھا۔اس سے آگے خواجہ عبدالحمید ڈی۔ ایس۔ پی کا مکان۔اس مکان کے سامنے ایک حویلی تھی۔خواجہ عبدالحمید صاحب کے والد نے کوئی سو سے اوپر ہی عمر پائی ہوگی۔ وہ امرتسر کے بچّے بچّے کو جانتے تھے۔انہوں نے جب مجھے پہلی بار سعادت کے یہاں دیکھا تو پوچھا کس کے بیٹے ہو؟ میں نے بتایا تو ان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ''ارے ارے تُو تو اپنا بچہ ہے۔ تیرے دادا جب گاؤں سے اٹھ کر شہر آئے تھے تو شروع شروع میں یہی تو لیا تھا مکان۔ ہمارے گھر کے سامنے جو حویلی ہے نا۔ لسّی منگوایا کرتے تھے ہم تمہارے گھر سے اوہو ہو کیا زمانہ تھا۔ کیا لوگ تھے.....''اس حویلی کے سامنے شمال کی طرف سعادت کا مکان تھا۔اس کا ایک دروازہ جنوب کی طرف کھلتا تھا۔ دوسرا مشرق کی طرف۔ اور یہ سعادت کے کمرے کا راستہ تھا ڈیوڑھی میں قدم رکھتے ہی دائیں ہاتھ۔ یہی کمرہ منٹو کی تحریروں میں ''دارالاحمر'' کے نام سے منسوب ہے۔ دروازے کے ساتھ ''دوکھوکھے'' رکھ کر اُن پر گدّا اور گدّے کے اُوپر ملتانی کھیس بچھا دیا گیا تھا۔ سامنے شمالی دیوار کے ساتھ کھڑکی کے قریب لکھنے کی میز تھی۔اس کے دائیں جانب دیوار میں ایک چھوٹی الماری، جو کتابیں الماری میں نہیں سما سکتی تھیں۔ میز پر دیواروں کے سہارے پڑی رہتیں۔ کتابوں کے علاوہ قلم، دوات، کاغذ، پنسلیں میز کے بائیں جانب آتشدان تھا جس پر بھگت سنگھ کا مجسمہ رکھا تھا۔ مجسمے کی ایک طرف تیل کا ٹیبل لیمپ تھا اور دوسری طرف پُرانی وضع کے ٹیلیفون کا ریسور۔ ایک پبلک ٹیلیفون سے جب متعدد کوششیں کرنے کے بعد بھی اُسے مطلوبہ نمبر نہیں مل سکا تھا تو اُس نے یہ کہتے ہوئے ریسیور کو کھینچ کر اوور کوٹ کی جیب میں ڈال لیا تھا کہ ''یہ کیا فراڈ ہے۔''اس نے خود اپنے لئے بھی کئی بار ''فراڈ'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ لیکن یہی ایک چیز تھی جو اُسے نہیں آتی تھی۔اس کا ظاہر و باطن ایک تھا وہ بڑا صاف شفاف آدمی تھا۔ اُس اُجلی چاندنی کی طرح جو کمرے کی مشرقی کھڑکیوں کے پاس بچھی رہتی تھی۔

میں اس کمرے میں پہلی بار سنہ ۱۹۳۱ء میں گیا۔ میں اُن دنوں ہندو سبھا کالج میں سائنس کا اسٹوڈنٹ تھا۔ ایک روز میں نے اُسے کالج کے جنوب مشرقی برآمدے میں دیکھا۔ اُس نے سُرخ دھاریوں کی بوسکی کی قمیض پہن رکھی تھی۔ اور سفید بوسکی کا پائجامہ۔ پاؤں میں چپل تھی۔ اور قمیض کے اُوپر اُونچا سا (فیشن کے مطابق) گرم کوٹ۔ وہ میرے ایک ہندو ہم جماعت پرکاش کی تصویر اُتار رہا تھا۔ پرکاش کو دیکھ کر کالج کے فارسی داں سینئر "بہ خال ہندوش بخشم سمرقند بخارارا" کے حال میں مبتلا ہو جاتے اور مصرع اولیٰ کے "اگر" کی خاطر ہاکیوں سے ایک دوسرے کے سر پھوڑنے کو تیار نظر آیا کرتے۔ پرکاش کو منٹو کے کمرے میں اترتے دیکھ کر تصویر و مصور دونوں کو چشم حور نے گھیر لیا۔ میں نے منٹو کو اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ کون ہے؟ میں نے اپنے ایک ہم جماعت سے پوچھا۔ جواب ملا۔ "ٹامی" میں نے یہ نام سن رکھا تھا۔ وہ اپنے اسکول، محلے اور کالج میں اسی نام سے مشہور تھا۔ اس کی وجہ تسمیہ اس کی شرارتیں تھیں۔ خیر یہ "ٹامی" جو اس وقت گویا پری کو شیشے میں اتار رہا تھا، مجھے کچھ عجیب وضع قطع کا آدمی نظر آیا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ کوئی معقول آدمی بوسکی کا پائجامہ اور لال دھاری کی قمیض گویا نائٹ سوٹ میں کالج بھی آ سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے اسے اور قریب سے جاننے کی کوشش نہ کی اور بات آئی گئی ہوئی۔

کچھ عرصہ بعد میرے والد کا انتقال ہو گیا۔ ان کی تصویر کی انلارجمنٹ کے لئے میں عاشق علی فوٹو گرافر کی دکان پر گیا۔ جس کے نام کا ان دنوں بہت چرچا تھا۔ اس کے پاس ایسے ایسے کیمرے تھے جو ہمارے شہر کے فوٹو گرافروں نے دیکھے بھی نہیں تھے۔ وہ بمبئی کی فلمی دُنیا سے بھی گھوم آیا تھا اور اس کے شوکیس میں فلمی تصویریں، روشنیوں اور سایوں کے عجیب و غریب امتزاج سے چمک رہی تھیں۔ کاروبار کی بہ نسبت اسے اپنے آرٹ کی زیادہ فکر تھی۔ اس کے اسٹوڈیو میں گاہک کی تسلی ثانوی حیثیت رکھتی تھی۔ چنانچہ وہ اکثر ایسی تصویریں بھی پھاڑ ڈالتا جو گاہک تو خوشی سے لے جاتے۔ لیکن وہ تصویر ہی کیا ہوئی کہ مصوّر کا اپنا جی خوش نہ ہو۔ وہ اعلانیہ شراب پیتا اور اس کا نوکر چھپ کر اس کی اسپرٹ۔ عاشق علی نے میرے والد کی دو تین تصویریں بنائیں اور پھاڑ ڈالیں۔ "کچھ بات نہیں بنی یار" بات بنانے کے لئے وقت درکار تھا۔ اس لئے میرا اکثر وہاں پھیرا رہتا۔ یہیں ٹامی سے میری ملاقات ہوئی۔ "کہئے پرکاش کی تصویر کیسی آئی۔" میں نے پوچھا۔ جواب ملا۔ "فلم ہی کب تھی کیمرے میں۔"

ہماری یہ ملاقات آہستہ آہستہ دوستی میں تبدیل ہوتی گئی۔ وہ مارلین ڈیٹرخ کی ٹانگوں پر مرتا تھا اور میں گاربو کے حسنِ اُداس کو دیکھ کر آہیں بھرتا تھا۔ جس مقام پر میں اب پہنچا تھا وہ اسے چار برس پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ وہ مئی ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوا تھا اور میں مئی ۱۹۱۶ء میں۔ خیر فلمی ستاروں کی کشش ان کے دو مفلوک الحال غائبانہ عشاق کو دنوں میں قریب سے قریب تر لے آئی۔ غالب نے کہا تھا:

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر جو تھا راز داں اپنا

لیکن کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ ''ذکر اس پری وش کا'' رقیبوں کو راز داں بنا دیتا ہے۔ منٹو سے اپنی دوستی کے لئے میں گریٹا گاربو اور مارلین ڈیٹرخ کا احسان مند ہوں۔ ان کی تصویروں کی کشش مجھے پہلی بار کوچۂ وکیلاں میں لے گئی۔ ہالی وُڈ سے امرتسر کے فاصلے آنکھ جھپکتے میں طے ہو گئے۔

سعادت کی میز کے پاس الماری میں رنگا رنگ کے فلمی رسالوں کے انبار لگے تھے۔ اس نے اپنا یہ ذخیرہ میرے سامنے چاندنی پر بچھا دیا اور کہا جون سی تصویر چاہو لے سکتے ہو۔

ہم نے چیدہ چیدہ تصویروں کو فریم کروانا شروع کیا۔ فریم کے لئے ان دنوں بائینڈنگ پیپر، ابھی نیا نیا چلا تھا۔ فلمی قسم کے فوٹوگرافی کی طرح اسے بھی عاشق علی نے امرتسر میں رواج دیا۔ ہمارا شوق اس کا جیتا جاگتا اشتہار تھا۔ بالی وُڈ کی پنڈلیاں اس پہ کوڈک کی گوٹ۔ نتیجہ آپ خود تصور کر لیجئے۔ لیکن یہ عشق ہمیں مہنگا پڑ رہا تھا۔ چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا کہ آئندہ خود بائنڈنگ کریں گے۔ مگر گوٹ اب بھی مہنگی تھی۔ منٹو کو سوجھی کہ پیسٹل پیپر (Pastel paper) آزمانا چاہئے، تجربہ کامیاب رہا۔

سعادت کے والد کا ان دنوں انتقال ہو چکا تھا۔ میں نے انہیں نہیں دیکھا تھا۔ ان کی ایک بڑی سی تصویر بھگت سنگھ، مارلین ڈیٹرخ اور جون کرافورڈ کے سامنے کی دیوار پر آویزاں تھی، بند کالر کا کوٹ، سر پر کشمیری وضع کی پگڑی، خشخشی ڈاڑھی، بڑی بڑی خشمگیں آنکھیں۔ یوں لگتا جیسے ہمارے مشاغل کو انتہائی ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ شاید ان کی غضب آلود نگاہوں کی زد سے بچنے کے لئے ہی سعادت بھاگ کر ایک بار بمبئی چلا گیا تھا۔ ان دنوں وہ میٹرک میں فیل ہو رہا تھا۔ کہا کرتا ''میاں جی اللہ بخشے بڑے سخت گیر آدمی تھے۔'' سعادت کی بہن بتا رہی تھیں ''جان خطا ہوتی تھی اس کی میاں جی کے ڈر سے۔ پتنگ اڑا رہا تھا ایک روز کوٹھے پر۔ میاں جی آ گئے اتنے میں چھت سے کود پڑا یہ برابر کے

کوٹھے پر، چوٹ آئی۔لیکن کیا مجال ہے جو ''سی'' تک کی ہو۔وہ سیڑھیوں اور سہاروں کا کبھی قائل نہیں تھا۔رحم کی التجا کرنے والوں سے اسے نفرت تھی۔وہ زندگی بھر پتنگ اُڑاتا رہا۔اوراسی طرح کودتا رہا۔ ایسے میں کئی بار وہ لوگوں کے سروں پر بھی آن گرا۔لوگ بھنّائے جھلّائے، گالیاں دیں۔قانون کو مدد کے لئے پکارا۔لیکن منٹو نے کہا مجھے بھی پتنگ اڑانے کا حق ہے۔آسمان کی وسعتوں پر کسی کا اجارہ نہیں۔ جو مجھے گرانے کی کوشش کرے گا میں اس کے سر پہ کود جاؤں گا، جو میرے پتنگ پر ''کانٹی'' پھینکے گا، میں اس کی کھوپڑی پر مٹی کی اینٹ ماروں گا۔

معاشرے کے اس کھیل کے دوران میں اس نے متعدد چوٹیں کھائیں۔لیکن رحم کی درخواست کبھی اس کی زبان پر نہ آئی۔وہ دادطلب تھا،فریاد کی لے سے اس کے لب ناآشنا تھے۔

اس کے والد منصف تھے۔انہوں نے دو شادیاں کیں۔سعادت کی والدہ ان کی وفات کے بعد چھوٹی بیگم اور ان کی اولاد...... سعادت اور اس کی بڑی بہن ناصرہ اقبال کے لئے کچھ باقی نہ بچا، تلخ یادوں کے سوا۔منٹو کی تحریروں میں یہی کڑواہٹ گھلی ہوئی ہے۔جیسے قند کی گولیوں میں یکا یک کونین کا ٹکڑا آجائے۔یہ تلخی کتنی دیرپا تھی اس کا اندازہ منٹو کی موت سے ہوسکتا ہے۔معاشرہ آدمی کا دوسرا باپ ہوتا ہے۔وہ بھی اس سے انصاف نہ کرسکا۔ اخلاق کے ٹھیکے دار اُسے عمر بھر کچہریوں میں لئے لئے پھرے کہ یہ عریاں نویس ہے، فحش نگار ہے، یہ جنسی باتوں کے بارے میں لکھتا ہے۔انہوں نے کبھی نہ سوچا کہ مرد و زن کے تعلقات اگر ناپاک ہیں تو حضرت آدم سب سے پہلے تماشبین تھے (نعوذ باللہ) لیکن منٹو کے ہاں جنسی تلذذ تھا ہی کہاں۔اس نے قوام کی گولیاں کبھی نہیں بیچیں۔اُس کی دکان پر کونین تو ضرور تھی، کوکین نہیں تھی۔اس کا منہ کڑوا تھا۔کڑواہٹ کے احساس کو کند کرنے کے لئے اس نے اور کڑواہٹ اپنے اندر انڈیلی۔بوتل کو منہ لگالیا:

جاں لب پہ آئی تو بھی نہ شیریں ہوا دہن
از بس کہ تلخیِ غمِ ہجراں چشیدہ ہوں

دو سال سے وہ بے تحاشا پی رہا تھا۔وہ ہر وقت مدہوش رہتا تھا۔شراب سے اس کا جگر چھلنی ہو چکا تھا۔۵۳ء کے اواخر میں وہ مرتے مرتے بچا۔ڈاکٹروں نے اسے معجزہ سمجھا اور کہا، سال یا دو سال اور۔ ''اگر اب بھی نہ چھوڑی۔'' لیکن اس نے پھر بوتل کو منہ لگالیا۔گلاس کی بھی ضرورت محسوس نہ کی۔اس کی

تھکی ہوئی روح کو سبو سے ساغر تک فاصلہ بھی بہت نظر آیا۔ اپنے اور ابدیت کے درمیان وہ بلور کا پردہ بھی برداشت نہ کر سکی۔ رہگذرِ زیست کا تھکا ہوا راہی، جس پر معاشرے نے قدم قدم پہ سنگباری کی تھی، جلد از جلد اس منزل پر پہنچنا چاہتا تھا جہاں درد کو "لذت سنگ" کے نام سے نہیں بہلایا جاتا، جہاں چٹانیں نہیں ہوتیں، پتھروں کے سوداگر نہیں ہوتے۔ ۱۸ر جنوری ۵۵ء کی صبح کو اس کی طبیعت یکا یک بگڑ گئی۔ لیکن وہ ہسپتال تک بھی نہ پہنچ سکا۔ اسے خون کی قے آئی۔ ایمبولینس کا راسے راستے میں واپس لے آئی۔ وہ اپنی منزل پر پہنچ چکا تھا۔ وہ صلیب کے سایے میں جیا اور صلیب کے سایے میں جان دے دی۔

مئی ۵۳ء میں کراچی سے پشاور آتے وقت جب میں اس سے ملنے گیا تو لحظہ بھر کے لئے مجھے بھی نہ پہچان سکا۔ مجھے دیکھ کر وہ چونک پڑا۔ اس کی آنکھوں سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ وہاں نہیں ہے۔ میں ٹھٹھک گیا۔ اتنے میں اس کی بہن نے کہا "سعادت! سعید آیا ہے۔" اس کا چہرہ چمک اٹھا اور آنکھیں جو کہیں خلاؤں میں دیکھ رہی تھیں یکا یک میرے چہرے پر اتر آئیں۔ "آ آ آ خواجہ......" میری نظریں گلاس پر گڑ گئیں، وہ سمجھ گیا میں کیا سوچ رہا ہوں۔ لیکن اس نے مجھے بولنے کا موقع نہ دیا۔ "ٹھیک ہے یار سب ٹھیک ہے، بکواس مت کر!" اس کی پھٹی پھٹی گلابی آنکھیں گلہ کر رہی تھیں کہ "تو بھی ناصح بن گیا۔ اسی کم بخت سے بھاگ کر تو میں نے پناہ لی ہے۔ تجھ سے مجھے بہتر سلوک کی توقع تھی۔"

اس کی بڑی بڑی بے چین آنکھوں میں بلا کا حسن تھا۔ ایک زمانے میں اسے پنجاب کی دیہاتی بولیاں جمع کرنے کا شوق ہوا تھا، جنھیں وہ اپنے جاننے والوں کے سامنے اکثر دہرایا کرتا۔ ان کے مقابلے میں باقی سب شاعری فراڈ تھی۔ آنکھوں کی تعریف میں یہ شعر اس نے کس کس کو نہیں سنایا ہوگا:

گورا رنگ تے شربتی اکھیاں
گھنڈ وچ قید کیتیاں

اس کی اپنی آنکھوں میں بھی یہی شربتی کیفیت تھی۔ سگریٹ کے دھوئیں کے پیچھے وہ دھند میں لپٹی ہوئی جھیلیں دکھائی دیتیں جن کی تہہ میں نہ جانے کتنی حسرتوں کے سفینے دفن تھے۔ وہ عمر بھر اس محبت اور ہمدردی کی جستجو کرتی رہیں جس سے وہ بچپن میں محروم ہو گیا تھا۔ اس کے دوستوں کا خلوص اور مداحوں کی قدردانی بھی اس کی تلافی نہ کر سکے۔

بھگت سنگھ کے بت کے سامنے آویزاں تصویر کی آنکھیں پھر میری چشم تصور میں ابھر رہی ہیں۔

ان خشمگیں نگاہوں کے سایہ میں پھر بڑی مصروفیت کا پتہ چلتا ہے۔ مگر موضوع گفتگو بدل چکا ہے۔ فلمی ستاروں کے بجائے ادب وانقلاب زیر بحث ہیں۔ گہرے سانولے رنگ کا ایک بھاری آدمی کارلائیل اور گبن کے اندازِ تحریر میں گفتگو کر رہا ہے۔ تین نوجوانوں کے تمتمائے ہوئے چہرے اس کی تاثیر سخن کے شاہد ہیں۔ کمرے کی فضا ایکٹروں کے قصیدوں کی بجائے والٹیر، روسو، ڈانٹن، مارکس، لینن، ٹرانسکی، اسٹالن اور گورکی کے تذکروں سے گونج رہی ہے۔ اس بزرگ کا نام باری (علیگ) ہے۔ اس کے مریدوں کے نام سعادت حسن، حسن عباسی اور ابوسعید قریشی۔

باری صاحب سے مجھے اپنی پہلی ملاقات یاد نہیں۔ یہی احساس رہتا ہے جیسے میں انھیں ہمیشہ سے جانتا تھا۔ بہرحال یہ منٹو سے ملاقات سے بعد کی بات ہے۔ ان سے ہمارا تعارف علم وادب اور حب الوطنی سے تعارف تھا۔ فلمی رسالوں کی جگہ اب ہم کتابیں خریدتے، متحرک تصویروں کی کہانیوں پر بحث کرنے کے بجائے انگریزوں کو ملک سے نکالنے کے پلاٹ سوچتے۔ دہشت پسندی کی داستانوں میں لطف آتا۔ مستند حکمرانوں کا تختہ الٹنے والوں کے آئینوں میں ہمیں اپنا عکس نظر آنے لگا۔ ہم نے اپنی چشمِ تصور میں امرتسر کے گلی کوچوں کی بارہا مورچہ بندی کی اور انقلاب زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے انگریزوں پر ٹوٹ پڑے۔ انہیں رودبارِ انگلستان تک دھکیلتے ہوئے لے گئے۔ یاجوج ماجوج کی طرح قید کر دیا تاکہ پھر دنیا کو تاخت وتاراج نہ کرسکیں اور عظمت افرنگ کے لازوال آفتاب کو تانبے کے پرانے پیسے کی طرح گردش سے نکال پھینکا۔ انقلاباتِ روس وفرانس کی داستانیں بچوں کی کہانیاں بن گئیں۔ منٹو اس زمانے کے بارے میں لکھتا ہے:

> "اب سوچا جائے تو اس زمانے کی یہ سب حرکتیں چھوٹے چھوٹے کھلونے معلوم ہوتی ہیں لیکن اس وقت یہ کھلونے ہی عظیم الجثہ اور قوی ہیکل تھے۔ ان سے پنجہ لڑانا گویا کسی دیو سے زور آزمائی کرنا تھا۔ ہمارے خلیفہ صاحب یعنی باری صاحب اگر بزدل نہ ہوتے تو یقیناً ہم چاروں اس زمانے میں ان کھلونوں سے اپنا جی بہلانے کے جرم میں پھانسی پا گئے ہوتے اور امرتسر کی خونیں تاریخ میں ایسے شہیدوں کے نام کا اضافہ ہو گیا ہوتا۔ جواب خلوصِ دل سے کہہ سکتے ہیں کہ ان کو اس وقت اپنے اس جوش کے رُخ کا بھی صحیح علم نہ

تھا۔ باری صاحب بزدل تھے۔ خدا کی قسم بہت بزدل تھے۔ زیادہ کھا لیتے تو
ڈرتے رہتے تھے کہ توند نہ نکل آئے۔ حالانکہ فاقوں کے زمانے میں بھی ان
کے جسم کا یہ حصہ بڑھتا رہا۔ زیادہ تیز نہیں بھاگتے تھے کہ ان کے دل پر اس کا اثر
پڑے گا۔ حالانکہ ان کے جسم کے اسی رئیس عضو نے ان کا ساتھ چھوڑا۔ بڑی
بڑی سرخ بغاوتوں کے نیلے نقشے تیار کرتے تھے اور پٹاخے کی آواز سن کر زرد
ہو جاتے تھے۔ اشترا کی ادیب باری تمام عمر اپنی زندگی کی جلی اور خفی سرخیاں
جماتا رہا۔ لیکن وہ ان کے نیچے وہ مضمون نہ لکھ سکا۔ جو اس کے وزنی سر میں
پرورش پاتے تھے۔" (باری صاحب از منٹو۔ مجموعہ "گنجے فرشتے")

اگر ہمارا مرشد بزدل نہ ہوتا تو دارالاحمر کے آتشدان پر رکھے ہوئے بھگت سنگھ کے بُت کے سایہ میں چار ایسے بچے کھیل رہے تھے جن کے مجسمے ڈانٹن، روبس پیری، میزنی، لینن اور ٹراٹسکی کی گیلری میں کھڑے ہوتے۔

لیکن بغاوت کی وہ چنگاری جو سعادت کے سینے میں سلگ رہی تھی، دبی نہ رہ سکی۔ باپ کی بے رخی۔ بھائیوں کی بے اعتنائی اور عزیزوں کی ستم ظریفی سے جو شعلہ بھڑکا تھا، زمانے کے حوادث نے اسے ہوا دی اور وہ معاشرے کے دیمک خوردہ شہتیروں کو چاٹنے لگا۔ اس کے قلم کی روشنائی لاوا بن کر بہہ نکلی۔ جن لوگوں کے گھر اس کے راستے میں آئے وہ چیخ اٹھے۔ انہوں نے قانون کو مدد کے لئے پکارا۔ مذہب اور اخلاق کے فائر بریگیڈ کو حرکت میں لائے۔ لیکن لاوا نہ رُکا، آگ نہ بجھی۔ حتیٰ کہ اس کی حدت میں اس کی اپنی زندگی کے سوتے بھی سوکھ گئے۔ وہ آتش فشاں پہاڑ اب خاموش پڑا ہے۔ اس کی آگ سے ڈرنے والے اب اس کے دامن میں پھول لگا رہے ہیں۔ لاوے کی مٹی بہت زرخیز ہوتی ہے۔

منٹو پر بہت کچھ لکھا جا رہا ہے۔ بہت کچھ لکھا جائے گا۔ آج ہر کوئی اس کا شناسا ہے۔ ہر ایک کو اس کی دو ایک باتیں ضرور یاد ہیں۔ ہر کوئی اس سے اپنی پہلی ملاقات کا حال لکھ رہا ہے۔ اس کی شخصیت اور فن کو نفسیاتی اور جمالیاتی کسوٹیوں پر پرکھا جا رہا ہے۔ ایک صاحب نے اس کی خود پسندی پر دو صفحے سیاہ کر دیے ہیں۔ ایک نے اس کا موازنہ موپاساں سے کیا ہے۔ ایک اور بزرگ نے اسے سمرسٹ کا رتبہ دیا ہے۔ ان تعزیتی تحریروں میں حفیظ ہوشیار پوری کے ہاں مجھے بہت خلوص نظر آیا ہے۔ لکھتا ہے:

''منٹو کی زندگی موت اور اس کے فن کے بہترین ترجمان، اس کے محبوب شاعر غالب کے یہ اشعار ہیں:

جز در آئینہ ندیدم اثر سعیِ خیال — ہر قدر بہر طلبگاریِ انساں رفتم
سازِ ہنگامہ نہ اندر خورِ طاقت کردم — راہ مستی نہ بہ اندازۂ ساماں رفتم
تا سبک روئیِ من رنج گرانی نہ کشد — شب وصل شدم و زود بپایاں رفتم
نگہم نقد بہ گنجینۂ دلہامی زد — مژدہ باد اہلِ ریا را کہ زمیداں رفتم

حفیظ نے آگے چل کر لکھا ہے:

''اس نے اپنی تاریخ وفات کی فرمائش کی تھی۔ آج میں اس فرض سے سبکدوش ہو رہا ہوں:

چوں سعادت زجہاں رفت ہمی گفت حفیظ — تشنہ از خمکدۂ عالم امکان رفتم
خوانداین مصرعِ تاریخ زغالب ''باآہ'' — مژدہ باداہلِ ریا را کہ ز میداں رفتم

۱۳۶۸+۶=۱۳۷۴ھ

اپنی نوک قلم سے وہ عمر بھر ریا کاری کے پیرہن تار تار کرتا رہا۔ ان میں ایک پیرہن مذہب کا بھی تھا۔ ہمارے ملک میں رسپوٹین کے بھی باپ بستے ہیں۔ جلالت مآب بزرگ، جن کی شرعی ڈاڑھیوں، نورانی چہروں، مقدس دستاروں، بے داغ عباؤں اور دوررس نگاہوں کو دیکھ کر شیطان بھی بہروپ بھرنا بھول جائے۔ خوش عقیدہ عوام ان کے دامِ فریب میں اس بُری طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ ہل نہیں سکتے۔ یہ دلوں کی مرادیں پوری کرتے ہیں۔ راکھ کا سونا بناتے ہیں۔ ان کی خاکِ پا لاعلاج مریضوں کا علاج ہے۔ ان کے ایمپلائمنٹ ایکسچینج بے روزگاروں کو روزی دلواتے ہیں۔ ان کی دکانوں پر جب کے تعویذ فروخت ہوتے ہیں جن سے سنگدل محبوب رام ہوں۔ ان کے کالے علم سے دشمن زیر ہوں اور مقدمے جیتے جائیں۔ یہ بانجھ کو بچہ دیں اور کنواریوں کے آسیب اُتاریں۔ منٹو کا ''صاحب کرامات'' (مجموعہ ''سڑک کے کنارے'') بھی ایک ایسا ہی بزرگ ہے جو ایک سادہ لوح کسان کو، جو جلد بازی میں اپنی بیوی بھاتاں کو طلاق دے چکا ہے۔ لیکن اب اسے دوبارہ بسانا چاہتا ہے۔ صاحب کرامات اسے حُبل دے کر پہلے اس کی کنواری بیٹی جیناں پھر اس کی بیوی بھاتاں (لڑکی کی ماں) کو نشہ پلا کر اپنے جلال کی آگ بجھاتا ہے۔ اس کے کندھے پر زرد رُومال ہے (جو حاجی لوگ تحفتاً لاتے ہیں) اس کی لال لال آنکھوں میں سرمے کی تحریر

ہے۔'' دراز ریش بزرگ لمبے لمبے پٹے ان کے اور ڈاڑھی کے بال کھچڑی...... ہاتھ میں چاندی کی مٹھ والا عصا...... مولوی صاحب نے جیناں کو اپنے پاس بٹھا کر اس کی پیشانی چوم لی۔ اس نے اٹھنا چاہا۔ مگر ان کی گرفت مضبوط تھی۔ مولوی صاحب نے اسے اپنے گلے سے لگالیا۔ اور موجو سے کہا۔'' چودھری تیری بیٹی کا نصیبا جاگ اٹھا۔'' لیکن اس روز جیناں کا نصیباں سو گیا۔ رہی پھاتاں؟ وہ مطلقہ ہے اور مولوی صاحب فرماتے ہیں۔'' جب کوئی آدمی اپنی بیوی کو طلاق دے، اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ اور پھر اس کو اپنے گھر میں بسانا چاہے تو اس کی سزا یہ ہے کہ پہلے وہ عورت کسی اور مرد سے شادی کرے۔ اس سے طلاق لے۔ پھر جائز ہے۔'' ہم نے خدا کے حضور گڑگڑا کر دعا مانگی کہ ایسی کڑی سزا نہ دی جائے..... موجو چودھری کو اپنی بیوی سے محبت ہے۔ ارشاد ہوا (خدا کی طرف سے جو مولوی صاحب سے ہم کلام ہے) تو ہم اس کی محبت کا امتحان لینا چاہتے ہیں۔ ایک دن کے لئے تو اس سے نکاح کر لے۔ دوسرے دن طلاق دے کر موجو کے حوالے کر دے..... مولوی صاحب نے کنڈی بند کر دی اور پھاتاں سے کہا۔ تم آج کی رات میری بیوی ہو...... '' صبح جاتے وقت مولوی صاحب اپنی ڈاڑھی اور پٹے بستر پر تکیے کے نیچے چھوڑ گئے۔ منٹو کا یہ خاص پینترا ہے۔ مذہب کی آڑ لے کر ہمارے یہاں اکثر ایسے جرائم کیے جاتے ہیں۔ مہذب اخبار ایسی خبروں کو گول کر جاتے ہیں۔ لیکن افسانہ نگار کی آنکھیں تہذیب کی سطح کو نہیں اس کی تہہ کو دیکھتی ہیں۔ وہ چیزوں کی ظاہری چمک دمک سے متاثر نہیں ہوتا۔ کیمیا گر دھات کی ماہیت اور اس کے عناصر ترکیبی کی جانچ پڑتال کرتا ہے۔ ملمع سے مرعوب نہیں ہوتا۔ اس کی بھٹی میں کھوٹ نہیں ٹھہر سکتا۔ وہ اسے کٹھالی سے نکال کر دکاندار کے منہ پر دے مارتا ہے کہ یہ لو اپنا سونا، اپنی تہذیب۔ منٹو اپنی تحریروں میں اپنے خاص ڈرامائی انداز سے جگہ جگہ معاشرے کی جعلی ڈاڑھیاں نوچتا نظر آتا ہے کہ یہ لو اپنا میک اپ! اس میک اپ کے پردے سے کبھی'' صاحب کرامات'' اپنی تمام تر عریانی سمیت نمودار ہوتے ہیں اور کبھی وہ شیاطین جو حوروں کو ورغلا کر لاتے ہیں اور انہیں چوک میں چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ واپس جانا چاہتی ہیں۔ لیکن وہاں رضوان کھڑا ہے۔ جنت کے دروازے ان پر بند ہو چکے ہیں۔ چودہ سو سال کی بت شکنی کے بعد بھی لات و منات دنیا میں موجود ہیں۔ اقبال نے کہا تھا:

جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا!

منٹو کا فن اسی فلسفۂ حیات کا ترجمان تھا۔ اقبال نے شکایت کی تھی:

کارگہِ حیات میں کیا کوئی غزنوی نہیں

کب سے ہیں منتظر کھڑے دیر وحرم کے سومنات

منٹو اسی سوال کا جواب تھا۔ یوم اقبال پر منٹو نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا تھا:

''اقبال نے خدا سے دُعا مانگی تھی: مرا نورِ بصیرت عام کر دے۔ یہ دُعا جو ایک دردمند دل سے نکلی تھی ضرور قبول ہوگی۔'' منٹو اس وقت بھول گیا تھا کہ یہ دعا قبول ہو چکی تھی۔

لیکن محمود وایاز کو الگ الگ تصور نہیں کیا جا سکتا۔ کلیم کے ساتھ آذر کا نام بھی ضرور آئے گا۔ بت شکن منٹو نے اپنے خاک وخون سے اپنے نحیف وناتواں جسم کی خاکستر کو آنسوؤں میں گوندھ کر بہت سے بت بنائے اور انہیں اولادِ آدم کے سامنے خالی شہ نشینوں اور طاقچوں میں چن دیا۔ بابو گوپی ناتھ اور ممی کی مورتیوں میں مجھے آدم وحوا کا عکس نظر آتا ہے۔ ان کا گناہ آدم وحوا کا گناہ ہے۔ لیکن ان کی روحیں آلودگی سے پاک ہیں۔ منٹو ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ان کا خمیر کس مٹی سے اٹھایا گیا تھا۔ منٹو کے مذہب میں انسان اپنے بارِ عصیاں کے باوجود انسان ہے۔ معبود ملائک! ان بتوں کا خالق ہے۔ ان کے آستانے پر اپنا سر جھکانے کو کفر نہیں گردانتا۔ غالباً یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اقبال نے:

آدم خاکی نہاد بندہ مولیٰ صفات

کا نام دیا تھا۔ ان سے مجھے ''میلادِ آدم'' کی یاد آتی ہے۔ منٹو نے اپنے کتبہ میں لکھا ہے۔'' یہاں سعادت حسن منٹو دفن ہے۔ وہ اب بھی مَنوں مٹی کے نیچے سوچ رہا ہے کہ وہ بڑا افسانہ نگار ہے یا خدا۔'' کیا ہم اسے اتنے بھی غلو کی اجازت نہیں دے سکتے؟ وہ کشمیری تھا۔ جرم وعصیاں کے آتش کدوں سے وہ ان قدیم عورتوں کی طرح، جو ریل کی پٹریوں سے ایندھن اکٹھا کرتی ہیں، یاس وحرماں کی راکھ میں لپٹی ہوئی محبت کی چنگاریاں چن چن کر ''اپنی کانگڑی'' بھرتا رہا تا کہ رسوم وقیود کے پالے کی ماری ہوئی روحیں اپنا سینہ گرم کر سکیں۔ سراج کی سرد مہری، بسم اللہ کی اداس آنکھوں اور شاردا کے سگریٹ کے ڈبے میں اسی آگ کی چنگاریاں پوشیدہ ہیں۔ سڑک کے کنارے کے چولھے جن پر بن بلائے مہمان کی خاطر داریاں چڑھی ہیں۔ اسی اَن دیکھی آگ سے گرم ہیں۔ وہ اپنے پھولے ہوئے پیٹ میں یہی کانگڑی چھپائے ہوئے ہے۔۔۔۔۔ وہ خود بھی اسی پالے کا شکار تھا۔ اس نے پرومتھیکس (Prometheus) کی طرح

[illegible]

گدھ اس کا جگر نوچنے لگے۔ آگہی سب سے بڑا گناہ ہے۔ منٹو کا آتش دان اسی آگ سے روشن ہے۔ لیکن اس کے اوپر بھگت سنگھ کا بت کیا کر رہا ہے؟ تخریب و تخلیق کہ شاید ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

منٹو کی تخلیقی کاوشوں کی ابتدا ترجموں سے ہوئی۔ پہلا ترجمہ (جہاں تک مجھے یاد ہے) ایک پُراسرار طویل افسانہ دست بریدہ بھوت تھا۔ اپنی قسم کا یہ پہلا اور آخری ترجمہ اور تجربہ تھا۔ باری صاحب تاریخ و معاشیات کے طالب علم تھے۔ انھیں افسانوی ادب سے کچھ ایسا شغف نہیں تھا، مگر ایسا بھی نہیں کہ وہ اپنے مریدوں کو اچھے بُرے کی پہچان نہ بتا سکتے۔ ذوقِ سلیم نے مدد کی اور دار الاحمر میں وکٹر ہیوگو، لارڈ لٹن، گورکی، چیخوف، پوشکن، سلوگ، گوگول، دوستووسکی، اندر یف، آسکر وائیلڈ اور موپاساں کی کتابیں نظر آنے لگیں۔ وکٹر ہیوگو، باری صاحب کے نزدیک دُنیا کا سب سے برا ناولسٹ تھا۔ ہم نے اس کی تصانیف دُور دُور سے منگوائیں اور انھیں درسی کتابوں کی طرح پڑھا۔ باری صاحب چاہتے تھے کہ اس کی Lesmisrable کا ترجمہ کیا جائے۔ لیکن اس کی ضخامت دیکھ ہمت نہ ہوئی۔ البتہ سرگزشتِ اسیر'' کے عنوان سے Last days of a condemaned کا ترجمہ کر دیا۔ یہ کتاب سزائے موت کے خلاف پُرجوش احتجاج ہے۔ مصنف صاحب کا چھوٹا بیٹا ہر ناانصافی کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔ آسکر وائلڈ کی ''ویرا'' کا ترجمہ بھی اسی دَور کی یادگار ہے۔

منٹو نے باری صاحب کے بارے میں اپنے مضمون میں اس کتاب کی اشاعت کا مفصل ذکر کیا ہے۔ یہ ڈرامہ روس کے دہشت پسندوں اور نراجیوں کی سرگرمیوں سے متعلق تھا۔ جن کے پاس ہر قسم کے ہتھیار موجود تھے۔ امرتسر میں ان دنوں اگر کوئی ہوائی بندوق سے بھی مسلح ہونا چاہتا تو توپ دم کر دیا جاتا۔'' چنانچہ جب اس کے اشتہار شہر کی دیوار پر نظر آئے اور لوگوں کو مستند حکمرانوں کے عبرت ناک انجام۔ روس کے گلی کوچوں میں صدائے انتقام کی خبر دی گئی۔'' اور ''زار یت کے'''' تابوت میں'' آخری کیل'' گاڑا گیا تو کوچہ وکیلاں میں بھگت سنگھ اور دت کے ان چیلوں کے بارے میں پوچھ گچھ شروع ہوئی جو امرتسر کے گلی کوچوں میں ماسکو کا ناٹک کھیلنا چاہتے تھے اور ہندوستان میں انگریز کی شہنشاہت کے خاتمے کے سفید پوشوں کو یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ یہ تو اپنے بچے ہیں میاں۔ جاؤ اپنا کام کرو اور بلا ٹل ہوگئی۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر پولیس نے بچوں کے اس کھیل کا اپنی روایتی تندہی سے تعاقب کیا ہوتا تو منٹو میں بھگت سنگھ بننے کی تمام صلاحیتیں موجود تھیں۔ اس کا افسانہ ''تماشا'' (مجموعہ: ''منٹو کے افسانے'') انھیں

صلاحیتوں کا آئینہ دار ہے۔ اس میں ۱۹۱۹ء کے مارشل لا کے ہنگامے کو ایک بچے کی نظروں سے دیکھا گیا ہے، اس کا ہیرو خود منٹو ہے۔ اس وقت وہ کوئی سات برس کا تھا۔ قانون کی بے اعتنائی نے اس بچے کو بڑا ہونے سے روک دیا۔ عزیزوں کی بے اعتنائی کیا کم تھی کہ وہ اِدھر کا رُخ کرتا۔ اس کے علاوہ اسے پٹے ہوئے راستوں سے نفرت تھی۔ لیڈروں کی خود غرضی سے یہ نفرت اور بڑھ گئی۔ وہ خلوص کا بھوکا تھا۔ لیکن ان لوگوں میں خلوص کہاں تھا۔ وہ چیخ اٹھا ''ہندوستان کو لیڈروں سے بچاؤ۔''

''ہندوستان کو ان لیڈروں سے بچاؤ جو ملک کی فضا بگاڑ رہے ہیں۔ یہ نام نہاد لیڈر اپنی اپنی بغل میں ایک ایک صندوقچی دبائے پھرتے ہیں جس میں یہ لوگوں کی جیبیں کتر کتر کر روپیہ جمع کرتے ہیں۔۔ ان کے ہر سانس میں آپ ریاکاری اور دغابازی کا تعفن محسوس کرتے ہیں، لمبے لمبے جلوس نکا کر منوں بھاری ہاروں کے نیچے دب کر۔ چوراہوں پر طویل طویل تقریروں کے کھوکھلے الفاظ بکھیر کر یہ نام نہاد رہنما اپنے لئے راستہ بناتے ہیں۔ جو عیش و عشرت کی طرف جاتا ہے۔ یہ لوگ چندے اکٹھے کرتے ہیں۔ مگر کیا انہوں نے آج تک بیکاری کا بل پیش کیا ہے۔۔۔ یہ لوگ جن کی روح لنگڑی، دماغ اپاہج، زبان مفلوج اور ہاتھ پیر شل ہیں۔ ملک و ملّت کی رہبری کیسے کر سکتے ہیں۔۔۔ ہندوستان کو بے شمار لیڈروں کی ضرورت نہیں، صرف ایک لیڈر کی ضرورت ہے جو حضرت عمرؓ کا سا اخلاق رکھتا ہو۔ جس کے سینہ یں اتاترک کا سپاہیانہ جذبہ ہو۔۔۔۔''

(منٹو کے مضامین۔ مطبوعہ ۱۹۴۲ء)

یہ مضمون جیسا کہ اس کی تاریخِ اشاعت سے ظاہر ہے۔ آزادی سے بہت پہلے لکھا گیا اور منٹو کی زندگی میں بمبئی کے پہلے دور کی پیداوار ہے۔ دارالاحمر کے زمانے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ لیکن اسے پڑھنے کے بعد یہ کہنے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی کہ سیاست اور لیڈروں کی دنیا کے بارے میں اس کا کیا ردِ عمل تھا۔ اسی مجموعہ میں آگے چل کر اس نے اپنا خیال اور واضح کر دیا ہے:

''سیاست سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ لیڈروں اور دوا فروشوں کو میں ایک ہی زمرے میں شمار کرتا ہوں۔ لیڈری اور دوا فروشی دونوں پیشے ہیں۔ خیر کہنا یہ

ہے کہ سیاسیات سے مجھے اتنی ہی دلچسپی ہے جتنی گاندھی جی کو سنیما سے۔ گاندھی
جی سنیما نہیں دیکھتے، میں اخبار نہیں پڑھتا۔ اصل میں ہم دونوں غلطی کرتے
ہیں۔ گاندھی جی کو فلم ضرور دیکھنے چاہئیں اور مجھے اخبار ضرور پڑھنے چاہئیں۔''

(باتیں، منٹو کے مضامین)

بادی النظر میں یہ چند سطور ''شوخیِ تحریر'' ہیں اور بس۔ درحقیقت گاندھی جی اور فلموں کا بُعد لیڈروں میں ذہنی توازن اور Sence of Humour کے فقدان کے نشان ہیں۔ گاندھی جی اور فلم محض علامتیں ہیں۔ سعادت نے اپنے خاص منٹوی انداز میں ایک حقیقت سے دوسری حقیقت کو بے نقاب کرنے کا کام لیا ہے۔ تضاد کو ابھارنا طنز کی خاص ٹیکنک ہے۔ منٹو اس کا ماہر تھا:

''وہی بمبئ تھا، جہاں کانگریس نے امتناعِ شراب کا قانون پاس کر کے ان ہزارہا مزدوروں کو بیکار کر دیا تھا جو تاڑی نکالتے تھے۔ وہی عروس البلاد تھی، جس کے گھونگھٹ کا ایک حصہ حریری ہے اور دوسرا کھردرے ٹاٹ کا۔ وہی بمبئ جہاں اونچی اونچی خوبصورت عمارتوں کے قدموں میں فٹ پاتھوں پر ہزارہا مخلوق رات کو سوتی ہے۔''

''مسلم لیگ مسجد ہے، کانگریس مندر ہے۔ کانگریس سوراج چاہتی ہے، مسلم لیگ بھی۔ لیکن دونوں مل جل کر کام نہیں کر سکتے۔ ان کے خون کا ملاپ موریوں اور بدروؤں میں ہوگا۔'' (باتیں)

ایسے میں سیاسیات سے اس کی برگشتگی قدرتی بات تھی۔ لیکن میں امرتسر سے بمبئ پہنچ گیا۔ جلیاں والا باغ کے شہر میں ماسکو کا منڈوا اپنے اشتہار کے بعد ہی ٹوٹ گیا۔ اس کی سین سینری، پردے پٹاخے ڈائریکٹر کے گھر میں مقفّل ہو گئے اور بعد میں کباڑ کے بھاؤ لاہور کے ایک کتب فروش نے خریدے۔ دنگلوں، مویشیوں کے میلوں، منشیات کے ٹھیکوں، عصمت فروشی اور اس طرح کے دوسرے کھیل تماشوں کی طرح کتاب چھاپنا بھی ایک تماشا تھا۔ اور یہ کتاب (ویرا) تو سچ مچ کا ناٹک تھا۔ جس کے لئے لائسنس ضروری تھا۔ لیکن لائسنس نہ ملا اور پروڈیوسر بھاگ گیا۔ باری صاحب غائب تھے! انہیں اس ناٹک کا انجام بھی یاد نہیں رہا تھا۔ وہ بھول گئے تھے کہ Picture of Dorian Gray کا مصنف

دہشت پسندی سے اتنا ہی دُور تھا جتنے گاندھی جی سینما سے۔ ناٹک کے اختتام پر 'ویرا' آسکر اوائلڈ کی ہیروئن وہی خنجر، جسے وہ زاروچ کے سینے میں گھونپنے کے لئے لائی تھی، اپنے سینے میں گھونپ لیتی ہے۔ اسے زاروچ سے عشق تھا۔ محبت فتح یاب ہوئی۔ فرض منہ دیکھتا رہ گیا۔

لیکن تماشا ابھی ختم نہیں ہوا۔ ''بچوں کا کھیل'' ابھی جاری ہے۔۔ پندرہ دن غائب رہنے کے بعد ویرا کے ''پروڈیوسر'' باری صاحب پھر آموجود ہوئے۔ اب کے ایک ہفتہ وار اخبار کے ایڈیٹر، پبلشر کے ''میک اپ'' میں۔ اخبار کا نام ''خلق'' تھا۔ ہمیں حکم ہوا کہ فوراً کام شروع کیا جائے تاکہ اخبار کی اشاعت میں مزید تاخیر نہ ہو۔ منٹو کا افسانہ ''تماشا'' خلق کے پہلے شمارے میں شامل تھا۔ میں نے بھی اپنی دانست میں ایک بڑا انقلاب انگیز مضمون لکھا۔ ''مزدور'' جس میں جذباتیت کی خامکاری بدرجۂ اتم موجود تھی۔ اور سرمایہ دار کو خوب خوب موٹے موٹے ''مقرّس ومعرّب'' الفاظ میں کوسا گیا تھا۔ یہ مضمون ''آدم'' کے فرضی نام سے شائع ہوا۔ منٹو نے بھی مارے ڈر کے اپنے افسانے کے مصنّف کا اعلان نہ کیا۔ باری صاحب نے ہیگل اور مارکس کے بارے میں اپنے خاص خطیبانہ انداز میں کچھ لکھا۔ جسے میں شاید آج بھی نہ سمجھ سکوں۔ مگر وہ ہمارے پیرومرشد تھے۔ جن کے روحانی فیض نے ہمیں اپنے تمام ہم عمروں سے ممتاز وممیز کر دیا تھا۔ اور تو اور ہمارے پروفیسر بھی (جن میں فیض احمد فیض اور صاحبزادہ محمودالظفر جیسے لوگ بھی شامل تھے) ہمیں ادب واحترام کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ ایسے میں ہمارے استاد باری کوئی بے معنی اور بے مصرف بات کیونکر کہہ سکتے تھے۔ اس مضمون کا مطلب کسی کی سمجھ میں آیا ہو یا نہ ہو۔ اتنا ضرور ہوا کہ مارکس کے نام سے پولس کے کان کھڑے ہوگئے۔ لیکن ''خلق'' اپنے پہلے ہی شمارے کے بعد مالی مشکلات میں مبتلا ہو چکا تھا اور باری صاحب کا اخباری دُنیا میں انقلاب بپا کرنے کا خواب بھی چکنا چور ہوگیا۔

باری صاحب بڑے بڑے منصوبے بناتے اور انھیں چائے کی پیالی میں گھول کر پی جاتے۔ وہ عجیب وغریب خواب دیکھا کرتے۔ وہ کہا کرتے کہ جذبۂ انقلاب کو جلا دینے کے لئے قید ہونا ضروری ہے۔ لیکن سعادت کہا کرتا تھا۔ ''باری صاحب آپ بکواس کرتے ہیں۔۔ آپ وہاں دو دن زندہ نہیں رہ سکتے۔'' لیکن باری صاحب کا خواب خبط کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ ''تم دیکھ لینا وہ دن دور نہیں جب تم مجھ سے جیل میں ملنے آیا کرو گے''۔۔۔۔۔ ''جیل میں۔۔۔'' وہ اپنی ڈائری لکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ہلکے

گلابی۔۔۔۔(مجھے رنگ اچھی طرح یاد نہیں) رنگ کا نہایت ہی عمدہ کاغذ لے کر شہر کے بہترین جلد ساز سے کالے عملی چمڑے کی ایک ڈائری بنوائی گئی۔ اس کے پہلے ورق پر آہنی سلاخوں والے دروازے کی ایک کٹنگ نہایت نفاست سے چپکائی گئی۔ اس تصویر کے اوپر کاتب سے ''دریچۂ زنداں'' کا عنوان نہایت ہی عمدہ خط میں لکھوایا گیا۔

اشتراکی ادیب باری بہت بڑا رومان پسند تھا!

اس کے چیلے اپنے گرو کی طرح مارکس اور اینگلز کا چلّا نہ کھینچ سکے۔ مادہ پرستی کا یہ وظیفہ ان کی سبک اور نازک روحوں کے لئے بہت بوجھل تھا۔ ان کی انفرادیت، اجتماعیت سے سمجھوتہ نہیں کر سکتی تھی...... منٹو کی ''انا''، ہجوم کو خدا نہیں مان سکتی تھی مگر ''انا الحق'' کی منزل ابھی دُور تھی۔

کرشن چندر

سعادت حسن منٹو

لانبا، ترچھا، گورا گورا، ہاتھ کی پشت پر وردیں ابھری ہوئی، گردن کا حلقوم باہر نکلا ہوا، سوکھی ٹانگوں پر بڑے بڑے پاؤں لیکن بے ڈول نہیں۔ ایک عجیب سی نفاست نسائیت لئے ہوئے، چہرے پر جھنجھلاہٹ، آواز میں بے چینی، لکھنے میں اضطراب، آداب میں تلخی، چلنے میں عجلت، سعادت حسن منٹو کو پہلی بار دیکھ کے کچھ ان باتوں کا احساس ہوتا ہے لیکن ان باتوں کے احساس پر ایک دوسرا احساس حاوی ہو جاتا ہے۔ منٹو کی پیشانی کا چوکھٹا اس کے دماغ کی طرح عظیم ہے اور عجیب وغریب بھی، بالعموم ذہین آدمیوں کی پیشانی کا چوکھٹا ان تصویروں سے زیادہ ملتا جلتا ہے جو مغربی مصور شیطان سے منسوب کرتے ہیں، یعنی فراغ ماتھا اور بال کنپٹیوں کے قریب سے پیچھے کی طرف غائب ہوتے ہوئے۔ منٹو کا ماتھا شیطان سے ملتا جلتا نہیں ہے۔ منٹو کا ماتھا مستطیل ہے۔ سیمیں پردے کی طرح، نیچے سے کم فراخ ہے اور اوپر سے زیادہ اور بال سیدھے لانبے اور گھنے ہیں اور آنکھوں میں ایک وحشی چمک ہے ایک بے باک درشتی ہے۔ ایک ایسی سوجھ بوجھ ہے جیسے منٹو موت کے دروازے کے اندر جھانک کر لوٹ آیا ہو۔ میں نے منٹو سے اس امر کے بارے میں کبھی نہیں پوچھا۔ سنا ہے کہ وہ ایک دفعہ تپ دق یا ایسی ہی کسی خوف ناک بیماری میں مبتلا ہوا تھا...... بہر حال اس کی بڑی بڑی وحشت ناک آنکھوں کا سوز و کرب اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ منٹو زندگی کی منزل سے بہت آگے جا کے واپس آیا ہے۔ ممکن ہے کوئی بیماری نہ ہو، خطرناک عشق رہا ہو اور حالانکہ عشق بھی ایک بیماری ہے۔ کچھ بھی ہو منٹو کے لئے یہ تجربہ مہنگا نہیں رہا۔ اس تجربے نے منٹو کو کندن بنا دیا۔

منٹو جواہر لال اور اقبال کی طرح کشمیری پنڈت ہے۔ عرصے سے اس کا خاندان امرتسر میں آباد تھا۔ اس کے دونوں بڑے بھائی ہندوستان سے ہجرت کر چکے ہیں۔ بڑا بھائی کینیا میں بیرسٹر ہے اور

وہاں کی دستوری مجلس کے رکن بھی۔ اس کے بڑے بھائی کو میں نے دیکھا ہے۔ شرعی داڑھی اور بے حد متقی، پارسا اور نمازی مسلمان۔ منٹو وہ سب کچھ ہے جو اس کے دونوں بڑے بھائی نہیں ہیں۔ وہ اپنے بزرگوں کی عزت کرتا ہے، محبت نہیں، آداب میں، اخلاق میں، زاویۂ نگاہ میں اس قدر شدید اختلاف تھا کہ منٹو نے بچپن ہی سے اپنا گھر چھوڑ دیا تھا اور اپنے لئے نئی راہ تلاش کرنی شروع کر دی تھی۔ علی گڑھ لاہور، امرتسر، بمبئی، دہلی۔ ان مقامات نے منٹو کے مختلف رنگ دیکھے ہیں۔ روسی ادب کا پرستار منٹو، چینی ادب کا شیدا منٹو، تلخی اور یاسیت کا شکار منٹو، گمنام منٹو، بدنام منٹو، بھٹیارخانوں، شراب خانوں اور قحبہ خانوں میں جانے والا منٹو اور پھر گھریلو منٹو۔ محبت کرنے والا منٹو۔ دوستوں کی مدد کرنے والا منٹو، ترشی اور تلخی کو مٹھاس میں سمونے والا منٹو، اردو کا معروف ترین ادیب منٹو۔ ان مقامات نے منٹو کو ہر رنگ میں دیکھا ہے اور منٹو نے بھی ان مقامات کو خوب دیکھا ہے۔ منٹو نے زندگی کے مشاہدے میں اپنے آپ کو ایک مومی شمع کی طرح پگھلایا ہے۔ وہ اردو ادب کا واحد شنکر ہے جس نے زندگی کے زہر کو خود گھول کر پیا ہے اور پھر اس کے ذائقے کو اس کے رنگ کو کھول کھول کے بیان کیا ہے۔ لوگ بد کتے ہیں، ڈرتے ہیں مگر اس کے مشاہدے کی حقیقت اور اس کے ادراک کی سچائی سے انکار نہیں کر سکتے۔ زہر کھانے سے اگر شنکر کا گلا نیلا ہو گیا تھا تو منٹو نے بھی اپنی صحت گنوالی ہے۔ اس کی زندگی انجکشنوں کی محتاج ہو کے رہ گئی ہے۔ زہر منٹو ہی پی سکتا تھا۔ اور کوئی دوسرا ہوتا تو اس کا دماغ چل جاتا مگر منٹو کے دماغ نے زہر کو بھی ہضم کر لیا ہے۔ ان درویشوں کی طرح پہلے گانجے سے شروع کرتے ہیں اور آخر میں سنکھیا کھانے لگتے ہیں اور سانپوں سے اپنی زبان ڈسوانے لگتے ہیں۔ منٹو کے ادب کی تیزی و تندی اور اس کی زبان کی نشتر زنی اس امر کی آئینہ داری کرتی ہے کہ منٹو کا فقر آخری منزل پر پہنچ چکا ہے۔ منٹو سے ملنے سے پہلے میں نے منٹو کے افسانے پڑھے تھے۔ ہفتہ وار مصوّر بمبئی میں منٹو کے افسانے شائع ہوتے تھے۔ یہ افسانے اتنے نکیلے تھے، اتنے عجیب و غریب الفاظ میں لکھے گئے تھے، اس قدر ٹیڑھے تھے کہ قائل ہونا پڑا۔ شوشو۔ خوشیا، دیوالی کے دیئے۔ غالباً یہ افسانے میں نے ''مصور'' ہی میں پڑھے تھے اور منٹو کو ان کے بارے میں توصیفی خطوط بھی لکھے تھے۔ ان دنوں منٹو بمبئی میں رہتا تھا ہفت روزہ مصوّر کی ادارت سنبھالے ہوئے تھا اور ''کیچڑ'' کی کہانی، منظر نامہ اور مکالمے بھی تحریر کر رہا تھا۔ پریم چند کے بعد منٹو پہلا ادیب ہے جس نے ادب سے فلم کی طرف رجوع کیا۔ شاید منٹو کے لئے یہ کہنا صحیح نہ ہوگا۔ اس لئے کہ اس کی

ادبی شہرت اس کی فلمی زندگی کے بعد شروع ہوتی ہے۔ شاید منٹو وہ پہلا ادیب ہے جو فلم سے ادب کی طرف آیا اور اپنی شہرت کی بنیادیں استوار کر کے پھر فلم کی طرف چلا گیا۔ اس کی ہر بات عجیب ہے۔

ان افسانوں کے پڑھنے کے بعد میں نے اس کا افسانہ ''لالٹین'' پڑھا جو بٹوٹ سے متعلق ہے جہاں منٹو غالباً اپنی شدید علالت کے دوران میں رہا تھا۔ مجھے تو اس افسانے کا بیشتر حصہ منٹو کی سوانح سے متعلق معلوم ہوتا ہے۔ اس کی جزئیات میں اور حرف آخر میں جو حزن و ملال جھلکتا ہے وہ خود رومانی منٹو کی زندگی کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بعد گویا منٹو کے افسانوں سے کسی نے ساری ملائمت اور نرمی اور مٹھاس چھین لی یا شاید اس نے خود ان اوصاف کو اپنی کہانیوں سے دھکے مار مار کر نکال دیا ہو۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی اذیت، کوشش، جذبے کے زیر اثر ایسا کرتا رہتا ہے۔ نکلو، نکلو، زندگی بہت تلخ ہے۔ ان میں ان جذبات کا گزر نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ یہاں سے نکل جاؤ۔ اس کے اکثر افسانوں میں معلوم ہوتا ہے گویا وہ ان جذبات کو دیدہ و دانستہ دھکے مار کر باہر نکال رہا ہو۔ کبھی بچوں کی طرح بسورنے لگتا ہے۔ کبھی تلخ لہجے میں، نہایت ہی ناخوشگوار لہجے میں ان کا مذاق اڑاتا ہے اور کوئی نہیں سمجھتا کہ اس تلخی، زہرناکی اور طنزیہ ہنسی کے پیچھے کتنی نرمی اور ملائمت اور زندگی کی چاہت چھپی ہوئی ہے۔ ایسی چاہت جس کی بھوک ابدی ہے اور کبھی نہیں مٹتی۔ منٹو ازل سے بھوکا ہے۔ اس کے ہر افسانے میں انسانی محبت کی پکار ہے۔ آپ اس کے انداز پر نہ جائیے۔ وہ ہزار بار کہتا ہے، مجھے انسانوں سے محبت نہیں ہے۔ میں ایک گلے سڑے کتے کے پلے سے محبت کرلوں گا مگر انسانوں سے نہیں۔ وہ کہے گا مجھے دوستی، عنایت شفقت کسی پر اعتبار نہیں۔ میرا اعتقاد شراب ہے۔ یہ ترقی پسندی سب بکواس ہے۔ میں ترقی پسند نہیں ہوں۔ میں صرف منٹو ہوں اور شاید وہ بھی نہیں ہوں۔ وہ یہ سب باتیں کہتا ہے تکلفاً کبھی آپ کا جی جلانے کے لئے، منہ چڑانے کے لئے، اپنے آپ کو دھوکا دینے کے لئے بھی وہ سب باتیں کہتا ہے لیکن اس کی آنکھیں کچھ اور کہتی ہیں۔ اس کا قلم کچھ اور کہتا ہے اور ہماری خوش قسمتی ہے کہ اس کی زبان کی طرح اس کا قلم اس کے قابو میں نہیں ہے۔ وہ اپنی انسانی ہمدردی، اپنی ترقی پسندی، اپنی بشری محبت پر پردہ ڈالنے کی ہزار کوشش کرتا ہے۔ اپنے افسانوں پر استہزاء کا روغن چڑھاتا ہے لیکن اس کا قلم اس کے قابو میں نہیں ہے اور ہر افسانے کے پس پردہ انسانی محبت ابلی پڑتی ہے۔

ان دنوں میں ''نئے زاویئے'' کی پہلی جلد مرتب کر رہا تھا۔ میں نے منٹو سے اس میں شرکت کے

نے کہا تو اس نے بہت جلد مجھے اپنی وہ کہانی [illegible] جو میرے خیال میں [illegible]
کہانی ہے اور ادب میں اس کا مقام وہی ہے جو راجندر سنگھ بیدی کے ''گرہن'' اور حیات اللہ انصاری کی ''آخری کوشش'' کا ہے۔ اتنے اچھے افسانے اب اردو میں مشکل سے لکھے جاسکیں گے۔ میں نے روسی شاہکار ''یاما'' بھی پڑھا ہے اور اسی موضوع پر کئی فرانسیسی کہانیاں بھی پڑھی ہیں اور امراؤ جان ادا کے کردار کا بھی مطالعہ کیا ہے لیکن ''ہتک'' کی ہیروئن کی ٹکر کا ایک کردار بھی مجھے ان ناولوں اور افسانوں میں نہیں نظر آیا، ایک ایک کر کے منٹو نے موجودہ سماجی نظام کے اندر بسنے والی طوائف کی زندگی کے چھلکے اتار کر الگ کر دیئے ہیں اس طرح کہ اس افسانے میں صرف طوائف کا جسم بلکہ اس کی روح بھی ننگی نظر آتی ہے۔ ایک شیشے کی طرح آپ اس کے آر پار دیکھ رہے ہیں کس بے دردی اور سفاکی سے منٹو نے اسے ننگا کیا ہے لیکن اس بدصورت خاکے کا ہر رنگ بدصورت ہوتے ہوئے بھی ایک نئے حسن کی تخلیق کرتا ہے۔ طوائفیت سے محبت نہیں ہوتی۔ سوگندھی اور اس کی زندگی پر رحم نہیں آتا لیکن سوگندھی کی معصومیت اور اس کے عورت پنے پر اور اس کی زندگی اور اس کی چاہت اور اس کی تخلیق پر اعتقاد پیدا ہو جاتا ہے اور یہی سچے اور لافانی ادب کا جوہر عظیم ہے!

''ہتک'' کے بعد پھر تو منٹو کے کئی ایک افسانے رسائل میں شائع ہوئے اور بجلی کے کوندے کی طرح منٹو کا نام پڑھے لکھے عوام کے اذہان میں چمک اٹھا۔ انہی دنوں میں آل انڈیا ریڈیو سے مجھے بلاوا ملا۔ اور میں لاہور سے دہلی چلا گیا۔ یہاں مجھے آئے ہوئے ایک ماہ بھی نہ ہوا تھا کہ مجھے منٹو کا خط آیا کہ وہ دہلی آ رہا ہے اور میرے یہاں ٹھہرے گا۔ مجھے تیس ہزاری میں ایک چھوٹا سا مکان مل گیا تھا اور ایک نوکر بھی۔ اس لئے چنداں فکر کی بات نہ تھی۔ میں شام کے وقت ۶ بجے کے قریب دفتر سے لوٹ کر اپنے مکان کے باہر ٹہل رہا تھا کہ ایک صاحب لمبے لمبے ترچھے، گورے گورے سے آئے۔ ایک چرمی بیگ بغل میں دبائے اور میری طرف دیکھ کے مسکرانے لگے۔ ہم دونوں نے یکا یک ایک دوسرے کو پہچان لیا۔

''تم کرشن چندر ہو۔'' نو وارد نے کہا۔

''منٹو۔'' میں نے جواب دیا اور ہم دونوں بغل گیر ہو گئے۔

منٹو ایک لمبا سا کوٹ پہنے آیا تھا۔ کمرے کے اندر جا کر منٹو نے اوور کوٹ اتار دیا اور چرمی بیگ کو صوفے پر پٹک دیا اور خود ایک کرسی پر پاؤں سکیڑ کر اس طرح بیٹھ گیا کہ جس طرح کنہیا لال جیب کترے کا

اٹ ادا کرتے وقت بیٹھتا ہے۔ مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا۔ ''لو سگریٹ پیو۔''

کوئی گھٹیا قسم کا سگریٹ تھا جو میں نے اسے پیش کیا۔

''لاحول ولاقوۃ۔'' منٹو بولا۔ ''ارے یہ سگریٹ تم پیتے ہو؟ حیرت ہے ایسے سگریٹ پی کر تم اچھے فسانے کیسے لکھ لیتے ہو۔ یہ سگریٹ پی کر تم صرف دفتر کی کلرکی کر سکتے ہو! سمجھے کرشن چندر ایم۔ اے۔۔۔۔۔ لو ب یہ سگریٹ پیو ۵۵۵ اور بھول جاؤ ان سگریٹوں کو۔''

نوکر نے گرم گرم پھلکیاں پلیٹ میں سجا کر بھیج دیں۔ میں نے کہا، ''پھلکیاں گھی میں تلی گئی ہیں۔ الص گھی پنجاب سے آیا ہے۔''

''پھلکیاں اور گھی میں۔'' منٹو چلایا۔ ''لاحول ولاقوۃ۔ ارے میاں تم تو نرے کودن ہو۔ ارے بھائی برے کون بیوقوف پھلکیاں گھی میں تلتا ہے۔ اس سے تو پھلکیوں کا مزہ ہی بدل جاتا ہے۔ تلنے کے لئے ھی نہیں ڈالڈا سے بہتر فرائی اور کہیں نہیں ہوتا۔ میری بیوی کو آنے دو۔ پھر تمہیں پھلکیاں کھلاؤں گا۔ چٹپٹی رکرکری اور ایسی مزیدار جیسے بمبئی کی گھاٹن ہوتی ہے۔ کبھی بمبئی گئے ہو۔''

میں نے کہا: ''میں تو دہلی بھی پہلی بار آیا ہوں۔ اس سے آگے دنیا کیسی ہے۔ معلوم نہیں۔''

''بمبئی چلو اور چھوڑو یہ ریڈیو ویڈیو۔ لو شراب پیو۔''

یہ کہہ کر منٹو نے اپنے چھوٹے کوٹ کی جیب سے ایک بوتل نکالی۔ سولن وسکی نمبر ایک اور اس کا کاگ اکر بولا: ''جلدی سے لو، گلاس منگواؤ۔ دیر ہو رہی ہے۔''

اب تک میں نے کبھی شراب نہ چکھی تھی لیکن منٹو کا چہرہ اس قدر درشت تھا۔ اس کا لہجہ اس قدر تند تھا یہ میں نے سوچا اگر میں نے انکار کیا تو کہیں وہ مجھے مار ہی نہ بیٹھے۔ میں نے نہایت اطمینان سے دو گلاس لوائے۔ منٹو نے شراب انڈیلنی شروع کی۔ پوچھنے لگا:

''تم کون سی شراب پیتے ہو۔''

میں نے کہا: ''برانڈی یا پھر۔۔۔۔۔ کوئی اچھی سی انگریزی وہسکی۔''

''کون سی انگریزی وہسکی'' منٹو نے تلخی سے کہا۔۔۔۔۔ ''وہسکی انگریزی نہیں ہوتی۔ اسکاچ ہوتی ہے۔ لے انگریز شراب تک تو کشید نہیں کر سکتے۔ ہندوستان پر حکومت کیا کریں گے۔''

میرے ذہن میں ایک انگریزی۔۔۔۔۔ اسکاچ وہسکی کا اشتہار آ گیا:

میں نے جلدی سے کہا: "DONT BE VAGUE ASK FOR HAGUE"

''سب بکواس ہے۔'' منٹو بولا۔ ''سولن وہسکی نمبرا رسب سے عمدہ ہے۔ ایک تو پیسے کم اور پھر مزے میں اور نشے میں ہیگ سے بہتر ہے۔ آئندہ سے ہیگ مت پیا کرو۔ صرف سولن وہسکی نمبرا ر سمجھے۔''

میں نے کہا: ''ٹھیک ہے۔ آئندہ سے ہیگ نہیں پیوں گا۔''

''اور ڈالوں۔'' منٹو نے میرے گلاس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو قریباً ایک چوتھائی بھر چکا تھا۔

میں نے کہا: ''اور نہیں، جیسی تمہاری مرضی۔ اور ڈال دو۔''

''تو کیا پٹیالہ پیگ پیو گے۔'' منٹو نے حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے جلدی سے کہا۔ ''ہاں''...... دراصل مجھے معلوم ہی نہ تھا کہ پٹیالہ پیگ کیا ہوتا ہے ہاں کہہ دینے سے نجات مل گئی۔

''بڑے بیباک ہو۔'' منٹو نے مجھے شبے کی نظر سے دیکھتے ہوئے کہا۔

میں تو پہلے ہی پیگ میں نہال ہو گیا تھا۔ اس کے بعد دوسرا میں نے نہیں لیا اور نہ منٹو نے اصرار کیا کیونکہ وہ میری حالت دیکھ چکا تھا۔ میں نے اقبال سے کہا کہ یہ پہلی بار شراب پی رہا ہوں اس پر منٹو نے شراب کے فائدے گنائے ''گناہ کی لذت شراب میں ہے عورت کی رنگت شراب میں ہے۔ ادب کی چاشنی شراب میں ہے۔ مکروہات دنیا سے نجات شراب میں ہے۔ بھئی تم کب تک پنڈت بنے رہو گے۔ آخر تمہیں ادب کی تخلیق کرتا ہے۔ کوئی اسکول کے بچّوں کو تو پڑھانا ہے نہیں۔ زندگی نہیں دیکھو گے، گناہ نہیں کرو گے، موت کے قریب نہیں جاؤ گے، غم کا مزہ نہیں چکھو گے، سولن وہسکی نمبرا ر نہیں پیو گے تو کیا تم خاک لکھو گے۔''

بوتل ختم کرنے کے بعد وہ بھی آؤٹ ہو گیا۔ اب اس کا تقاضا یہی تھا کہ میں کرشن چندر ایم۔ اے کیوں ہوں۔ صرف کرشن چندر کیوں نہیں۔

پھر مجھے چڑانے کے لئے بار بار کہنے لگا: ''کرشن چندر ایم اے، کرشن ایم اے، کرشن چندر ایم اے۔''

اور میں نے بدلہ چکانے کے لئے کہا: ''تم یہ بتاؤ تم کون ہو؟ منٹو ہو یا منٹو ہو...... یہ منٹو کیا بلا ہے منٹو۔ منٹو۔ منٹو!''

وہ کہنے لگا: ''کرشن چندا یم۔ اے، کرشن چندر ایم۔ اے، کرشن چندر ایم اے۔''

تھوڑی دیر تک اسی طرح گردان کرتے ہوئے ہم دونوں سو گئے۔ میں صوفے اور وہ اسی کرسی پر اسی طرح سو گیا۔ گردن کو ٹانگوں میں دبائے ہوئے اور صبح تک اسی طرح سویا رہا...... صبح جب میں جاگا تو وہ اسی طرح سو رہا تھا۔ میز پر بوتل اوندھے منہ پڑی تھی، گلاس خالی تھے اور پھلکیاں باسی تھیں۔

میں نے منٹو کو جگایا: ''اٹھو۔''

وہ اٹھتے ہی کہنے لگا۔ ''اگر اس وقت بھی تھوڑی سی مل جائے تو شراب کا ذائقہ زبان سے دور ہو جائے۔ تم جانتے ہو شراب کے ذائقے کو دور کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ صبح اٹھتے ہی آدمی پھر دو گھونٹ شراب کے پی لے۔ سمجھے...... شراب منگاؤ۔ پھر مجھے آل انڈیا ریڈیو جانا ہے۔''

''وہ کیوں۔'' میں نے پوچھا۔

''میں یہاں ڈرامے لکھنے کے لئے بلایا گیا ہوں۔''

اور تم تو مجھے بمبئی بھیج رہے تھے رات کو فلموں میں کام کرنے کے لیے۔''

''گولی مارو بمبئی کو اور یہ بکواس بند کرو۔ اور شراب منگواؤ۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنا چرمی بیگ کھولا اور ایک افسانہ نکال کر مجھے دیا۔'' اسے ذرا پڑھ لو۔ میں اپنے افسانے کسی کو نہیں دکھاتا ہوں۔ اپنے باپ کو بھی نہیں۔ بس تمہیں صرف دکھا سکتا ہیوں، گو تم بھی بہت اچھا نہیں لکھتے مگر ایک بات ہے ان میں۔ اسے مانتا ہوں۔ سمجھے کرشن چندر ایم۔ اے''

ریڈیو پر ہم لوگ دو سال اکٹھے رہے۔ بعد میں اوپندر ناتھ اشک بھی آ گئے۔ میں ڈرامہ پروڈیوسر تھا۔ منٹو اور اشک دونوں ڈرامے لکھتے تھے اور مجھے ان دونو ں کے بیچ میں توازن قائم رکھنا پڑتا تھا۔ دونوں اچھے ادیب، دونوں اپنی انانیت پر قائم۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان دنوں بہت اچھے ریڈیائی ڈرامے لکھے گئے اور یہ ڈرامے کسی دوسری زبان سے ترجمے نہ کئے گئے تھے۔ یہ اعلیٰ دماغوں کی بہترین تخلیق تھے اور ان ڈراموں سے اردو ادب میں ماڈرن ڈراموں کو فروغ حاصل ہوا بلکہ اس کے بعد تو اوپندر ناتھ نے اپنی بہترین کاوشیں ڈرامے کے لئے وقف کر دیں۔

یہ بڑے مزے کا زمانہ تھا۔ ہم تینوں میں ادبی بحثیں ہوتی تھیں۔ نوک جھونک، افسانے لکھے جاتے، ڈرامے لکھے جاتے، مضامین ایک دوسرے کو سنائے جاتے، پھر کچھ عرصہ کے لئے بیدی بھی آ گئے۔ احمد ندیم قاسمی بھی اور ن۔م۔ راشد بھی۔ اور اس اجتماع نے اردو ادب میں ایک نئے باب کا

دوایک روز تو منٹو سے خوب گاڑھی چھنی۔ مگر منٹو کے مزاج کی تلخی ستیارتھی کی شیریں بیانی کی ضد تھی۔ زیادہ دیر تک نہ نبھ سکی۔ منٹو نے اپنے ایک افسانے میں ستیارتھی پر چوٹ کی۔ ستیارتھی نے ''نئے دیوتا'' میں اس کا جواب دیا۔ منٹو کو اس کا صدمہ ضرور ہوا۔ دو تین روز تک اس افسانے کا اثر رہا۔ آخر اس نے کہا: ''یہ نئے دیوتا...... ٹھیک ہے۔ چلو ہٹاؤ۔''

میں نے کبھی اس سے اس موضوع پر بات نہیں کی۔ منٹو اکثر مجھے کہتا تھا: ''مجھے تمہاری یہ حرکت پسند نہیں۔ میں تم سے لڑنا چاہتا ہوں اور تم ہمیشہ طرح دے جاتے ہو۔ یہ نامعقولیت مجھے پسند نہیں۔''

میں نے کہا: ''لڑنے کے لئے کیا اشک کافی نہیں۔''

اشک اور منٹو میں نوک جھونک خوب ہوتی تھی اور اکثر دنیا کے ہر موضوع پر ہو جاتی تھی اور ایسی ایسی ادبی موشگافیاں نکلتی تھیں کہ دن بھر جی لگا رہتا تھا۔

منٹو کے پاس اردو ٹائپ رائٹر تھا اور منٹو اپنے تمام ڈرامے اسی طرح لکھتا تھا کہ کاغذ ٹائپ رائٹر پر چڑھا کے بیٹھ جاتا تھا اور ٹائپ کرنا شروع کر دیتا تھا۔ منٹو کا خیال ہے کہ ٹائپ رائٹر سے بڑھ کے دنیا میں خیال انگیز مشین اور کوئی نہیں ہے۔ الفاظ گھڑے گھڑائے موتیوں کی طرح جلا لئے ہوئے صاف ستھری مشین سے نکلتے آتے ہیں۔ قلم کی طرح نہیں کہ نب گھسی ہوئی ہے تو روشنائی کم ہے۔ کاغذ پتلا ہے۔ ایک ادیب کے لئے ٹائپ رائٹر اتنا ضروری ہے کہ جتنا خاوند کے لئے بیوی اور ایک او پندر ناتھ اشک اور کرشن چندر ہیں کہ قلم گھس گھس کئے جا رہے ہیں۔ ارے میاں کبھی عظیم ادب کی تخلیق آٹھ آنے کے پن ہولڈر سے بھی ہو سکتی ہے۔ تم گدھے ہو نرے گدھے!

میں تو خیر چپ رہا مگر دو تین روز کے بعد ہم لوگ کیا دیکھتے ہیں کہ اشک صاحب اپنی بغل میں ایک نیا اردو ٹائپ رائٹر دبائے چلے آ رہے ہیں اور آپ نے منٹو کی میز کے سامنے اپنا ٹائپ رائٹر سجا دیا اور کھٹ کھٹ کرنے لگے۔

''ارے اردو کے ٹائپ رائٹر سے کیا ہوتا ہے۔ انگریزی ٹائپ رائٹر بھی ہونا چاہیے۔ کرشن! تم نے انگریزی کا ٹائپ رائٹر دیکھا ہے۔ دہلی بھر میں ایسا ٹائپ رائٹر کہیں نہیں ہوگا۔ ایک روز لا کے تمہیں

دکھاؤں گا۔"

اشک نے اس پر نہ صرف انگریزی کا بلکہ ہندی کا ٹائپ رائٹر بھی خرید لیا۔ جب وہ اکثر آتا تو چپراسی ایک چھوڑ تین ٹائپ رائٹر اٹھائے اس کے پیچھے داخل ہوتا اور اشک منٹو کے سامنے سے گزر جاتا کیونکہ منٹو کے پاس صرف دو ٹائپ رائٹر تھے۔ آخر غصے میں آ کر منٹو نے اپنا انگریزی کا ٹائپ رائٹر بھی بیچ دیا اور پھر اردو ٹائپ رائٹر کو بھی وہ رکھنا نہیں چاہتا تھا مگر اس سے کام میں تھوڑی سی آسانی ہو جاتی تھی اس لئے اس نے اسے نہیں بیچا۔ پہلے پہل۔ مگر تین ٹائپ رائٹروں کی مار وہ کب تک کھاتا۔ آخر اس نے اردو کا ٹائپ رائٹر بھی بیچ دیا۔ کہنے لگا۔

"لاکھ کہو۔ وہ بات مشین میں نہیں آ سکتی جو قلم میں ہے۔ کاغذ، قلم اور دماغ میں جو رشتہ ہے وہ ٹائپ رائٹر سے قائم نہیں ہوتا۔ ایک تو کم بخت کھٹا کھٹ شور کئے جاتا ہے۔ مسلسل متواتر۔ اور قلم کس روانی سے چلتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے روشنائی سیدھی دماغ سے نکل کر کاغذ کی سطح پر بہہ رہی ہے۔ ہائے یہ شیفر کا قلم کس قدر خوبصورت ہے اس کا نوکیلا اسٹریم لائن حسن دیکھو جیسے باندرہ کی کرسچن چھوکری!"

اور اشک نے جل کر کہا، "تمہارا بھی کوئی دین ایمان ہے۔ کل تک ٹائپ رائٹر کی تعریف کرتے تھے۔ آج اپنے پاس ٹائپ رائٹر ہے تو قلم کی تعریف کرنے لگے۔ واہ! یہ بھی کوئی بات ہے۔ ہمارے ایک ہزار روپے خرچ ہو گئے۔"

منٹو زور سے ہنسنے لگا۔

ایک روز منٹو بہت خوش خوش میرے پاس آیا کہنے لگا: "بھئی یہ احمد ندیم قاسمی کا خط آیا ہے۔ تمہیں بھی سلام کہا ہے۔ ذرا اسے پڑھ لو۔"

میں نے خط پڑھا۔ بڑا پیارا خط تھا مگر منٹو نے خط مجھے اس لئے پڑھنے کے لئے دیا کہ اس میں منٹو کی افسانہ نگاری کی تعریف کی گئی تھی۔ اس نے منٹو کو یہ خط مجھے دکھانے پر مجبور کر دیا تھا۔ خط کا آخری فقرہ یہ تھا:۔

"آپ افسانہ نگاری کے بادشاہ ہیں۔"

خط پڑھ کے میں نے اپنی میز کی دراز کھولی اور اس میں سے ایک خط نکالا۔ یہ خط بھی احمد ندیم قاسمی نے لکھا تھا اور آج ہی مجھے ملا تھا۔ ابھی کوئی منٹو کے آنے سے چند منٹ پہلے۔ اسے پڑھ کے میں نے میز کی دراز میں رکھ دیا تھا۔ میں نے وہ خط منٹو کو دیا: "لو بھئی۔ یہ ایک خط انہیں صاحب نے مجھے بھی

بھیجا ہے۔ اسے تم پڑھ لو۔"

میرے خط میں ندیم نے میری افسانہ نگاری کی تعریف کی تھی۔ خط کا آخری فقرہ یہ تھا:

"آپ افسانہ نگاری کے شہنشاہ ہیں۔"

میں نے کہا: "منٹو تم تو صرف بادشاہ ہو۔ ہم شہنشاہ ہیں۔ تم سے بڑے ہیں۔ بولو اب کیا کہتے ہو۔"

پھر ہم دونوں ہنسنے لگے۔ ندیم نے ہم دونوں سے کیا اچھا مذاق کیا تھا۔ منٹو نے کہا:

"آؤ ہم دونوں اسے ایک خط لکھیں اور اسے یہاں بلائیں۔"

پڑھی لکھی شریف گھرانوں کی لڑکیاں اس وقت تک ریڈیائی ڈراموں میں حصّہ لینے سے گھبراتی تھیں۔ جب میں دہلی آیا تو صرف تین چار لڑکیاں ہی ایسی تھیں جو ہمارے ڈراموں میں حصہ لے سکتی تھیں اور جب نئے ڈھب کے ڈرامے لکھے جانے لگے جن میں متوسط یا اعلیٰ طبقے کی زندگی کی عکاسی ہوتی تو ضرورت محسوس ہوتی کہ اپنے گروپ کو وسیع کیا جائے۔ چنانچہ میں نے بڑی کاوشوں سے دس بارہ لڑکیوں کا گروپ بنایا تھا جو ہمارے ڈراموں میں حصّہ لیا کرتی تھیں۔

ایک روز منٹو نے مجھ سے پوچھا: "دیکھو بھئی تم اپنے ڈرامے کے لئے کتنی لڑکیاں لا سکتے ہو۔"

"کتنی کیا مطلب جتنی کہو۔"

"اب دو ن کی مت لو۔ میں تم سے پوچھتا ہوں۔"

"پوچھتے کاہے کو ہو۔ تم ڈرامہ لکھو۔ اس میں جتنی چاہے لڑکیاں بھر لو، میں لا دوں گا۔"

"اچھا تو میں ایک ڈرامہ لکھوں گا۔ اس میں صرف لڑکیاں ہوں گی۔ چھبیس ستائیس لڑکیاں رکھوں گا۔"

میں نے کہا: "اور اس کا نام رکھو "ایک مرد"۔"

ڈرامہ لکھا گیا: "براڈکاسٹ بھی ہوا۔ ہر کردار کے لئے لڑکی بھی مل گئی۔

اسی طرح ہر چیز میں مقابلے سے کام لیا جاتا۔ میں نے ایک اچھا افسانہ لکھا تو منٹو نے بھی اور پھر اشک نے بھی۔ اور راشد نے بھی ایک نظم کہہ ڈالی۔ منٹو نے ڈرامہ لکھا تو اشک بھی ضرور لکھیں گے اور پھر میں بھی ان دونوں کی تقلید میں لکھنے کی کوشش کرتا۔ میرے تمام ریڈیائی ڈرامے جن میں "سرائے کے باہر" بھی شامل ہے انہی دنوں کی پیداوار ہیں۔ جب میرا اور منٹو کا ساتھ تھا۔ وہ دن اتنے اچھے تھے کہ مالی پریشانیوں کے باوجود بھی ہم لوگ بہت خوش رہتے تھے اور بہت لکھتے تھے اور جو کچھ لکھتے تھے، تازگی اور

تعاون تھا کہ دن رات اکھٹے رہتے اور اپنے پروگرام کو بہتر بنانے کی تجاویز سوچا کرتے۔ ریڈیو آرٹسٹ خاص طور پر منٹو کو بہت چاہتے تھے۔ منٹو ہماری ریہرسل میں کم آتا تھا لیکن جب آتا تو اپنی پھلجھڑیوں سے ایک شگفتگی پیدا کر دیتا کہ جس کا تاثر گھنٹوں تک رہتا۔ منٹو کے ڈرامے ان آرٹسٹوں نے جس کاوش اور انہماک سے نشر کئے ہیں اور وہ عوام میں کس قدر مقبول ہوئے ہیں اس کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ منٹو نے اپنی ریڈیائی ڈراموں کی ایک کتاب ان فنکاروں کے نام معنون کی ہے۔ اسی دوران میں منٹو نے اور میں نے مل کر ایک فلمی کہانی لکھی۔ میرے لئے یہ پہلی فلمی کاوش تھی جس میں، میں نے حصہ لیا ہو۔ ''بنجارا'' اس کا نام تھا۔ دہلی میں کسی ڈسٹری بیوٹر کے ہاتھ اس نے بیچ دی تھی کیونکہ ان دنوں ہم لوگ نئے سوٹ سلوانا چاہتے تھے اور ابھی ایک لمبے عرصے تک کسی پبلشر سے پیسوں کے آنے کی امید نہ تھی لیکن اس فلمی کہانی کا دلچسپ پہلو ہمارے نئے سوٹ نہ تھے بلکہ کم از کم ہمارے لیے تو یہ تجربہ تھا۔ کہانی سن کر سیٹھ نے کہا:۔

''کہانی بہت اچھی ہے۔ ہم لوگ خرید لیں گے۔ لیکن منٹو صاحب۔ آپ نے فلم میں مل کے منیجر کو بہت بُرا بتایا ہے اسے اچھا دکھانا چاہئے ورنہ مزدوروں پر بُرا اثر پڑتا ہے۔''

''تو اسے اچھا دکھا دیں گے۔''

میں حیرت سے منٹو کی طرف تکنے لگا۔ میں کہنے والا تھا۔ ''یہ کیسے ہوسکتا ہے۔......اس نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

اور سیٹھ صاحب پھر بولے: ''اور یہ منیجر کی بیوی ہے۔ یہ اگر اس کی کنواری بہن ہو اور ہیرو سے پریم کرے۔ ایک ویمپ کے موافق۔ کیسا رہے گا منٹو صاحب۔''

''بہت اچھا۔ بہت اچھا۔'' منٹو نے کہا۔ میں پھر حیران رہ گیا۔ یہ وہ منٹو ہے جو کسی کے لئے اپنے ایک سطر تو کیا ایک حرف تبدیل نہیں کر سکتا۔ اس کے افسانے جوں کے توں شائع ہونے چاہئیں ورنہ وہ افسانہ واپس لے لے گا۔ کیا یہ وہی منٹو ہے؟ میں حیرت سے اس کی طرف تکنے لگا۔

جب ہم سیٹھ سے مل کر باہر آگئے تو منٹو نے کہا: ''بھئی یہ ادب نہیں ہے یہ فلم ہے جو پڑھے لکھے

''چاہئے۔''

''تو فلمی کہانی میں تبدیلی ضرور ہوگی۔''

''ضرور ہوگی بھئی!''

مزاج، جسم اور روح کے اعتبار سے منٹو آج بھی کشمیری پنڈت ہے۔ بہت سی باتوں میں وہ اشک سے ملتا جلتا ہے۔ میں جانتا ہوں اسے پڑھ کر اسے بڑی کوفت ہوگی مگر یہ سچائی سے بعید نہیں کیونکہ اشک بھی برہمن ہے۔ پنڈت ہے۔ دونوں لانبے دبلے پتلے ہیں۔ دونوں دن رات انجکشنوں کی فکر میں رہتے ہیں۔ دونوں میں برہمنوں کی ہٹ دھرمی، برہمنوں کی ضد، ان کی ذہانت اور ان کا چڑ چڑا پن پایا جاتا ہے۔ دونوں بہت باتیں کرتے ہیں۔ ہاں منٹو کی باتوں میں مزاح، انوکھا پن ذرا زیادہ ہوتا ہے۔ دنیا کے کسی موضوع پر اس سے گفتگو کیجئے۔ وہ اس پر ایک نئے انداز سے پوچھے گا۔ عام راستوں سے بچ کر چلنے کی عادت اب اس کے مزاج کا خاصہ بن گئی ہے۔ وہ اسے ترک نہیں کرسکتا۔ آپ اگر دستوسکی تعریف کریں تو وہ سمرسٹ ماہم کے گن گائے گا۔ آپ بمبئی شہر کی خوبیاں گنائیں گے تو وہ امرتسر کی تعریف میں رطب اللسان ہوگا۔ آپ جناح یا گاندھی کی عظمت کے قائل ہوتے نظر آئیں گے تو وہ اپنے محلے کے موچی..... کی عظیم ہستی کا معترف ہوگا۔ آپ گوشت اور پالک پسند فرمائیں گے تو وہ آپ کو دل کھانے کی ترغیب دے گا۔ آپ شادی کرنا چاہیں گے تو وہ آپ کو کنوارا رہنے کے لئے مصر ہوگا۔ آپ کنوار پنے کو بہتر سمجھیں گے تو وہ شادی کی افادی حیثیت سے بحث کر کے آپ کو شادی کے لئے مجبور کرے گا۔ آپ اس کے احسان کی تعریف کریں گے تو وہ برا بھلا کہے گا۔ آپ اسے گالی دیں گے تو وہ آپ کے لئے پانسو روپے کی نوکری ڈھونڈتا پھرے گا۔ منٹو کے مزاج کی طرح اس کی دوستی، دشمنی اور اس کا انتقام بھی عجیب ہے اور اس میں بھی بشریت کے بہت سے پہلو پائے جاتے ہیں۔

اس کی درشتی، بے باکی اور تلخی ایک قسم کا خول ہے جو اس نے اپنی نرم شخصیت کے تحفظ کی خاطر

ہمدرد ہے۔ منٹو کو لوگوں نے اکثر ہنستے ہوئے، شراب پیتے ہوئے، اپنے احباب کا مذاق اڑاتے ہوئے تسلیم شدہ حقیقتوں اور سچائیوں کو طنزیہ انداز میں جھٹلاتے ہوئے دیکھا ہے لیکن میں نے منٹو کو روتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ وہ دنیا کے دکھوں پر نہیں روتا۔ وہ اپنے دکھوں پر نہیں روتا۔ اسے عشق نہیں ہوا تھا۔ اسے کسی خطرناک بیماری کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ وہ اپنے ڈیڑھ سالہ بچے کی موت پر رو رہا تھا۔ جس وقت مجھے خبر ملی میں جلدی سے اس کے گھر دوڑا دوڑا گیا، منٹو نے اس طرح اپنی لال لال آنکھوں سے مجھے گھور کر دیکھا گویا کہہ رہا ہو، اور تم اب آئے ہو جب کہ وہ مر چکا ہے جبکہ ہم اسے دفنانے کے لئے لے جا رہے ہیں۔ اس سے پہلے تم کہاں تھے۔ تم پہلے آتے تو شاید میرا بچہ بچ جاتا...... اس کا گلا رندھا ہوا تھا اور اس کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے اور اس نے مجھ سے کہا۔ کرشن! میں موت سے نہیں ڈرتا۔ کسی کی موت سے نہیں متاثر ہوتا۔ لیکن یہ بچہ...... اس لئے نہیں کہتا ہوں کہ یہ میرا بچہ ہے اس لئے کہتا ہوں تم اسے دیکھتے ہونا...... اس وقت بھی کتنا معصوم، کتنا نیا، کتنا پیارا معلوم ہوتا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ جب کوئی نیا خیال اپنے اختتام تک پہنچنے سے پہلے ٹوٹ جاتا ہے، اس وقت کتنا بڑا سانحہ ہوتا ہے، ہر نیا بچہ ایک خیال ہے۔ یہ کیوں ٹوٹ گیا؟ ابھی میں نے اس کی جانکنی دیکھی ہے۔ میں مر جاؤں۔ تم مر جاؤ۔ بڈھے، جوان، ادھیڑ عمر کے لوگ مر جائیں۔ مرتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ بچہ، فطرت کو کسی نئے خیال کو اتنی جلدی نہ توڑنا چاہئے...... اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کے قنوطی خول کے ٹکرے ٹکرے ہو گئے تھے۔

اس کے بعد میں نے اسے روتے ہوئے نہیں دیکھا لیکن ان آنسوؤں نے مجھے منٹو کے اندر اس گہرے سمندر میں پہنچا دیا جہاں سے اس کے ادب کی تخلیق ہوتی ہے۔ اس سمندر کا رنگ گہرا، سبز و سنہرا ہے۔ اس کا پانی کھاری اور شارک مچھلیاں اور آکٹوپس اور دوسرے خطرناک سمندری جانور بھی اس کی تہہ میں چھپے ہوئے ہیں لیکن یہاں رنگارنگ دل کی شاداب چٹانیں بھی ہیں جن کے مخملیں سبزوں پر سیپ کے موتی آرام کر رہے ہیں۔ اس عجیب و غریب منظر کو میں نے صرف ایک بار دیکھا ہے۔ آپ نے وہ موتی دیکھے ہیں جو منٹو ایک غواص بن کر اپنے دل کی گہرائیوں سے نکال لاتا ہے۔ یہ اس کے خون

کی جمی ہوئی بوندیں ہیں جن پر وہ اپنے طنز اور قنوط سے جلا دے کے ایک استہزائیہ انداز میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہے۔ آپ اس کے انداز پر نہ جائیے۔ یہ سچے موتی ہیں۔ یہ ہمارے ملک کی بدقسمتی ہے کہ ہم ان کی قدر نہیں کرتے۔ کہنے کو تو ہندوستان ادب، تہذیب اور کلچر اور فنون لطیفہ کا گہوارہ رہا ہے لیکن صدیوں سے ہم نے اپنے عظیم فن کاروں سے ایسی شدید لاپروائی برتی ہے کہ اب ہمیں اپنے جرم کا احساس تک نہیں ہوتا۔ میرے سامنے سہگل کی مثال ہے۔ جب سہگل کا انتقال ہوا تو ہمارے ملک کی عظیم ترین شخصیتوں سے ایک کلمۂ تاسف بھی نہ نکلا اور یہ وہ لوگ ہیں جو دن رات اپنی تہذیب و تمدن اور کلچر کی بقا کے رونے رویا کرتے ہیں۔ لیکن ان سے کبھی پوچھئے کہ ہندوستان کے عظیم فن کار، ادیب، آرٹسٹ، مغنی، مصور کون کون سے ہیں اور آج کل کیا کر رہے ہیں تو ان کی زبان گنگ ہو جائے گی اور یہ اپنی عدیم الفرصتی کا بہانہ کر کے خاموش ہو جائیں گے۔

منٹو کو اچھے کپڑوں کا شوق نہیں۔ اسے اچھے گھر، اچھے کھانے اور اچھی شرابوں کا شوق ہے۔ اس کا گھر ہمیشہ آپ کو قرینے سے سجا ہوا ملے گا۔ وہ صاف ستھرے پاکیزہ ماحول میں کام کرنے کا عادی ہے۔ صفائی، باقاعدگی اور عمدگی اس کے مزاج کا خاصہ ہیں۔ وہ لاابالی پن، پھوہڑ پن جو اکثر ادیبوں کے گھروں میں آپ کو ملتا ہے منٹو کے ہاں نہیں ملے گا۔ منٹو کے گھر میں آپ کو کوئی بات ٹیڑھی نہیں ملے گی۔ صرف صاحب خانہ کی سوچ ٹیڑھی ہے۔ لیکن اس میں بھی ایک واضح ترتیب ہے جس کا انکشاف بالعموم افسانے کے اختتام پر ہوتا ہے۔ منٹو کے افسانے اس کے مزاج اور اس کے ماحول کے آئینہ دار ہیں۔ منٹو اپنے افسانوں کا لباس نفاست سے تیار کرتا ہے۔ اس میں کہیں جھول نہیں آتا۔ کہیں کچے ٹانکے نہیں

لوگ زندگی کو ایک اوپری، چھلتی ہوئی نظروں سے دیکھنے کے عادی ہیں وہ منٹو کے عمیق مشاہدے اور اس ژرف نگاہی کی داد دینے سے قاصر رہتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کہیں کہیں اس کی حد سے بڑھی ہوئی انا اسے دھوکا دے جاتی ہے یا ایسا ہوتا ہے کہ وہ گھاس کے کیڑوں اور آسمان میں اُڑتے ہوئے بادلوں کے درمیان زندگی اور ادب کا توازن برقرار نہیں رکھ سکتا اور انفرادی اور مزاجی روش اختیار کر لیتا ہے لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے اور اس کی بیشتر تخلیقات عظیم بشریت کے نصب العین پر پوری اُترتی ہیں اور اپنی سادگی اور سچائی اور تلخی کے اندر ایک ایسے شیریں حسن کی نمو رکھتی ہیں کہ جس کے حصول کے لئے انسان کا سینہ آج تک ترس رہا ہے۔

شروع شروع میں منٹو پر روسی تخلیقات کا نمایاں اثر تھا۔ اس میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ دنیا بھر کے ترقی پسند ادیبوں نے بلکہ ایسے ادیبوں نے بھی جو اپنے خیالات میں رجعت پسند تھے روسی ادب کی وراثت سے فائدہ اٹھایا ہے۔ لیکن تھوڑے عرصے ہی کے بعد منٹو نے اپنا طرز انشاء اختراع کر لیا جو اسی کا ہے۔ عباس، اشک، عصمت، اور کرشن چندر کے بہتیرے نقال آپ کو مل جائیں گے لیکن منٹو اور کسی حد تک بیدی کے طرز انشاء کو آج تک کوئی اپنا نہ سکا۔ اردو ادب میں ایک ہی منٹو ہے اور ایک ہی بیدی ہے۔ باقی ادیبوں کی ملتی جلتی تصویریں آپ کہیں نہ کہیں ضرور دیکھ سکتے ہیں۔ خاص طور پر جنسیات کے مسئلے پر جس بے باکانہ انداز میں منٹو نے قلم اٹھایا ہے ہمارے ادب میں اور ہندی ادب میں اور جہاں تک میں نے مرہٹی اور گجراتی، بنگالی زبانوں کے تراجم پڑھے ہیں، دوسری زبان میں بھی اس کی مثال ڈھونڈنا مشکل ہے، منٹو نے پہلے تو شرم اور شرم کے خول اکھاڑے پھر غلاظت کی تہوں کو صاف کیا اور پھر اصل موضوع کو صابن سے دھودھو کر اتنا چمکایا کہ آج ہم میں سے ہر شخص جنس کی اہمیت، اس کی پیچیدگیوں اور اس کے گوناگوں تاثرات سے بخوبی واقف نظر آتا ہے۔ اس جنسی تعلیم کیلئے ہم بڑی حد تک منٹو کے معترف ہیں۔ یہ تعلیم اس نے اپنی جوانی اور اپنی صحت کو کھو کے ہمیں دی ہے۔ بمبئی کی چالیں، بمبئی کے شراب خانے، بمبئی کے قمار خانے، بمبئی کے قحبہ خانے...... منٹو نے بمبئی کی جرائم پیشہ دنیا کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا ہے۔ سچائی کی تلاش میں وہ اس کیچڑ کے اندر گھٹنوں گھٹنوں دھنس گیا۔ اس کے کپڑے ضرور آلودہ ہو گئے لیکن اس کی روح کبھی میلی نہیں ہوئی۔ اس کے افسانوں کے اندر چھپا چھپا کرب اس کا گواہ ہے۔ وہ عورت کی عزت کا، اس کی عصمت کا اور اس کے گھریلو پن کا جس قدر قائل ہے کوئی دوسرا مشکل

سے ہوگا۔اس لئے جب وہ عورت کی عزت کو جاتے ہوئے دیکھتا ہے،اسے اپنا ناموس کھوتے ہوئے دیکھتا ہے۔اس کے گھریلو پن کو مٹتے ہوئے دیکھتا ہے تو وہ بے قرار ہو جاتا ہے اور بے تاب ہوکر جاننا چاہتا ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ایسا کیوں وتا ہے؟ اور جب وہ ہر بار اپنے مشاہدے کو بروئے کار لاکر ایک ہی تسلسل کو ایک ہی ترتیب کو سماج کے ایک ہی نظام کو دیکھتا ہے تو غصے میں آکر اسے تھپڑ مارنا چاہتا ہے۔منٹو اپیل کا قائل نہیں۔وہ ڈرانے اور تھپڑ مارنے کا قائل ہے۔اس کے ہر افسانے کے آخر میں ایک طمانچہ ہوتا ہے جو پڑھنے والے کے منہ پر اس طرح پڑتا ہے کہ قاری بھنا کے رہ جاتا ہے اور منٹو کو صلواتیں سنانے لگتا ہے لیکن منٹو اس طمانچے سے باز نہیں آتا۔کبھی نہیں آئے گا۔جسے بہت سے نقاد منٹو کی اذیت پسندی کہتے ہیں۔وہ اس کی اذیت پسندی اس قدر نہیں ہے بلکہ اس کی زخمی انسانیت کی ایک بدلی ہوئی صورت ہے اور یہی چیز آپ کو منٹو کے اطوار و گفتار، اس کے تخلیقات، اس کے قول و فعل میں ہر جگہ دکھائی دے گی۔منٹو کی زندگی کی بہت سی باتیں ہیں جو اس کی زندگی میں نہیں کہی جاسکتیں اور اس لئے لکھی بھی نہیں جاسکتیں۔لیکن ایک واقعہ میں یہاں لکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔

یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب میں شالیمار پکچرز، پونا میں ملازم تھا اور بمبئی میں ترقی پسند ادیبوں کی کانفرنس میں شرکت کرنے کی غرض سے آیا تھا۔اچانک میری ملاقات منٹو سے ریل گاڑی میں ہوگئی۔ کوئی [illegible]

کی اُپج اوراس کی فنی استعداد کی دلیل نہیں ہے۔اس کے جوہر کا غالب حصّہ انسانی حسن، انسانی ہمدردی اورانسانیت کو بہتر بنانے کی آرزو کی غمازی کرتا ہے اور یہی اس کے ادب کے گہرے نقوش ہیں۔

☆☆☆

عصمت چغتائی

منٹو میرا دوست، میرا دشمن!

اڈلفی چیمبر کی چوبی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے مجھے گھبراہٹ سی ہو رہی تھی۔ جیسی کبھی امتحان کے ہال میں داخل ہونے سے پہلے ہوا کرتی تھی۔ مجھے ویسے ہی نئے آدمیوں سے ملتے گھبراہٹ ہوا کرتی تھی۔ لیکن یہاں تو وہ ''نیا آدمی'' منٹو تھا۔ جس سے پہلی بار ملنے جا رہی تھی۔ میری گھبراہٹ وحشت کی حدوں کو چھونے لگی۔ میں نے شاہد سے کہا ''چلو واپس چلیں، شاید منٹو گھر پر نہ ہو۔'' مگر شاہد نے میری اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔

''وہ شام کو گھر ہی پر رہتا ہے۔ کیونکہ وہ شام کو روز پیتا ہے۔''

یہ لیجئے میرے پر سو دُرّے۔ ایک تو منٹو، اور وہ بھی پیتا ہوا منٹو۔ مگر میں نے جی کڑا کر لیا۔ ایسا بھی سوچا۔ مجھے کھا تو نہیں جائے گا! ہونے دو جو اس کی زبان کی نوک پر ڈنک ہے۔ میں بلبلہ تو ہوں نہیں جو پھونک ماری تو بیٹھ جاؤں گی۔ چر چراتی گرد آلود سیڑھیاں طے کر کے ہم منزل پر پہنچے۔ فلیٹ کا دروازہ نیم وا تھا۔ ڈرائنگ روم نما کمرے میں ایک کونے میں صوفہ سیٹ پڑا تھا۔ دوسری طرف ایک بڑا سا سفید اور صاف پلنگ پڑا تھا۔ کھڑکی سے ملی ہوئی ایک لدی پھندی بڑی میز کے سامنے ایک بڑی سی کرسی میں ایک

ہنستے ہوئے کہا۔

''اور میں سمجھتی تھی آپ نہایت دبنگ قسم کے گلہیر چنگھاڑتے ہوئے پنجابی ہو گے۔''

میں نے سوچا رسید دیتے چلو کہیں یہ ایک دم ہاپٹے پر نہ لے لے۔

اور دوسرے لمحہ ہم دونوں پوری تندہی سے جٹ کر بحث کرنے لگے کہ جیسے اتنے عرصے ایک دوسرے سے ناواقف رہ کر ہم نے بڑا گھاٹا اُٹھایا ہو اور اسے پورا کرنا ہو۔ دو تین بار بات اُلجھ گئی لیکن ذرا سا تکلف باقی تھا، لہٰذا دوسری ملاقات کے لئے اٹھا رکھی۔ کئی گھنٹے ہمارے جبڑے مشینوں کی طرح مختلف موضوعات پر جملے کترتے رہے اور میں نے جلد ہی معلوم کیا کہ میری طرح منٹو بھی بات کاٹنے کا عادی ہے۔ پوری بات سننے سے پہلے ہی بول اٹھتا ہے اور جو رہا سہا تکلف تھا وہ بھی غائب ہو گیا۔ باتوں نے بحث اور بحث نے باقاعدہ نوک جھونک کی صورت اختیار کر لی اور صرف چند گھنٹوں کی جان پہچان کے بل بوتے پر ہم نے ایک دوسرے کو نہایت ادبی قسم کے لفظوں میں احمق، جھکّی اور کج بحث کہہ ڈالا۔

گھمسان کے بیچ میں، میں نے ایک بار کنارے ہو کر غور سے دیکھا۔ موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے لپکتی ہوئی بڑی بڑی سیاہ پتلیوں والی آنکھیں، جنہیں دیکھ کر مجھے بے ساختہ مور کے پر یاد آ گئے۔ مور کے پر اور آنکھوں کا کیا جوڑ؟ یہ مجھے کبھی نہ معلوم ہو سکا مگر جب بھی میں نے ان آنکھوں کو دیکھا مجھے مور کے پر یاد آ گئے۔ شاید رعونت اور گستاخی کے ساتھ ساتھ ان میں بیساختہ شگفتگی مجھے مور کے پروں کی یاد دلاتی تھی، ان آنکھوں کو دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ انہیں تو میں نے کہیں دیکھا ہے۔ بہت قریب سے دیکھا ہے۔ قہقہہ لگاتے، سنجیدگی سے مسکراتے، طنز کے نشتر برساتے اور پھر نزع کے عالم میں پتھراتے! وہی نازک نازک ہاتھ پیر، سر پر ٹوکرا بھر بال، پچکے زرد زرد گال اور کچھ بے تکے سے دانت۔ پیتے پیتے اچانک منٹو کو اچھو لگا اور وہ کھانسنے لگا میرا ماتھا ٹھنکا۔ یہ کھانسی تو جانی پہچانی سی تھی۔ اسے تو میں نے بچپن سے سنا تھا۔ مجھے کوفت ہونے لگی۔ نہ جانے کس بات پر میں نے کہا۔

''یہ بالکل غلط۔'' اور ہم باقاعدہ لڑ پڑے۔

''آپ کج بحثی کر رہی ہیں۔''

''حماقت ہے یہ۔''

دھاندلی ہے۔ عصمت بہن۔''

''آپ مجھے بہن کیوں کہہ رہے ہیں۔'' میں نے چڑ کر کہا۔

''بس یونہی، عموماً میں عورتوں کو بہن کم کہتا ہوں۔ میں اپنی بہن کو بھی بہن نہیں کہتا۔''

''تو پھر مجھے چڑانے کو کہہ رہے ہیں؟''

''نہیں تو، وہ کیسے جانا آپ نے؟''

''اس لئے کہ میرے بھائی مجھے ہمیشہ جلاتے، چڑاتے اور مارتے پیٹتے رہے یا پکڑ کر پٹواتے رہے۔'' منٹو زور سے ہنسا۔

'تب تو میں ضرور آپ کو بہن ہی کہوں گا۔''

''تو اتنا یاد رکھئے کہ میرے بارے میں میرے بھائیوں کے خیالات بھی کچھ خوش گوار نہیں ہیں۔ یہ آپ کو کھانسی ہے اس کا علاج کیوں نہیں کرتے؟''

''علاج؟ ڈاکٹر گدھے ہوتے ہیں۔ تین سال ہوئے ڈاکٹروں نے کہا تھا سال بھر میں مر جاؤ گے، تمہیں ٹی۔ بی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ میں نے نہ مر کر ان کی پیشین گوئی کو سچا ثابت نہ ہونے دیا۔ اور اب تو بس میں ڈاکٹروں کو احمق سمجھتا ہوں۔ ان سے تو مسمریزم اور جادو کرنے والے زیادہ عقلمند ہوتے ہیں۔''

''یہی آپ سے پہلے ایک بزرگ فرمایا کرتے تھے۔''

''کون بزرگ؟''

''میرے بھائی، عظیم بیگ، نُومن مٹی کے نیچے آرام فرما رہے ہیں۔''

تھوڑی دیر ہم عظیم بیگ کے فن پر بحث کرتے رہے۔ آئے تھے صرف ملاقات کرنے لیکن باتوں میں رات کے گیارہ بج گئے۔ شاہد، جو ہماری جھڑپیں الگ تھلگ بیٹھے دیکھ رہے تھے، بھوک سے تنگ آ چکے تھے۔ ملاڈ پہنچتے پہنچتے ایک بج جائے گا لہٰذا کھانا کھا ہی لیا جائے۔ منٹو نے مجھ سے الماری سے پلیٹیں اور چمچے نکالنے کو کہا اور خود ہوٹل سے روٹی لینے چلا گیا۔

''ذرا اس برنی سے آچار نکال لیجئے''۔ منٹو نے تیزی سے میز پر کھانا لگایا اور کرسی پر اُکڑوں بیٹھے۔ وہی میز جو دم بھر پہلے ادبی کارگزاریوں کا میدان بنی ہوئی تھی ایک دم کھانے کی میز کی خدمات انجام دینے لگی اور بغیر کسی سے ''پہلے آپ'' کہے ہم لوگوں نے کھانا شروع کر دیا، جیسے برسوں سے اسی طرح کھانے کے عادی ہوں۔

کھانے کے بیچ میں گرما گرم مباحثہ چلتا رہا، منٹو گھوم پھر کر ''لحاف'' کے بخیے ادھیڑنے لگتا، جوان

گھسیٹ ڈالا۔ اُسے بڑا دھکا لگا یہ سن کر کہ مجھے ''لحاف'' لکھنے پر افسوس ہے۔ خوب جلی کٹی سنا ڈالیں اور مجھے نہایت بزدل اور کم نظر کہہ ڈالا۔ میں ''لحاف'' کو اپنا شاہکار ماننے پر تیار نہیں تھی اور منٹو مصر تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ''لحاف'' سے بھی بڑھ چڑھ کے ہم نے بحث کر ڈالی، نہایت کھل کر۔ اور مجھے تعجب ہوا کہ منٹو گندی سے گندی اور بیہودہ بات دھڑ سے اس معقولیت اور بھول پن سے کہہ جاتا ہے کہ ذرا جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ یا وہ مہلت دیتا ہی نہیں۔ اس کی باتوں پر ہنسی آجاتی ہے گھن یا غصہ نہیں آتا۔

چلتے وقت اس نے پھر صفیہ کا ذکر کیا۔ اتنی دیر ہم بیٹھے رہے اور منٹو کو صفیہ کی یاد نے کئی بار ستایا۔

''صفیہ بہت اچھی لڑکی ہے۔''

''صفیہ بہت عمدہ سالن پکاتی ہے۔''

''آپ اس سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔''

''بہت یاد آرہی ہے۔ تو اسے بلا کیوں نہیں لیتے۔'' میں نے کہا۔

''ارے...... کیا سمجھتی ہیں اس کے بغیر سو نہیں سکتا۔'' وہ اپنی اصلیت پر اترنے لگا۔

''نیند تو سولی پر بھی آجاتی ہے۔'' میں نے بات ٹالی اور وہ ہنس پڑا۔

''آپ کو صفیہ سے بہت محبت ہے؟'' میں نے راز داری کے انداز میں پوچھا۔

''محبت؟'' وہ چیخ پڑا جیسے میں نے اُسے گالی دی ہو۔ ''مجھے اس سے قطعی محبت نہیں۔'' اس نے کڑوا منہ بنا کر بڑی بڑی پتلیاں گھمائیں۔ ''میں محبت کا قائل نہیں۔''

''ارے آپ نے کبھی کسی سے محبت ہی نہیں کی؟'' میں نے مصنوعی حیرت سے کہا۔

''نہیں''۔

''اور آپ کے کبھی گلسوئے بھی نہیں نکلے۔ خسرہ بھی نہیں ہوئی۔ مگر کالی کھانسی تو ضرور ہوئی ہوگی۔'' وہ ہنس پڑا۔

''محبت سے آپ کا کیا مطلب ہے۔ محبت تو ایک بڑی لمبی چوڑی چیز ہے۔ محبت ماں سے بھی ہوتی ہے، بہن اور بیٹی سے بھی...... بیوی سے بھی محبت ہوتی ہے۔ چپلوں اور بوٹ جوتے سے بھی محبت ہوتی ہے۔ میرے ایک دوست کو اپنی کتیا سے محبت ہے۔ ہاں مجھے اپنے بیٹے سے محبت تھی۔'' وہ بیٹے کے

''آپ یقین کیجئے چھ سات دن کا تھا کہ میں اُسے اپنے پاس سلانے لگا۔ میں اسے خود تیل مل کر نہلاتا۔ تین مہینے کا بھی نہیں تھا کہ ٹھٹھا مار کر ہنسنے لگا۔ بس صفیہ کو کچھ نہیں کرنا پڑتا تھا۔ دودھ پلانے کے سوا اس کا کوئی کام نہ کرتی، رات کو بس پڑی سوئی رہتی۔ میں چپ چاپ بچے کو دودھ پلوالیتا، اسے خبر بھی نہ ہوتی۔ بچے کو دودھ پلوانے سے پہلے یوڈی کلون یا اسپرٹ سے صاف کر لینا چاہئے۔ نہیں تو بچے کے منہ میں دانے ہو جاتے ہیں۔'' وہ بڑی سنجیدگی سے بولا اور میں حیرت سے اسے دیکھتی رہی کہ یہ کیسا مرد وا ہے جو بچے پالنے میں مشاق ہے۔

''مگر وہ مرگیا''۔ منٹو نے مصنوعی مسرّت چہرہ پر لاکر کہا۔ ''اچھا ہوا جی وہ مرگیا۔ مجھے تو اُس نے آیا بنا ڈالا تھا۔ اگر وہ زندہ رہتا تو آج اس کے پوتڑے دھوتا۔ نکما ہو کر رہ جاتا۔ مجھ سے کوئی کام تھوڑا ہوتا۔ سچ مچ عصمت بہن مجھے اس سے عشق تھا۔''

چلتے چلتے اس نے پھر کہا کہ ''صفیہ آنے والی ہے بس جی خوش ہو جائے گا، آپ کا اس سے مل کر۔''

اور واقعی صفیہ سے مل کر میرا جی خوش ہو گیا۔ منٹوں میں ہماری اتنی گھٹ گئی کہ سر جوڑ کر پوشیدہ باتیں بھی ہونے لگیں، جو صرف عورتیں ہی کہتی ہیں جو مردوں کے کانوں کے لئے نہیں ہوتیں۔

مجھے اور صفیہ کو یوں سر جوڑے کھسر پھسر کرتے دیکھ کر منٹو جل گیا اور طعنے دینے لگا۔ اُس نے پچھلے کمرے کی چوبی دیوار سے کان لگا کر ہماری ساری سرگوشیاں سن لی تھیں وہ شریر بچوں کی طرح بولا۔

''توبہ توبہ میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ عورتیں بھی اتنی گندی گندی باتیں کرتی ہیں۔''

''صفیہ کے شرم سے کان لال ہو گئے۔''

''اور آپ سے تو عصمت بہن مجھے قطعی اُمید نہ تھی کہ یوں محلّے کی جاہل عورتوں کی طرح باتیں کریں گی۔ کب شادی ہوئی، شادی کی رات کیسی گزری۔ بچہ کب اور کیسے پیدا ہوا توبہ ہے۔'' وہ چڑانے لگا۔

میں نے فوراً گام لگائی۔ ''حد ہے منٹو صاحب! میں آپ کو اتنا تنگ نظر نہ سمجھتی تھی۔ ارے آپ بھی ان باتوں کو گندی کہتے ہیں۔ ان میں گندگی کیا ہے۔ بچہ کی پیدائش دنیا کا حسین ترین حادثہ ہے اور یہ کانا

سے سخت خفا ہے۔ آپ کا جی نہیں گھبراتا اس سے گھنٹوں باتیں کر کے کہ قورمے میں کتنی ہلدی، اُردکی دال کے دہی بڑے......''

''اے منٹو صاحب قورمے میں ہلدی کہاں پڑتی ہے۔''صفیہ نے ہیبت زدہ ہوکر کہا۔

اور منٹو لڑ پڑا۔ وہ بضد تھا کہ ہلدی ہر کھانے میں پڑنی چاہئے اور جو نہیں پڑتی تو یہ سراسر ظلم اور ناانصافی ہے۔''میرا ایک راجپوت دوست تھا۔ وہ گھی اور ہلدی پی کر جاڑوں میں کسرت کیا کرتا تھا۔ پورا پہلوان تھا۔'''' اور ہم مصر تھے کہ آپ کا دوست گھی اور ہلدی چھوڑ کر کیچڑ پیتا تھا۔ ہم کسی شرط پر ہلدی ڈالنے کو تیار نہیں اور منٹو کو قائل ہونا پڑا۔

میں اور منٹو اگر پانچ منٹ کے ارادہ سے بھی ملتے تو پانچ گھنٹے کا پروگرام ہو جاتا۔ منٹو سے بحث کر کے ایسا معلوم ہوتا جیسے ذہنی قوتوں پر دھار رکھی جا رہی ہے۔ جالا صاف ہو رہا ہے، دماغ میں جھاڑو سی دی جا رہی ہے۔ اور بعض اوقات بحثیں اتنی طویل اور گھن دار ہو جاتیں کہ ایسا معلوم ہوتا بہت سے کچے سوت کی پونیاں اُلجھ گئی ہیں اور واقعی سوچنے اور سمجھنے کی قوت پر جھاڑو پھر گئی۔ مگر دونوں بکتے جاتے، اُلجھے جاتے، بدمزگی پیدا ہونے لگتی۔ مجھے تو اپنی شکست کو چھپانے کا ملکہ تھا۔ مگر منٹو بالکل روہانسا ہو جاتا۔ آنکھیں مور پنکھوں کی طرح تن کر پھیل جاتیں۔ نتھنے پھڑکنے لگتے، منہ کڑوا کسیلا ہو جاتا اور وہ جھنجھلا کر اپنی حمایت میں شاہد کو پکارتا۔ اور جنگ، ادب یا فلسفہ سے پلٹ کر گھریلو صورت اختیار کر لیتی۔ منٹو بھنا کر چلا جاتا۔ شاہد مجھ سے لڑتے کہ''تم میرے دوستوں سے اتنی بدتمیزی سے کیوں باتیں کرتی ہو۔ منٹو آج خفا ہو کر گیا ہے۔ اب وہ ہمارے ہاں نہیں آئے گا اور نہ میری ہمت ہے کہ اس کے ہاں جاؤں، وہ بدتمیز آدمی ہے۔ کچھ کہہ بیٹھے گا تو میری اُس کی پرانی دوستی ختم ہو جائے گی۔''

اور مجھے بھی کبھی محسوس ہوتا کہ واقعی میں نے منٹو کو کڑوی بات کہہ دی۔ ممکن ہے روٹھ جائے اور ہماری اور صفیہ کی دوستی بھی ختم ہو جائے۔ جواب منٹو سے زیادہ گہری اور پائیدار ہو گئی تھی۔ منٹو کی خودداری

رعونت کی سرحدوں کو پہنچی ہوئی تھی۔ وہ اپنے دوستوں پر رعب جمانے کا بڑا شوقین تھا۔ اور اگر ان دوستوں کے سامنے، جن کو وہ مرعوب کر چکا ہو، کوئی اُس کا مذاق بنادے تو وہ بُری طرح چڑ جایا کرتا تھا، اُس کا خیال تھا کہ ویسے وہ اور میں تو پلے کے ہیں ایک دوسرے کو کہہ سن سکتے ہیں مگر ''عام لوگوں'' کے سامنے ایک دوسرے پر چوٹیں نہ کرنی چاہئیں۔ وہ زیادہ تر اپنے ملنے والوں کی ذہنی سطح کو اپنے سے نیچا سمجھتا تھا۔

لیکن صبح لڑائی ہوتی اور اتفاق سے شام کو پھر ملاقات ہو جاتی تو وہ اس قدر جوش سے ملتا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو اور ویسے ہی گھل مل کر باتیں ہوتیں۔ تھوڑی دیر ہم ایک دوسرے سے بڑی اور ضرورت سے زیادہ نرمی سے بولتے۔ ہر بات پر ہاں میں ہاں ملاتے۔ مگر میرا جلد ہی اس تصنع سے دل اکتا جاتا اور اس کا بھی۔ اور پھر چلنے لگتی دونوں طرف سے آتش بازی۔ اور گولیوں کی سی تندی آ جاتی۔ کبھی لوگ ہم دونوں کو یوں اُلجھا دیکھ کر مزہ لینے لگتے اور ہم پھر جل کر ایک دوسرے سے مل جاتے۔ ہم بحث کرتے تھے اپنی دلچسپی کے لئے نہ کہ ان کے لیے بیٹر بن کر لطف پیدا کرتے۔ منٹو کی یہی رائے تھی کہ گھر پر چاہے جتنی اُلٹی سیدھی بحث کر لیں مگر محفلوں میں ہمیں مورچہ بنا کر جانا چاہئے اور ہمارا مورچہ اتنا مضبوط ہوگا کہ لوگوں کے چھکے چھڑا دے گا۔ مگر مجھے عموماً مورچہ سے اپنی وفاداری کا احساس نہ رہتا اور مورچہ بھڑوں کے چھتے کی طرح بھنکارنے لگتا۔

یہ مجھے کبھی نہ معلوم ہو سکا کہ منٹو پی کر بہکتا ہے یا بہک کر پیتا ہے۔ میں نے اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ یا زبان میں لکنت نہ پائی۔ مجھے تو کبھی کوئی فرق ہی نہیں محسوس ہوا۔ ہاں بس اتنا معلوم ہوتا تھا کہ جب زیادہ پئے ہو تو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا تھا کہ وہ بالکل نشہ میں نہیں اور جان کو آ جاتا تھا۔

''میں آپ سے سچ کہتا ہوں عصمت بہن، میں بالکل نشہ میں نہیں اور میں آج پینا چھوڑ سکتا ہوں۔ میں جب چاہوں پینا چھوڑ دوں، آپ شرط لگائیے۔''

''میں شرط نہیں لگاؤں گی کیونکہ آپ ہار جائیں گے۔ آپ پینا نہیں چھوڑ سکتے......اور آپ نشے میں ہیں۔''

کیسا کیسا منٹو ثبوت دیتا کہ وہ نشے میں نہیں اور اسی وقت پینا چھوڑ سکتا ہے۔ صرف شرط لگانے کی دیر ہے۔ ایک دن تنگ آ کر مجھے شرط لگانی پڑی اور منٹو شرط ہار گیا۔ میں جیت گئی۔ مگر کیا؟ شرط تو لگی تھی لیکن کوئی رقم مقرر نہ ہوئی تھی۔ اس کے بعد جب منٹو کو بہت چڑھتی اور وہ شرط لگانے پر اڑ جاتا اور

اس وقت میرے اور اپنے سوا دنیا میں کسی کو ادیب نہ مانتا۔ خاص طور پر کرشن چندر اور دیوندر ستیارتھی کے خلاف ہو جاتا۔ اگر ان کی تعریف کرو تو سلگ اٹھتا۔ میں کہتی آپ کوئی تنقید نگار تو ہیں نہیں جو آپ کی بات مانی جائے اور وہ تنقید نگاروں کو جلی کٹی سنانے لگتا۔ ایک سرے سے ان کے وجود کو ہی سم قاتل سمجھتا خاص طور پر ادب کے لئے۔

''بکواس کرتے ہیں یہ لوگ''۔ وہ جل کر کہتا۔ ''جو یہ کہتے جائیں بس اس کا الٹا کرتے جاؤ، یہی لوگ جو اعتراض کرتے ہیں چھپ چھپ کر میری کہانیاں پڑھتے ہیں اور ان سے کچھ سیکھنے کے بجائے لطف اندوز ہوتے ہیں اور پھر اس لطف کی یاد پر نادم ہو کر اول فول لکھتے ہیں''۔ وہ کبھی اتنا چڑ جاتا کہ میں اسے تسلی دینے کو کہتی ''جب آپ کو یقین ہے کہ یہ اول فول لکھتے ہیں تو آپ ان کا جواب کیوں دینے لگتے ہیں۔ اگر تنقید سے آپ کو مدد نہیں ملتی تو نہ کیجئے مگر رائے عامہ کو تو مطعون نہ کیجئے۔ مگر وہ بھنا تا رہتا۔

ایک دن بڑی سنجیدہ صورت بنائے آئے اور کہنے لگے۔

''مقدمہ دائر کریں گے۔''

میں نے کہا ''کون''۔

کہنے لگے۔ ''ہم یعنی میں اور آپ۔ اُس مردود نے میری اور آپ کی کہانی ایک مجموعہ میں یہ لکھ کر چھاپی ہے کہ یہ فحش ہے۔ ایسے ادب سے مُلک کو بچانا چاہئے۔ اب اس کمبخت سے پوچھو کہ کیسی الٹی بات کر رہا ہے۔ ایک تو وہ اسے کتاب میں چھاپ کر مشتہر کر رہا ہے۔ دوسرے پیسے کمانے کا الگ انتظام کر رہا ہے۔ اس نے ہماری اجازت کے بغیر کیوں کہانیاں چھاپی ہیں، اسے نوٹس دلوا رہا ہوں کہ ہرجانہ دے۔'' پھر نہ جانے بھول بھال گئے۔

منٹو اپنی ڈینگوں سے زیادہ میرے سامنے اپنے دوستوں کی شیخی بگھارا کرتا تھا۔ رفیق غزنوی سے کچھ عجب قسم کی محبت تھی جو سمجھ میں نہ آئی۔ جب اس کا تذکرہ کیا، یہی کہا ''بڑا بدمعاش لفنگا ہے۔ ایک ایک کر کے چار بہنوں سے شادی کر چکا ہے۔ لاہور کی کوئی رنڈی ایسی نہیں جس کی اس نے اپنے جوتے پر ناک نہ گھسوالی ہو۔''

بالکل رفیق کا ایسے ذکر کرتا جیسے بچے بڑے بھیا کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کے عشقوں کے قصے تفصیلوں سے سنایا کرتا۔ ایک دن مجھے اس سے ملانے کو کہا۔ میں نے کہا ''کیا کروں گی مل کر، آپ تو کہتے ہیں لفنگا ہے وہ''۔

کہنے لگے ''ارے جب ہی تو ملا رہا ہوں۔ یہ آپ سے کس نے کہا کہ لفنگا اور بدمعاش برا آدمی ہوتا ہے۔ رفیق نہایت شریف آدمی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''منٹو صاحب لفنگا، شریف، بدمعاش یہ آخر کیسا آدمی ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ مجھے جتنا ذہین اور تجربہ کار سمجھتے ہیں شاید ویسی نہیں۔''

''آپ بنتی ہیں۔'' منٹو نے برا مان کر کہا۔ ''جبھی تو آپ کو رفیق سے ملانا چاہتا ہوں۔ بڑا دلچسپ آدمی ہے۔ کوئی عورت بغیر عاشق ہوئے نہیں رہ سکتی۔''

''میں بھی تو عورت ہوں۔'' میں نے فکرمند بن کر کہا۔ اور وہ کھسیانہ ہو گیا۔

''میں آپ کو اپنی بہن سمجھتا ہوں۔''

''مگر آپ کی بہن بھی تو عورت ہو سکتی ہے۔'' منٹو نے قہقہہ لگایا۔

''ہو سکتی ہے! یہ خوب کہا'' مگر منٹو کو ضد ہو گئی۔ آپ کو اس سے ملنا پڑے گا، دیکھئے تو سہی۔

''میں اسے اسٹیشن پر دیکھ چکی ہوں۔ آپ نے میرے ایسے کان بھر دیئے تھے کہ میں بھاگ آئی کہ کہیں کمبخت پر عاشق نہ ہونا پڑے۔''

اور رفیق سے ملنے کے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ منٹو کا مطالعہ کتنا گہرا ہے۔ باوجود دُنیا کے ساتوں عیب کرنے کے رفیق میں وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جو ایک مہذّب انسان میں ہونا چاہئیں۔ وہ ایک عجیب بدمعاش ہو سکتا ہے۔ ساتھ ہی نہایت ایمان دار اور شریف بھی۔ کیسے اور کیوں؟ یہ میں نے سمجھنے کی کوشش نہ کی۔ یہ منٹو کا میدان ہے۔ وہ دنیا کی ٹھکرائی گھورے پہ پھینکی ہوئی غلاظت میں سے موتی چُن کر نکال لاتا ہے۔ گھورا کریدنے کا اسے شوق ہے، کیونکہ دنیا کے سنوارنے والوں پر اسے بھروسہ نہیں۔ ان کی عقل اور فیصلہ پہ بھروسہ نہیں۔ وہ ان کی شریف اور پاکباز بیویوں کے دل کے چور پکڑ لیتا ہے اور کوٹھے میں رہنے والی رنڈی کے دل کے تقدّس سے اس کا موازنہ کرتا ہے۔ عطر میں ڈوبی ہوئی عیش پسند دلہن سے میل اور پسینے میں سڑتی ہوئی گھاٹن زیادہ خوشبودار معلوم ہوتی ہے۔ ''بو'' میں حالانکہ جسم ہی جسم

ہے۔ غور سے دیکھئے تو جسم کے اندر روح بھی ہے۔ عیش پرست طبقہ کی پھٹے ہوئے دودھ کی طرح پھٹکیوں دار روح اور کچلے ہوئے طبقے کی تصنع سے دور اصلیت۔ اگر طبقاتی تفریق کا سوال نہیں تو ہم اسے قطعی طور پر جسمانی سوال بھی نہیں کہہ سکتے۔ منٹو کے ذہن میں ضرور دو طبقوں کے فرق کا خیال تھا اور وہ اُس بُت کو، جس کی دنیا پوجا کرے، زمین پر پٹخنے میں بڑی بہادری محسوس کرتا تھا۔

وہ ہمیشہ اپنے بدمعاش دوستوں کے کارنامے فخریہ سنایا کرتا۔ ایک دن میں نے جلانے کو کہہ دیا ''یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ اصل میں نہ ہزاروں رنڈیوں سے ان کا تعلق اور نہ ہی انھوں نے کبھی کسی عورت کی آبروریزی کی۔'' اور وہ طرح طرح سے مجھے یقین دلانے لگا کہ یہ لوگ واقعی بدمعاشیاں کرتے ہیں، اتنی ہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

''سب جھوٹ!'' میں دھاندلی کرنے لگی۔

''ارے آپ کو یقین کیوں نہیں آتا۔ بازار میں جو چاہے جا سکتا ہے۔''

''مگر ان لوگوں کی اتنی ہمت نہیں جو طوائفوں کے کوٹھوں پر جا سکیں۔ بہت کرتے ہوں گے گانا سن کر چلے آتے ہوں گے۔''

''مگر میں خود گیا ہوں رنڈی کے کوٹھے پر۔''

''گانا سننے۔'' میں نے چڑایا۔

''جی نہیں، اپنے دام وصول کرنے اور ہمیشہ میرے دام وصول ہوگئے۔'' پھر بھی میں نے کہا۔

''میں نہیں یقین کرتی۔''

''وہ کیوں؟'' وہ اٹھ کر بالکل میرے سامنے قالین پر اکڑوں بیٹھ گیا۔

''بس میری مرضی۔ آپ میرے اوپر رعب ڈالنا چاہتے ہیں۔''

''بھئی خدا کی قسم، میں کہتا ہوں میں گیا ہوں۔''

''خدا پر آپ کو یقین نہیں بیکار اُسے نہ گھسیٹئے۔''

''اپنے مرحوم بچّے کی قسم کھاتا ہوں میں ایک نہیں بلکہ......''

''مرحوم بچّے کو اب آپ جھوٹی قسم کھا کر کیا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔''

اور منٹو وہیں پھسکڑا مار کر بیٹھ گیا کہ آج تو منوا کر رہوں گا کہ میں رنڈی باز ہوں۔ صفیہ کی گواہی

صفیہ چپ سی ہوگئی۔ "اب یہ تو میں نہیں کہہ سکتی کہ سلام کر کے آگئے یا......" وہ عجب گومگو میں رہ گئی۔

منٹو نے جوش میں کچھ زیادہ تیزی سے پی ڈالی اور بُری طرح لڑنے لگا کہ یہ تو آج منوا کر چھوڑوں گا کہ میں پکا رنڈی باز ہوں اور میں نے کہہ دیا آج اِدھر کی دُنیا اُدھر ہو جائے میں مان کے دوں گی نہیں۔

ایک تو نشہ دوسرے منٹو کے مزاج کی جبلّی تلخی۔ اگر بس چلتا تو میرا منہ نوچ لیتا۔

صفیہ نے بسور کر کہا "بہن مان جاؤ۔" شاہد نے کہا "بس اب گھر چلو۔" منٹو نے شاہد کی ٹانگ لینی شروع کی۔ اور کہہ دیا کہ بغیر قائل ہوئے جانے نہیں دوں گا۔ خاصا ہنگامہ ہو گیا۔

بڑی سنجیدگی سے منٹو نے شاہد سے کہا "چلو رنڈی کے یہاں ابھی اسی وقت، آج میں قائل نہ کردوں تو میں نے ماں کا دودھ نہیں سُور کا دودھ پیا۔" مگر میں نے اور چڑایا۔

"آپ جائیں وائیں گے نہیں یونہی بانکا برج پر گھوم کر آجائیں گے اور ہم یقین نہیں کریں گے کیا فائدہ۔"

اب تو منٹو کے سر میں لگی تو ایڑی میں جا کر شاید ہی بجھی ہو۔ غصہ ضبط کر کے پوچھا۔

"پھر کیسے یقین دلایا جائے۔"

میں نے کہا۔ "ہمیں یعنی مجھے اور صفیہ کو بھی ساتھ لے چلئے۔"

"میں نہیں جاؤں گی۔" صفیہ بگڑی۔ "تمہارا تو دماغ خراب ہوا ہے۔ تم ہی جاؤ۔"

"جائے گی کیسے نہیں۔" منٹو غرّایا۔

"چلو چلو".......صفیہ کو ہم نے آنکھ ماری اور چاروں چلے۔ دروازے سے ہم دونوں تو نکل آئے۔

منٹو کو صفیہ نے نہ جانے کیسے قابو میں کیا۔ دوسری دفعہ جب ملاقات ہوئی تو منٹو نے خوب قہقہے لگائے اور پھر چپکے سے کہا "مگر اب تو مان جاؤ۔"

میں نے کہا "قطعی نہیں۔"

مجھے نہیں معلوم منٹو کو تجربہ تھا جو اس نے رنڈی کے بارے میں لکھا، وہ اس کے اپنے اصول اور

یقین کی بنا پر ہے کیونکہ اگر وہ رنڈی کے کوٹھے پر گیا بھی ہوگا تو وہاں رنڈی سے زیادہ اس نے ایک عورت کا دل دیکھا ہوگا جو باوجود یہ کہ موری کا کیڑا ہے مگر زندگی کی قدروں کو پیار کرتی ہے۔ اچھے اور بُرے کو ناپنے کے جو پیمانے عام طور پر بنا دیے گئے ہیں وہ انہیں توڑ پھوڑ کر اپنی بنائی ہوئی تول سے ان کا اندازہ لگاتا تھا، خوشیا جیسے ڈھیٹ اور نکمے انسان کی رگ حمیت بھی پھڑک سکتی ہے، ''گوپی ناتھ'' جیسا رقیق انسان بھی دیوتاؤں پر بازی لے جا سکتا ہے۔ بلند و مہان دیوتا بھی سرنگوں ہو سکتے ہیں۔ قومی رضا کار بدکار بھی ہو سکتے ہیں اور لاش سے زنا کرنے والا خود لاش بھی بن سکتا ہے۔

کبھی کبھی میرا اور منٹو کا جھگڑا اتنا سخت ہو جاتا کہ ڈور ٹوٹتی معلوم ہوتی۔ ایک دن کسی بات پر ایسا چڑا کہ آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ دانت پیس کر بولا۔

''آپ عورت ہیں ورنہ ایسی بات کہتا کہ دانت کھٹے ہو جاتے۔''

''اب جانے بھی دیجیے کوئی مرد ہوتا تو بتاتے۔''

''بتا بھی دیجیے۔ ایسے کون کون سے تیر ترکش میں باقی رہ گئے ہیں، نکال بھی دیجیے۔''

''آپ جھینپ جائیں گی''

''قسم خدا کی نہیں جھینپوں گی۔''

''تو آپ عورت نہیں۔''

''کیوں کہ عورت کے لئے جھینپنا اشد ضروری ہے۔ چاہے جھینپ آئے یا نہ آئے۔ بڑا افسوس ہے منٹو صاحب آپ بھی عورتوں اور مردوں کے لئے الگ الگ اصول بناتے ہیں۔ میں سمجھتی تھی آپ عام لوگوں کی سطح سے بلند ہیں۔'' میں نے مسکا لگایا۔

''قطعی نہیں...... میں عورت اور مرد میں تفریق نہیں سمجھتا۔''

''تو پھر کہئے نا وہ جھینپا دینے والی بات۔''

''نہیں اب غصہ اُتر گیا۔'' وہ ہنس کر بولا۔

''اچھا دوستی ہی میں سہی، بتایئے وہ کونسی خطرناک بات تھی۔''

''کچھ نہیں...... اب کچھ یاد نہیں رہا۔ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ شاید کوئی موٹی سی گال دے دیتا۔''

''بس۔'' میں نے نا اُمید ہو کر کہا۔

''یا شاید کس کے جھانپڑ مارتا۔'' نادم ہو کر بولا۔

''مجھ پر کچھ اثر نہ ہوتا۔ میں نے ایسی لحیم شحیم گالیاں سنی ہیں کہ حد نہیں اور میرے تھپڑ بھی خاصے زور کے پڑ چکے ہیں۔ مگر پہلی دفعہ آپ نے عورت سمجھ کر رعایت کی۔ میرے بھائی تو لگا چکے ہیں کئی بار۔'' اور ہمارا ملاپ ہو گیا۔

ایک دن دفتر میں گرمی سے پریشاں ہو کر میں نے سوچا جا کر منٹو کے یہاں آرام کر لوں پھر واپس ملاڈ جاؤں۔ دروازہ حسب معمول کھلا ہوا تھا، جا کر دیکھا تو صفیہ منہ پھُلائے لیٹی ہے۔ منٹو ہاتھ میں جھاڑو لئے شاسٹ پلنگ کے نیچے ہاتھ مار رہا ہے۔ اور ناک پر گرتے کا دامن رکھے میز کے نیچے جھاڑو چلا رہا ہے۔

''یہ کیا کر رہے ہیں''۔ میں نے میز کے نیچے جھانک کر پوچھا۔

''کرکٹ کھیل رہا ہوں۔'' منٹو نے بڑی بڑی مور پنکھ جیسی پُتلیاں گھما کر جواب دیا۔

''یہ لیجئے! ہم نے سوچا تھا ذرا آپ کے یہاں آرام کریں گے آپ لوگ تو روٹھے بیٹھے ہیں۔'' میں نے واپس جانے کی دھمکی دی۔

''ارے!'' صفیہ اُٹھ بیٹھی۔ ''آؤ آؤ۔''

''کاہے کا جھگڑا تھا۔'' میں نے پوچھا۔

'' کچھ نہیں میں نے کہا کھانا پکانا گرہستی وغیرہ مردوں کا کام نہیں بس جیسے تم سے اُلجھتے ہیں مجھ سے بھی اُلجھ پڑے کہ کیوں نہیں مردوں کا کام۔ میں ابھی جھاڑو دے سکتا ہوں۔ میں نے بہت روکا تو اور لڑے، کہنے لگے ایسا ہی ہے تو طلاق لے لے۔'' صفیہ نے بسور کر کہا۔

منٹو سے جھاڑو چھڑانے کے لئے میں نے بن کر کھانسنا شروع کیا۔'' صبح ہی صبح میونسپلٹی کے بھنگی

[illegible]

"افوہ یہ صفیہ کیا مردہ جلا رہی ہے۔" میں نے ناک بند کر کے کہا۔ منٹو نے چونک کر مجھے دیکھا، سر سے پیر تک بڑی بڑی پتلیاں گھمائیں اور چھلانگ مار کر جھپٹا باورچی خانے میں۔ صفیہ چیختی رہی اور اس نے بھرلوٹا پانی پتیلی میں جھونک دیا۔

واپس آ کر وہ سہما سہما رسان سے کرسی پر بیٹھ گیا اور پھر کچھ جھینپ کر ہنس دیا۔ میں بے وقوفوں کی طرح دیکھتی رہی۔

صفیہ بڑبڑاتی آئی تو اُسے زور سے ڈانٹا پھر بڑے شرمیلے انداز میں بولا۔

"آپ کے پیٹ میں بچہ ہے؟" جیسے بچہ میرے نہیں خود ان کے پیٹ میں ہو۔" میں نے فوراً تاڑ لیا جب صفیہ کے پیٹ میں بچہ تھا تو اسے بھی بگھار سے اُبکائی آتی تھی۔"

"منٹو صاحب خدا کے لئے دائیوں جیسی باتیں نہ کرو۔" میں نے چڑ کر کہا۔ وہ زور سے ہنسا۔

"ارے واہ۔ اس میں کیا بُرائی ہے، ارے آپ کو کھٹی جیسی چیزیں بھاتی ہوں گی۔ میں ابھی کیریاں لاتا ہوں۔" وہ لپک کر نیچے گیا اور کُرتے کے دامن میں بچوں کی طرح کیریاں بھر کے لے آیا۔ کیریاں چھیل کر بڑی نفاست سے نمک مرچ لگا کر مجھے دیں اور خود اکڑوں بیٹھا مجھے غور سے دیکھ کر مسکراتا رہا۔

"صفیہ ارے صفیہ۔" وہ چلایا۔ صفیہ دھوئیں سے اٹی آنکھیں آنچل سے پونچھتی ہوئی آئی "کیا ہے منٹو صاحب کتنا چلاتے ہو۔"

"ارے بے وقوف۔ ان کا پیر بھاری ہے۔" اس نے صفیہ کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا۔

"اُف گندگی کی انتہا ہے۔ جبھی تو آپ کو لوگ فحش نگار کہتے ہیں۔" میرے اس بگڑنے پر منٹو خوب خوب چہکا۔ اور بڑی بوڑھیوں جیسے مشورے دینے لگا۔

"پیٹ پر زیتون کے تیل کی مالش سے کھرونچے نہیں پڑیں گے۔"

"نہار منہ سیب کا مربہ کھانے سے اُبکائیاں نہیں آتیں۔"

"کھوپرہ کھانے سے بچہ گورا ہوگا اور آسانی سے ہوگا۔"

"جاپے میں برف نہ چبایئے گا۔ نلے سوج جاتے ہیں، کیوں صفیہ؟"

"ہو منٹو صاحب کیسی باتیں کرتے ہو۔" صفیہ کھسا کر رہ گئی۔

اور جب سیما پیدا ہوئی تو صفیہ میرے پاس بیٹھی کانپتی رہی۔ مگر بچّی کو دیکھ کر منٹو کو اپنا بیٹا بہت یاد آیا۔ وہ دیر تک مجھے اس کی چھوٹی چھوٹی شرارتیں بتاتا رہا۔ صفیہ کا دل پگھل گیا اور سال کے اندر اندر منٹو کی بڑی بیٹی پیدا ہو گئی۔ پونا سے آنے کے بعد مجھے معلوم ہوا۔ میں فوراً گئی تو منٹو نے مکان بدل لیا تھا۔ ڈھونڈ ڈھانڈ کر دوسرے مکان پہنچی تو دیکھا ڈرائنگ روم میں الگنی پر پوتڑے نچوڑ نچوڑ کر پھیلا رہے ہیں۔ نیا مکان بہت چھوٹا اور بغیر ہوا کا تھا۔ منٹو نے اس لئے بدل لیا کہ اس کا فرش گندہ تھا۔ بچّی گھٹنوں چلتی تو پھانس لگ جاتی اور مٹّی چاٹ جاتی۔ یہاں نکہت مزے سے فرش پر کھیل سکے گی۔ حالانکہ نکہت چند ہفتوں کی تھی۔

''مجھے بچّے سخت ناپسند ہیں۔'' منٹو سنجیدگی سے کہتا۔ ''جان کو چمٹ جاتے ہیں۔ مجھے ان سے اسی لئے ڈر لگتا ہے۔ ہر وقت انہیں کا خیال رہتا ہے کسی کام میں دل نہیں لگتا'' وہ دودھ کی بوتل دھو کر فلسفہ چھانٹتا۔ میری بھتیجی مینوا سے بڑی پیاری تھی گھنٹوں اس کے ساتھ گڑیوں اور ہنڈکلیوں کی باتیں کیا کرتا۔ فرمائش پر کھڑکی سے بانس ڈال کر اس کے لئے املیاں توڑ کر نیچے سے کرتے کے دامن میں سمیٹ لاتا۔ سیما کو پاٹ پر بٹھا کر ''شی شی'' کرتا۔ اور بچوں کا بہت شاقی تھا کیونکہ وہ ان کی محبت میں بے بس ہو جاتا تھا۔

ایک دن جب ہم ملاڈ میں رہتے تھے۔ رات کے کوئی ساڑھے بارہ بجے ہوں گے کہ دروازے پر دستک ہوئی، معلوم ہوا۔ صفیہ سانس پھولی ہوئی سی کھڑی ہیں۔ میں نے پوچھا کیا ہوا۔ بولی ''میں نے منع کیا کہ ایسی حالت میں کسی کے گھر نہیں جانا چاہئے، مگر وہ کہاں سنتے ہیں۔'' منٹو مع نندا جی اور خورشید انور کے آ گئے۔

''یہ صفیہ کون ہوتی ہے منع کرنے والی۔'' ہاتھ میں بوتل اور گلاس لئے تینوں در آئے۔ شاہد نے پارٹی کو لبیک کہا۔ طے ہوا بہت بھوکے ہیں۔ ہوٹل سب بند ہو چکے ہیں، ریل کا وقت گزر گیا۔ کچھ مل جائے تو خود پکا کر کھالیں گے۔ بس آٹا دال دے دو، خود باورچی خانے میں جا کر پکالیں گے۔

صفیہ کو مردوں کا روٹی پکانا قطعی نہ بھایا۔ مگر وہ کہاں مانتے تھے۔ باورچی خانے پر چڑھائی کر دی۔ منٹو آٹا گوندھنے لگے۔ نندا جی انگیٹھی پر ٹوٹ پڑے اور خورشید انور کو آلو چھیلنے کو دے دیئے گئے جو چھیلنے سے زیادہ کچے کھانے پر مصر تھے اور پھر بوتل بھی باورچی خانے میں آ گئی۔ لوگ پھسکڑا کر وہیں بیٹھ گئے

اور کچے کچے پڑا ٹھے پکاتے گئے کھاتے گئے۔ منٹو نے آٹا بہت اچھا گوندھا اور بڑے سلیقے سے روٹی پکالی اور پھر جھٹ سے پودینے کی چٹنی پیس ڈالی۔ کھانا کھا کر یہ لوگ وہیں پھیل کر سو بھی جاتے اگر زبردستی برآمدے تک نہ گھسیٹا جاتا۔

یہ زندگی تھی جو منٹو کو سب سے زیادہ دلچسپ معلوم ہوتی تھی۔ معقول آمدنی ہو، پینا پلانا ہو، قہقہے ہوں اور بے فکریاں، ہر بات مذاق معلوم ہوتی تھی۔ اسی زمانے میں لاہور گورنمنٹ نے میرے اور منٹو پر مقدمہ چلا دیا۔ منٹو کی دیرینہ آرزو برآئی۔ لاہور میں بھی لطف آگیا۔ خوب دعوتیں آڑائیں۔ اسی بہانے لاہور کی زیارت ہوگئی۔ زری جوتے خریدنے ہم دونوں ساتھ گئے۔ منٹو کے پیر بہت نازک اور سفید تھے۔ جیسے کنول کے پھول۔ زری کے جوتے بہت جچنے لگے۔

''میرے پیر بڑے بھدّے ہیں۔ میں نہیں خریدوں گی اتنے خوبصورت جوتے۔'' میں نے کہا۔

''اور میرے پیر اتنے زنانے ہیں کہ مجھے ان سے شرم آتی ہے۔'' مگر ہم نے کئی جوڑے جوتے خریدے۔

''آپ کے پیر بہت خوب صورت ہیں۔'' میں نے کہا۔

''بکواس ہیں میرے پیر۔ لائیے بدل لیں۔''

''بدلنا ہی ہے تو لائیے سر بدل لیں۔'' میں نے رائے دی۔

''بخدا مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' منٹو نے چہک کر کہا۔

محبت کے مسئلہ پر کتنی ہی جھڑپیں ہوئیں مگر کسی فیصلہ پر نہ پہنچ سکے۔ وہ یہی کہتا۔

''محبت کیا ہوتی ہے۔ مجھے اپنے زری کے جوتے سے محبت ہے۔ رفیق کو اپنی پانچوں بیوی سے محبت ہے۔''

''میرا مطلب اس عشق سے ہے جو ایک نوجوان کو ایک دوشیزہ سے ہو جاتا ہے۔''

''ہاں...... میں سمجھ گیا۔'' منٹو نے دور ماضی کے دھندلکوں میں کچھ ٹٹول کر سوچتے ہوئے خود سے کہا ''کشمیر میں ایک چرواہی تھی۔''

''پھر......؟'' میں نے داستان سننے والوں کی طرح ہنکارہ دیا۔

''پھر کچھ نہیں۔'' وہ ایک دم بچاؤ کے لئے تن گیا۔

کا انتظار کرتا تھا جب وہ ہاتھ اوپر کرے تو آستین سرک جائے اور مجھے اس کی سفید کہنی دکھائی دے جائے۔"

"کہنی......؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں...... میں نے سوائے کہنی کے اس کے جسم کا اور کوئی حصہ نہیں دیکھا۔ ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے رہتی تھی، اس کے جسم کا کوئی خط نہیں دکھائی دیتا تھا۔ مگر اس کے جسم کی ہر جنبش پر میری آنکھیں کہنی کی جھلک دیکھنے کے لئے لپکتی تھیں۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر ایک دن میں کمبل پر لیٹا تھا وہ مجھ سے تھوڑی دور آ کر بیٹھ گئی۔ وہ اپنے گریبان میں کچھ چھپانے لگی۔ میں نے پوچھا۔ مجھے دکھاؤ۔ تو شرم سے اس کا چہرہ گلابی ہو گیا۔ اور بولی کچھ بھی نہیں۔ بس مجھے ضد ہو گئی۔ میں نے کہا جب تک تم دکھاؤ گی نہیں جانے نہیں دوں گا۔ وہ روہانسی ہو گئی مگر میں بھی ضد پر اڑ گیا۔ اور آخر کو بڑی ردوکد کے بعد اس نے مٹھی کھول کر ہتھیلی میرے سامنے کر دی اور خود شرم سے گھٹنوں میں منہ دے لیا۔"

"کیا تھا اس کی ہتھیلی پر۔" میں نے بے صبری سے پوچھا۔

"مصری کی ڈلی! اس کی گلابی ہتھیلی پر برف کے ٹکڑے کی طرح پڑی جھلملا رہی تھی۔"

"پھر آپ نے کیا کیا۔"

"میں دیکھتا رہ گیا۔" وہ پھر سوچ میں ڈوب گیا۔

"پھر......؟"

"پھر وہ اٹھ کر بھاگ گئی۔ تھوڑی دور سے پلٹ آئی اور وہ مصری کی ڈلی میری گود میں ڈال کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ مصری کی ڈلی بہت دنوں تک میری قمیض کی جیب میں پڑی رہی۔

پھر میں نے اسے دراز میں ڈال دیا اور کچھ دن بعد چیونٹیاں کھا گئیں۔''

''اور لڑکی......''

''کون سی لڑکی......؟'' وہ چونکا۔

''وہی جس نے آپ کو مصری کی ڈلی تھما دی۔''

''اسے میں نے پھر نہیں دیکھا۔''

''کس قدر پھس پھسا ہے آپ کا عشق؟'' میں نے ناامیدی سے چڑ کر کہا۔ ''مجھے تو بڑے کسی شعلہ بداماں قسم کے عشق کی اُمید تھی۔''

''قطعی پھس پھسا نہیں۔'' منٹو لڑ پڑا۔

''بالکل ردّی...... تھرڈ ریٹ۔ مرگھلا عشق۔ مصری کی ڈلی لے کر چلے آئے۔ بڑا تیر مارا۔''

''تو اور کیا کرتا۔ اس کے ساتھ سو جاتا۔ ایک حرامی پلاّ اس کی گود میں چھوڑ کر آج اس کی یاد میں اپنی مردانگی کی ڈینگیں مارتا۔'' وہ بگڑا۔

''ٹھیک کہتے ہیں آپ۔ مصری کی ڈلی کڑکڑا کر کھانے کی نہیں دھیرے دھیرے چوسنے کی چیز ہے۔''

یہ وہی منٹو تھا۔ فحش نگار۔ گندہ ذہن۔

جس نے ''بو'' لکھی تھی۔

جس نے ''ٹھنڈا گوشت'' لکھا تھا۔

لیکن مرزا غالبؔ میں چودھویں بیگم مرزا غالبؔ کی محبوبہ ہو یا نہ ہو اس کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ مگر منٹو کے خیالوں کی لڑکی ضرور ہے۔ جسے وہ ہاتھ نہیں لگانا چاہتا۔ جس کی کلائی کی جھلک دیکھنے کے لئے وہ ساری زندگی بیٹھ سکتا ہے۔ یہ تھا وہ تضاد جو منٹو کی مختلف کہانیوں میں مختلف اوقات میں ظاہر ہوتا تھا۔ ایک طرف وہ ''نیا قانون'' لکھتا ہے اور دوسری طرف ''بو''...... دونوں میں وہ خود کو غرق کر کے لکھتا ہے۔ لوگوں کو ایک فحش نگار یاد رہ جاتا ہے اور واقعہ نگار کو وہ بھول جاتے ہیں۔ قصداً یا سہواً؟...... ایک ہی بات ہے۔

ملک میں فساد شروع ہو گئے۔ بٹوارے کے بعد اس کوٹھی کے وہاں اس کوٹھی میں کئے جانے لگے۔ منٹو اس وقت فلمستان میں قریب قریب مستقل تھا۔ وہ بڑا خوش نظر آتا تھا۔ مدح سرائی جو اس کی زندگی کا سہارا تھی۔ اسے ملتی تھی کہ اس کی فلم ''آٹھ دن'' کامیاب نہ ہوئی، نہ جانے کیوں وہ فلمستان چھوڑ کر اشوک کمار

کے ساتھ بمبئی ٹاکیز چلا گیا۔ اسے اشوک کمار بہت پسند تھا۔ مکر جی نے نہ جانے اسے کیا کہہ دیا تھا کہ وہ ایک دم ان کے خلاف ہو گیا۔

''بکواس ہے مکر جی۔ فراڈ ہے پکا!'' وہ تلخی سے کہتا۔

بمبئی ٹاکیز میں جا کر اس نے مجھے بھی کمپنی میں ایک سال کے لئے سینریو ڈیپارٹمنٹ میں کام دلوا دیا اور بہت ہی خوش ہوا۔ ''اب ہم دونوں مل کر کہانی لکھیں گے۔ تہلکہ مچ جائے گا۔ میری اور آپ کی کہانی، اشوک کمار ہیرو، بس پھر دیکھئے گا۔''

ایک کہانی منٹو کی زیر غور تھی۔ اشوک کو وہ پسند تھی۔ اس سے پہلے اسے مجبور کی کہانی پسند تھی پھر دل سے اُتر گئی اور منٹو کی کہانی پسند آئی۔ میرے آنے کے بعد اسے میری کہانی ضدی پسند آ گئی۔ خیر منٹو کو ناگوار نہ گذارا۔ اب اشوک کمار نے مجھ سے منٹو کی کہانی پر کام کرنے کو کہا اور منٹو کو میری کہانی پر! نتیجہ یہ کہ منٹو مجھ سے اور میں منٹو سے شاکی ہونے لگی۔ ادھر کمال امروہی ''محل'' کی کہانی لے کر آ گئے اور اشوک کمار کو وہ پسند آ گئی اور ہم دونوں کی کہانی کھٹائی میں پڑ گئی۔ اب صرف عزت کا سوال ہوتا تو اور بات تھی۔ وہاں تو یہ حال ہو گیا کہ ہماری کہانی نہیں بن رہی ہے تو ہم کسی شمار قطار ہی میں نہیں۔ گو ہم سے کہہ دیا گیا تھا کہ چین سے بیٹھو۔ تنخواہ ملتی رہے گی کیونکہ کنٹریکٹ ہو چکا ہے لیکن کہانی ہماری نہیں بنے گی۔ لہٰذا میری اور شاہد کی پوری کوششیں اپنی کہانی ''ضدی'' کو بنوانے کی طرف لگ گئیں اور بغیر اشوک کمار کے دوسرے درجہ کی تصویروں کی قطار میں ''ضدی'' بنائی جانے لگی۔

مگر منٹو کی کہانی رہ گئی! منٹو دن بھر اپنے کمرے میں بیٹھا اپنی کہانی کی اُدھیڑ بُن کیا کرتا کبھی انجام کو آغاز بنا کر لکھتا کبھی آغاز کو انجام بنا کر، کبھی وسط سے شروع کر کے آغاز پر ختم کرتا اور وسط کو انجام بنا دیتا۔ باوجود ہزاروں آپریشنوں کے کہانی کی کوئی کل اشوک کمار کو پسند نہ آئی۔ مگر منٹو یہی کہتا:

''آپ گنگولی کو نہیں سمجھتیں۔ میں سمجھتا ہوں۔ وہ میری کہانی میں ضرور کام کرے گا۔''

''آپ کی کہانی میں اس کا رول رومانٹک نہیں باپ کا ہے۔ وہ کبھی نہیں کرے گا۔'' اور منٹو سے پھر لڑائی ہونے لگتی۔ مگر ادبی زبان ... [illegible]

لئے۔ منٹو نے ہم سے [illegible] کہا۔ پاکستان میں [illegible] ہے۔ وہاں [illegible]
کوٹھیاں ملیں گی۔ وہاں ہم ہی ہم ہوں گے۔ بہت جلد ترقی کر جائیں گے۔ میرے جواب پر منٹو مجھ سے واقعی بددل ہوگیا۔ اتنی لڑائیاں اور جھگڑے میرے اس سے ہوئے مگر یوں کسی سنجیدہ اصول پر بحث نہیں ہوئی۔

اور اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ منٹو کتنا بزدل ہے۔ کسی قیمت پر وہ بھی اپنی جان بچانے کو تیار ہے۔ اپنا مستقبل بنانے کے لئے وہ بھاگے ہوئے لوگوں کی زندگی کی کمائی پر دانت لگائے بیٹھا ہے اور مجھے اس سے نفرت سی ہوگئی۔۔

اور ایک دن وہ بغیر اطلاع کئے اور ملے پاکستان چلا گیا۔ مجھے بڑی ہتک محسوس ہوئی۔ پھر جب اس کا خط آیا کہ وہ بہت خوش ہے۔ بہت عمدہ مکان ملا ہے۔ کشادہ اور خوبصورت قیمتی سامان سے آراستہ۔ ہمیں اس نے پھر بلایا تھا۔ ''ضدی'' ختم ہوگئی تھی اور ہم نے آرزو شروع کر دی تھی۔ بُرے وقت آئے تھے اور چلے گئے تھے۔ اس کے پھر دو خط آئے۔ اس نے بلایا تھا، ایک سنیما الاٹ کروانے کی امید دلائی تھی۔ مجھے بڑا دکھ ہوا۔ اس کی محبت کا پہلے بھی یقین تھا۔ مگر اب تو اور بھی مان جانا پڑا۔ مگر میں نے اس کے خط پھاڑ دیے اس بات سے چڑ کر کہ وہ میرے اصولوں کی قدر کیوں نہیں کرتا۔ میں نے اسے جانے سے نہیں روکا۔ پھر وہ مجھے اپنے راستے پر کیوں گھسیٹ رہا ہے۔

پھر سنا منٹو بہت خوش ہے۔

مکان چھن گیا مگر دوسرا مکان بھی خاصا اچھا ہے۔

ایک لڑکی اور پیدا ہوئی۔

اور سال گزرتے گئے۔

ایک لڑکی اور پیدا ہوئی۔ منٹو کا ایک خط آیا ''کوشش کر کے مجھے ہندوستان بلوا لو۔''

پھر معلوم ہوا منٹو پر مقدمہ چلا اور جیل ہوگئی۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہے۔ کسی نے احتجاج بھی نہ کیا۔ بلکہ کچھ ایسا لوگوں کا رویّہ تھا کہ اچھا ہوا جیل ہوگئی۔ اب دماغ درست ہو جائے گا۔ نہ کہیں جلسے ہوئے، نہ میٹنگیں ہوئیں، نہ ریزولیشن پاس ہوئے۔

پھر معلوم ہوا کہ دماغ چل نکلا اور پاگل خانے میں یار دوست پہنچا آئے ہیں۔

مگر ایک دن منٹو کا خط آیا۔ بالکل ہوش وحواس میں لکھا تھا کہ اب بالکل ٹھیک ہوں اگر مکرجی سے

کہہ کر بمبئی بلوالو تو بہت اچھا ہو۔ اس کے بعد عرصہ تک کوئی خیر خبر نہیں ملی۔ نہ ہی میرے خط کا جواب آیا۔ پھر سنا کہ دوبارہ پاگل خانے چلے گئے۔ اب منٹو کی خبروں سے ڈر سا لگتا تھا۔ پوچھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ خدا جانے اس کا اگلا قدم کہاں پڑا ہو۔ مگر پاگل خانے سے آگے جو قدم پڑتا ہے وہ لوٹ کر نہیں آتا۔ پاکستان سے آنے والے لوگوں سے بھی اتنی کڑوی خبریں سنیں کہ جی اُوب گیا۔ بے طرح پینے لگے ہیں۔ اپنے پرائے ہر ایک سے پیسہ مانگ بیٹھتے ہیں۔ اخبار والے بٹھا کر سامنے مضمون لکھواتے ہیں پیشگی پیسہ دو تو سب کھا جاتے ہیں۔

منٹو کا آخری خط آیا جس میں ایک مضمون اپنے اُوپر لکھنے کو کہا تھا۔ اور بے ساختہ میری منحوس زبان سے نکل گیا کہ اب تو مرنے کے بعد ہی مضمون لکھوں گی۔

اور آج منٹو کے مرنے کے بعد میں لکھ رہی ہوں۔ منٹو ہی نہیں عرصہ ہوا میرے اور منٹو کے درمیان بہت کچھ مر چکا تھا۔ آج صرف ایک کسک زندہ ہے، یہ پتہ نہیں چلتا کہ کس بات کی کسک ہے؟ کیا اس بات کی ندامت ہے کہ وہ مر چکا ہے اور میں زندہ ہوں؟ یہ میرے سینے پر پھر قرض جیسا بوجھ کیوں ہے۔ مجھے تو منٹو کا کوئی قرضہ یاد نہیں۔ اور اس کا قرضہ بھی کیا تھا یہی نا کہ اس نے مجھے بہن کہا تھا۔ مگر بہنیں تو کھڑی بھائیوں کو دم توڑتا دیکھتی ہیں اور کچھ نہیں کر پاتیں۔ مرنے والے زخم لگا جاتے ہیں، جو نہ دُکھتا ہے نہ رِستا ہے خاموش سلگتا رہتا ہے۔

آج مجھے صفیہ بے طرح یاد آ رہی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ایک بار سر جوڑ کر ہم ویسے ہی باتیں کر سکیں جیسے برسوں ہوئے اڈلفی چیمبر میں کیا کرتے تھے۔ مگر وہ تھیں سہاگ رات اور پہلوٹھی کے بچے کی باتیں۔ یہ ہیں موت کی باتیں۔ اسی لئے ڈرتی ہوں اور میرا قلم خشک ہو جاتا ہے۔ نہ جانے ان چند سالوں میں اُس پر کیا گزری ہے۔ کس دل سے پوچھوں کہ جب ساری دنیا نے منٹو کو فراموش کر دیا تب بھی تمہاری محبت اس طوفانی ہستی کا سہارا چٹان بن کر دیتی رہی۔ یا تمہارا پیار تھک کر نڈھال ہو چکا تھا۔ کیا یہ بارہ تیرہ برس کا بھونچال تمہیں جھنجھوڑ کر پست کر گیا یا تم اب بھی اپنے ''منٹو صاب'' کی صفیہ رہیں۔ پاس پڑوس کے مہذب لوگ اور رشتہ دار جب اس کی بدروئی پر ناک بھوں چڑھاتے تھے تو تم کیا کرتی تھیں۔ ان خاموش گیسوں کا تمہارے پاس کیا جواب تھا جو بے مروتی اور لاپروائی سے تمہارے ارد گرد منڈلایا کرتی تھیں۔ دم تو گھٹ جاتا تھا۔ کیا اس نے تمہاری پیار بھری گود میں دم توڑا یا وہ تنہا اور بھرے خاندان

میں اکیلا ہی سدھارا۔ کیا بچیاں اپنے باپ کو پاگل، مفلس، شرابی سمجھتی تھیں۔ اس نے تمہیں تنگدستی اور ندامت کے سوا کیا کچھ بھی نہیں دیا۔ مجھے کچھ بھی تو نہیں معلوم۔ نہ جانے کیوں اس کی تحریروں میں اپنی زندگی کا دھندلا سا بھی عکس نہیں ہے۔ وہ اپنی مشکلوں کو اپنی کمزوری پر محمول کرتا رہا۔ اس نے انہیں عیب کی طرح چھپایا۔ اُسے غرّہ تھا کہ چاہے تو وہ دم بھر میں لاکھوں کما کر پھینک دے جبھی تو اُسے یقین نہ آتا تھا کہ وہ فاقے بھی کر سکتا ہے اور اس کا قلم بیکسی سے گھسٹتا رہتا ہے۔

تم عاجز تو نہیں آگئیں ادیبوں سے! یونہی خود گھسٹتے ہیں اور اپنوں کو دلدل میں گھسیٹتے ہیں!......اور پھر ایک دن اکیلا چھوڑ کر چل دیتے ہیں۔ تو بہن یہ ادیبوں ہی کی عادت نہیں ہمارے دیش کے لاکھوں کروڑوں انسان اسی طرح زندگی میں ناکامی اور نامرادی کا شکار ہوتے ہیں۔ چاہے وہ ادیب ہوں یا کلرک! ان کی یہی زندگی ہے اور کم وبیش یہی انجام جو زیادہ حساس ہوتے ہیں، وہ پاگل ہو جاتے ہیں اور ڈھیٹ سسکتے رہتے ہیں۔

نہ جانے دل کیوں کہتا ہے کہ منٹو کی اس جواں مرگی میں میرا بھی ہاتھ ہے۔ میرے دامن پر بھی خون کے نظر نہ آنے والے چھینٹے ہیں! جو صرف میرا دل دیکھ سکتا ہے۔ وہ دُنیا جس نے اُسے مرنے دیا۔ میری ہی تو دُنیا ہے۔ آج اسے مرنے دیا اور کل یونہی مجھے بھی مر جانے کی اجازت ہوگی۔ اور پھر لوگ ماتم کریں گے۔ میرے بچوں کا بوجھ ان کے سینے پر چٹان بن جائے گا۔ جلسے کریں گے، چندے جمع کریں گے اور اُن جلسوں میں عدیم الفرصتی کی وجہ سے کوئی نہ آسکے گا۔ وقت گذر جائے گا۔ سینے کا بوجھ آہستہ آہستہ ہلکا ہو جائے گا اور وہ سب کچھ بھول جائیں گے۔

☆☆☆

منٹو — میرا دشمن

منٹو میرا دشمن سمجھا جاتا تھا۔ ہم میں خاصی چپقلش رہتی تھی اور اس میں شک نہیں کہ جب تک ہم اکٹھے رہے، ہم نے ایک دوسرے کو سخت چوٹیں پہنچائیں۔ کتب پبلشر، بمبئی سے شائع ہونے والے ''نئے ادب کے معمار'' کے سلسلے میں سعادت حسن منٹو کا جو اسکیچ کرشن چندر نے لکھا اُس میں اس چپقلش کا ذکر بھی کر دیا اور، ہماری یہ دشمنی روایتی ہو گئی۔ یہاں تک کہ ایک دوست نے اسی دشمنی کا ذکر کرتے ہوئے مجھ سے اصرار کیا ہے کہ اگر میں نے منٹو کے بارے میں مضمون نہ لکھا تو وہ مجھے کبھی نہ بخشے گا۔ لیکن آج جب منٹو اس دنیا میں نہیں ہے، میں سوچتا ہوں کہ کیا ہم واقعی دشمن تھے؟ اور پندرہ بیس برسوں کا جائزہ لیتا ہوں تو پاتا ہوں کہ اگر ہمارے تعارف کی ابتدا ہی دُشمنی سے نہ ہوتی تو ہم بہت اچھے دوست ہوتے۔

منٹو کی اور میری اُفتاد میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ لڑکپن ہی سے دینو یا فضلو کمہار کی دوکانوں کے اُوپر چوباروں میں جمنے والی جوئے کی محفلوں میں شامل ہوتا تھا اور رات کو خواب بھی فلش ہی کے دیکھتا تھا، اور میں نے کبھی تاش کو ہاتھ نہیں لگایا۔ وہ رندِ بلانوش تھا اور میں نے شراب تو دُور رہی، سگریٹ بھی پہلی بار ۱۹۴۲ء میں پیا، جب میں بتیس برس کا تھا۔ اس نے کٹڑہ گھونیا ہو، ہیرا منڈی ہو یا فارس روڈ۔ اس بازار کی خوب سیر کی تھی اور میں نے اُدھر جھانک کر بھی نہیں دیکھا۔ بات یہ ہے کہ ماں نے بچپن ہی سے ان تینوں کے خلاف سخت نفرت میرے دل میں بھر دی تھی۔ والد محترم نے ان تینوں میدانوں میں جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے خاندان کی آئندہ دو نسلیں اس سلسلے میں کچھ بھی کئے بغیر ان پر فخر سے سر بلند کر سکتی ہیں۔ ان کے انہیں کارناموں کی وجہ سے گھر کی جیسی حالت ہو گئی اور ہم نے جس عسرت میں بچپن کے دن کاٹے، اس نے خون کو کچھ ایسا منجمد کر دیا کہ آج جب میں سگریٹ یا شراب کو ویسا معیوب نہیں سمجھتا، کبھی کھل کھیلنے کا حوصلہ نہیں ہوتا، پتا جی جب ایک آدھ پیگ

چڑھا لیتے تھے، عموماً نعرہ لگاتے تھے۔ کوڑی نہ رکھ کفن کے لئے! وہ حال میں جیتے تھے اور انہوں نے کبھی مستقبل کی فکر نہیں کی۔ ردِّ عمل کے طور پر میں نے لڑکپن ہی میں زندگی کا سارا خاکہ تیار کر لیا تھا...... اور منٹو کو میرے اس زہد، حسابیت، پلاننگ، کفایت شعاری اور ٹھہراؤ سے نفرت تھی۔ اپنی اس نفرت کا اظہار اس نے کئی بار سخت ترین الفاظ میں کیا...... مجھے منٹو نے فلمستان میں کام کرنے کے لئے بمبئی بلایا تھا میرے بمبئی پہنچنے کے دوسرے یا تیسرے دن کا ذکر ہے، ہم وکٹوریہ میں آمنے سامنے بیٹھے گرانٹ روڈ کو جا رہے تھے۔ منٹو نے تھوڑی سی پی رکھی تھی۔ اچانک اس نے انگریزی میں کہا۔ I Like you though I Hate you...... ڈیڑھ سال بعد ہم فلمستان کی کینٹین میں بیٹھے تھے۔ لنچ کا وقت تھا۔ منٹو کی میز پر حسبِ دستور راجہ مہدی علی خاں، واچا وغیرہ دو ایک دوست تھے۔ میں برابر کی میز پر ایک یونٹ کے دو ایک دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ نہ جانے کیسے ہندوؤں کے داہ کرم سنسکار اور کپال کریا...... یعنی مردے کی کھوپڑی کو توڑنے کی رسم کا ذکر چلا تو منٹو نے دانت پیس کر کہا...... ''اشک جب مرے گا تو اس کی کپال کریا میں کروں گا۔''

......میں کے۔ ای۔ ایم ہسپتال میں بیمار پڑا تھا۔ ڈاکٹروں نے دِق کا فتویٰ دے دیا تھا۔ راجہ مہدی علی خاں مجھ سے ملنے آیا اور اس نے کہا...... ''منٹو کہتا ہے کہ سالا اس طرح پیسہ نہ جوڑتا تو بیمار نہ پڑتا۔''

جب گرانڈ روڈ کو جاتے ہوئے منٹو نے مجھ سے کہا تھا، میں تمہیں پسند کرتا ہوں، لیکن مجھے تم سے سخت نفرت ہے تو میں نے جواب میں کہا کہ یہی حال میرا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے محض جواب کے لئے جواب دیا تھا، ورنہ منٹو سے مجھے دراصل کبھی نفرت نہیں ہوئی۔ رہا منٹو، تو اس نفرت کے باوجود جس کا اظہار وہ وقتاً فوقتاً کرتا تھا اور اس تضاد کے باوجود جو ہماری طبیعتوں میں تھا، میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ہم دونوں گہرے دوست ہوتے اگر میں نے اپنے بھکوپنے میں منٹو کو بنا دیکھے، بنا جانے، بنا پڑھے اس کے خلاف ایک سخت جملہ نہ کس دیا ہوتا۔

''خوشیا'' کے بارے میں میرے رائے پوچھی۔

میں نے اس وقت تک منٹو کی کوئی چیز نہ پڑھی تھی۔ نہ اُسے دیکھا تھا، ''سرگذشت اسیر'' کے نام سے ہیوگو کا ایک ترجمہ منٹو کے نام سے شائع ہوا تھا اور میں نے کسی سے سنا تھا کہ وہ روسی افسانوں کے ترجمے بغل میں دبائے کسی ناشر کی تلاش میں لاہور آیا تھا۔ اس بات میں کہاں تک صداقت ہے، یہ میں نہیں جانتا۔ بہرحال ''خوشیا'' کی اشاعت سے پہلے منٹو کے بارے میں یہی دو ایک باتیں جانتا تھا اور چونکہ لکھنا میں نے کرشن، منٹو اور بیدی سے بہت پہلے شروع کر دیا تھا، عمر میں بھی میں تینوں سے بڑا ہوں اور اس وقت میرے کچھ مشہور افسانے ''ڈاچی''، ''کونپل''، ''قفس'' وغیرہ لکھے جا چکے تھے اور مترجم کو میں طبعزاد لکھنے والے سے کمتر سمجھتا تھا، اس لئے میری نظروں میں منٹو کی کوئی خاص وقعت نہ تھی، ظاہر ہے کہ ''خوشیا'' پڑھتے وقت بھی میں پہلے ہی سے مصنف کے خلاف تھا۔ ''خوشیا'' مجھے بہت اچھا نہیں لگا۔ حالانکہ منٹو کی کہانیوں میں اسے خاصا درجہ حاصل ہے۔ اور بنیادی خیال کو منٹو نے بہت اچھی طرح نبھایا ہے، تو بھی مجھے یہ اعتراض تھا کہ ''خوشیا'' حقیقی کردار نہیں بلکہ مصنف کے دماغ کی اختراع ہے۔ میرے ایک دوست اس زمانے میں باقاعدہ اس گلی کی سیر کرتے تھے اور ان کی وساطت سے مجھے اس کے آداب وقواعد سے خاصی واقفیت تھی۔ نچلے طبقے کی طوائفوں کے (جیسی کہ ''خوشیا'' کی کانتا ہے) دلال عموماً ان سے پہلے ہی جسمانی طور پر متعارف ہو جاتے ہیں، یہ بات میں یقینی طور پر جانتا تھا، اسی لئے میرا خیال تھا کہ خوشیا کا کردار غیر حقیقی ہے۔ بیدی نے جب ''خوشیا'' کے بارے میں میری رائے پوچھی تو اس وقت غیر شعوری طور پر یہ باتیں میرے ذہن میں تھیں۔ یوں بھی پھکڑ پنے کے دن تھے۔ کسی چیز پر اتنی سنجیدگی سے غور کرنے کی عادت نہ تھی۔ جو منہ میں آیا، بک دیتے تھے، اس لئے میں نے کہا۔

''دو کوڑی کی کہانی ہے۔''

میں نے یہ بات کہی اور بھول گیا۔ لیکن بیدی نہیں بھولا۔ اور خود کچھ عرصے بعد بیدی دہلی گیا اور وہاں منٹو نے (جو اس وقت آل انڈیا ریڈیو، دلّی میں آ گیا تھا) اپنی عادت کے مطابق اسے پریشان کیا تو نہ جانے کیسے اور نہ جانے کس سلسلے میں بیدی نے ''خوشیا'' کے بارے میں میری رائے کا ذکر کر دیا۔

دلّی سے واپس آ کر بیدی نے منٹو سے اپنی ملاقات کا حال سنایا اور کہا کہ میں نے منٹو تک تمہاری بات پہنچا دی ہے۔ چونکہ مجھے کبھی یہ خیال بھی نہ تھا کہ منٹو اور میں کبھی ایک دوسرے کا راستہ کاٹیں گے،

اس لئے میں نے اس اطلاع کو سنا ان سنا کر دیا۔ لیکن ۱۹۴۰ء میں جب کرشن چندر کے بلاوے پر میں دلی ریڈیو اسٹیشن پر گیا اور وہاں جاتے ہی ملازم ہو گیا تو مجھے پہلی بار اس بات کا احساس ہوا کہ میرا وہ ریمارک کہاں تک پہنچ گیا ہے۔ دوستوں نے میری ملازمت پر اس لئے خوشی کا اظہار کیا کہ اب منٹو کو اپنا بدل ملے گا۔ یعنی اگر چہ میں اور منٹو کبھی آمنے سامنے نہ ہوئے تھے، لیکن لوگوں نے ہم کو ایک دوسرے کا حریف مان لیا تھا۔

دہلی میں اپنی نوکری پر آنے کے دوسرے ہی دن مجھے اس بات کا پتہ چل گیا اور چونکہ میں ایک بڑی تکلیف دہ اور کشمکش بھری زندگی سے نجات پا کر آیا تھا، اس لئے اس خیال سے میری روح کانپ گئی کہ مجھے پھر کسی سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ میں موقع ملتے ہی منٹو کو سمجھاؤں گا کہ لوگ محض تماشا دیکھنا چاہتے ہیں اس لئے ہم کیوں تماشہ بنیں۔ لیکن ایک تو یہ کہ ریڈیو میں اس وقت منٹو کا طوطی بولتا تھا۔ دوسرے وہ پہلے ہی سے مجھے نیچا دکھانے کے لئے اُدھار کھائے بیٹھا تھا اس لئے میری کوششیں بارآور نہیں ہوئیں۔...... ریڈیو کا دفتر ان دنوں علی پور روڈ کی ایک بڑی کوٹھی میں تھا۔ بڑے کمرے اسٹیشن ڈائرکٹر، پروگرام ڈائرکٹر اور میوزک ڈپارٹمنٹ کے پاس تھے۔ چھوٹے کمروں میں سے (جو شاید کوٹھی کے باتھ روم رہے ہوں گے) ایک میں راشد دوسرے میں کرشن اور تیسرے میں منٹو بیٹھتے تھے۔ یہ کمرے ساتھ ساتھ تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میں کرشن کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ کرشن اسٹوڈیو میں (جو سڑک کے دوسری طرف ایک کوٹھی میں واقع تھا۔) گیا ہوا تھا اور میں کوئی فیچر لکھ رہا تھا کہ منٹو ٹہلتا ہوا آیا اور اِدھر اُدھر کی بات کر کے اس نے ''خوشیا'' کی بات چھیڑی۔

''مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہیں میری کہانی ''خوشیا'' پسند نہیں آئی؟'' وہ بولا۔

میں نے ٹالنے کی کوشش کی۔ لیکن منٹو یوں چھوڑنے والا نہیں تھا۔ ''تمہیں اس میں کیا پسند نہیں آیا؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے اسے سمجھایا کہ'' میں یہاں ہندی صلاح کار کی حیثیت سے آیا ہوں۔ میرا تمہارا کوئی مقابلہ نہیں۔ تم مزے سے کام کرو، اور مجھے کام کرنے دو۔ فضول بحث مباحثے میں مت پڑو۔ لوگ تماشا دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہم کیوں تماشہ بنیں......''

لیکن منٹو نے مجھے بات نہیں ختم کرنے دی۔ اس نے ہاتھ کی جنبش سے جیسے میری بات کو کاٹتے ہوئے

وہی سوال دہرایا اور شاید کوئی سخت بات بھی کہی۔ مجبوراً میں نے کہا۔ ''کہانی وہ اچھی ہے، لیکن حقیقی نہیں۔''

''کیوں حقیقی نہیں؟'' تب میں نے اپنا اعتراض بتایا۔ ''تمہیں ایک خیال سوجھا اور تم نے اپنے آپ کو دلال کے روپ میں رکھ کر ویسی صورت میں اپنے ردِ عمل کو قلمبند کر دیا۔ حقیقی دنیا میں ''خوشیا'' واقعی دلال ہوتا، کانتا اس کے سامنے یوں برہنہ ہو جاتی تو وہ اسے وہیں دبوچ لیتا...... تم نے جو کچھ لکھا وہ ایک پڑھا لکھا شاعر سوچ سکتا ہے۔ اَن پڑھ دلال نہیں۔''

کچھ اسی طرح کی بات بڑے زوروں سے میں نے کہی۔ منٹو لمحہ بھر کو چپ رہا پھر تلملا کر بولا۔ ''ہاں ہاں، میں وہ دلال ہوں، منٹو وہ دلال ہے، تمہیں افسانہ نویسی کا علم بھی ہے۔ تم خود کیا لکھتے ہو؟''

لیکن اس وقت کرشن چندر آ گیا یا مجھے اڈوانی (اسٹیشن ڈائرکٹر) نے بلا لیا یا جانے کیا ہوا، بہر حال وہ قصہ وہیں ختم ہو گیا۔

......لیکن وہ قصہ کبھی ختم نہیں ہوا۔ دلی میں جو چپقلس اس کے بعد رہی سو رہی۔ منٹو میرے اس اعتراض کو کبھی نہ بھول سکا۔ گذشتہ سال 'نقوش' کے کسی خاص نمبر میں اردو ادیبوں کا ایک سمپوزیم شائع ہوا تھا۔ اس وقت جب اُردو میں کوئی نیا افسانہ لکھے ہوئے (ادھر میرے جو افسانے اردو میں چھپے بھی وہ ایک طرح سے ہندی سے ترجمہ ہوئے ہیں) مجھے آٹھ برس ہونے کو آئے ہیں اور میرے احباب اور اُردو کے ناظر تک مجھے بھول گئے ہیں، منٹو کو میں یاد رہا۔ ''خوشیا' کے بارے میں میرے اعتراض اور اپنے جواب کا ذکر کرنا وہ اس سمپوزیم میں بھی نہیں بھولا۔

اس کے بعد اگرچہ میں نے بڑی کوشش کی کہ منٹو سے میری چشمک نہ ہو، میں اپنی میز بھی اٹھا کر دوسری منزل میں لے گیا لیکن میری تمام کوششیں ناکام رہیں۔ میں جب بھی نیچے اُترتا، دوستوں میں جاتا، منٹو سخت حقارت کی نظر سے مجھے دیکھتا اور کسی نہ کسی طریقے سے اپنی نفرت کا اظہار بھی کر دیتا۔

ان دنوں کی بڑی صاف تصویر دماغ کے پردے پر نقش ہے۔ منٹو ریڈیو کے لئے ڈرامے لکھنے پر مامور تھا۔ کرشن چندر ڈرامے کا انچارج تھا، میں ہندی صلاح کار تھا اور چونکہ اس نظام میں ہندی کو اہم زبان نہ سمجھا جاتا تھا، اس لئے کچھ زیادہ کام نہ تھا اور میں فرصت کے وقت میں ایک آدھ ڈرامہ بھی لکھ دیا کرتا تھا۔

منٹو کا ڈھنگ یہ تھا کہ وہ اردو کا ٹائپ رائٹر لے کر بیٹھ جاتا اور کرشن سے پوچھتا۔ ''بولو بھئی کس موضوع پر ڈرامہ لکھا جائے؟'' موضوع سنتے ہی فوراً ٹائپ کرنا شروع کر دیتا اور شام تک مسودہ کرشن کو

دے دیتا۔ منٹو کو اس بات کا زعم تھا اور اس کا اعلان وہ عموماً کیا کرتا تھا کہ وہ جس چیز پر چاہے ڈرامہ لکھ سکتا ہے۔ ریڈیو کے ڈرامہ آرٹسٹ...... غلام محمد، رندھیر (جواب فلم ایکٹر ہیں) تاج محمد وغیرہ اسے عموماً گھیرے رہتے تھے۔ منٹو لکھتے لکھتے انہیں ڈرامہ سنایا بھی کرتا تھا اور وہ سن کر ''منٹو صاحب، آپ ڈرامہ کے بادشاہ ہیں۔'' کہتے ہوئے منٹو کے خرچ پر چائے اڑایا کرتے تھے، جاوید اور حسرت صاحب سے منٹو کا پینے پلانے کا رشتہ تھا۔ اور اڈوانی اس سے اس لئے دبتے تھے کہ منٹو کے کوئی رشتے دار محکمہ اطلاعات اور براڈ کاسٹنگ کے سکریٹری تھے۔ ریڈیو اسٹیشن پر ہر وقت، منٹو صاحب، منٹو صاحب، ہوتی رہتی اور ہر معاملے میں منٹو کی رائے حکم کا درجہ رکھتی تھی، منٹو خوشامدیوں یا دوستوں میں گھرا رہتا، لنچ کے وقت کبھی اس کے اور کبھی کرشن کے کمرے میں محفل جمتی۔ میں بھی کبھی کبھی آ کھڑا ہوتا۔ منٹو کبھی مجھے بات نہ کرنے دیتا۔ میرے بارے میں کوئی نہ کوئی تحقیر آمیز ریمارک ضرور پاس کرتا اور اگر چہ میرے معاملے میں لوگ اس کا ساتھ نہ دیتے۔ مگر مجھے بڑی کوفت ہوتی۔

آخر ایک دن میں نے کرشن سے کہا۔ ''دیکھو بھائی، تم منٹو کو سمجھا دو، وہ مجھے خواہ مخواہ تنگ کرتا ہے، میں طرح دے جاتا ہوں۔''

''تم بھی اسے تنگ کرو۔'' کرشن نے کہا۔ ''میرے سمجھانے سے وہ کیا سمجھے گا۔''

اور اس دن میں دفتر گیا تو میں نے طے کرلیا کہ آج میں منٹو کو پریشان کروں گا۔ کچھ دن پہلے اس کی کہانی 'دھواں' شائع ہوئی تھی۔ کہانی مجھے بے حد پسند تھی۔ منٹو نے ایک نازک موضوع پر بڑی نزاکت اور نفاست سے افسانہ لکھا تھا۔ لیکن میں تو شرارت پر تُلا ہوا تھا اور چونکہ میں اس دوران میں منٹو کی انانیت کے ہر پہلو کا مطالعہ کر چکا تھا اس لئے میں نے اپنا طرز عمل طے کرلیا۔ دفتر پہنچ کر میں منٹو کے کمرے میں گیا۔ وہ ابھی آ کر بیٹھا ہی تھا کہ میں نے کہا...... ''میں نے تمہاری کہانی ''دھواں'' پڑھی۔''

''کیسی لگی؟''

''اچھی ہے، اب تم چیپٹی پر لکھو۔''

منٹو لحظہ بھر کو چپ رہا۔ پھر اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں تقریباً باہر نکالتے ہوئے کہا۔ ''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

میں نے کچھ نہیں کہا اور وہی بات دُہرا دی۔ ''بس اب تم چیپٹی پر لکھو!''

اس وقت عصمت نے 'لحاف' نہ لکھا تھا۔ منٹو چڑ گیا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ تم خود کیا افسانے لکھتے ہو، لیکن کچھ دن پہلے وہ اس بات کا اعلان کر چکا تھا کہ اس نے کبھی میرا افسانہ نہیں پڑھا۔ اس لئے اس نے کہا ''تم جھک مارتے ہو؟ میں نے تمہارے ڈرامے پڑھے ہیں۔''

اس وقت میرا مجموعہ ''پاپی'' چھپ چکا تھا اور میں کچھ بہت اچھے ڈرامے لکھ چکا تھا۔ چونکہ لڑنے کا فن مجھے خوب آتا ہے اس لئے طرح دے کر میں نے کہا۔ ''میں تو ڈرامہ لکھنا ابھی سیکھ رہا ہوں، اس لئے میرے ڈراموں کی بات چھوڑو، لیکن تم جو ڈراموں کے بادشاہ کہلاتے ہو، جیسی جھک مارتے ہو، وہ میں اچھی طرح جانتا ہوں، ''کروٹ'' میں تم نے ماہم کے افسانہ ''رین'' کی کہانی چرالی ہے۔ ''روح کا ناٹک'' پورے کا پورا ترجمہ کر دیا۔ (اس وقت میں نے مصنف کا نام بھی لیا تھا) اور حوالہ تک نہیں دیا۔ میں اچھے ناٹک نہیں لکھتا۔ لیکن طبعزاد تو لکھتا ہوں۔ میری اچھی بری چیز میری اپنی ہے۔ کسی دوسرے کی چرائی تو نہیں۔''

منٹو جھلا اٹھا، لیکن میں وہاں نہیں رکا۔ کرشن چندر کے کمرے میں آ گیا۔ منٹو ڈرامہ لکھنے جا رہا تھا، لیکن ڈرامہ لکھنا تو دور رہا اس کے لئے اپنے کمرے میں بیٹھنا تک مشکل ہو گیا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے کرشن کے کمرے میں آیا۔ اس نے پھر مجھ سے افسانہ کے فن کو لے کر بات کرنے کی کوشش کی لیکن میں پھر طرح دے کر نکل گیا اور اسٹوڈیو چلا گیا۔ منٹو نے اسٹوڈیو میں میرا پیچھا کیا۔ لیکن میں پھر ٹال گیا۔

تھے۔ ''نیا قانون''، ''منتر''، ''ڈرپوک''، ''موسم کی شرارت''، ''ہتک''، ''مسز ڈی کوسٹا'' مجھے بہت پسند آئے تھے۔ لیکن جب تک میں دلّی میں رہا۔ میں نے کبھی منٹو کے سامنے اس کے افسانوں کی تعریف نہیں کی۔ چونکہ منٹو کی نظر کافی تیز تھی، اس لئے خوشامد کرنے پر وہ اگر چہ وقتی طور پر خوش ہوتا تھا۔ لیکن خوشامدی کے لئے اس کے دل میں کوئی عزّت نہیں رہتی تھی۔ یہ عجیب بات ہے کہ کرشن نے مجھے دلّی بلا کر منٹو کے مقابل لا کھڑا کیا۔ لیکن جب بھی ہم میں جھگڑا ہوا، اس نے ہمیشہ منٹو کی طرفداری کی۔ منٹو اس طرفداری کا فائدہ اٹھالیتا تھا۔ لیکن کرشن چند کے لئے اس کے دل میں عزّت نہ تھی۔ وہ اسے بھی گالیاں دیتا تھا۔ چونکہ ان دنوں منٹو کو ہر وقت خوشامدی لوگ گھیرے رہتے تھے، اس لئے میری اس حقیقی تعریف کو بھی منٹو خوشامد پر محمول کرے یہ میری انا کو منظور نہ تھا۔ میں دانستہ منٹو کے اچھے افسانوں کا ذکر چھوڑ جاتا اور اس کے کمزور افسانوں کی تنقید بڑے زوروں سے کرتا غرضیکہ خاصی چپقلش رہتی تھی۔

ان دنوں عریاں نگاری کو ترقی پسندی سمجھا جاتا تھا۔ احمد علی، عصمت، اور منٹو اس کے علمبردار تھے۔ کرشن چندر کھل کر نہ کھیلتے تھے لیکن انہوں نے بھی اپنی کہانیوں کا فارمولا بنا رکھا تھا جس میں وہ رومان انگیزی اور ترقی پسندانہ طنز میں تھوڑی سی عریانی بھی ملا دیتے تھے۔ میرا کہنا تھا کہ عورتوں کی عصمت فروشی اور آبروریزی کے علاوہ بھی بیسیوں مسائل ہیں جو اتنے ہی اہم ہیں، لیکن نہ جانے کیوں اس وقت ترقی پسندوں کو عریاں نگاری اور گھٹیا درجے کی طوائفوں کے چوباروں میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کا مارے مارے پھرنا ہی واحد موضوع سوجھتا تھا۔ جب میں کرشن سے کہتا کہ یہ ترقی پسندی نہیں تو کرشن کہتا کہ چونکہ تم یہ سب نہیں لکھ سکتے اس لئے تمہیں منٹو اور عصمت (ان دونوں کے ساتھ وہ اپنے کو بھی شامل کر لیتا) سے حسد ہوتا ہے۔ ایک دن منٹو نے بھی کچھ ایسی ہی بڑ ہانکی، تو میں نے طے کیا کہ میں بھی ایک ایسا ہی افسانہ لکھوں گا۔ یہ یاد نہیں کہ کسی نے موضوع تجویز کیا یا میں نے اپنے آپ لکھا۔ لیکن دونوں نے ایک ہی موضوع، یعنی نوکروں کے سامنے مالکوں کی جنسی بے پروائی پر افسانے لکھے۔ منٹو نے ''بلاؤز'' میں نے ''اُبال'' دونوں افسانے ''ساقی'' دہلی کے ایک ہی نمبر میں (غالباً کسی سالنامے میں) چھپے۔ ''اُبال'' کو دوستوں نے بہت پسند کیا۔ کرشن نے اسے اس وقت تک کے میرے افسانوں میں بہترین مانا۔ بعد میں اس کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا تو وہ کافی پسند کیا گیا۔ ''بلاوز'' اور ''اُبال'' اس وقت کے میرے اور منٹو کے آرٹ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ عریانی دونوں افسانوں میں ایک جیسی ہے۔ مالکوں کی جنسی بے پروائی کا اثر دونوں افسانوں

کے نوکروں پر ایک جیسا ہوتا ہے لیکن جہاں بلاؤز کے انجام کی حقیقت کوری حقیقت ہے۔ وہاں ''اُبال'' کے انجام میں نوکر کی ٹریجڈی کے ساتھ ساجی ٹریجڈی بھی پنہاں ہے اور افسانہ ساجی حقیقت (Social Realism) کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ افسانہ نگار کو، حقیقت جیسی بھی ہے اس کا خاکہ کھینچتے وقت ہی اپنے قلم کو محدود رکھنا چاہئے یا اس حقیقت کے پس منظر میں ساج کا بھی جائزہ لینا چاہئے۔ یہ بحث طویل ہے اور فن برائے فن اور فن برائے زندگی کے پیرو اس موضوع پر ہمیشہ بحث کرتے رہیں گے۔ بہر حال منٹو کے ساتھ ہونے والی چشمک میں، میں نے بھی ویسا ہی ایک افسانہ لکھا اور اگر چہ اس کی بڑی تعریف ہوئی، لیکن پھر میں نے اس طرف کا رُخ نہیں کیا۔ اس لئے نہیں کہ ویسے افسانے لکھنا میں کچھ معیوب سمجھتا ہوں بلکہ اس لئے کہ وہ میرے مزاج اور طبیعت سے میل نہیں کھاتے۔

باری صاحب کے بارے میں منٹو نے لکھا ہے کہ وہ بڑے رنچھوڑ قسم کے آدمی تھے۔ لیکن منٹو کو، جیسا کہ میں نے دیکھا، میرا خیال ہے کہ باری صاحب کا کچھ اثر اس پر بھی تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنے کردار کے اس پہلو سے خود واقف نہ ہو۔ جن حالات میں اچانک ایک دن منٹو دہلی سے غائب ہو گیا، تقریباً انہیں حالات میں وہ بمبئی سے پاکستان بھاگ گیا۔ دہلی سے اس کے فرار کا باعث میں تھا اور بمبئی سے نذیر اجمیری۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ منٹو خود بھی اس فرار کا باعث تھا۔ کیونکہ لڑائی میں جب تک وہ مارتا چلا جاتا تھا، خوش رہتا تھا اور جب دوسرے اسی کے حربوں کو اس پر آزماتے تھے تو وہ میدان چھوڑ کر بھاگ جاتا تھا۔ بمبئی سے بھاگنے کے بارے میں نذیر اجمیری کی مخالفت کا ذکر کرتے ہوئے منٹو نے لکھا ہے:۔

''میں نے بہت غور کیا' کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ آخر میں نے اپنے آپ سے کہا۔''منٹو بھائی۔ آگل راستہ نہیں ملے گا۔ کار موٹر روک لو۔ ادھر باجو کی گلی سے چلے جاؤ۔ اور میں باجو کی گلی سے پاکستان چلا آیا۔''

دہلی سے اچانک منٹو غائب ہو گیا تو میں حیران رہ گیا تھا۔ حالانکہ یہ افواہ اڑی تھی کہ اسے فلم میں نوکری مل گئی ہے۔ لیکن دو سال بعد اس نے خود مجھے بتایا کہ وہ کسی نوکری کے بغیر دہلی سے چلا آیا تھا۔ باجو کی گلی سے۔ آگل راستہ نہ ملنے پر۔ بالکل ویسے ہی جیسے کچھ سال بعد وہ بمبئی چھوڑ گیا۔

میرے والد زندگی بھر لڑتے رہے''کوڑی نہ رکھ کفن کے لئے'' کے ساتھ ساتھ جو دوسرا نعرہ لگایا کرتے تھے وہ تھا ''سر قائم جنگ دائم''۔ اور وہ اپنے لڑکوں کو بھی یہی نیک صلاح دیا کرتے تھے۔ چونکہ ان کا خیال تھا کہ ان کا کوئی بیٹا شہر کا سب سے بڑا لڑاکا ہوگا، اس لئے وہ سب کو لڑنے کے طریقے بتایا

کرتے تھے۔ سب سے زیادہ زور وہ اس بات پر دیا کرتے تھے کہ جو آدمی پٹ سکتا ہے وہی پیٹ بھی سکتا ہے۔ پیٹنے سے پٹنا مشکل ہے۔ پٹو، لیکن پیٹنے والے کو نہ چھوڑو۔ میری صحت تو لڑکپن ہی سے خراب تھی۔ اپنے والد یا بھائیوں کی طرح تو میں کیا لڑتا، لیکن یہ بات ضرور ذہن نشین ہوگئی اور کشمکش حیات میں جہاں جہاں بھی معرکہ پڑا ہے، میں نے پٹ کر آخر پیٹنے والے کو پیٹ دیا ہے۔

منٹو سے میرا دو بار سابقہ پڑا۔ ایک بار دلی میں اور دوسری بار بمبئی میں۔ دہلی میں، میں نے اسے زک دے دی۔ لیکن بمبئی میں ہماری جوڑ برابر رہی۔

''دھواں'' کے سلسلے میں ہم میں جو چشمک ہوئی اس کے بعد میرے اور اس کے تعلقات اور بھی کشیدہ ہو گئے۔ چونکہ منٹو زور میں تھا اور کرشن اگر مجھے کچھ نہ کہتا تھا لیکن ہر بار منٹو کے لئے ڈھال بن جاتا تھا، اس لئے میرا وار اوچھا پڑتا تھا۔ لیکن اس دوران میں اپنے زعم میں منٹو، راشد سے بھی بگاڑ بیٹھا۔ راشد آزاد نظم کے بانی سمجھے جاتے تھے اور منٹو کو آزاد نظم سے چڑ تھی۔ انہیں دنوں راشد کی نظموں کا مجموعہ 'ماورا' کے نام سے شائع ہوا جس پر کرشن چندر نے دیباچہ لکھا، منٹو نے دونوں کا مذاق اڑایا۔ اس نے 'نیلی رگیں' کے عنوان سے ایک ڈرامہ بھی لکھا جس میں راشد کی نظموں سے الفاظ لے کر ان کا مذاق اُڑایا۔ ڈرامہ آزاد نظم سے شروع ہوتا ہے۔ دو مکالمے دیکھئے:

''سعید (شاعر) کرشن، تم نے کبھی کسی عورت کے ٹھنڈے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبائے ہیں؟

کرشن: ٹھنڈے ہاتھ......؟

سعید: ٹھہرو، مجھے اپنا فقرہ درست کر لینے دو۔ اب بتاؤ کیا تم نے کسی اجنبی عورت کے ٹھنڈے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبائے ہیں۔ ایسے ہاتھ جو چاند کی طرح خنک ہوں۔ کسی اجنبی عورت کے ہاتھ جو تمہاری زندگی میں یوں داخل ہوں جیسے رات کے سنسان اندھیرے میں کوئی جگنو بھٹکتا آ نکلے۔

کرشن: (مذاق کے طور پر) اپنی دم سے لالٹین باندھے نہیں۔ چاند کی ڈلی چوستا ہوا ادھر آ نکلے۔ تمہیں آج ہو کیا گیا ہے سعید۔ یہ ٹھنڈی یخ عورت تمہاری زندگی میں کب داخل ہوگئی؟

کچھ دن منٹو آزاد شاعری کا، راشد کی نادر تشبیہوں کا، اجنبی عورت کا، زمستان کی رات کا مذاق اُڑاتا رہا، پھر اس نے کوئی دوسرا موضوع ڈھونڈ لیا اور بات آئی گئی ہوگئی۔ لیکن راشد اُسے نہیں بھولے۔

اس کے بعد ایک دن منٹو نے کوئی ڈرامہ لکھا اور راشد کو پڑھنے کے لئے دیا۔ راشد ٹائپ مسودہ اپنے کمرے میں لے گئے اور کچھ دیر بعد واپس آ کر انہوں نے مسودہ واپس کیا۔

''کیسا ہے؟'' منٹو نے پوچھا۔

''نہایت اچھا ٹائپ ہوا ہے۔'' راشد نے اس استہزا آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا جو ان کی اپنی چیز تھی۔ اور منٹو بقول خود کباب ہو گیا۔ اس کے بعد منٹو ہفتوں راشد اور ان کی نظموں کو کوستا رہا۔ اپنے کسی دوست سے اس نے راشد کی نظموں پر ایک مضمون بھی لکھوایا۔

ہندی صلاح کار کی حیثیت سے میں زیادہ وقت راشد کے ساتھ گزارتا تھا اور چونکہ منٹو اور راشد میں چلنے لگی تھی، راشد میرے پڑوسی بھی تھے اس لئے منٹو مجھے زیادہ نقصان نہ پہنچا سکتا تھا۔ تاہم مجھے پریشان کرنے میں منٹو نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

پھر غالباً ۱۹۴۲ء کے اواخر یا ۱۹۴۳ء کے شروع میں (ٹھیک سن مجھے یاد نہیں) اچانک ایک دن راشد ترقی کر کے پروگرام ڈائریکٹر (پروگرام اگزیکیٹو) ہو گئے۔ راشد نے چارج سنبھالتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ کرشن کی غیر حاضری میں اس کا تبادلہ لکھنؤ کرا دیا۔ بات دراصل یہ تھی کہ راشد کو چھوڑ کر دہلی کے ریڈیو اسٹیشن پر پروگرام اسسٹنٹوں میں کرشن سب سے قابل تھا۔ اور باقی جتنے پروگرام اسسٹنٹ تھے وہ اپنا شیڈول بنانے میں کرشن سے مدد لیتے تھے اور ظاہر ہے کہ اس کا کہنا مانتے تھے، پروگرام ڈائریکٹر تک بیسیوں باتوں میں کرشن سے مدد لیتے تھے اس لئے اس کے کام میں دخل نہ دیتے تھے، اور بہت سی باتیں کرشن براہِ راست ڈائریکٹر سے منظور کرا لیتا تھا۔ راشد کی فطرت میں آمریت کا کافی دخل ہے۔ انہیں یہ منظور نہ تھا کہ کرشن ان کو نظر انداز کر جائے، اس لئے انہوں نے اس کو لکھنؤ بھجوا دیا۔ لیکن کرشن کی تبدیلی جن حالات میں ہوئی (راشد نے ان کی غیر حاضری میں ان کے خلاف کچھ الزامات لگائے اور چونکہ بخاری صاحب تک راشد کی براہِ راست رسائی تھی، اس لئے فوراً تبادلہ کرا دیا) اس سے مجھے رنج ہوا اور میں نے راشد سے اپنے اس افسوس کا اظہار بھی کیا۔ راشد امید کرتے تھے کہ میں ان کی تائید کروں گا۔ لیکن جب میں نے کرشن کی طرفداری کی تو باوجود اس کے کہ ہم برابر کے گھروں میں رہتے تھے اور میری بیوی اور بیگم راشد میں بہت اچھے تعلقات تھے، روز کا ملنا بیٹھنا تھا، راشد مجھ سے بدظن ہو گئے۔

راشد پروگرام ڈائریکٹر ہو گئے اور کرشن چلے گئے تو منٹو نے کچھ ہی دنوں میں دوسرے پروگرام

ڈائریکٹر (سریندر چوپڑا) کو گانٹھ لیا۔ اس کے جنم دن پر منٹو نے ایک بڑھیا سوٹ اسے پرزنٹ کیا اور یوں اسے اپنی طرف ملا لیا۔ اڈوانی چونکہ مجھ سے خوش تھے اس لئے انہوں نے مجھے نئے پروگرام اسسٹنٹ کے آنے تک کرشن کی جگہ سنبھالنے کے لئے کہا۔ منٹو کا ڈرامہ شیڈول پر تھا۔ میں نے پروڈیوس بھی کیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ منٹو اس کی ریہرسلوں میں اسٹوڈیو بھی آتا رہا۔ حالانکہ وہ شاذ ہی اپنے ڈراموں میں دلچسپی لیتا تھا۔

اس دوران لکھنؤ سے ہندی کا ایک پروگرام اسسٹنٹ کرشن کی جگہ لینے پہنچا جو نہایت بدصورت، لمبا تڑنگا، چپٹی ناک والا نوجوان تھا۔ اڈوانی نے صبح اسے اور مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور اس سے کہا کہ وہ کچھ دن تک مجھ سے کام سیکھے۔ کرشن کے کمرے میں ایک میز اور دو کرسیوں کے علاوہ زیادہ جگہ نہ تھی۔ میں میٹنگ کے بعد کرشن والی کرسی پر جا بیٹھا اور اس دن کا کام نمٹانے لگا۔ لیکن میٹنگ کے بعد ہی منٹو نے اس لکھنوی پی۔ اے (پروگرام اسسٹنٹ کو) سمجھایا کہ وہ پروگرام اسسٹنٹ ہے اور اسے کرشن والی کرسی پر بیٹھنا چاہئے۔ وہ اپنے آپ کو سمجھتا بھی بہت تھا، کام سیکھنے کی بات بھی اسے اچھی نہ لگتی تھی۔ اس نے راشد سے پوچھا تو راشد نے بھی اس سے یہی کہا کہ ڈرامہ ڈپارٹمنٹ کی سب ذمہ داری تمہاری ہے، اشک تو آرٹسٹ ہے۔ کوئی بھی خرابی ہو، جواب دہ پروگرام اسسٹنٹ ہی ہوگا، مجھے ان سب باتوں کا علم نہ تھا۔ میں کرشن والی کرسی پر بیٹھا کام کر رہا تھا کہ منٹو اس لکھنوی پی۔ اے کے ساتھ آیا۔ میرا دھیان مسودے میں لگا تھا کہ منٹو نے میری کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ آپ کی کرسی ہے۔''
ساتھ ہی اس نے میرے سامنے پڑی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا'' آپ ادھر آجایئے۔''

میں نے نگاہیں اٹھائیں۔ پی۔ اے کی آنکھوں میں تحکم تھا اور منٹو کی آنکھوں میں فاتحانہ چمک۔ مجھے معاملہ سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ میں نے کہا۔'' میں اوپر اپنے کمرے میں جاتا ہوں۔ آپ کو میری ضرورت ہو تو وہیں آجایئے گا۔''

اور میں چلا گیا۔ میری آنکھوں کے آگے غصہ کے مارے اندھیرا چھا گیا۔ راشد سے میں نے ذکر کیا تو معلوم ہوا کہ لکھنوی پی۔ اے ان سے مل چکا ہے۔ یہ بھی پتہ چل گیا کہ وہ چاہتے ہیں ان کے پروگرام اسسٹنٹ خود ہی غلطیاں کر کے سیکھیں۔ دراصل انہیں یہ بات پسند نہ آئی تھی کہ اڈوانی نے بغیر ان سے پوچھے مجھے کرشن کی جگہ کام کرنے کو کہہ دیا۔ میں اس کا شائق بھی نہ تھا۔ کیونکہ ایک بار جب

جنگل صاحب نے مجھے پی۔اے کی جگہ آفر کی تھی تو میں نے انکار کر دیا تھا۔لیکن ایک بار جب میں اس جگہ جا بیٹھا تو اس طرح اٹھنا اور وہ بھی منٹو کے سامنے،اس کی انگیخت پر مجھے کھل گیا۔ پہلے خیال آیا کہ اڈوانی کے پاس جاؤں کیونکہ انہوں نے ہی مجھے بھیجا تھا۔لیکن پھر سوچا کہ اڈوانی کچھ نہ کر سکیں گے۔ منٹو کی فاتحانہ چمک میرے دل میں دور تک گھاؤ کرتی چلی گئی۔اسی غصہ میں ایک لمحے کے لئے خیال آیا کہ استعفا دے دوں، پھر خود ہی اس پر ہنسی آ گئی۔جھلایا ہوا اوپر اپنے کمرے میں جا بیٹھا۔منٹو کی آنکھوں کی چمک پھر سامنے آ گئی...... خدا گواہ ہے اگر منٹو اس لکھنوی پی۔اے کے ساتھ نہ آیا ہوتا اور اس کی آنکھوں میں وہ چمک نہ ہوتی تو میں وہ سب نہ کرتا جو میں نے کیا اور منٹو کو دہلی نہ چھوڑنی پڑتی۔

اس وقت کمرے میں جا بیٹھا تو کام کرنا میرے لئے یکسر مشکل ہو گیا۔ بار بار اپنی ہتک کا خیال آنے لگا۔راشد پر غصہ آتا،اس لکھنوی پی،اے، پر غصہ آتا لیکن سب سے زیادہ غصہ آتا منٹو پر!اس کی آنکھوں میں جو چمک تھی اس سے پتہ چل گیا تھا کہ میری ہتک کرنے والا نہ وہ پی اے ہے، نہ راشد،منٹو ہے اور میں نے طے کر لیا کہ منٹو کو اس سازش کا مزہ چکھاؤں گا۔میرے غصے کی ایک وجہ یہ بھی کہ جتنے دن میں نے کرشن کی جگہ کام کیا اس میں منٹو ہی کا ڈرامہ پروڈیوس کیا اور حتی الامکان کوشش کی کہ میں اس میں ایک لفظ نہ کاٹوں اور وہ اچھے سے اچھا پروڈیوس ہو۔کچھ پہلے کا غصہ اور کچھ تازہ ہتک کا گھاؤ،کام دام چھوڑ کر میں بس کہنیاں میز پر ٹکا،ہتھیلیوں پر ٹھوڑی رکھ کر بیٹھ گیا۔

جانے اجداد میں سے کسی نے مہرشی چانکیہ کے آشرم میں تعلیم پائی تھی یا جانے ہمارا خاندان ان سے وابستہ تھا یا بچپن سے والد محترم سے اس مہرشی کے کارنامے سن سن میں نے اسی کی طرح سوچنا سیکھ لیا تھا، بہر حال ہمیشہ جب مجھ پر مصیبت آئی،میری سمجھ اور سوچ کی قوتیں اور بھی تیزی سے کام کرنے لگیں اور توہین کرنے والے کو، اگر وہ میرے برابر کا یہ مجھ سے اونچا ہے، میں نے کبھی معاف نہیں کیا (اور یہ بات کتنی بری کیوں نہ ہو) اس سے ضرور انتقام لیا اور نہ صرف ہر مصیبت سے نکلا ہوں، بلکہ ایک دم آگے ہی بڑھا ہوں۔

سوچنے پر مجھے محسوس ہوا کہ یہ لکھنوی پروگرام اسسٹنٹ نہایت احمق آدمی ہے۔یہ ٹھیک ہے کہ منٹو نے اسے بھڑکایا،لیکن جو منٹو کے کہنے میں آ گیا،اس کی حماقت میں کیا شک ہے۔اس وقت ہندی میں میرا کافی نام تھا۔اس نے میرا نام نہ سنا ہو،ایسی بات نہیں۔وہ سمجھدار ہوتا تو مجھے الگ لے جا کر بات

کر لیتا اور یوں تحکمانہ لہجے میں مجھ سے کچھ نہ کہتا۔ سوچا کہ اس احمق ہی کو آلۂ کار بنایا جائے اور کچھ دیر بعد میں نیچے گیا۔ لکھنوی پی۔ اے سینہ تانے، چپٹی ناک چڑھائے۔ نتھنے پھلائے، لکھنؤ کے اپنے قصے سنا رہا تھا کہ کیسے چپ صاحب (جو اس وقت لکھنؤ کے اسٹیشن ڈائریکٹر تھے) اسے چاہتے ہیں اور کیسے کیسے اس نے وہاں کارہائے نمایاں سرانجام دیے ہیں اور منٹو (اپنی عادت کے خلاف) چپ چاپ پاؤں کرسی پر رکھے، گھٹنے بانہوں میں دبائے ہمہ تن گوش اس کی لن ترانیاں سن رہا تھا، میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ کرسی تو دوسری تھی نہیں کہ بیٹھتا۔ دونوں نے ایک نظر مجھے دیکھ لیا۔ کچھ دیر کے بعد منٹو کو جو بڑا صاحب کا چپراسی بلا کر لے گیا تو میں نے ان لکھنوی حضرت سے کہا۔ "مجھے ابھی معلوم ہوا ہے کہ آپ ہندی کے آدمی ہیں۔ اس اسٹیشن پر ہندی کے ایک پروگرام اسسٹنٹ کی بڑی ضرورت تھی۔" اور میں نے اسے شام کو گھر پر چائے کے لئے مدعو کر دیا۔

میں ان دنوں تیس ہزاری میں رہتا تھا۔ وہاں نزدیک ہی چھوٹی سی پہاڑی اور خوشنما جنگل ہے۔ برسات کی شام تھی۔ چائے پلا کر میں اس لکھنوی احمق کو رج لے گیا۔ بادل گھرے ہوئے تھے اور بڑی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ وہ لگاتار اپنی تعریفیں کرتا رہا کہ کس طرح اس نے ڈرامے لکھے، کس طرح چپ صاحب نے کہا کہ ویسا اسکرپٹ (Script) ہندی میں کوئی نہیں اور کس طرح انہوں نے اس کی سفارش کرا کے اسے پروگرام اسسٹنٹ بنا دیا۔ میں نے بھی اسے خوب چنگ پر چڑھایا۔ اس کی شخصیت کی تعریف کی۔ اسے سمجھایا کہ اگر شروع ہی سے اس نے اپنا سکہ جما دیا تو سب اس سے خوف کھائیں گے، نہیں تو آرٹسٹ اچھے سے اچھے کو بدھو بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ میں نے اس سے یہ بھی کہا کہ پی۔ اے کا کام ہے کہ جو ڈرامے براڈ کاسٹ ہوں انہیں اچھی طرح پڑھے، ویٹ کرے۔ اس نے کہا کہ وہ ایک بھی چیز پڑھے اور ویٹ کئے بغیر براڈ کاسٹ نہ ہونے دے گا۔ "اب جب آپ آ گئے ہیں اور ہندی جانتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "تو میں آئندہ ڈرامے آپ کی سہولت کے لئے ہندی رسم الخط ہی میں لکھوں گا۔ باقی تو اردو مسودے ہی آئیں گے، وہ آپ مجھ سے سن کر ویٹ کیا کیجئے۔ اور یوں اچھی طرح دیکھ کر براڈ کاسٹ کیجئے۔ کیونکہ خراب ڈرامہ براڈ کاسٹ ہو تو ذمہ داری آپ کی ہوگی اور میٹنگ میں ڈانٹ آپ ہی کو پڑے گی۔" اس پر اس نے اپنی قابلیت کے بارے میں میرے علم کو اور بڑھایا اور بہت خوش خوش واپس ہوا۔

اب شیڈیول تو تین مہینے پہلے بن جاتا تھا اور وہ کرشن بنا کر گیا تھا۔ میں مہینے دوسرے مہینے ڈرامہ لکھتا تھا اور منٹو کے دو تین ڈرامے ہر مہینے ہوتے تھے۔ اگلا ڈرامہ منٹو ہی کا تھا۔ نام تھا (جہاں تک کہ مجھے یاد ہے) ''آوارہ''! پلاٹ وغیرہ میں سب بھول گیا ہوں۔ اتنا یاد ہے کہ وہ ڈرامہ بھی منٹو کے ان دنوں لکھے بیشتر ڈراموں کی طرح ایک ہی دن میں لکھا ہوا تھا۔ دوسرے ہی دن اس لکھنوی پی۔ اے نے اس کا مسودہ نکالا اور مجھے بلایا۔ میں اسے اسٹوڈیو میں لے گیا اور وہاں جا کر اسے سنانے لگا۔ اس کو زبان وغیرہ یا ڈرامہ وغیرہ کی خاک سمجھ نہ تھی۔ ڈرامہ سناتے سناتے میں کہتا۔ ''کیوں صاحب اس لفظ کی جگہ یہ لفظ ہو تو کیسا رہے؟'' اور وہ کہتا۔ ''ہاں ہاں، یہ بہتر ہے۔'' اسی طرح میں لال پنسل کی مدد سے الفاظ اور محاورے بدلتا چلا گیا۔ دو چار جگہ میں نے گول نشان لگا دیے۔ میں نے ان حضرت سے کہا کہ راشد صاحب ان الفاظ کے سخت خلاف ہیں۔ ان کے ساتھ سال ڈیڑھ سال کام کر کے میں جان گیا ہوں۔ میں ان کو نہیں بدلتا۔ یہ وہ خود بدل دیں گے اور اس طرح ان تبدیلیوں کی تمام تر ذمہ داری ان کی ہو جائے گی۔ ڈرامہ کا اختتام میں نے کاٹ دیا اور اس کی جگہ تین اختتام تجویز کر دیے۔

جیسا کہ میں نے سوچا تھا، ویسا ہی ہوا، اس لکھنوی پی۔ اے نے راشد پر بڑا رعب ڈالا کہ اس نے منٹو کا ڈرامہ پڑھا ہے، بڑا خام ہے۔ اس نے بڑی محنت سے ویٹ کیا ہے۔ راشد مسودہ دیکھیں اور پاس کریں تو براڈ کاسٹ ہو۔ راشد تو منٹو سے پہلے ہی جلے بیٹھے تھے، ان کو اپنا پرانا بدلہ نکالنے کا موقعہ ہاتھ آیا اور انہوں نے وہ چند الفاظ بھی جن پر میں نے لال پنسل سے گول دائرے بنا دیے تھے، بدل دیے۔

جب منٹو کو معلوم ہوا کہ اس کا ڈرامہ ویٹ ہوا ہے تو اس کے سر پر خون سوار ہو گیا۔ وہ ڈائریکٹر کے کمرے میں گیا اور اس نے راشد اور اس لکھنوی پی۔ اے کو بے نقط سنائیں اور کہا کہ ڈرامہ ہوگا تو بنا ایک لفظ کٹے ہوگا، ورنہ نہیں ہوگا۔

میں اوپر نوبڑ ہ کلارک (انگریزی اناؤنسر) کے کمرے میں بیٹھا کرتا تھا۔ اڈوانی کے کمرے کا روشندان میری آنکھوں کے سامنے پڑتا تھا۔ نیچے اڈوانی کے کمرے میں منٹو کچھ اتنے زور سے چلا رہا تھا کہ میں اٹھ کر روشندان کے پاس چلا گیا اور جھک کر اندر کا نظارہ کرنے لگا۔ راشد کہہ رہے تھے کہ انہوں نے خود ڈرامہ پڑھا ہے اور ہوگا تو انہیں تبدیلیوں کے ساتھ ہوگا ورنہ نہیں ہوگا اور ڈیوی ایشن (Deviation) یعنی جدول کے انحراف کی ذمہ داری ان کی نہیں ہوگی۔ جب ہم باہر والوں کی چیزیں

ٹ کر سکتے ہیں تو اپنے آرٹسٹوں کی کیوں نہیں کر سکتے۔ اور منٹو پنجرے میں بند شیر کی طرح تلملا رہا تھا
رتقریباً دہاڑتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ ڈرامہ ہوگا تو اسی روپ میں ہوگا ورنہ نہیں ہوگا۔

مجھے منٹو کی اس تلملاہٹ کو دیکھ کر کچھ عجیب سی شیطانی مسرّت ہوئی۔ منٹو نے مجھے جتنی گالیاں دی
یں، میری ترقی کے راستے میں جو رکاوٹیں ڈالی تھیں۔ اردو کا ٹائپ رائٹر میرے ہاتھ بیچتے ہوئے جو
لیس روپیہ جھوٹ بول کر زیادہ لے گئے تھے اور اوپر سے مجھے بنایا تھا اور جتنا بھی مجھے ستایا تھا، اس
ب کا صلہ ان چند لمحوں کی اس کی تلملاہٹ میں مجھے مل گیا۔ ''ساردی ٹھک ٹھک، لوہاردی اکو سٹ۔''
ں نے من ہی من میں پنجابی کا محاورہ دہرایا اور واپس اپنے کمرے کی طرف پھرا۔

مجھے یاد نہیں، اڈوانی نے کیا فیصلہ دیا تھا، غالباً انہوں نے راشد پر سب کچھ چھوڑ دیا تھا اور پروگرام
ائریکٹر کے کام میں مداخلت کرنے سے انکار کر دیا تھا، بہرحال ایک عجیب سی شیطانی مسرّت سے
عمور میں واپس آ کر کرسی پر بیٹھ گیا اور ٹانگیں میز پر پھیلا کر اطمینان کی سانس لی۔

لیکن اس مسرّت اور اطمینان کے باوجود کچھ عجیب طرح کی تکلیف اور اداسی کا احساس دل دماغ
پر طاری ہو گیا۔ آنکھوں کے سامنے منٹو کی تلملاہٹ، اس کے خوبصورت ماتھے پر پڑی ہوئی شکنیں، اس کی
باہر کو نکلی ہوئی آنکھیں۔ سب کچھ گھوم گیا۔ اور اس کی تلملاہٹ کا باعث میں تھا۔ میں جو درحقیقت اسے
چاہتا تھا، اس کے پاس بیٹھنا چاہتا تھا، اس کے افسانوں کا اس کے نام نہاد چاہنے والوں سے کہیں زیادہ
مداح تھا، میں، جس نے دو ایک مہینہ پہلے اپنے ڈراموں کا دوسرا مجموعہ ''چرواہے'' اس کے نام معنون
کیا تھا۔

''چرواہے'' کا ایک نسخہ میرے پاس پڑا ہے۔ منٹو کے نام کیا ہوا انتساب میرے سامنے ہے۔

منٹو کے نام
جو مجھے کبھی بہت اچھا لگتا ہے اور کبھی سخت بُرا

میرے اس وقت کے جذبات کی کتنی صحیح تصویر انتساب پیش کرتا ہے۔

دوسرے دن میٹنگ میں ڈرامہ کا قصہ پیش ہوا۔ لکھنوی پی۔ اے نے راشد کے کہنے پر ڈرامے کی
تحریری تنقید پیش کی، آل انڈیا ریڈیو، دہلی کی زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ کسی ہونے والے ڈرامے کی
تنقید میٹنگ میں ہو۔ لیکن چونکہ ڈیوی ایشن کا سوال تھا، اگر وہ ڈرامہ نہ ہوا تو اس کی جگہ دوسرا ڈرامہ چننے

کی بات تھی اس لئے راشد نے میٹنگ میں وہ بات اٹھائی۔لکھنوی پی اے نے پہلے ہی سے وہ تنقید تیار کر رکھی تھی۔تو اس نے پڑھ دی۔ بہر حال منٹو کی تنقید ہوا اور وہ بھی بھری میٹنگ میں، یہ کبھی نہ ہوا تھا، منٹو اس طرح اپنی تنقید سننے کا عادی نہیں تھا، لکھنوی پی۔ اے کی سمجھ کے بارے میں اس نے دو تین تیز باتیں کیں اور تیز باتیں کہتے وقت منٹو کچھ سوچتا نہ تھا، مجھے پھر غصہ آ گیا اور میں نے کہا کہ یہ ڈرامہ میری نظر سے بھی گزرا ہے اور ان صاحب نے بالکل ٹھیک تنقید کی ہے۔اور چونکہ سب قطع و برید میں نے کی تھی اس لئے میں نے بڑی صفائی سے اس ڈرامے کی کمزوریاں اُجاگر کر دیں۔

مجھے اب یاد نہیں، منٹو نے کیا کہا، لیکن غصہ میں اس نے میری قابلیت کے بارے میں کوئی تیز بات کی جس کا مطلب تھا کہ تکنیک کے ضمن میں میں کچھ نہیں جانتا اور پوچھا کہ تم اس سے بہتر لکھ کر دکھا سکتے ہو؟

میں نے اور بھی تیز لہجہ میں کہا کہ میں تمہیں دس برس تک ڈرامہ لکھنا سکھا سکتا ہوں۔تم اُوپر میرے کمرے میں آؤ تو تمہیں بتاؤں، ڈرامہ کیسے لکھا جاتا ہے اور یہ ڈرامہ بھی بہتر بنا کر دکھا دوں۔

بات بڑھ جاتی، لیکن شور سن کر اڈوانی صاحب اپنے کمرے سے آ گئے۔۔طے ہوا کہ ڈرامہ تصحیح شدہ حالت میں ہوگا اور چونکہ اپنے آرٹسٹ کا سوال ہے اس لئے جدول سے انحراف نہیں ہوگا۔

منٹو میٹنگ کے بعد دفتر میں نہیں رُکا۔اُس نے ٹائپ رائٹر اُٹھایا اور چلا گیا۔دوسرے دن بھی وہ دفتر نہیں آیا دوپہر کو خورشید صاحب (سکریٹری انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ) کا فون آیا کہ منٹو کا ڈرامہ اگر براڈکاسٹ کرنا مقصود ہو تو منٹو کے لکھے ہوئے مسودے کے مطابق کیا جائے ورنہ رد کر دیا جائے۔

(ٹھیک واقعات مجھے یاد نہیں رہے۔غالباً ڈرامہ خورشید صاحب نے منگایا تھا اور پھر انہوں نے یہ پیغام بھیجا تھا۔راشد چونکہ تُلے ہوئے تھے کہ وہ جدول سے انحراف نہیں ہونے دیں گے اور ڈرامہ تصحیح شدہ حالت میں کریں گے اس لئے خورشید صاحب کے ذریعے اُسے کینسل کرا دیا تھا۔)

تیسرے دن بھی منٹو دفتر میں نہیں آیا۔ڈرامہ اس نے منگا لیا۔ چوتھے یا پانچویں یا غالباً ساتویں دن سُنا کہ وہ بمبئی چلا گیا ہے اور اسے فلم کمپنی میں پانچ سو کی جگہ مل گئی ہے۔

گرانٹ روڈ کو جاتے ہوئے وکٹوریہ میں میرے سامنے بیٹھے بیٹھے منٹو نے بتایا کہ نوکری ووکری اُسے کچھ نہیں ملی تھی اور بمبئی میں اُسے خاصی تکلیف ہوئی، بیوی کو وہ دہلی میں چھوڑ آیا تھا۔ بعد میں فلمستان میں اُسے ساڑھے تین سو کی نوکری ملی تو غالباً اس کا دوست نذیر جا کر اس کی فیملی کو بمبئی لے آیا۔

"وہ تمہارا لال کیا ہوا مسودہ اب بھی میرے پاس محفوظ ہے۔" اچانک منٹو نے کہا یعنی جس طرح مجھے نہ راشد پر غصہ تھا، نہ اس لکھنوی پی اے پر بلکہ منٹو پر غصہ تھا اسی طرح منٹو کو بھی ان دونوں کے بجائے مجھی پر غصہ تھا اس کا ڈرامہ میں نے کاٹا ہے، یہ بات وہ جان گیا تھا۔

"اب تمہارے کیا ارادے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

منٹو چپ رہا۔

"دیکھو، دہلی کی دہلی میں رہی۔ اگر ہمیں اسی طرح لڑنا ہے تو مجھے فلمستان کی نوکری منظور نہیں۔ وہاں ساڑھے تین سو پاتا ہوں آرام سے ہوں۔ یہاں پانچ سو بھی ملے اور چخ چخ رہی تو کیا فائدہ۔"

"نہیں نہیں۔ ویسا کچھ نہیں ہوگا۔" اور اس نے انگریزی میں فقرہ پورا کرتے ہوئے کہا۔ اس دن گھر واپس آکر میں نے صفیہ بھابھی سے کہا۔ "دیکھئے منٹو نے مجھے بمبئی بلایا ہے۔ میں آنہیں رہا تھا۔ دوبارہ تار دینے پر چلا آیا ہوں۔ منٹو نے باتوں باتوں میں بتا دیا ہے کہ وہ "آوارہ" کا مسودہ سنبھالے ہوئے ہے اور دلی کے اس واقعہ کو نہیں بھولا۔ ہم دہلی میں لڑتے رہے ہیں اور لوگوں کے لئے تماشا بنے ہیں اب اس نے مجھے بمبئی بلایا ہے تو آپ اسے سمجھا دیجئے کہ مجھے یہاں تنگ نہ کرے، کیونکہ وہ تنگ کرے گا تو میں بھی تنگ کروں گا اور آخر ہم دونوں تنگ ہوں گے۔"

منٹو اور صفیہ بھابی نے مجھے یقین دلایا کہ ویسی کوئی بات نہیں ہوگی۔ اور میں نے اگرچہ کانٹریکٹ پر دستخط نہیں کئے لیکن 'ہاں" کر دی۔ لیکن جب میں نے سوچا تو میں نے طے کیا کہ میں حتی الامکان اس بات کا موقع ہی نہ آنے دوں گا کہ منٹو سے میری لڑائی ہو۔ اور بمبئی میں جتنے میرے واقف کار تھے ان سے مل کر میں نے فلمستان، اس کے کرتا دھرتا ششدھر مکرجی اور وہاں کے طریق کار کے بارے میں واقفیت حاصل کی۔ میں خاص طور پر ان لوگوں سے ملا جو منٹو کے ساتھ کام کرتے تھے اور اب وہاں نہیں تھے۔ مجھے تین چار اہم باتوں کا پتہ چلا۔

(۱) فلمستان کا باس مکرجی زمانہ قدیم کے سادیت پسند ان داروغوں جیسا ہے جو غلاموں کو کوڑے مار مار کر ان سے کام لیتے تھے۔

(۲) فلمستان میں منٹو کا ایک چھتر راج ہے۔

(۳) جب سال بھر پہلے شاہد لطیف نے میرا نام تجویز کیا تھا تو منٹو نے فلمستان میں میرے آنے کی

ہیں اور

سب کو رد کر کے خود لکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ سب سے اچھا ہوتا ہے۔ اسی طرح انہوں نے شاہد لطیف اور سنتوش کو فلمستان چھوڑنے پر مجبور کر دیا جبکہ شاہد لطیف ہی منٹو کو فلمستان میں لے گیا تھا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ایک سال پہلے منٹو مجھے خطرناک سمجھتا تھا تو سال بھر بعد میں کس طرح اتنا بے ضرر ہو گیا کہ خود اس نے ہی مجھے وہاں بلوایا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب منٹو نے مجھے فلمستان میں کام کرنے کے لئے خط لکھا تھا تو خود میں نے اپنے آپ سے یہی سوال کیا تھا اور پہلی بار میں نے جانے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن ایک مہینے بعد جب منٹو نے مجھے تار دیا کہ انٹرویو کو آؤ اور سکینڈ کلاس کا کرایہ کمپنی دے گی تو چونکہ کوشلیا ٹریننگ لینے بمبئی جا رہی تھی۔ لہٰذا میں بھی تیار ہو گیا۔ خیال تھا کہ کچھ نہ سہی تو بمبئی کی سیر ہی ہو جائے گی۔ لیکن وہاں جانے کا فیصلہ کرنے کے باوجود میں سوچتا تھا کہ آخر منٹو نے مجھے کیوں بلایا ہے۔ اس وقت میں جس نتیجے پر پہنچا تھا، اس میں مجھے بمبئی میں منٹو سے ملنے اور وہاں کے حالات جاننے پر تھوڑی سی ترمیم کرنی پڑی۔ لیکن اس بنیادی وجہ میں فرق نہیں پڑا۔ چونکہ اس قصہ کا ایک نفسیاتی پہلو بھی ہے اور خاصا دلچسپ ہے، اس لئے میں اس کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا، مجھے منٹو سے نفرت نہ تھی۔ نفرت یا محبت کے لئے کچھ وقت کا ساتھ ناگزیر ہے اور میں تو دہلی آنے سے پہلے منٹو سے ملا بھی نہ تھا۔ اور جب ملا تو پہلی ملاقات میں، جہاں تک شکل وصورت کا تعلق ہے وہ مجھے اچھا لگا تھا۔ گورا چٹا رنگ۔ پتلا چھریرا جسم، فراخ پیشانی، ستواں ناک، بڑی بڑی آنکھیں اور ہونٹوں پر استہزا آمیز مسکراہٹ۔ منٹو کی یہی پہلی جھلک ہے جو میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ اس دوران میں، میں ''منتر''، ''نیا قانون'' اور شاید ''مسز ڈی کوسٹا'' پڑھ چکا تھا اور یہ افسانے مجھے بے حد اچھے لگے تھے اور منٹو نے میرے دل میں ایک مترجم کے بجائے ایک ذہین افسانہ نگار کی حیثیت سے جگہ بنالی تھی۔ لیکن دہلی میں میرے آنے سے پہلے ہی ہمارے لئے جو پارٹ ڈھل گئے تھے ان سے نجات نہیں ملی۔ ہمیں ایک دوسرے کا حریف ہونا تھا اور ہم باہم حریف ہو کر رہے۔

لیکن جب منٹو اچانک دہلی سے چلا گیا تو مجھے بڑا افسوس ہوا۔ کرشن لکھنؤ تبدیل ہو گیا تھا،

اختر الایمان کو راشد نے جواب دلوا دیا تھا۔ چڈھا، میرا جی اور راجہ مہدی علی خاں، راشد کی خوشامد میں لگے رہتے تھے اور راشد چونکہ مجھے کرشن کا آدمی سمجھتے تھے اس لئے مجھے تنگ کرنے کے درپے تھے۔ منٹو کی غیر موجودگی مجھے بہت شاق گزرتی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ منٹو کے رہنے پر کبھی کبھی جھپٹ ہو جاتی، خاصی چپقلش بھی رہتی تھی، لیکن اچھے سے اچھا لکھنے میں مدد بھی ملتی تھی اور ایک عجیب سی قربت کا احساس رہتا تھا۔ منٹو کے بمبئی جانے کے بعد اس کی اور اس کے افسانوں کی تعریف نہ کرنے کے سلسلے میں، میں نے اپنے اوپر زبردستی جو قید لگا رکھی تھی اسے ڈھیلا کر دیا۔ منٹو کے بمبئی جانے کے سال ڈیڑھ سال بعد۔ ٹھیک سن مجھے یاد نہیں، اس کا افسانہ ''بو'' شائع ہوا۔ اس افسانے کے شائع ہوتے ہی اس کے خلاف ایک شور برپا ہو گیا۔ چودھری نذیر احمد نے اس کے بارے میں میری بھی رائے مانگی۔ میں نے ''بو'' کی خوب تعریف کی۔ مجھے ''بو'' کے کنٹنٹ سے غرض نہ تھی۔ میں اس افسانے کی تکنیک پر فدا تھا۔ ایک بڑی نازک سی تھیم کو منٹو نے جس چابکدستی سے ''بو'' میں سمویا ہے، وہ نہ صرف قابل داد ہے بلکہ قابلِ تقلید بھی ہے۔ میں وہ افسانہ اپنے کئی دوستوں کو سنا چکا ہوں، جن میں ہندی کے مشہور افسانہ نگار یشپال بھی شامل ہیں اور یشپال میری رائے سے متفق ہیں۔ ہر مبتدی افسانہ نگار کو میرا مشورہ ہے کہ افسانہ کی تکنیک کو جاننے کے لئے وہ ''بو'' ضرور پڑھے۔ تکنیک کے کمال کے لحاظ سے اس کے جوڑ کا افسانہ بیدی کا ''لاجونتی''

[illegible] بتایا کہ تمہارے مکالموں کے پرخچے اڑا دے گا۔ تم خواہ ضرور ابھی پاؤ گے، لیکن تمہاری جان ضیق میں آجائے گی۔ اور میں سمجھ گیا کہ میں نے اس کے ڈرامے کی جو دھجیاں اڑائی تھیں اس کا انتقام لینے کی ترکیب اس نے یوں نکالی تھی۔ اور چونکہ میں 'ہاں' کر چکا تھا اور دہلی میں مشہور ہوگیا تھا کہ میں نے فلم کی نوکری کرلی ہے اس لئے میں واپس تو نہ گیا لیکن میں نے فلمستان میں اپنا لائحہ عمل طے کرلیا۔

میں نے اس وقت تک کنٹریکٹ پر دستخط نہ کئے جب تک فلمستان میں مجھے الگ کمرہ اور الگ میز کرسی نہیں مل گئی۔ (یہ پہلی احتیاط تھی کہ منٹو میں اور مجھ میں جھگڑے کی نوبت نہ آئے) اور یہ طے نہیں ہوگیا کہ صرف میں ہی نتن بوس کے لئے مکالمے لکھوں گا اور میں ہی ڈائیلاگ ڈائریکشن کروں گا۔

میرا پہلا فلم ''مزدور'' تھا اور دوسرا ''سفر'' جسے مترا نے ڈائریکٹ کیا۔ نہ صرف پہلے کے بلکہ دوسرے کے مکالمے بھی صرف میں نے لکھے اور یوں فلمستان کا ڈیڑھ سال نسبتاً آرام سے گزر گیا۔ منٹو کو اس بات کا قلق ضرور رہا کہ میں نے اس کی چال کاٹ دی لیکن میں نے اپنی عادت کو جانتے ہوئے نت جھگڑنے کے بدلے اس بات کا انتظام کرلیا کہ جہاں تک ممکن ہو اس سے بچا جائے۔

لیکن میری تمام احتیاط کے باوجود آخر منٹو مجھے ایک چوٹ پہنچانے میں کامیاب ہوگیا۔ میرا پہلا فلم ''مزدور'' خواہ باکس آفس پر کامیاب نہ رہا تھا لیکن میرے مکالمے ۱۹۴۵ء کے بہترین ڈائیلاگ سمجھے گئے تھے اور مجھے ایک سند بھی ملی تھی۔ میرا دوسرا فلم ''سفر'' باکس آفس پر بھی کامیاب رہا، اور ظاہر ہے کہ میرا کریڈٹ بھی بڑھ گیا۔ تب اشوک کمار نے اپنا الگ فلم پروڈیوس کرنے کی خواہش ظاہر کی اور مکر جی مان گئے۔ منٹو کے دونوں فلم ''چل چل رے نوجوان'' اور ''شکاری'' دو دو سال لینے کے باوجود نا کام رہے تھے۔ اس لئے اشوک کمار میرے پاس آئے اور انہوں نے مجھ سے ایک کہانی لکھنے کی فرمائش کی۔ میں نے ان کو دو تین پلاٹ، جو میرے ذہن میں تھے، سنائے، اشوک نے ایک پسند کرلیا اور مجھ سے کہا کہ میں ایک خاکہ

اوں گا اور ڈائیلاگ نوکری کے کھاتے میں لکھوں گا۔ اگرچہ اشوک کمار مکرجی کا سالا تھا لیکن دونوں سالے بہنوئی کے تعلقات کچھ کشیدہ تھے۔ اشوک نے کہا۔ "آپ مکرجی سے کہئے۔" لیکن مکرجی مجھ سے خوش نہ تھے۔ میں نے انکار کر دیا تب اشوک نے کہا کہ میں سیٹھ چنی لال سے کہوں گا۔ آپ بات کر لیجیے گا لیکن اس دوران میں آپ ایک خاکہ ضرور لکھ ڈالئے۔

منٹو کو یہ خبر مل گئی کہ اشوک میرے پاس پہنچا ہے اور میں دو ہزار روپیہ مانگ رہا ہوں تو اس نے واچا کو ساتھ بلا لیا۔ واچا اشوک کو اپنے فلیٹ پر لے گئے۔ شراب واچا کے ہاں اعلیٰ قسم کی رہتی تھی۔ اشوک کو انہوں نے اس وقت تک نہ آنے دیا جب تک یہ طے نہیں کر لیا کہ منٹو نئے فلم کی کہانی لکھے گا اور دوسرے دن اس کا مہورت ہو جائے گا۔

چونکہ کہانی کوئی تیار نہ تھی اور مہورت ہو گیا تھا اس لئے "آٹھ دن" کے فلم کے سلسلہ میں ...

کے سب ڈائیلاگ میں لکھتا تھا۔ منٹو ایک لائن لکھتا تو میں چار کر دیتا، منٹو ایک سین لکھتا تو میں اس کے دو بنا دیتا۔ مجھے اسٹیج ایکٹنگ تو پسند ہے لیکن فلم ایکٹنگ کو فلم ناٹک کی طرح میں کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ لیکن منٹو کو پریشان کرنے کے لئے وہ مضحکہ خیز رول میں کرتا رہا اور منٹو اتنا پریشان ہوا کہ ایک دن سیٹ پر ہاتھا پائی تک کی نوبت آ گئی۔

اور اس بار ہم دونوں ساتھ ساتھ فلمستان سے الگ ہوئے اور اگرچہ اشوک اور واچا منٹو کے دوست تھے اور منٹو ان کے ساتھ بمبئی ٹاکیز میں چلا گیا (جسے اشوک نے مکرجی سے علیحدہ ہو کر خرید لیا تھا) لیکن منٹو وہاں ایک بھی کہانی نہ دے سکا۔ جب میں پنج گنی سے الہ آباد آتے ہوئے اشوک سے ملا اور میں نے پوچھا کہ منٹو کیوں چلا گیا تو اس نے کہا کہ اس نے کہانی لکھی تھی، لیکن ہم نے کمال امروہوی کی کہانی ''محل'' لینے کا فیصلہ کر لیا۔ منٹو کچھ کہے بغیر چلا گیا حالانکہ ہم نے کہا کہ اس کے بعد تمہاری والی کہانی بنائیں گے لیکن اس نے نہیں سنا۔

در حقیقت ساؤنڈ رکارڈسٹ واچا (جو منٹو کا دوست تھا) اور بمبئی ٹاکیز کے مالک واچا میں فرق تھا اور منٹو ایسے آدمیوں میں گھر گیا جنہیں کبھی اس نے فلمستان چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اور جب اس نے دیکھا کہ اگلا راستہ بند ہے، کار موٹر نہیں چلے گی تو وہ باجو کی گلی سے پاکستان چلا گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کلیدی آسامیوں پر مسلمانوں کے آنے کی وجہ سے ایک دو چھٹیاں اشوک اور واچا کو ملی تھیں، لیکن اسٹوڈیو کو آگ لگانا اور خود بیکار ہو جانا آسان نہیں۔ اس کا اثر نہ شاہد لطیف نے لیا نہ نذیر اجمیری نے۔ منٹو کے بددل ہونے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ پہلی کہانی نذیر اجمیری کی چنی گئی اور دوسری کہانی کمال امروہوی کی۔ جس دن کمال امروہوی کی کہانی کا پتہ چلا، منٹو نے بمبئی چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

لیکن منٹو کی اس رن چھوڑیت اور باری صاحب کی رن چھوڑیت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ... چھوڑیت میں غالباً بزدلی کا عنصر تھا، جبکہ منٹو کی رن چھوڑیت اس کی زبردست ... منٹو کو خوشامد کرنے سے

بات نہیں اور پھر بنگالی کے ناتے بنگال کا چھوٹے سے چھوٹا شاعر ان کے نزدیک غالبؔ سے بڑا ہے!)
اشوک اور واچا کی محفل میں بیٹھ کر سوقیانہ لطیفے سناتے دیکھا ہے۔اَن پڑھ ایکٹروں اور میوزک ڈائریکٹروں کی محفلوں میں بڑی سرگرمی سے 'بکواس' کرتے سنا ہے (جسے منٹو بکواس اور دوسرے بذلہ سنجی کا نام دیتے ہیں) لیکن ان میں سے کسی بھی کام میں ان کی 'انا' کو ٹھیس نہیں پہنچی، کیونکہ اوّل تو یہ کہ وہ ان کو اپنے سے کہیں کمتر سمجھتا رہا اور دوسرے یہ سب لوگ خواہ منٹو کو نسلی سمجھتے ہوں، شرابی سمجھتے ہوں لیکن اوّل درجے کا ڈائیلاگ رائٹر سمجھتے تھے۔آل انڈیا ریڈیو کی اس میٹنگ میں جہاں راشد نے، میں نے اور اس لکھنوی پی۔اے نے اس کے ڈرامے کی "تنقید" کی اور بمبئی ٹاکیز کے اسٹوڈیو میں جہاں اشوک اور واچا (اس کے جگری دوستوں) نے اس کی کہانی کے مقابلے میں نذیر اجمیری اور کمال امروہوی کی کہانیاں لے لیں، منٹو کی انانیت کو زبردست ٹھیس پہنچی اور جب اس کی انانیت کو ٹھیس لگی تو پھر وہاں اس کے لئے ٹھہرنا مشکل ہو گیا۔کوئی موٹی کھال والا ابن الوقت مصنف ہوتا تو ہتک برداشت کرتا ہوا بھی وہیں جما رہتا۔لیکن منٹو کی انانیت کے لئے وہ ہتک ناقابلِ برداشت تھی، اور چونکہ پٹ کر پیٹ دینے کے فن میں وہ ماہر نہیں تھا، اس لئے دونوں بار میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔دونوں بار اسے سخت تکلیف ہوئی۔دوسری بار تو اس کی جان پر آ بنی، لیکن تکلیف کے خوف سے اپنی انانیت کو ٹھیس لگنے دینا اس نے منظور نہ کیا۔

پارٹی ہو، میٹنگ ہو (نارمل یا انفارمل) منٹو ہمیشہ پیش پیش رہنا پسند کرتا تھا، اگر کسی پارٹی یا محفل میں کوئی دوسرا آدمی لوگوں کی توجہ مبذول کر لے تو وہ بڑی خاموشی سے بغیر کسی کو بتائے کھسک جاتا تھا، یوں تو فلمستان میں اپنی ملازمت کے شروع کے دنوں میں، جب میں نے کانٹریکٹ پر دستخط کئے تھے، اور میری شرطیں مکرجی نے ابھی منظور نہ کی تھیں اور میں مکرجی کو غالبؔ کے بجائے مہادیوی ورما کے گیت سنایا کرتا تھا، میں نے منٹو کی انانیت کے اس پہلو کو دیکھا تھا لیکن ایک خاص واقعہ جسے میں بھلا نہیں سکا

بھی مدعو کیا۔ شام کو فلمستان کی کینٹین میں، جو کھلے میں بنی تھی اور چھت کے باوجود تین طرف سے کھلی تھی، میزیں لگادی گئیں اور ششدھر مکرجی، گیان مکرجی، اشوک، واچا، چتلکر، برمن، نیپالی، وغیرہ اکٹھے ہوئے چونکہ اس ایکٹر کو ہمارے ہاں آنے سے پہلے فلم پروڈیوسرز کی ایسوسی ایشن میں جانا تھا، اس لئے اسے دیر ہوگئی۔ بڑے مکرجی اُٹھ گئے، باقی لوگ وہیں بیٹھے گپ شپ کرتے رہے، منٹو حسب معمول باسز (Bosses) کے ساتھ بیٹھا، بقول شیام اپنی بذلہ سنجی ان پر ضائع کرتا رہا۔ میں نیپالی، برمن وغیرہ کے ساتھ بیٹھا تھا، آخر ایکٹر صاحب اپنی بیوی کے ساتھ تشریف لائے۔ لمبوترا سامنہ۔ جیسے کسی نے دونوں جبڑوں کو شکنجے میں کس کر چپٹا کردیا ہو، بالکل ویسا ہی جیسا فلم میں دیکھا تھا، ان کی بیوی بڑی حسین تھی، ظاہر ہے کہ روپیہ اور نام کی کشش نے اس حور کو اس لنگور کے پہلو میں لا بٹھایا تھا، بہر حال اس کے آگے آگے رائے بہادر چنی لال اور مکرجی آئے۔ کینٹین میں ایک بڑی میز بچھی تھی اور اس کے ساتھ چھوٹی چھوٹی میزیں لگی تھیں۔ بڑی میز مہمانوں اور کمپنی کے باسز کے لئے تھی اور چھوٹی میزوں پر دوسرے لوگ بیٹھے تھے۔ میں نیپالی وغیرہ کے ساتھ چھوٹی میز پر جا بیٹھا۔ لیکن منٹو، اشوک اور واچا کے ساتھ بڑی میز پر بیٹھا رہا۔ لیکن ایک تو اس ایکٹر کے ساتھ آنے والے لوگ زیادہ تھے دوسرے رائے بہادر کے ساتھ بھی چند مہمان تھے۔ اشوک اور گیان مکرجی مالکوں میں سے تھے۔ مکرجی نے واچا اور منٹو کو اشارہ کیا کہ وہ چھوٹی میز پر جا بیٹھیں، واچا اٹھ کر چھوٹی میز پر چتلکر کے پاس جا بیٹھا۔ اس نے منٹو کو بھی پاس بٹھانا چاہا۔ لیکن منٹو نہیں بیٹھا۔ اس افراتفری میں جب مہمان بیٹھ رہے تھے، منٹو چپ چاپ کھسک گیا۔ میں یہ سب تماشہ دیکھ رہا تھا، جب وہ میرے پاس سے گزرا تو میں نے کہا۔ ''کیوں؟''

''چلو چلیں۔''

''کیوں؟''

''سب بکواس ہے۔''

''بیٹھو۔'' میں نے کہا۔ ''جہاں اس بکواس کے انتظار میں ڈیڑھ گھنٹہ بیٹھے ہیں وہاں آدھ گھنٹہ اس کے ساتھ بیٹھ لیتے ہیں۔''

لیکن منٹو نہیں رُکا، خاموشی سے کینٹین سے نکل گیا۔

''گنجے فرشتے'' میں منٹو نے شیام پر جو اسکیچ لکھا ہے، اس میں منٹو کی انانیت کے اس پہلو کی جھلک

بار بار ملتی ہے۔ لاہور میں شیام آیا تو اس کو ملنے والے اتنے تھے اور وہ لوگوں کی توجہ کو اس طرح کھینچے ہوئے تھا کہ منٹو کی 'انا' کو بار بار ٹھیس لگتی تھی۔ منٹو لکھتا ہے:

> ''شیام نے مجھ سے کہا۔ میرے ساتھ رہو، لیکن اس کے دماغ کی مضطرب کیفیت کے احساس نے مجھے سخت پراگندہ کر دیا۔ اس سے وعدہ کر کے کہ رات کو میں اس سے فیلٹی ہوٹل میں ملوں گا، چلا گیا۔''

لیکن جیسا کہ میں نے منٹو کو دیکھا اور جانا ہے، منٹو کے چلے جانے کی وجہ (باوجود اس کے دیرینہ دوست کی اس خواہش کے کہ وہ اس کے ساتھ رہے) اور کچھ نہ تھی، اس کی انا تھی۔ اس کی اس الجھن اور گھٹن کو میں نے اس امریکی (یا انگریزی) ایکٹر کی آمد پر بھی محسوس کیا۔ مکرجی نے جب منٹو کو اٹھ جانے کا اشارہ کیا تو وہ ایک لخت اُداس ہو گیا اور پھر وہاں بیٹھنا اس کے لئے مشکل ہو گیا۔ منٹو، شیام سے ملنے فلیٹی بھی گیا، لیکن اس ملاقات کا حشر بھی پہلی ملاقات سے مختلف نہ ہوا اور منٹو اور بھی چڑ کر واپس آ گیا۔ بمبئی میں جب وہ شیام سے ملتا تھا تو عموماً شیام نہیں، منٹو لوگوں کی توجہ کا مرکز ہوتا تھا، کیونکہ ایکٹروں، ڈائریکٹروں میں وہ اپنی قابلیت، لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی سے سننے والوں کی توجہ کو اپنی طرف لگائے رکھتا تھا۔ لیکن لاہور کی ان دو ملاقاتوں میں، سننے والے آرٹسٹ نہیں تھے، عام لوگ تھے، جن میں سے شیام کو سب جانتے تھے اور منٹو کو جو چند ایک جانتے تھے وہ بھی ہنگامی طور پر بھول گئے تھے اور میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس بات سے منٹو کو، جو اپنے آپ کو سب سے برتر سمجھتا تھا، کتنی کوفت ہوئی ہوگی۔

منٹو جس طرح پیٹنا جانتا تھا، لیکن پٹنا نہیں، پدانا جانتا تھا لیکن پدنا نہیں، اسی طرح مذاق کرتا تھا لیکن مذاق برداشت کرنے کی حس اس میں مفقود تھی، وہ بہت ذکی الحس تھا (اپنے مضامین میں بار بار اس نے اس کا ذکر کیا ہے) لیکن دوسرے بھی ذکی الحس ہو سکتے ہیں، دوسروں کو بھی بات چبھ سکتی ہے، اسے وہ اونچے درجہ کا افسانہ نگار اور ماہر نفسیات ہونے کے باوجود نہ جانتا تھا، کبھی کبھی مجھے اس بات کا بھی خیال آتا تھا، لیکن انسان کی یہ عام خامی ہے۔ ٹالسٹائی کئی بار نفس سے اندھے ہوئے، لیکن اپنے افسانوں میں انہوں نے اس کے خلاف لکھا، بالزاک نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں زندگی کی بے شمار حقیقتوں کو بے نقاب کیا ہے، لیکن اپنی ذاتی زندگی میں وہ اتنی سی حقیقت نہ سمجھ سکے کہ انہیں روپیہ بے دریغ اور بچکانی چیزوں پر نہ خرچ کرنا چاہئے، ہوائی قلعے نہ بنانے چاہئیں اور بے دریغ قرض نہ لینا چاہئے۔ منٹو

قرطاس پر زندگی کی دبی چھپی حقیقتوں کو عظیم فنکار کی چابکدستی سے قلم بند کرنے والا زندگی بھر عیاں حقیقتوں کو نہ سمجھ سکا اور بے حد پریشان رہا۔ آج میں یہ سب اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ لیکن ان دنوں حقیقت نگار ہونے کا دعویٰ کرنے کے باوجود میں زندگی کی اس بڑی حقیقت کو نہ جانتا تھا۔

میں جن دنوں دہلی گیا، منٹو کی ایک کہانی کا بڑا چرچا تھا۔ اس کا نام تھا ''ترقی پسند''...... چرچا اس کا یوں تھا کہ منٹو نے وہ دیوندر ستیارتھی اور بیدی پر لکھی تھی۔ چونکہ بیدی میرے بہت نزدیک تھا اس لئے پہلی فرصت میں، میں نے منٹو کی وہ کہانی پڑھ ڈالی۔ کہانی میں جو قصہ درج تھا وہ مجھے معلوم تھا، کیونکہ مجھے بتا چکا تھا، بات یہ تھی کہ لوک گیت لکھتے لکھتے ستیارتھی ایک دم افسانے لکھنے لگا تھا، نئے ادیب یا شاعر کو اپنے افسانے یا شعر سنانے کا مرض ہوتا ہے۔ ستیارتھی کو بھی تھا۔ ہوسکتا ہے دوسروں کی نسبت کچھ زیادہ ہو، بہرحال وہ اپنے کنبے سمیت راجندر سنگھ بیدی کے ہاں مہمان ہوگئے اور صبح وشام اسے افسانے سنانے لگے۔ بیدی اس وقت پوسٹ آفس میں کلرک تھا اور لاہور چھاؤنی میں رہتا تھا، دو کمرے اس کے پاس تھے۔ جگہ زیادہ نہیں تھی، پھر ستیارتھی کی موجودگی میں خلوت کا میسر آنا یوں بھی مشکل۔ بیدی شام کا تھکا ہارا آتا تو ستیارتھی ایک افسانہ سنانے کے لئے تیار رہتے۔ سن کر نہ صرف رائے لیتے بلکہ تصحیح چاہتے۔ اسی میں رات کو دیر ہو جاتی۔ صبح اٹھتا تو اسے تصحیح شدہ افسانہ سننا پڑتا۔ مہینہ بھر ستیارتھی وہاں رہے اور بیدی اپنے بیوی بچوں سے بات کرنے کو ترس گیا۔ منٹو کی کہانی ''ترقی پسند'' کا پلاٹ یہی ہے، صرف آخیر میں منٹو نے ذرا افسانوی پیچ دیا ہے کہ پرمارتھی (ترقی پسند میں ستیارتھی کا بدل) اپنے میزبان سے کچھ ایسا چمٹتا ہے اور اس کے وقت کا ہر لمحہ کچھ اس طرح لے لیتا ہے کہ وہ غریب اپنی بیوی سے پیار کرنے کے لئے بھی غسل خانہ ہی بہتر خیال کرتا ہے۔

کہانی اچھی ہے۔ اس میں چٹخارہ بھی ہے لیکن منٹو نے اس سے کہیں زیادہ اچھے افسانے لکھے ہیں۔ مجھے کہانی پڑھنے میں دلچسپ لگی۔ لیکن چونکہ بیدی کی ذاتی زندگی کا ایک واقعہ (بیدی کے منہ سے سنا ہوا) منٹو نے قلمبند کردیا، اس لئے مجھے برا لگا۔ میرے خیال میں اسے لکھنے کا حق بیدی کا تھا۔ یا پھر منٹو کو بیدی سے کہہ دینا چاہئے تھا کہ دیکھو یار، اس واقعہ پر افسانہ لکھ رہا ہوں، تمہیں لکھنا ہو تو میں نہ لکھوں ورنہ میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔ لیکن منٹو سے افسانہ نگار کو اتنا صبر کہاں۔ خیال آیا تو اسے قلمبند کردیا، یہ بھی نہ سوچا کہ اس ذاتی واقعہ کو لکھنے سے دو دوستوں میں شکر رنجی کی دیوار کھڑی ہوسکتی ہے۔

دوستوں کے درمیان دیوار نہ کھڑی ہوئی بلکہ انہوں نے منٹو کے خلاف ایک مشترکہ محاذ قائم کرلیا اور جس طرح منٹو نے اپنی کہانی میں بیدی اور ستیارتھی کے عادات واطوار، شکل وشباہت اور ذاتی زندگی کا مذاق اُڑایا تھا، اسی طرح ان دونوں نے مل کر ایک افسانہ لکھ کر منٹو کی ذاتی زندگی اور اس کی خامیوں کو اجاگر کردیا۔ کہانی ستیارتھی کے نام سے شائع ہوئی۔ انہوں نے ہی لکھی بھی تھی، بیدی نے اس پر نظر ثانی کرتے ہوئے کچھ ایسے پتے لگائے کہ کہانی، جہاں تک کردار نگاری کا تعلق ہے، بے حد اچھی اُتری۔ نام ہے۔ ''نئے دیوتا''

''اتنی بھی کیا خوشی ہے۔ میں سوچ رہا تھا، اتنا تو نفاست حسن (نئے دیوتا میں سعادت حسن کا بدل) پہلے بھی کمالیتا ہوگا۔ ڈیڑھ سو روپیہ کے لئے اس نے اپنی آزادی بیچ دی اور اب خوش ہو رہا ہے۔ وہ تو شروع ہی سے باغیانہ طبیعت کا آدمی مشہور ہے۔ اس کے افسانے ترقی پسند ادب میں نمایاں جگہ پاتے رہے ہیں پھر یہ نوکری اس نے کیسے کرلی۔ غریبوں پر ظلم ڈھائے جاتے ہیں، زندگی کی ہتک کی جاتی ہے، سرمایہ دارانہ نظام مکڑی کی طرح برابر اپنا جالا بنتا رہا ہے اور غریب کسان مزدور آپ سے آپ اس اجالے میں پھنسے چلے جاتے ہیں۔ ان خیالات کا مالک آج خود مکھی کی طرح اس جالے میں پھنس گیا اور اس خوشی میں یار دوستوں کو دعوت دے رہا ہے۔

اور یوں شروع کر کے ''نئے دیوتا'' کے لکھنے والوں نے نفاست حسن (یعنی سعادت حسن) کی حرکات وسکنات، عادت واطوار، سنکلی پن، شراب نوشی، چڑچڑاہٹ، انانیت اور سنک، پرورش، جنس نگاری اور دوسری کمزوریوں کا کچھ ایسے لطیف پیرائے میں مذاق اڑایا کہ منٹو بلبلا اٹھا (بعد میں جیسا کہ اس کی عادت تھی، اس نے خود اپنی سنک اور فلسفے پن کی تشہیر شروع کردی) جوگیشوری کالج کے طلبا کے سامنے تقریر کرتے ہوئے منٹو نے کہا۔

> ''البتہ جب میں بیٹھا بیٹھا اپنا نیا خریدا ہوا قیمتی پن نکالتا ہوں تو مجھے
> اپنا یہ فلسفہ پن بہت دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔''
>
> (لذتِ سنگ)

''نئے دیوتا'' کے شائع ہوتے ہی لاہور اور دلی کے ادبی حلقوں میں ایک شور برپا ہوگیا۔ چونکہ منٹو

مذاق اُڑاتے ہوئے، مذاق کئے جانے پر کس طرح سیخ پا ہو جاتا، اس کا ایک واقعہ آج بھی مجھے یاد ہے۔

لنچ کا وقت تھا، لوگ کھانا وغیرہ کھا کر کرشن کے کمرے میں اکٹھے ہوئے تھے، گپ ہو رہی تھی۔ کرشن اپنی کرسی پر سر جھکائے بیٹھا سب کی سن رہا تھا۔ اس کے سامنے کی کرسی پر منٹو پاؤں اوپر کئے، گھٹنوں کو بانہوں میں دبائے اُکڑوں بیٹھا تھا، راشد، قدوس اور دوسرے پروگرام اسسٹنٹ منٹو کی کرسی کے گرد گھیرا بنائے کھڑے تھے۔ (اختر الایمان اور میراجی شاید اس وقت ریڈیو میں نہیں تھے۔ یا شاید تھے، مجھے یاد نہیں) حفیظ جاوید نیچے دری پر دیوار سے پیٹھ لگائے، گھٹنے پر ٹانگ رکھے، ادھ لیٹے، ادھ بیٹھے خاموشی سے سب کچھ سن رہے تھے۔ میں ذرا دیر سے پہنچا تھا، کمرے میں جگہ نہ تھی اس لئے کونے میں پڑے ریکارڈوں کے اونچے چیسٹ پر ٹانگیں نیچے کو لٹکائے بیٹھ گیا تھا، تبھی جانے کس نے اور جانے کیسے ستیارتھی کی بات چھیڑ دی اور کہا کہ نہایت گھٹیا افسانہ نگار ہے۔

دوسرے نے کاٹا ''لیکن'' ننے دیوتا'' تو اس نے خوب کہانی لکھی ہے۔''

''واہ!'' کرشن نے سر اور دایاں ہاتھ ایک ساتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ لیکن اسی وقت اس کی نگاہیں منٹو سے چار ہوئیں جو ستیارتھی کا نام سنتے ہی چوکنا ہو بیٹھا تھا اور کرشن کا اٹھا ہوا ہاتھ نیچے آ گیا اور نگاہیں پھر جھک گئیں۔

اور تب کسی نے (منٹو کو بتاتے ہوئے) کہا۔ ''ارے یار، ستیارتھی کیا کھا کر ویسا افسانے لکھے گا، وہ تو بیدی کا لکھا ہوا ہے۔''

''بیدی کا تو نہیں۔'' تیسرے نے کہا۔ ''لکھا تو ستیارتھی ہی کا ہے، بیدی نے اس میں پتے لگائے ہیں اور کہانی دو آتشہ ہو کر نکلی ہے۔''

''ہم نے سنا فیض کا بھی ہاتھ ہے.....''

اور اس وقت منٹو نے پاؤں نیچے کئے اور سب کی آوازوں کو جیسے اپنی آواز کی کرختگی میں ڈبوتے اور اپنی بڑی بڑی آنکھیں گڑھوں سے نکالتے ہوئے کہا۔ ''بیدی اور فیض کیا، اس میں تاثیر کا ہاتھ ہے، تبسم کا ہاتھ ہے، سنت سنگھ سکھوں اور موہن سنگھ کا بات ہے، منٹو از این انسٹی ٹیوشن.....''

سمجھا کرتا تھا......''

میں نے شیام لال کا ذکر کیا تھا کہ دوستوں نے زور کا قہقہہ بلند کیا، لیکن اس سے پہلے کہ میں، بات کرتا یا قہقہہ خاموش ہوتا، منٹو جھنجلا کر اٹھا اور اس نے غصہ سے پاگل ہو کر دو تین غلیظ گالیوں کے ڈھیلے میرے طرف پھینک دیے۔

کوئی دوسرا موقع ہوتا، منٹو مجھے گالی دیتا تو میں کھینچ کر ایک تھپڑ اس کے منہ پر جما دیتا۔ لیکن لڑنے کی طرح مذاق کرنے کا بھی ایک فن ہے۔ مذاق مذاق میں جو چڑ جاتا ہے، گالی دیتا ہے، یا ہاتھ اٹھاتا ہے دراصل وہی پٹ جاتا ہے۔ منٹو نے گالیاں دیں تو لوگ اور بھی زور سے ہنس دیے۔ کرشن نہیں ہنسا۔ اس نے منٹو کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔'' کیا کرتے ہو؟'' اور دوسرے لمحے منٹو نے اپنے اوپر قابو پالیا۔ بڑھ کر میرا ہاتھ تھاما اور دھیرے سے انگریزی میں کہا۔'' ڈونوٹ مائنڈ اِٹ۔''(Do not mind it)

اس وقت چاہے منٹو اور دو گالیاں بھی دے لیتا تو شاید میں ہاتھ نہ اٹھاتا۔ لیکن دوسری بار مجھے یاد ہے۔ منٹو نے گالی دی اور میں ہاتھ اٹھانے کو تیار ہو گیا۔ اگر وہ ذرا بھی منہ کھولتا تو پھر پھتول ہو جاتی۔

فلمستان کے زمانے کی بات ہے۔'' آٹھ دن'' کی شوٹنگ چل رہی تھی اور میں نے اس میں پنڈت طوطارام کا ایک مزاحیہ رول لے لیا تھا۔ چونکہ دن کو اسٹوڈیو خالی نہ تھے اور اشوک کمار نے زبردستی پروڈکشن لے لی تھی اس لئے آٹھ دن کی، بیشتر شوٹنگ رات کو ہوتی۔ منٹو رات کو سیٹ پر آنے کا عادی نہ تھا۔ اس کے اشغال دوسرے تھے۔ لیکن جب سے میں نے تگڑم بھڑا کر'' آٹھ دن'' میں رول لے لیا تھا اور منٹو کے لکھے مکالموں میں رد و بدل کرنے لگا تھا تو منٹو رات کو بھی سیٹ پر آنے لگا تھا۔ رات کو وہ پیا پلایا کرتا تھا اور سیٹ پر آنا اسے بے حد شاق گزرتا تھا۔ لیکن میں اُس کے مکالموں کو'' مسخ'' نہ کر دوں، اس بات کا اسے ڈر تھا۔ لیکن میری یہ عادت ہے کہ لڑائی میں بھی شاذ ہی غلطی اپنے سر لیتا ہوں۔ ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتا ہوں کہ غلطی دوسرے کے سر رہے۔ اس موقع پر بھی میں نے منٹو کو اتنا چڑا دیا کہ وہ بے اختیار ہو کر گالی دے بیٹھا، لیکن سننے والوں کو غلطی اسی کی معلوم ہوئی۔

'' آٹھ دن'' کی شوٹنگ کے بعد میں بیمار ہو کر پنچ گنی چلا گیا تھا اور میں نے وہ فلم نہیں دیکھا اس

لئے مجھے اس کی کہانی یاد نہیں۔ اتنا یاد ہے کہ رات کی شوٹنگ تھی، شادی کا سیٹ
سے ہیرو کی شادی کرنا تھی اور میں کمر میں دھوتی کسے ننگے بدن پر جنیو پہنے، رام نامی دوپٹہ گلے میں
ڈالے، سر پر پنڈتوں سی پگڑی سجائے ویدی پر بیٹھا تھا اور ہیرو کی ماں سے (یہ پارٹ لیلا مصرا کر رہی
تھیں) میرا جھگڑا ہو رہا تھا۔ اس میں کہیں فقرہ آ گیا۔ ''تو کیا میں جھک مار رہا ہوں۔'' یا شاید یہ فقرہ تھا۔
''میں ہرگز یہ جھک نہیں مار سکتا۔'' بہر حال جھک مارنے کا محاورہ منٹو نے استعمال کیا تھا۔ اشوک ہدایات
دے رہے تھے۔ منٹو پٹے ہوئے اور چپ چاپ ایک طرف بیٹھا سین شوٹ ہوتے دیکھ رہا تھا کہ اچانک
مجھے شرارت سوجھی اور میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں یہ ڈائیلاگ نہیں بول سکتا۔''

''کیوں؟'' اشوک نے پوچھا۔

''جھک مارنا ہنسی بھرا شبد ہے۔ ویدی پر بیٹھا ہوا، ویدوں کا وکتا، دھرم پرائن برہمن ایسا واکیہ کبھی
نہیں بول سکتا۔''

''لیکن یہ تو محاورہ ہے۔'' منٹو تنک کر اٹھا۔

''بہت سے ایسے محاورے ہیں جو بڑے معنی خیز ہیں۔ لیکن شریف لوگ نہیں بولتے، اسی طرح
ویدی پر بیٹھا ہوا پنڈت یہ ہنسی بھرا محاورہ نہیں بول سکتا۔'' میں بولا۔

''لیکن محاورے کا مطلب تشدد بھرا نہیں۔''

''جھک کیا ہے، مچھلی۔ جھک مارنا مچھلی مارنا۔ مطلب اس محاورے کا کچھ بھی ہو، لیکن کوئی پنڈت
اسے نہیں بول سکتا۔''

''بنگال کے پنڈت مچھلی مارتے ہی نہیں، کھاتے بھی ہیں۔''

''لیکن پنڈت طوطا رام بنگالی نہیں، نہ یہ کہانی بنگالیوں کی ہے۔''

''تم بکواس کرتے ہو۔'' منٹو جھلا اٹھا۔ ''تمہیں یہی فقرہ بولنا ہوگا۔''

''میں نہیں بول سکتا۔ میں ویدی پر بیٹھا ہوا برہمن ہوں۔''

''میں بھی برہمن ہوں۔'' منٹو گرجا۔

''برہمن تمہارے اجداد ہوں گے۔ اس وقت تو تم یہاں جھک مار رہے ہو۔''

اور منٹو نے بے اختیار ہو کر زور سے مجھے گالی دی۔

کر اپنی پنڈت ویدی پر بیٹھ کر ایسا محاورہ نہیں بول سکتا۔ اعتراض نہایت لچر تھا۔ لیکن
جولوگ فلمی دنیا سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ایسے لچر اعتراض وہاں سیٹوں پر شب و روز ہوتے ہیں۔
میں جانتا ہوں کہ اعتراض لچر ہے لیکن برہمن یہ بول سکتا ہے یا نہیں، اس سوال نے اسے ایک دم وزن
عطا کردیا۔ فلمی دنیا والے نہایت ڈرپوک آدمی ہوتے ہیں۔ بڑے سے بڑا ناستک وہاں مہورت
کرتا ہے (حالانکہ ان مہورتوں کے باوجود آئے دن حادثے ہوتے ہیں، فلم فیل ہوتے ہیں اور فنانسر
خسارہ اٹھاتے ہیں) میری بات اشوک اور واچا کو ٹھیک لگی۔ منٹو نے گالی دی تو میرا پلہ اور بھی بھاری ہو گیا
اور چونکہ میں محض مذاق نہ کر رہا تھا اور لڑائی پر آمادہ تھا اس لئے میں نے کہا ''دیکھو منٹو، میں پہلوان نہیں،
لیکن اتنا جانتا ہوں کہ تم بھی پہلوان نہیں ہو اور تم نے لب بھی کھولے تو میں تمہیں اُٹھا کر اسٹوڈیو کے باہر
پھینک دوں گا۔''

معاملے نے کچھ ایسا رُخ اختیار کیا کہ اشوک گھبرا گئے۔ شوٹنگ رُک گئی۔ انہیں فکر ہوئی کہ ہم
دونوں اَڑے رہے تو شوٹنگ نہ ہو سکے گی اور چار چھ ہزار کی ذز پڑ جائے گی۔ وہ منٹو کو باہر لے گئے (یا
شاید مجھے لے گئے، یہ مجھے یاد نہیں) لیکن کچھ دیر بعد جب ہم سیٹ پر آئے تو منٹو نے میرے ہاتھ کو آہستہ
سے دباتے ہوئے افسوس کا اظہار کیا۔

اس کے بعد وہ پھر نہیں بیٹھا۔ پھر کبھی وہ رات کو سیٹ پر نہیں آیا۔ میں نے مکالمے ہی نہیں، مناظر
تک بدل ڈالے لیکن پھر اُس نے میرا راستہ نہیں کاٹا۔

منٹو کو گالی دینے کا بہت شوق تھا۔ اس بات کی اُسے خواہش رہتی تھی کہ وہ کرشن کو ایک آدھ غلیظ گالی
دے۔ (سالے والے تو کہتا ہی رہتا تھا) لیکن کرشن کبھی ایسا موقع نہ آنے دیتا تھا۔ منٹو مجھے بھی گالی دینا
چاہتا تھا۔ دو موقعوں کا تو میں نے ذکر کر دیا۔ ایک بار اس نے اور مجھے گالی دی۔ اُن دِنوں ہم میں تناؤ
نسبتاً کم تھا۔ مکرجی نے اشوک اور منٹو وغیرہ کو زک دینے کے لئے سنتوشی کو پھر بلا لیا تھا اور ''آٹھ دن''
کے لئے اس کا ایک گیت منظور کر لیا تھا۔ مجھ اس بات کی خبر نہ تھی، لیکن منٹو، سنتوشی کا وہاں آنا پسند نہ کرتا
تھا، اس لئے وہ ایک گیت مجھ سے لکھوا رہا تھا۔ ہم میوزک روم سے دفتر کی طرف آ رہے تھے، کہ سیڑھیاں

چڑھتے ہوئے منٹو نے اچانک مجھے باتوں باتوں میں دھیرے سے گالی دی۔

کسی زمانے میں، میں خود بڑی گالیاں بکتا تھا۔ والد محترم نت نئی گالیاں تصنیف کرنے میں یکتا تھے۔ یوں بھی جالندھر گالی خیز خطہ ہے۔ دوست جب ملتے ہیں تو بڑی بھاری بھرکم گالیوں سے ایک دوسرے کا خیر مقدم کرتے ہوئے ہم آغوش ہوتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میں بھیشم، لاہور کے دفتر میں کام کرتا تھا، اور اپنے سینئر ایڈیٹر جناب ساگر چند گورکھا کے ساتھ (جو بعد میں روز نامہ ''پرتاپ'' کے مزاحیہ نگار کی حیثیت سے بہت مشہور ہوئے تھے اور اب آل انڈیا ریڈیو کے کسی شعبہ میں گمنامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں) ریلوے روڈ پر جا رہا تھا کہ سامنے سے میرا لڑکپن کا دوست کلونت سنگھ آتا ہوا دکھائی دیا۔ دُور ہی سے اس نے ایک موٹی سی گالی سے میرا حال چال پوچھا اور میں اس سے بھی موٹی گالی دیتا ہوا اُس سے بغل گیر ہو گیا۔ (آج یہ بات کچھ خواب کی سی معلوم ہوتی ہے۔ اور حالانکہ میری بیوی اب بھی مجھے خاصا غیر مہذب سمجھتی ہے، لیکن جالندھر سے لاہور آنے والے اشکؔ اور الٰہ آباد کے اشک میں زمین و آسمان کا فرق ہے) گورکھا صاحب حیران و ششدر کھڑے دیکھتے رہے۔ بعد میں، میں نے انھیں سمجھایا کہ وہ میرا لنگوٹیا یار تھا اور جالندھر کے لنگوٹیے یاروں میں خیر مقدم کی یہ پرانی رسم ہے......

کاش منٹو میں اور مجھ میں ایسا یارانہ ہوتا اور ہم دونوں بے تکلفی سے ایک دوسرے کو گالیاں دے سکتے۔ لیکن دفتر کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے اُس نے دھیرے سے مجھے جو گالی دی تھی، اُس میں بے تکلفی نہ تھی، یارانہ نہ تھا، سرپرستی کا غیر مبہم سا جذبہ تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں نے یہ گالی خاموشی سے سن لی تو مجھے اور بھی گالیاں سننی پڑیں گی اور بے تکلفی نہ ہونے کے باعث میں گالی نہ دے سکوں گا۔ میں نے فوراً کہا۔ ''دیکھو منٹو، تم امرتسر کے ہو تو میں جالندھر کا ہوں۔ میں گالیاں دوں گا تو تمہاری طبیعت صاف ہو جائے گی۔ دوبارہ تم مجھے کبھی مت گالی دینا۔''

اور منٹو نے مجھے پھر کبھی گالی نہ دی۔ اس کی بے پناہ جھنجھلاہٹ میری کپال کریا کرنے کی خواہش میں ضرور ظاہر ہوئی لیکن گالی وہ مجھے نہ دے سکا۔

منٹو جب گالی دینے پر معافی مانگ لیتا تھا، اتنا مادہ اس میں تھا تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہم میں برابر کشیدگی رہی اور ہم لڑتے رہے۔ میں نے خود اس بات پر غور کیا ہے اور میں ہمیشہ اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ زندگی کی بساط پر ہمیں ایک دوسرے کے مقابل رکھ دیا گیا ہے اور ہم لڑنے پر مجبور رہے۔ اگر کہیں برابر مل

کے بیٹھتے بھی تو ایک دوسرے سے نبرد آزما، ایک دوسرے کے پینترے کو کاٹ کر کشت دینے والے مہروں کی طرح!

ہم نے ایک دوسرے سے ملنے کی کوشش نہ کی ہو، ایسی بات نہیں۔ لیکن ہماری انا یا احتیاط کھل کر ہمارے ملنے کے راستے کی ہمیشہ دیوار بن گئی۔ میں نے ملنے کی کوشش کی تو منٹو تنا رہا، منٹو نے ملنے کی کوشش کی تو میں تنا رہا، ٹھیک سن یاد نہیں، لیکن کرشن لکھنؤ جا چکا تھا۔ راشد پروگرام ڈائریکٹر کی کرسی پر جا براجے تھے، چوپڑا صاحب کو ابھی منٹو نے پھانسا نہیں تھا، منٹو کو مخالفت کا حلقہ اپنے گرد تنگ ہوتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ شام کا وقت تھا، دیے جل چکے تھے اور میں میز پر بیٹھا کوئی ڈرامہ یا کہانی لکھ رہا تھا۔ کوشلیا اندر باورچی خانے میں کھانے پکانے کا انتظام کر رہی تھی کہ اچانک باہر سڑک پر سے سخت اور تیکھی آواز آئی...... ''اشک!''

منٹو!...... مجھے خیال آیا...... اور میرا دل دھک سے رہ گیا۔ کیونکہ اگرچہ میں اس کے گھر (حسن بلڈنگز، کشمیری گیٹ) میں تین چار بار گیا تھا، لیکن وہ گذشتہ ڈیڑھ برس میں کبھی میرے گھر نہ آیا تھا۔ حالانکہ میں تیس ہزاری میں بھیرو کے مندر کے سامنے رہتا تھا اور ہمارے گھروں میں نصف میل سے

تھے۔ جس وقت کا ذکر ہے، راشد ایک نمبر میں، میں تین نمبر میں اور کرشن پانچ نمبر کے کوارٹر میں رہتے تھے۔ ایک کمرہ سونے کا اور ایک بیٹھنے کا تھا۔ بیٹھنے کے کمرے میں، میں نے ایک کرسی میز کام کرنے کے لئے رکھ چھوڑی تھی اور بیٹھنے کے لئے ایک دری اور جاجم فرش پر بچھا رکھی تھی......اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے کہا۔ ''بیٹھو بیٹھو۔'' اور کوشلیا کو آواز دی کہ ''دیکھو منٹو اور صفیہ بھابی آئے ہیں۔'' منٹو اور پرویز بیٹھ گئے۔ صفیہ بھابی اندر باورچی خانے کی طرف چلی گئیں اور میں اس وقت تک بات چلانے کی کوشش کرتا رہا۔ جب تک صفیہ کوشلیا کے ساتھ بیٹھک میں نہیں آ گئیں۔

مجھے اس میٹنگ کی کوئی بات یاد نہیں۔ سوا اس کے کہ مسعود پرویز کی آنکھیں بڑی خوبصورت تھیں، اس کا ناک نقشہ بے حد دلکش تھا اور میں نے کئی بار دزدیدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تھا اور میرا خیال تھا کہ وہ یقیناً فلمی دنیا میں ہیرو کی حیثیت سے مشہور ہوگا۔ (شاید وہ اس وقت کسی فلم کمپنی میں نوکر تھا یا جانے کی کوشش کر رہا تھا) منٹو ادھر اُدھر کی بڑی اوپری باتیں کرتا رہا اور میں تنہا بیٹھا رہا۔ بات کو میں نے اپنی طرف نہیں موڑا۔ پرویز سے یہ نہیں پوچھا کہ اس نے کونسی میری چیز پڑھی ہے، وہ کب دہلی آیا ہے، کیا کر رہا ہے، کب تک رہے گا؟ بات چیت کو میں نے ذاتی پچ نہیں دیا۔ منٹو کو باتیں کرنے کے لئے چھوڑ دیا، بلکہ جب کوشلیا آئی تو ان لوگوں کو باتوں میں مشغول چھوڑ کر میں کام کرنے کا ناٹک کرتا رہا۔

میں نے ایسا کیوں کیا، جب میں اس بارے میں سوچتا ہوں تو پاتا ہوں کہ مجھے اس بات کا ایک منٹ کو بھی یقین نہیں آیا کہ پرویز مجھ سے ملنا چاہتا تھا اور منٹو اپنے شام کے شغل مئے نوشی کو چھوڑ کر اُسے مجھ سے ملانے چلا آیا تھا۔ صفیہ بھابی کوشلیا سے ملنا چاہتی ہوں گی، یہ بات میری سمجھ میں آ سکتی تھی، صفیہ کوشلیا کو چاہتی تھیں اور کوشلیا بھی صفیہ اور منٹو دونوں کی عزت کرتی تھی لیکن منٹو نے اس بات کا ذکر نہیں کیا اور میرے ہاں آنے کا جو بہانہ اُس نے بنایا، اُس کا مجھے یقین نہ تھا۔ پھر منٹو کے اس طرح آنے میں، اُس کے اس طرح آواز دینے میں، میرے ہاں بیٹھنے اور باتیں کرنے میں کچھ ایسا انداز تھا جیسے میرے ہاں آکر وہ مجھ پر کوئی بڑا احسان کر رہا تھا اور مجھے اس کا شکر گزار ہونا چاہئے تھا۔ باتوں میں اس نے جتا بھی دیا کہ وہ اس ڈیڑھ برس میں کرشن کے گھر بھی کبھی نہیں آیا اور مجھے اس کا یہ انداز کھل گیا تھا۔

منٹو کی بات میں نہیں جانتا، لیکن اس ملاقات کی بے کیفی مدتوں میرے دماغ پر حاوی رہی۔ میں

پھکڑ آدمی ہوں، منٹو بھی اوّل درجے کا پھکڑ رہا ہے، لیکن ایک دوسرے کی موجودگی جانے ہماری انانیت کے کن تاروں کو چھیڑ دیتی تھی کہ وہ بے ساختہ تن جاتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں کرسی پر بیٹھا لکھنے کا بہانہ کر رہا تھا، اور پاس ہی دری پر بیٹھے منٹو اور مسعود، صفیہ بھابی اور کوشلیا باتیں کر رہی تھیں، میں سوچ رہا تھا کہ میں کیوں ان کی باتوں میں شامل نہیں ہوتا، جب وہ میرے گھر آئے ہیں تو مجھے ایسا گھٹیا پن نہ کرنا چاہئے اور چونکہ میں منٹو کے آنے کا صحیح مقصد جانتا تھا، جسے اُس نے احساس برتری کے زیر اثر دبا رکھا تھا، اس لئے میں کھل نہیں سکا۔ ہلکا سا ترحم کا جذبہ منٹو کو اپنی بلندیوں سے ذرا نیچے اُترتے دیکھ کر میرے دل میں ضرور پیدا ہوا، لیکن اُن بلندیوں سے اُسے اُتارلانے کی کامیابی پر مجھے اتنی ہی مقدار میں خوشی بھی ہوئی۔

منٹو پھر میرے گھر کبھی نہ آیا۔ دہلی میں بھی نہیں، بمبئی میں بھی نہیں اور اُس نے دہلی چھوڑ جانا منظور کر لیا لیکن اور زیادہ نیچے اترنا اُسے منظور نہ ہوا۔

شاہد احمد دہلوی

منٹو

دبلا ڈیل، سوکھے سوکھے ہاتھ پاؤں، میانہ قد، چمپئی رنگ، بے قرار آنکھوں پر سنہرے فریم کی عینک، کریم کلر کا سوٹ، سُرخ چہچہاتی ٹائی، ایک دھان پان سا نو جوان مجھ سے ملنے آیا۔

یہ کوئی چوبیس پچیس سال اُدھر کا ذکر ہے۔ بڑا بے تکلف، تیز، طرار، چرب زبان۔ بولا:

......''میں منٹو ہوں سعادت حسن۔ آپ نے ''ہمایوں'' کا روسی ادب نمبر دیکھا ہوگا۔ اب میں ''ساقی'' کا فرانسیسی ادب نمبر نکالنا چاہتا ہوں:

پہلی ہی ملاقات میں اُس کی یہ ضرورت سے بڑھی ہوئی بے تکلفی طبیعت کو کچھ ناگوار گزری۔ میں نے اس کا پانی اُتارنے کے لئے پوچھا۔'' آپ کو فرانسیسی آتی ہے؟''

بولا۔ ''نہیں''!

میں نے کہا'' تو پھر آپ کیا کرسکیں گے۔''

منٹو نے کہا۔'' انگریزی سے ترجمہ کر کے میں آپ کا یہ خاص نمبر ایڈٹ کروں گا۔''

میں نے کہا'' اپنا پرچہ تو میں خود ہی ایڈٹ کرتا ہوں۔ پھر'' ساقی'' کے چار خاص نمبر مقرر ہیں۔ ان کے علاوہ اور کوئی نمبر فی الحال شائع نہیں ہوسکتا۔''

منٹو نے دال گلتی نہ دیکھی تو فوراً اس موضوع ہی کو ٹال گیا۔ اور رخصت ہونے سے پہلے مجھ پر واضح کر گیا کہ اگر کسی مضمون کی ضرورت ہو تو معاوضہ بھیج کر اُس سے منگایا جا سکتا ہے۔

اس زمانے میں منٹو ترجمے ہی کیا کرتا تھا۔ اُس کی کتاب'' سر گزشتِ اسیر'' چھپ کر آئی تھی۔'' منٹو سے کبھی کبھی خط و کتابت ہوتی رہی۔ اور اس کے چند مضامین'' ساقی'' میں چھپے بھی۔ مگر قلبی تعلقات اُس سے قائم نہ ہوسکے مجھے یہی گمان رہا کہ یہ شخص بہت بہکا ہوا ہے۔ شیخی خورا اور چھچھورا سا آدمی ہے۔ اس

میں ''میں'' سما گئی ہے۔ زمانے کی چھری تلے آئے گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔

معلوم ہوا کہ بڑا کٹر کمیونسٹ ہے اور مُسلم یونیورسٹی سے اسے یہ کہہ کر نکال دیا گیا ہے کہ اس کو دق ہے۔ علیگڑھ سے نکالے جانے کے بعد وہ اپنے گھر امرت سر چلا گیا۔ گھر والے بھی اس کے باغیانہ خیالات سے نالاں تھے۔ اس لئے اُن سے بھی بگاڑ ہو گیا تھا۔ امرت سر میں اپنے چند ہم خیال دوستوں کے ساتھ اس نے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ ان کے لیڈر کمپنی کی حکومت والے باری (علیگ) تھے۔ مگر یہ سب لوگ تو کچھ دبے دبے سے رہے۔ اس لئے حکومت کی قید و بند سے بچے رہے۔ پھر باری رنگون چلے گئے۔ اور منٹو بمبئی جا کر اخبار ''مصوّر'' میں نوکر ہو گیا۔

کئی سال گزر گئے۔ منٹو سے ایک آدھ ملاقات اور ہوئی۔ مگر دل کی جواری اُن سے اب بھی نہ کھلی۔ جیسا اور بہت سے...... مضمون نگاروں سے تعلق تھا اُن سے بھی رہا یہاں تک کہ پچھلی بڑی جنگ کے زمانے میں وہ دلی ریڈیو میں آ گئے۔ اور اب جوان سے پہلی ملاقات ہوئی تو انہوں نے چھوٹتے ہی کہا۔

''اب میں آپ سے معاوضہ نہیں لوں گا۔''

میں نے پوچھا۔ کیوں؟''

بولے، معاوضہ میں اس لئے لیتا تھا کہ مجھے پیسوں کی ضرورت رہتی تھی۔''

دلی، ریڈیو اسٹیشن پر جنگ کے زمانے میں ادیبوں اور شاعروں کا بڑا اچھا جمگھٹا ہو گیا تھا۔ احمد شاہ بخاری (پطرس) کنٹرولر تھے، خبروں کے شعبے میں چراغ حسن حسرت اور ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، پروگرام کے شعبے میں ن۔ م۔ راشد۔ انصار ناصری، محمود نظامی اور کرشن چندر۔ ہندی کے مسودہ نویس اوپندر ناتھ اشک اور اردو کے منٹو اور میرا جی تھے۔ اس زمانے میں منٹو کو بہت قریب سے دیکھنے کا مجھے موقع ملا۔

منٹو نے کچھ روپے جمع کر کے دو ٹائپ رائٹر خرید لئے، ایک انگریزی کا اور ایک اردو کا۔ اُردو کا ٹائپ رائٹر وہ اپنے ساتھ ریڈیو اسٹیشن روزانہ لاتے تھے۔ منٹو کے ذمہ جتنا کام تھا اس سے وہ کہیں زیادہ کرنے کے خواہش مند رہتے تھے۔ روزانہ دو تین ڈرامے اور فیچر لکھ دیتے۔ لکھنا تو انہوں نے بالکل چھوڑ ہی دیا تھا۔ کاغذ ٹائپ رائٹر پر چڑھایا۔ اور کھٹا کھٹ ٹائپ کرتے چلے جاتے۔ فیچر لکھنا اس زمانے میں بڑا کمال سمجھا جاتا تھا، مگر منٹو کے لئے یہ بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

ذرا سی دیر میں فیچر ٹائپ کر کے بڑی حقارت سے پھینک دیا جاتا کہ......

''لو یہ رہا تمہارا فیچر!''

منٹو کی اس تیز رفتاری پر سب حیران ہوتے تھے۔ چیز بھی ایسی جچی تلی ہوتی کہ کہیں انگلی دھرنے کی اُس میں گنجائش نہ ہوتی۔

دلّی آنے کے بعد منٹو کی افسانہ نگاری کا دور جدید شروع ہوا۔ انہوں نے طبعزاد افسانے ایک اچھوتے انداز میں لکھنے شروع کئے۔ ''ساقی'' کے لئے ہر مہینے ایک افسانہ بغیر مانگے مِل جاتا۔ ''دھواں'' اس رسالے میں لکھا گیا۔ اور اس کی اشاعت پر دلّی کے پریس ایڈوائزر نے مجھے اپنے دفتر بلوایا۔ وہ پڑھا لکھا اور بھلا آدمی تھا۔ انگریزی ادبیات میں میرا ہم جماعت بھی رہ چکا تھا۔ بولا ''بھائی، ذرا احتیاط رکھو۔ زمانہ بُرا ہے۔'' بات آئی گئی ہوئی۔ میں نے منٹو سے اس کا ذکر کیا۔ حسبِ عادت بہت بگڑا مگر ساقی کے باب میں کچھ احتیاط برتنے لگا۔

لیکن یہ ناسور دلّی میں بند ہوا تو لاہور میں پھوٹا اور ''بُو'' پر حکومت پنجاب نے منٹو کو دھر لیا۔ صفائی کے گواہوں میں منٹو نے مجھے بھی دلّی سے بلوالیا تھا۔ عدالتِ ماتحت تو قائل نہ ہوسکی۔ لیکن اپیل میں غالباً منٹو بری ہوگئے تھے۔ اس کے بعد رہا سہا خوف بھی منٹو کے دل سے نکل گیا، اور انہوں نے دھڑلے سے ''فحش'' مضامین لکھنے شروع کر دیئے۔ حکومتِ پنجاب کے پریس ایڈوائزر چودھری محمد حسین ایک عجیب وغریب بزرگ تھے۔ تھے تو علامہ اقبال کے حاشیہ نشینوں میں سے۔ مگر انہیں یہ زعم تھا کہ اقبال کو اقبال میں نے بنایا ہے۔ یہ صاحب ہاتھ دھو کر منٹو کے پیچھے پڑ گئے۔ اور یکے بعد دیگرے انہوں نے منٹو پر کئی مقدمات قائم کرا دیئے۔ پھر ان کا نشۂ اقتدار اتنا بڑھ گیا کہ انہوں نے مضمون نگاروں کے ساتھ ناشروں اور کتب فروشوں کو بھی لپیٹنا شروع کر دیا۔ مقدمات کے سلسلے میں منٹو کو بمبئی سے لاہور آنا پڑتا تھا۔ ادھر ہم بھی دلّی سے ملزموں کی برات لے کر پہنچتے تھے۔ چند روز لاہور کے ادبی حلقوں میں خاصی چہل پہل رہتی۔ شاید ایک آدھ ہی افسانے میں جرمانہ قائم رہا، ورنہ اپیل میں سب بری ہوتے رہے اور چودھری صاحب کلستے رہے۔ منٹو نے اپنے مقدمات کی رُوداد کسی کتاب کے دیباچے میں لکھی ہے اور اس کتاب کو چودھری صاحب کے نام سے معنون کیا ہے۔

منٹو کی باتیں بڑی دلچسپ ہوتی تھیں۔ انہیں ہمیشہ یہ احساس رہتا تھا کہ میں ہی سب سے اچھا لکھنے والا ہوں، اس لئے وہ اپنے آگے کسی کو گردانتے نہ تھے۔ ذرا کسی نے دُون کی لی اور منٹو نے اڑنگا

لگایا۔ خرابیِ صحت کی وجہ سے منٹو کی طبیعت کچھ چڑ چڑی ہوگئی تھی۔ مزاج میں سہار بالکل نہیں رہی تھی۔ بات بات پر اڑنے اور لڑنے لگتے تھے۔ جو لوگ ان کے مزاج کو سمجھ گئے تھے وہ ان سے بات کرنے میں احتیاط برتا کرتے تھے۔ ان کا مرض بقول ان کے کسی ڈاکٹر سے تشخیص نہ ہوسکا۔ کوئی کہتا دق ہے۔ کوئی کہتا معدے کی خرابی ہے، کوئی کہتا جگر کا فعل کم ہوگیا ہے۔ اور ایک ستم ظریف نے کہا کہ تمہارا پیٹ چھوٹا ہے اور انتڑیاں بڑی ہیں۔ مگر منٹو ان سب بیماریوں سے بے پرواہو کر ساری بد پرہیزیاں کرتا رہا۔

منٹو کی زبان پر ''فراڈ'' کا لفظ بہت چڑھا ہوا تھا..... میرا جی کے ہاتھ میں دو لوہے کے گولے رہتے تھے میں نے ان سے پوچھا، ان کا مصرف کیا ہے؟ منٹو نے کہا، ''فراڈ'' ہے۔ میرا جی نے سیویوں کے مزعفر میں سالن ڈال کر کھانا شروع کر دیا۔ میں نے کہا، یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ منٹو نے کہا ''فراڈ''......اوپندر ناتھ اشک نے کوئی چیز لکھی، منٹو نے کہا فراڈ ہے۔ اُس نے کچھ چیں چیں کی تو کہا ''تو خود ایک فراڈ ہے۔''

یادش بخیر! ایک صاحب تھے دیوندر ستیارتھی۔ تھے کیا، اب بھی ہیں اور اردو اور ہندی کے بہت بڑے ادیب ہیں۔ لوک گیتوں پر انگریزی میں بھی ایک کتاب چھپوا چکے ہیں۔ اسی زمانے میں وہ دتی آئے تو انہیں بھی افسانہ نگاری کا شوق چرایا......خاصے جہاں دیدہ آدمی تھے مگر باتیں بڑی بھولی بھولی کرتے تھے۔ بھاری بھرکم۔ قدآور آدمی، چہرے پر بہت زبردست داڑھی۔ دراصل انہوں نے اپنی وضع قطع ٹیگور سے ملانے کی کوشش کی تھی۔ ٹیگور کے ساتھ انہوں نے ایک تصویر بھی کھنچوائی تھی جس کے نیچے لکھا ہوا تھا ''گرو اور چیلا''۔ ایک طرف سفید بگلا استاد اور دوسری طرف کالا بھجنگ شاگرد۔

ہاں تو ستیارتھی صاحب نے افسانے لکھنے اور سنانے شروع کئے۔ ابتدا میں تو سب نے لحاظ مروّت میں چند افسانے سُنے پھر کنّی کاٹنے لگے، پھر انہیں دُور ہی سے دیکھ کر بھاگنے لگے۔ مگر منٹو بھاگنے والے آدمی نہیں تھے۔ منٹو نے ایک آدھ افسانہ تو سُنا۔ اس کے بعد ستیارتھی صاحب کو گالیوں پر دھر لیا۔ منٹو نے برملا کہنا شروع کر دیا ''تو بہت بڑا فراڈ ہے۔ تیری داڑھی داڑھی نہیں ہے، پروپیگنڈہ ہے۔ تو افسانے ہم سے ٹھیک کراتا ہے اور جا کر اپنے نام سے چھپوا لیتا ہے۔'' اور اس کے بعد مغلظات سنانا شروع کر دیں۔ مگر صاحب، مجال ہے کہ ستیارتھی کی تیوری پر بل بھی آیا ہو! اُسی طرح مسکراتے اور بھولی بھالی باتیں کرتے رہے۔ میں کہتا تھا کہ اس شخص میں ولیوں کی سی صفات ہیں۔

منٹو کہتا تھا ''.........''

دراصل منٹو کو بناوٹ سے چڑ تھی۔ خود منٹو کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ اس لئے لگی لپٹی نہ رکھتا تھا۔ جو کچھ کہنا ہوتا صاف کہہ دیتا، بلکہ منٹو بدتمیزی کی حد تک مُنہ پھٹ تھا۔

ایک دفعہ احمد شاہ بخاری نے بڑے سرپرستانہ انداز میں کہا۔ ''دیکھو منٹو میں تمہیں اپنے بیٹے کے برابر سمجھتا ہوں۔''

منٹو نے جھلّا کر کہا۔ ''میں آپ کو اپنا باپ نہیں سمجھتا!''

مزہ تو اُس وقت آیا جب چراغ حسن حسرت سے منٹو کی ٹکر ہوئی۔ واقعہ دلّی ریڈیو کا ہے جہاں اتفاق سے سبھی موجود تھے اور چائے کا دَور چل رہا تھا۔ حسرت اپنی علمیت کا رعب سب پر گانٹھتے تھے۔ ذکر تھا سومرسٹ ماہم کا جو منٹو کا محبوب افسانہ نگار تھا اور مولانا جھٹ بات کاٹ کر اپنی عربی فارسی کو بیچ میں لے آئے اور لگے اپنے چڑاؤ نے انداز میں کہنے ''مقاماتِ حریری میں لکھا......آپ نے تو کیا پڑھی ہوگی، عربی میں ہے یہ کتاب۔'' دیوانِ حماسہ اگر آپ نے پڑھا ہوتا......مگر عربی آپ کو کہاں آتی ہے۔'' اور حسرت نے تابڑتوڑ کئی عربی فارسی کتابوں کے نام گنوادیئے۔

منٹو خاموش بیٹھا پیچ وتاب کھاتا رہا۔ بولا تو صرف اتنا بولا۔ ''مولانا ہم نے عربی فارسی اتنی نہیں پڑھی تو کیا ہے؟ ہم نے اور بہت کچھ پڑھا ہے۔''

بات شاید کچھ بڑھ جاتی مگر کرشن چندر وغیرہ نے بیچ میں پڑ کر موضوع ہی بدل دیا۔ اگلے دن جب پھر سب جمع ہوئے تو حسرت کے آتے ہی بھونچال سا آ گیا۔ منٹو کا جوابی حملہ شروع ہو گیا'' کیوں مولانا'' آپ نے فلاں کتاب پڑھی ہے؟ مگر آپ نے کیا پڑھی ہوگی' وہ تو انگریزی میں ہے۔ اور فلاں کتاب؟ شاید آپ نے اس جدید ترین مصنف کا نام بھی نہیں سُنا ہوگا۔'' اور منٹو نے جتنے نام کتابوں کے لئے اُن میں شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہو جس کا نام مشہور ہو۔ منٹو نے کوئی پچاس نام ایک ہی سانس میں گنوادیئے اور مولانا سے کہلوالیا کہ اِن میں سے ایک بھی کتاب نہیں پڑھی۔ ہم چشموں اور ہم نشینوں میں یوں سُبکی ہوتے دیکھ کر مولانا کو پسینے آ گئے۔

منٹو نے کہا۔ ''مولانا اگر آپ نے عربی فارسی پڑھی ہے تو ہم نے انگریزی پڑھی ہے۔ آپ میں کوئی سُرخاب کا پَر لگا ہوا نہیں ہے۔ آئندہ ہم پر رعب جمانے کی کوشش نہ کیجئے۔''

مولانا کے جانے کے بعد کسی نے پوچھا۔ ''یار تو نے یہ اتنے سارے نام کہاں سے یاد کر لئے؟''

جب چند دور ہو چکے تو ... اور حسرت ...

منٹو نے کہا۔ ''مولانا تم بھی فراڈ ہو اور میں بھی فراڈ ہوں۔''

حسرت نے کہا ''نہیں تم ماہم ہو۔''

منٹو نے کہا ''تم ابنِ خلدون ہو۔

اور دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔

منٹو بڑا ذہین آدمی تھا۔ اگر ذرا کوئی اپنی حد سے بڑھتا تو وہ سمجھتا کہ یہ شخص میری توہین کر رہا ہے، مجھے احمق سمجھ رہا ہے۔ دل میں بات رکھنے کا وہ قائل نہیں تھا۔ اس کام کے لئے اوپندر ناتھ اشک بنا تھا۔ بڑی گنجل طبیعت کا آدمی تھا۔ منٹو مہینے میں تیس چالیس ڈرامے اور فیچر لکھ دیتا تھا، اور اشک صرف دو ڈرامے لکھتا تھا، اور وہ بھی رو رو کر۔ پھر بڑی ڈھٹائی سے کہتا پھرتا تھا کہ جتنی تنخواہ مجھے ملتی ہے اُس سے

صاحب کی حسین ٹانگوں کو دیکھ کر کہنے لگے۔ ''اگر مجھے ایسی چار ٹانگیں مل جائیں تو انہیں کٹوا کر اپنے پلنگ کے پائے بنوالوں۔''

ریڈیو اسٹیشن پر منٹو ایک دن بڑے بے زار بیٹھے تھے۔ میں نے کہا ''خیریت تو ہے؟'' بولے سخت بدتمیز اور جاہل ہیں یہاں کے لوگ۔ ٹیلی فون receive کر کے کہتا ہوں ''منٹو'' تو اُدھر سے وہ حیران ہو کر پوچھتا ہے۔ ''ون ٹو؟'' میں کہتا ہوں ''ون ٹو نہیں 'منٹو'۔ تو وہ کہتا ہے ''بھنٹو؟''

منٹو کو اپنی زبان دانی پر بڑا ناز تھا، اور واقع میں منٹو بہت صحیح اور عمدہ زبان لکھتے تھے۔ انہوں نے اپنی کسی افسانے میں ایک عورت کا حُلیہ لکھنے کے سلسلے میں یہ بھی لکھا تھا کہ بچہ ہونے کے بعد اُس کے پیٹ پر شکنیں پڑ گئی تھیں۔ میں نے شکنیں بدل کر چُرسیں کر دیا۔ جب افسانہ ''ساقی'' میں چھپ کر آیا تو منٹو اس لفظ پر اُچھل پڑے۔ بولے ''میں نے جس وقت شکنیں لکھا تھا تو میں سوچ رہا تھا کہ یہ لفظ ٹھیک نہیں ہے۔ مگر میری سمجھ میں اور کوئی لفظ نہیں آیا۔ اصل لفظ یہی ہے جو میں لکھنا چاہتا تھا'' اس کے بعد کھلے دل سے انہوں نے سب کے سامنے کہا کہ ''میں صرف دو ایڈیٹروں کی اصلاح قبول کرتا ہوں، ایک آپ اور دوسرے حامد علی خاں۔ آپ دونوں کے علاوہ کسی اور کو میرا ایک لفظ بھی بدلنے کی اجازت نہیں ہے۔''

منٹو بظاہر بڑا اکھڑ، اور بدتمیز آدمی نظر آتا تھا مگر دراصل اس کے پہلو میں ایک بڑا احساس دل تھا۔ دُنیا نے اُسے بڑے دکھ پہنچائے تھے۔ امیر گھرانے کا لاڈلا بچہ تھا۔ بگڑ گیا اور خوب پیٹ بھر کے بگڑا۔ دوست احباب، کنبہ دار، رشتہ دار، سب سے اسے تکلیفیں پہنچی تھیں۔ اس لئے اس میں نفرت کا جذبہ بہت بڑھ گیا تھا، مگر اُس کی انسانیت مرتے دم تک قائم رہی، منٹو کا گل گوتھنا سا بچہ اچھا خاصا کھیلتا مالتا ذرا سی بیماری میں چٹ پٹ ہو گیا۔ مجھے معلوم ہوا تو میں بھی اس کے گھر پہنچا، احتیاطاً سو روپے ساتھ لیتا گیا کہ شاید منٹو کو روپے کی ضرورت ہو۔ صفیہ کا روتے روتے بُرا حال ہو گیا تھا۔ موتا کا گھر تھا۔ اس لئے میری بیوی کھانا لے کر پہنچیں، انہوں نے صفیہ کو سنبھالا۔ منٹو کی آنکھوں میں پہلی اور آخری بار میں نے آنسو دیکھے۔ بچہ دفنایا جا چکا تھا۔ میں نے منٹو کو رسمی دلاسا دیا اور چپکے سے روپے ان کی طرف بڑھا دیئے۔ منٹو نے روپے نہیں لئے۔ مگر تھوڑی دیر کے لئے وہ اپنا غم بھول گیا اور حیرت سے میرا منہ تکتا رہا۔ بعد میں اس واقعہ کا تذکرہ اُس نے اکثر احباب سے کیا، اور مُتعجب ہوتا رہا کہ بے مانگے کوئی روپے کسی کو کیسے دے سکتا ہے۔

منٹو کو شراب پینے کی لت خدا جانے کب سے تھی۔ جب تک وہ دلّی رہے اُن کی شراب بڑھنے نہیں پائی تھی۔ بمبئی جانے کے بعد انہوں نے پیسہ بھی خوب کمایا اور شراب بھی خوب پی۔ جب پاکستان بنا تو وہ لاہور آ گئے۔ یہاں فلموں کا کام نہیں تھا، اس لئے انہیں قلم کا سہارا لینا پڑا۔ ہمارے ادب جیسی بنجر زمین سے روزی پیدا کرنا منٹو ہی کا کام تھا۔ صحت پہلے ہی کون سی اچھی تھی۔ رہی سہی شراب نے غارت کردی۔ کئی دفعہ مرتے مرتے بچے۔ روٹی ملے یا نہ ملے بیس روپے روز انہیں شراب کے لئے ملنے چاہئیں۔ اس کے لئے انہوں نے اچھا بُرا سب کچھ لکھ ڈالا۔ روزانہ دو ایک افسانے لکھنا ان کا معمول ہو گیا تھا۔ انہیں لے کر وہ کسی ناشر کے پاس پہنچ جاتے۔ ناشروں نے پہلے ضرورت سے انہیں خریدا۔ پھر بے ضرورت۔ پھر اُبرانے اور منہ چھپانے لگے۔ دُور سے دیکھتے کہ منٹو آ رہا ہے تو دکان سے ٹل جاتے۔ منٹو کی اب بالکل وہی حالت ہوگئی تھی جو آخر آخر میں اختر شیرانی، اور میرا جی کی۔ بے تکلف لوگوں کی جیب میں ہاتھ ڈال دیتے اور جو کچھ جیب میں ہوتا نکال لیتے۔ اس میں سے گھر کچھ نہیں پہنچتا تھا۔ شراب سے بچانے کی بہت کوشش کی گئی۔ خود منٹو نے اس سے بچنے کے لئے اپنے آپ کو پاگل خانے میں داخل کرالیا۔ منہ سے یہ کافر لگی چھوٹ بھی گئی تھی مگر اللہ بھلا کرے دوستوں کا ایک دن پھر پلا لائے۔ نتیجہ یہ کہ رات کو خون کی قے ہوئی۔ اسپتال پہنچایا گیا۔ مہینوں پڑے رہے اور جینے کا ایک موقع اور مل گیا۔

اگست ۱۹۵۴ء میں کئی سال بعد لاہور گیا تھا۔ لاہور کے ادیب، شاعر، اڈیٹر اور پبلشر ایک بڑی پارٹی میں جمع تھے کہ غیر متوقع طور پر منٹو بھی وہاں آ گئے۔ اور سیدھے میرے پاس چلے آئے۔ اُن کی حالت غیر تھی۔ میں نے کہا۔ "آپ تو بہت بیمار ہیں۔ آپ کیوں آئے؟ میں یہاں سے اُٹھ کر خود آپ کے پاس آنے والا تھا۔"

بولے "ہاں بیمار تو ہوں، مگر جب یہ سُنا کہ آپ یہاں آ رہے ہیں تو جی نہ مانا۔"

اتنے میں ایک شامت کا مارا پبلشر ادھر آ نکلا۔ منٹو نے آواز دی "اوئے اِدھر آ۔" وہ رُکتا جھجکتا آ گیا۔ "کیا ہے تیری جیب میں؟ نکال۔" اس نے جیب میں سے پانچ روپے نکال کر پیش کئے۔ مگر منٹو پانچ روپے کب قبول کرنے والے تھے۔ "حرام زادے دس روپے تو دے۔" یہ کہہ کر اُس کی اندر کی جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ اور دس روپے کا نوٹ نکال کر پھر مجھ سے باتیں کرنے لگے۔ گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ پبلشر نے بھی سوچا کہ چلو سستے چھوٹے، وہاں سے رفو چکر ہو گیا۔ منٹو پندرہ بیس منٹ تک بیٹھے باتیں کرتے

رہے۔ مگر اُن کی بے چینی بڑھ گئی اور عذر کر کے رخصت ہو گئے۔ مجھ سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔

پانچ مہینے بعد اخباروں سے معلوم ہوا کہ منٹو اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ انہوں نے پھر چپکے سے شراب پی لی تھی، خون ڈالتے ڈالتے مر گئے۔ ہمیں تو منٹو کی عظمت کا اعتراف ہے ہی، خود کو بھی احساس تھا، چنانچہ جو کتبہ انہوں نے اپنی لوحِ مزار کے لئے خود لکھا تھا اُس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا۔

''یہاں سعادت حسن منٹو دفن ہے۔ اُس کے سینے میں فنِ افسانہ نگاری
کے سارے اسرار و رموز دفن ہیں۔ وہ اب بھی منوں مٹی کے نیچے سوچ رہا ہے
کہ وہ بڑا افسانہ نگار ہے یا خدا؟''

☆☆☆

احمد ندیم قاسمی

منٹو کی چند یادیں

میرے اور منٹو کے تعلقات کی کہانی اٹھارہ برس پر پھیلی ہوئی ہے اور اس دوران میں منٹو نے اگر مجھے ایک سطر کا خط بھی لکھا ہے تو میں نے اسے محفوظ کر لیا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے مجھے منٹو کی شخصیت سے بھی پیار تھا اور اس کے فن سے بھی عقیدت تھی اور ایک ادیب کے خطوط میں اس کی شخصیت اور اس کے فن کی جھلکیاں کچھ اس طرح یکجا ہو کر رہ جاتی ہیں کہ ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ (مجھے مختی نصیر انور نے بتایا ہے کہ جن دنوں میں نے رسالہ ''سنگ میل'' میں منٹو کے نام ایک کھلی چھٹی لکھی تو منٹو نے اس چٹھی کو پڑھے بغیر ایک روز میرے ان خطوط کا بنڈل کھولا جو میں نے گذشتہ دس برس میں اسے لکھے تھے انہیں ایک ایک کر کے نذر آتش کر دیا۔)

۱۹۳۷ء میں اختر شیرانی مرحوم کے توسط سے ہمارا تعارف ہوا اور چار برس کی خط و کتابت نے ہمارے درمیان خلوص کا ایک ایسا رشتہ قائم کر دیا جس کے بارے میں منٹو کو ۱۹۴۰ء تک یہ ڈر لگا رہا کہ اگر کہیں ہم دونوں کی ملاقات ہوگئی تو یہ رشتہ ٹوٹ جائے گا۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ منٹو اس انداز سے کیوں سوچتا ہے۔ شاید میرے خطوط سے اس نے زندگی اور اخلاق سے متعلق میرے نظریات کا اندازہ لگا لیا ہو اور اسے محسوس ہوا ہو کہ ہم ایک ہی راہ پر تو کیا متوازی راہوں پر بھی نہیں چل سکیں گے، یہی وجہ ہے کہ جب (۱۹۴۰ء میں) منٹو بمبئی سے دہلی آیا اور مجھے ملتان سے دہلی بلا بھیجا تو مجھے اس کے وہ تمام خطوط یاد آ گئے جس میں اس نے ہماری ملاقات کی خطرناکی کا خدشہ ظاہر کیا تھا۔ میں دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر اُترا اور تانگے والے کو اپنی ''منزل'' کا پتہ بتایا تو وہ مسکرانے لگا۔ میں سمجھا یہ شخص میری بڑی سی ''گھیرے دار'' شلوار اور اس کوٹ کے نظارے سے محظوظ ہو رہا ہے جسے اگرچہ پتلون پر پہننے کیلئے تیار کیا گیا ہے لیکن جسے میں نے شلوار پر لٹکا رکھا ہے۔ اُن دنوں میری صحت پہلوانوں جیسی تھی اور کو جوان

... کا راز اس وقت کھلا جب ہم اپنی "منزل" کے قریب پہنچے۔

میں دہلی میں پہلی بار آیا تھا اس لئے کوچوان کے رحم وکرم پر تھا۔ پہلے تو مجھے کچھ ایسا احساس ہوا جیسے یہ کوچوان کوئی غنڈا ہے اور میرے اجنبی تیروں کا شہ پا کر اس بازار میں آنکلا ہے جہاں ہر طرف ہارمونیم بج رہے ہیں بکھرے بالوں اور لپ اسٹک سے تھپے ہوئے ہونٹوں کی چھاؤں چھار ہی ہے۔ خواتین کھڑکیوں اور دریچوں میں یوں بیٹھی ہیں جیسے نمبردار اپنی چوپال پر اور کبڈی کے کھلاڑی اپنے دوستوں کے کندھوں پر بیٹھے ہیں۔ یہاں سے وہاں تک کھلے جبڑوں کے تھکے ماندے قہقہے اور پان کی پیکیں اور مرجھائے ہوئے پھول بکھر رہے ہیں اور کوچوان کہہ رہا ہے۔ "کیوں میاں؟ کیا آپ دلی میں پہلی بار آئے ہیں۔ یہ چاوڑی بازار ہے۔ آپ نے چاوڑی بازار جانے کو کہا تھا نا۔ کہاں اتریئے گا؟"

منٹو نے مجھے چاوڑی بازار ہی کا پتہ لکھا تھا۔ اور میں حیران تھا کہ کیا پنڈت کرپا رام کو رسالہ "مووِیز" کے دفتر کے لئے ساری دلی میں چاوڑی سے بہتر کوئی جگہ نہیں مل سکی؟ لیکن اب لوگوں سے اس دفتر کا پتہ پوچھتے ہوئے جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر کسی نے یہ کہہ دیا کہ "میاں یہاں رسالوں کے دفتر کہاں، یہاں تو دوسرے دفتر کھلے ہیں" تو میں سوائے جھینپ جانے کے اور کیا کر سکوں گا۔ میں نے سوچا کہ کھاری باؤلی میں رسالہ "ساقی" کا دفتر ہے۔ وہیں چلتے ہیں۔ مگر اچانک "مووِیز" کا بورڈ نظر آ گیا اور میں تانگے سے اُتر کر اندر چلا گیا۔

میں نے منٹو کو پہچان لیا۔ وہ ریلوے ٹائم ٹیبل میں سے اس گاڑی کا وقت دیکھ رہا تھا جس سے اتر کر میں چاوڑی میں پہنچ چکا تھا۔ منٹو سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ عام جسمانی صحت یونہی سی تھی مگر آنکھوں میں چمک اور رنگ میں سنہرا پن تھا۔ شام کو ہم نئی دہلی کے ایک الٹرا ماڈرن سینما ہال کی چوتھی منزل پر بذریعہ لفٹ منتقل کر دیئے گئے۔ جہاں میں نے ایک مرہٹہ ادیب کھانڈیکر کی فلمی کہانی "دھرم پتنی" کے مکالمے اور گیت لکھنا شروع کئے اور منٹو نے ان مکالموں اور گیتوں کو ٹائپ کرنے کا کام سنبھال لیا۔ دن بھر ہم یہ "تخلیقی اور تکنیکی" کام کرتے اور شام کو نیچے بازار میں چلے جاتے، منٹو شراب پیتا اور میں "پوٹیٹو چپس" کھاتا۔ دو تین دن کے بعد اس نے کہا کہ معاف کرنا احمد ندیم قاسمی۔ تم میری شراب کے مقابلے میں آلوؤں کی یہ کتریں کھاتے ہوئے بھلے نہیں لگ رہے۔" اور دوسرے دن اس "تنہائی"

بلکہ اکثر فلمی تکنیک کے سلسلے میں میری رہنمائی کرتا ہے اور بعض لمبے لمبے سین تو اس نے خود ہی لکھ کر ٹائپ کر ڈالے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ میری مدد کرنا چاہتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ مجھے بحیثیت سب انسپکٹر آبکاری صرف ساڑھے بہتر روپے ماہانہ ملتے ہیں مگر میں بھی تو یہ جانتا ہوں کہ منٹو بمبئی کے ہفت روزہ ''مصور'' کی ادارت کا حق الخدمت صرف پچاس روپے ماہانہ کی صورت میں حاصل کرتا ہے۔ پھر وہ کون ساجذبہ ہے جس نے منٹو کو بمبئی سے دہلی لا کر اسے میری خاطر اندھا دھند مشقت پر مجبور کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ جذبہ اس بے لوث خلوص کا تھا جو منٹو کی اور میری افتاد طبع میں واحد قدر مشترک کی حیثیت رکھتا تھا۔ ایک دوسرے کا احترام کرنے کے سوا ہم اپنی اپنی زندگی کی بیشتر سرگرمیوں میں ایک دوسرے کا ساتھ نہ دے سکے۔ طبائع کے اس واضح اختلاف کے باوجود ہمارے دوستانہ تعلقات ہمیشہ قائم رہے۔ ہمیں ایک دوسرے سے شکایتیں ضرور تھیں اور شکایتوں کا علی الاعلان اظہار بھی ہوتا رہا۔ مگر ہم جب بھی ایک دوسرے سے ملے۔ میل دھل گیا اور ہم آج سے سترہ برس پہلے کے منٹو اور ندیم بن گئے۔

منٹو سے میری دوسری ملاقات اس سے اگلے سال ہوئی۔ وہ بمبئی کو چھوڑ کر مستقل طور سے دہلی آ گیا تھا۔ یہاں وہ آل انڈیا ریڈیو میں ملازم تھا اور تلسن روڈ پر ن بلڈنگ کے ایک فلیٹ میں رہتا تھا۔ ان دنوں دہلی ریڈیو اسٹیشن میں اردو کے بہت سے ادیب اور شاعر جمع تھے۔ مولانا چراغ حسن حسرت شاید نیوز سیکشن سے متعلق تھے۔ ان کے علاوہ کرشن چندر، میرا جی، اوپندر ناتھ اشک اور ن م راشد بھی موجود تھے۔ اردو شاعری کے لئے نئے رجحانات کے نمائندہ شعراء کو ریڈیو والوں نے مدعو کیا تھا۔ تاثیر مرحوم اس محفل کے صدر تھے۔ اور شرکائے محفل میں فیض احمد فیض، حفیظ جالندھری، راشد، میرا جی، مجاز، تصدق حسین خالد، سیماب مرحوم، روش صدیقی اور ساغر نظامی کے ناموں کے علاوہ اپنا نام یاد رہ گیا ہے۔ منٹو کا فن ان دنوں انتہائی عروج پر تھا۔ صحت بری نہیں تھی۔ طبیعت میں شوخی اور بے باکی تو ہمیشہ سے تھی لیکن ان دنوں اس کی شخصیت کے یہ پہلو بھی اپنے عروج پر تھے۔ ایک دن اچانک بولا۔

''آؤیار۔ ذرا حفیظ صاحب کو چھیڑیں۔'' پھر وہ بھری محفل میں حفیظ صاحب کے پاس گیا اور نہایت ادب سے بولا۔''شاہنامۂ اسلام کے ایک شعر کے سلسلے میں آپ سے استفادہ کرنا ہے۔ بہت گہرا شعر ہے۔ آپ نے فلسفے میں کوئی نکتہ نظم فرمایا ہے۔ میں نے ہزار سر مارا۔ پڑھے لکھے دوستوں سے بھی مشورہ لیا مگر وہ مجھے مطمئن نہیں کر سکے۔ آپ کا وہ شعر یہ ہے۔

یہ لڑکا جو کہ بیٹھا ہے وہ لڑکی جو کہ بیٹھی ہے
یہ پیغمبر کا بیٹا ہے وہ پیغمبر کی بیٹی ہے

ساری محفل کشت زعفران بن گئی اور حفیظ صاحب بھی مسکرا کر ٹال گئے۔

پھر ایک دن منٹو نے مولانا چراغ حسن حسرت کو چھیڑنے کا پروگرام بنایا۔ مولانا شاید میرا جی کے کمرے میں تھے۔ کرشن، اشک اور میں، منٹو کے ہمراہ اُن کے پاس پہنچے اور منٹو نے بیٹھتے ہی علامہ اقبال پر برسنا شروع کر دیا۔ بانگ درا کے پہلے حصے سے آگے کے اقبال کو میں شاعر کے بجائے مولانا سمجھتا ہوں۔ آخر یہ بھی کوئی شاعری ہے کہ فلسفے کے نظریات کو بغیر کسی مقصد کے نظم کرتے جاؤ اور ہر نظریئے کے کوٹ کے کالر میں خودی کا پھول سجائے پھرو۔'' پہلے تو مولانا حسرت صاحب نے اقبال کی حمایت میں چند نہایت ٹھوس باتیں کیں مگر انہیں منٹو کے تیوروں سے اس کی نیت کا جلد ہی پتہ چل گیا اور انہوں نے ایسی ایسی شگفتہ چٹکیاں لینا شروع کیں کہ منٹو کی تجویز کے مطابق ہم وہاں سے سچ مچ بھاگ آئے۔

میں چند روز منٹو کے ہاں رکا۔ منٹو کے گھر میں مجھے سلیقہ، صفائی اور سادگی کا وہ معیار نظر آیا جو بڑے بڑے گھروں میں بھی محض ذوق لطیف کی کمی کے باعث غائب ہوتا ہے۔ منٹو کے لکھنے پڑھنے والے کمرے میں سفید چاندنی کا فرش بچھا رہتا۔ فٹ ڈیڑھ فٹ اونچے ڈسک میں منٹو کے مسودے بند ہوتے۔ اتنی ہی بلند تپائی پر منٹو کا ٹائپ رائٹر رکھا رہتا۔ کتابیں نہایت سلیقے سے ایک لمبے شلیف میں سجی رہتیں۔ اور گورا چٹا منٹو سفید براق لباس پہنے وہاں بیٹھا لکھتا اور ٹائپ کرتا نظر آتا۔ وہ اپنی شراب کی بوتل کو بھی اسی ڈسک کے نیچے ''چھپاتا'' تھا۔ اس لئے کہ ان دنوں منٹو کی بڑی بہن اس کے ہاں مقیم تھیں اور منٹو کہتا تھا کہ ''میں اپنی بہن سے ڈرتا ہوں اور پھر آج کل کے بچے اتنے تیز ہیں کہ انہیں ہزار سمجھایا جائے کہ اس بوتل میں تیل بھرا ہے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے گھورے جائیں گے۔ سو ان سے بھی چھپانا پڑتا ہے۔ رہی صفیہ تو جب اس نے دیکھا کہ میں چھوڑ نہیں سکتا تو اس نے ایک پیمانہ مقرر کر دیا ہے۔ اور اس پیمانے سے میری سیری نہیں ہوتی۔ سو

فراڈ کرنا ہی پڑتا ہے۔

منٹو کے مکان کی اس نہایت خوبصورت سادگی سے مجھے ۱۹۴۸ء کا ایک اور واقعہ یاد آ گیا ہے۔ منٹو میرے پاس آیا۔ ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھے چند منٹ تک باتیں کرتے رہے کہ اچانک اس نے چونک کر کہا۔ ''معلوم ہوتا ہے کہ اس کمرے میں تازہ تازہ سفیدی ہوئی ہے۔'' میں نے اسے بتایا کہ سفیدی کو بس ایک ہفتہ ہی گزرا ہوگا۔ وہ بولا۔ ''تم شاعر ہو کر ایسی بھونڈی سفیدی کو برداشت کئے بیٹھے ہو۔'' میں نے اسے اطلاع دی کہ سفیدی خود میں نے کی ہے اس لئے عدم برداشت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر مجھے اپنے گھر لے گیا اور اپنے ڈرائنگ روم میں داخل ہو کر بولا ''سفیدی اسے کہتے ہیں!''

تیسری مرتبہ خود منٹو نے مجھے دہلی بلا بھیجا۔ منٹو اور کرشن چند نے بنجارہ کے نام سے ایک فلمی کہانی لکھی تھی اور مجھے اس کے گیت لکھنا تھا۔ مجھے کوئی ایک مہینہ منٹو کے ہاں رہنے کا موقع ملا۔ اس دوران منٹو نے مجھ سے ریڈیو کے لئے طویل آپیرا اور چار منظوم ڈرامے بھی لکھوائے۔ واجبات کے معاملے میں ریڈیو کے حکام سے خوب خوب لڑائیاں کیں۔ پھر جب مجھے خاصی معقول رقم دلوا چکا تو مجھے چاندنی چوک میں لے گیا۔ وہاں سے اس نے ایک امرتسری دکاندار سے میرے لئے پتلونوں اور کوٹوں کے کپڑے خریدے۔ دو تین دنوں میں میرا یہ لباس تیار ہو گیا اور یوں میں نے زندگی میں پہلی بار پتلون پہنی اور ٹائی لگائی۔

چوتھی ملاقات ''بو'' پر مقدمے کے سلسلے میں ہوئی۔ جب منٹو بمبئی میں تھا اور میں ''ادب لطیف'' لاہور کا ایڈیٹر تھا۔ پانچویں ملاقات انارکلی بازار میں محض اتفاق سے ہوئی جب میں ''سویرا'' کے خلاف ایک مقدمے کے سلسلے میں لاہور آیا ہوا تھا اور منٹو مستقل طور سے لاہور آ گیا تھا۔ چند روز کے بعد وہ پشاور میں میرے پاس پہنچا اور وہاں پندرہ بیس روز مقیم رہا۔ ہمارے نظریاتی اختلاف کی ابتداء وہیں سے ہوئی۔

ہم دن بھر ریڈیو اسٹیشن میں گزارتے۔ شام کو منٹو کسی نہ کسی شخص کو اپنے ساتھ لے آتا۔ اور پھر شراب کے دور چلتے۔ ادب میں حقیقت اور جنس پر بحثیں ہوتیں۔ منٹو کو ان تمام مقدمات پر عبور حاصل تھا جو دنیا کے بڑے بڑے ممالک میں مختلف ادیبوں پہ عریانی کے الزام میں چلائے گئے۔ وہ ان مصنفین اور ان کی تحریروں کی مثالیں دیتا اور اس وقت اس کی زبان اتنی تیز ہو جاتی کہ اس پر ایک شعلہ نوا مقرر کا دھوکا ہوتا۔ ایک روز میں نے کہا۔ ''ٹالسٹائی نے موپساں کے کسی افسانے کے بارے میں لکھا ہے کہ اگر موپساں کو اپنی ننگی ہیروئن کو نہاتے ہوئے دکھانا تھا تو کیا اتنا کہہ دینا کافی نہیں تھا کہ وہ نہا رہی تھی۔ یا چلیے

یہ بھی کہہ دیجئے کہ وہ نہا چکی تو اس کے جسم پر بے شمار قطرے تھمے رہ گئے۔ لیکن موپساں کو یہ کہنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی کہ پانی کے ان قطروں کا رنگ ہیروئن کے جسم کی رنگت کی طرح سنہری یا ہلکا گلابی تھا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے ادب میں لذتیت کی ابتدا ہوتی ہے۔ اور یہ سن کر منٹو بھڑک اٹھا۔ بولا تم کیا جانو عورت کے جسم کے راز۔ تم نے ابھی تک شادی نہیں کی۔ تم نے تو شراب تک نہیں چکھی۔ تم تو اس روز چاوڑی میں یوں نظر آ رہے تھے جیسے راج ہنسوں کے ہجوم میں کوا گھس آئے۔ تم کیا جانو موپساں نے قطروں کی رنگ کا اظہار کیوں ضروری سمجھا، اگر وہ رنگت کا ذکر نہ کرتا تو یہ عورت کیسی چپٹی چپٹی سپاٹ لگتی۔ ان گلابی قطروں ہی نے تو اسے زندگی کی شگفتگی دی ہے۔ تم کسانوں کی کہانیاں لکھ لیتے ہو تو یہ ضروری نہیں کہ تم کسان عورتوں کی نفسیات کو بھی سمجھ سکو، عورت پر لکھتے وقت عورت بن جانا پڑتا ہے۔ اور کبھی تم تخلیق کے لمحوں میں عورت بنے ہو؟ تمہیں کبھی کسی نے چھیڑا ہے؟ کبھی کسی اجنبی نے تمہارے جسم پر ہاتھ رکھا ہے۔ کوئی جھرجھری محسوس کی ہے؟ تمہارے اعصاب کبھی اس اجنبی لمس کے مضراب سے بھی جھنجھنائے ہیں؟ سو میری جان ٹالسٹائی کبھی کبھی اس طرح گاندھی پنے پر اتر آتا تھا مگر کیا تمہارے خیال میں اس نے اپنی اینا کرینیا کے ننگے پاؤں پر لکھتے ہوئے وہ کیفیت محسوس نہیں کی ہوگی جو موپساں نے اپنی ہیروئن کے جسم پر پانی کے گلابی قطرے دیکھنے میں محسوس کی؟ سو احمد ندیم قاسمی۔ بات یہ ہے کہ تم ادب کے وزیر خارجہ اور ہم ادب کے وزیر داخلہ ہیں۔ ہماری اپنی اپنی راہیں اور اپنی منزلیں ہیں، نہ ندیم منٹو بن سکتا ہے نہ منٹو ندیم۔ ٹالسٹائی ٹالسٹائی ہے۔ اور موپساں موپساں ہے۔ اور میرے خیال میں، میں نے ایک پیگ زیادہ چڑھ لیا ہے، چلو اب سو جائیں۔"

ان دنوں میں نے تہیہ کرلیا کہ منٹو سے اس کے بعض افسانوں کے عریاں ٹکڑوں کی عریانی کی حقیقت تسلیم کرالوں۔ میں پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ گیا اور آخر ایک روز منٹو ایسی تلخ کلامی پر اُتر آیا جس کا میں تصور تک نہیں کرسکتا تھا۔ پھر ایک روز میں نے اسے وہیں پشاور میں بہت زیادہ شراب پینے سے روکا تو وہ تنگ آ کر بولا۔ "یہ میرا پرائیویٹ معاملہ ہے اور تم میرے دوست ضرور ہو مگر میں نے تمہیں اپنے ضمیر کی مسجد کا امام مقرر نہیں کیا۔"

دوسرے ہی دن اسے اپنے اس خوبصورت فقرے کی تلخی کا احساس ہوگیا کیونکہ اس کی باتوں اور تیوروں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ مجھے منا رہا ہے۔ پھر یہاں لاہور میں جب ہمارے درمیان مہینوں تک

کوئی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ وہ ایک دن میرے ہاں آیا مجھے اپنے گھر لے گیا اور پھر بولا۔ ''یہ باتیں نوٹ کرلو میری جان۔ شاید چند دنوں بعد تمہیں دو باتیں مرحوم منٹو کی یاد میں لکھنا پڑیں۔'' یہ سن کر میں خلاف معمول آپے سے باہر ہو گیا اور میں نے یہ سوچے بغیر کہ منٹو نشے میں ہے کہنا شروع کیا۔ ''اگر آپ کو میری دوستی اتنی عزیز ہے تو پھر شراب چھوڑنی پڑے گی۔ آپ تو پاگلوں کی طرح پیتے ہیں۔ کیا آپ کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ جس گھر میں آپ پی رہے ہوتے ہیں۔ اس میں نکہت بیٹی بھی رہتی ہے۔ یہ وہی بچی ہے جس کی ایک نہایت پیاری تصویر آپ نے بمبئی سے مجھے بھیجی تھی اور جو میرے پاس اب تک محفوظ ہے۔ آپ تو ادب کے وزیر داخلہ ہیں لیکن کیا آپ نکہت کے اس داخلی ردعمل کو خود سے محسوس نہیں کر سکتے۔ جو چند برس کے بعد آپ کو اس کیفیت میں دیکھ کر اس کے ذہن پر وارد ہوگا؟ اور اگر آپ کو اس بات کا احساس نہیں تو اب اپنے آپ کو ادب کا وزیر بے قلمدان کہا کیجئے۔ کیونکہ جو ادیب صرف اپنے اندر بند رہتا ہے...... اور منٹو نے کہا۔'' اس فراڈ کی کوئی خاص ضرورت تو نہیں۔'' اور اس کے بعد اس نے مجھ سے صاف صاف کہہ دیا کہ اس کی ذات کے معمولات میں دخل دینے کا مجھے کوئی دور دراز کا بھی حق نہیں۔ میں خفا ہوئے بغیر چلا آیا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ کل ہوش میں آکر ان باتوں پر پچھتائے گا۔ مگر وہ نہیں پچھتایا۔ بلکہ چند روز بعد سرراہے ملاقات ہوئی اور میں نے شکایت کی تو معلوم ہوا کہ اس روز جو کچھ اس نے کہا تھا وہ حرف آخر تھا اور وہ نشے کی نہیں ہوش کی باتیں تھیں۔

تب میں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس دوران گاہے گاہے ملاقات ہوتی رہی۔ مگر یہ حقیقت اپنی جگہ قائم رہی کہ نہ منٹو کو اپنی انتہا پسندیوں میں میری رفاقت گوارا ہے اور نہ مجھ میں اتنا حوصلہ ہے کہ اسے آہستہ آہستہ ختم ہوتے دیکھوں اور کچھ نہ بولوں۔ میں نے بول کر دیکھ لیا تھا۔

مگر اب مجھے کچھ ایسا احساس ہوتا ہے کہ میں نے بزدلی دکھائی تھی۔ میں اس کا پہرہ دار بن کر کیوں نہ بیٹھ گیا۔ میں اس کی جھڑکیاں اور گالیاں تک سہتا مگر اسے زندہ رکھنے کی کوشش کرتا۔ اس مہم میں اس کے گھرانے کے افراد اور اس کے چند نیک نفس دوست میرا ساتھ دیتے۔ اور ہم سب مل کر قوم کی اس متاع کو اتنی جلد نابود ہونے سے بچا لیتے۔ اور منٹو نے ایک بار مجھے یہ بھی تو لکھا تھا کہ مجھے آپ کی ہمیشہ ضرورت رہے گی۔ سو اب دو ماتم میرے سپرد ہوئے ہیں۔ ایک منٹو کا اور دوسرا اپنی عزت نفس کے تحفظ کے ڈھونگ کا۔

☆☆☆

سعادت حسن منٹو

منٹو کا نام میں نے پہلی بار ۱۹۴۴ء میں سنا۔

میں نوکری کی تلاش میں دہلی آیا۔ جنگ لگنے کی وجہ سے ہر بی اے، ایم اے کو بھرتی کیا جارہا تھا۔ میں آل انڈیا ریڈیو کے جنگ کی خبریں براڈ کاسٹ کرنے والے سیکشن میں دوسو روپے ماہوار پر ملازم ہوگیا۔

ہم چھ ساتھی ایک بڑے کمرے میں ایک بڑی میز کے گرد بیٹھتے۔ سارے دن میں آدھ گھنٹہ خبریں ترجمہ کرنے میں اور دس منٹ براڈ کاسٹ کرنے میں لگتے۔ باقی سارا دن خالی۔ مگر ہمارے لئے فوجی حکم تھا کہ ہم باہر نہ نکلیں۔

اکثر ہم دروازہ بند کر کے لطیفے سُناتے۔ ہری چند چڈہ ماں بہن کی گالیاں دیتا ہوا سیاسی اور ادبی محفلوں کے دلچسپ واقعات سناتا۔ رنڈیوں اور فوجی لڑکیوں کی ننگی کہانیاں بیان کرتا۔ کبھی کبھی وہ میز پر کھڑا ہو کر ناچنے لگتا، اور ہم تمام تال دیتے۔ مگر اس خرمستی کا رنگ ادبی تھا۔

اُردو افسانوں کا ذکر ہوتا۔ تو چڈہ جس کے منہ سے گالی بھلی لگتی تھی، کہتا ''تمہارے باپ منٹو نے سارے ادیبوں کی ماں کو۔۔۔''

سردی کے دن تھے۔ باہر بوندا باندی ہو رہی تھی۔ دلوں میں عجیب ویرانی اور اُداسی، چڈہ چھٹی لے کر شراب پینے گیا۔ ہم اور بھی زیادہ بجھے بجھے اور اکیلے محسوس کرنے لگے۔ کسی کام میں دل نہیں لگتا تھا۔ جاتے ہوئے چڈہ، ادبِ لطیف، کا افسانہ نمبر چھوڑ گیا تھا۔

میں ورق اُلٹنے لگا۔ اس میں کرشن چندر کی مشہور کہانی 'اَن داتا' تھی۔ جس میں بنگال کے سب سے بڑے قحط کا ذکر تھا۔ بہت لمبی۔ میں نے دس بارہ صفحے پڑھے اور کہانی چھوڑ دی۔ دوسرے ادیبوں کی

کہانیوں پر نگاہ دوڑائی مگر کوئی ادبی شعلہ نہ بھڑکا۔

اچانک میری نظر سعادت حسن منٹو کے نام پر پڑی۔ بہت عجیب نام تھا۔ منٹو...... جیسے لارڈ منٹو یا پنٹو............ بہت نقلی اور مضحکہ خیز نام۔ پھر کہانی کا نام پڑھا: 'بُو'۔

کہانی پڑھنے لگا، تو ایک نشست میں تمام کہانی پڑھ گیا۔ ہر فقرہ حسین۔ کہانی کے کرداروں کے نفسیاتی اور جسمانی رشتے بہت واضح اور جادو بھرے تھے۔ مجھے آج تک اُس کہانی کے فقرے، تشبیہوں اور سانسوں کا بیان یاد ہے۔ اس کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ مجھے پتہ ہی نہ چلا، کہ پانچ بج گئے اور میرے ساتھی گھر جانے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

کہانی میں جسمانی خوشبو تھی۔ ایک چمک تھی۔ نفسیاتی تجربہ اور لذت تھی۔ چھوٹے چھوٹے فقروں میں سادگی جو ایک پُختہ منجھے ہوئے فنکار میں ہوتی ہے۔

اس کہانی کا ہیرو رندھیر ہے۔ جس نے ایک گھاٹن لڑکی کے ساتھ رات گزاری۔ رندھیر اپنے کمرے کی کھڑکی میں بیٹھا بور ہو رہا تھا کہ اس کو رسّیوں کے کارخانے میں کام کرنے والی گھاٹن نظر آئی۔ جو بارش سے بچنے کے لئے املی کے درخت کے نیچے کھڑی تھی۔ رندھیر نے گلا صاف کرنے کے بہانے کھانس کر اس کی توجہ اپنی طرف کر لی، اور اشارے سے اُس کو اوپر بُلا لیا۔

دونوں نے کوئی خاص بات چیت نہ کی۔ جسم میں سے تڑپتی ہوئی رُوح ہی اُن کی زبان بن گئی تھی۔ رندھیر نے اس کے بارش میں بھیگے ہوئے کپڑے دیکھ کر اُس کو نئی دھوتی دے دی۔ لڑکی نے گیلا لباس کھول کر ایک طرف رکھ دیا۔ اور دھوتی لپیٹ لی۔ اس کے بعد وہ چولی کی تنیاں کھولنے لگی۔ تو بارش سے بھیگی تنیوں کی گانٹھ اور کَس گئی۔ اُس نے صرف یہی کہا 'کُھلتی نہیں'۔

رندھیر کے مضبوط ہاتھوں نے تنیوں کو جھٹکا دیا تو چولی کھل گئی اور اس کے ہاتھوں میں گھاٹن کی سُرمئی چھاتیاں آ گئیں۔

منٹو اس گھاٹن کے جسم کی سانولی چمک اور چھاتیوں کو بیان کرتا ہے، جیسے کسی کمہار نے چک پر سے کچی مٹی کے پیالے اُتارے ہوں — جیسے گندھلے تالاب میں دو دیئے جل اُٹھے ہوں۔

رندھیر گھاٹن کے جسم کی بو کو ساری رات پیتا رہا اور یہ بُو اُس کے جسم سے ہوتی ہوئی دماغ کے ہر کونے میں رچ گئی تھی۔ پھر جب وہ شادی کرتا ہے تو اس کو سہاگ رات مناتے ہوئے اپنی دلہن کا حسن

پھیکا اور بے رس لگتا ہے۔ جیسے پھٹے دُودھ میں پھٹیاں تیر رہی ہوں اس کے سُرخ ریشمی ازار بند نے اس کے نرم سفید جسم پر گہرے نشانات ڈال دیئے تھے۔ ریشمی دھبے۔ وہ گھاٹن کے ساتھ گزاری رات اور اس کے جسم کی صحت مند بُو کو نہیں بھول سکتا۔ اس سانولی بو کے سامنے درمیانے طبقے کی گھُٹی ہوئی محبت اور بیوی کے ساتھ رسمی پیار پھیکا اور بے جان ہے۔

کہانی پڑھنے کے بعد میں نے پہلی بار نئے اُردو ادب کے بارے میں نئے ڈھنگ سے سوچنا شروع کیا۔

اس سے پہلے میں نے کرشن چندر کی کہانیاں پڑھی تھیں، جن کا پسِ منظر کشمیر تھا اور جن میں پیار اور غریبی کی تڑپ تھی۔ دوسرے ادیبوں کے افسانے پڑھنے کا بھی موقع ملا تھا۔ مگر سب کو پڑھ کر مجھے یہی لگا تھا، ''اس طرح کی کہانی تو میں لکھ سکتا ہوں۔''

یہ میری صرف ذہنی سوچ تھی۔ شاید میں کرشن چندر یا راجندر سنگھ بیدی جیسی کہانی نہ لکھ سکتا۔ مگر ان کو پڑھتے ہوئے یہی محسوس ہوا کہ میری تخلیقی قوت کی اُڑان اُن سے اونچی تھی۔

مگر جب منٹو کو پڑھا، تو محسوس ہوا کہ میں اس طرح کی کہانی نہیں لکھ سکتا۔ کاش! میں ایسی منفرد اور عظیم کہانی لکھ سکتا۔ نہیں، میں اتنی عظیم کہانی کبھی نہیں لکھ سکتا۔

منٹو میرے لئے کہانی کی علامت بن گیا۔

ایک دن اچانک لنچ کے بعد دفتر کا چپراسی میری میز پر ایک لفافہ رکھ گیا۔ پتہ نہیں کیوں مجھے اس لفافے میں کوئی خطرہ نظر آیا، کوئی سنگین حکم، کوئی پریشان کرنے والا پیغام، لفافہ کھولنے سے پہلے مجھے اُس وقت کی دماغی کیفیت ابھی تک یاد ہے۔

لفافہ کھولا، میں نوکری سے برخاست کر دیا گیا تھا۔ میں لفافہ لے کر میجر بخشی کے پاس گیا۔

اس نے کہا''ہم کوئی وجہ بتانے کے لئے تیار نہیں۔ یہ رہی آپ کی ایک مہینے کی پیشگی تنخواہ۔''

اُس نے دراز میں سے دس دس روپے کے نئے اور کرارے نوٹ نکالے، اور میں اُن کو لے کر واپس آ گیا۔

میری معطلی کا پروانہ اس لئے آیا تھا کہ سرکار نے اپنی خفیہ پولس کے ذریعے میری گزشتہ سرگرمیوں کی چھان بین کی تھی۔ ان کو پتہ چلا کہ ۱۹۴۲ء کو آزادی کی تحریک میں حصہ لینے کے لیے مجھے

گرفتار کیا گیا۔ معطلی کے لئے یہ جُرم کافی تھا۔

میں نے کمرے میں جا کر اپنے ساتھیوں کو یہ خبر سُنائی۔ ہمدردی کے لئے ایک ہندی کا مصنف رونے لگا۔ میں نے نئی تنخواہ سے ایک کرارہ نوٹ نکالا اور سب کے لئے چائے اور پیسٹری کا آرڈر دیا۔ چڈہ نے اس چھوٹی سی الوداعی رسم کی صدارت کی اور اپنے خاص انداز میں بولا، ''اوئے مادر چودو! تم سب یہاں سرکار کی غلامی کرتے رہو گے۔ یہ پنچھی آزاد ہو گیا۔''

جاتے وقت اُس نے مجھے منٹو کی کہانیوں کی کتاب دی۔

وہ خود منٹو کے ساتھ دہلی ریڈیو اسٹیشن پر کام کر چکا تھا اور اکثر منٹو کی باتیں سناتا۔ وہ کہتا ''منٹو سب کا باپ تھا۔ یہاں آل انڈیا ریڈیو پر ڈیڑھ سال نوکری کر کے وہ بمبئی چلا گیا اور پیچھے ایک سو ڈرامے اور فیچر چھوڑ گیا۔ اور یہ اوپندر ناتھ اشک ساری عمر اس کے ساتھ دوستی کے لئے کوشش کرتا رہا۔ مگر اُس نے نزدیک تک نہ آنے دیا۔''

منٹو کی ادبی دوستی کا گھیرا شاہانہ تھا۔ اس میں کرشن چندر، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی شامل تھے۔ مگر اوپندر ناتھ اشک کبھی بھی اس حلقے میں شامل نہ ہو سکا۔ وہ بیرونی کنارے پر ہی رہا۔ ریڈیو میں ایک جگہ کام کرتے ہوئے وہ منٹو کی عظیم تخلیقی قدروں کو نہ چھو سکا۔ اس لئے احساسِ کمتری کا مارا وہ ہمیشہ اپنے آپ کو بڑا ثابت کرنے کے لئے شیخیاں مارتا رہا۔

منٹو ہندوستانی ادب کا اونچا مینار تھا۔

مجھے اُس وقت بھی اس بات کا احساس تھا کہ منٹو ایک انوکھا ادبی معجزہ ہے۔ میں جانتا تھا کہ کچھ ... کے بعد لوگ پوچھیں گے کہ منٹو کس کیفے میں بیٹھتا تھا۔ کہاں رہتا تھا۔ کس قسم کا پین استعمال

ہوتے ہوئے بولا'' کیا میں اندر آسکتا ہوں؟''

دوسرے آدمی نے کہا'' منٹو، مزہ تب ہے جب تم اس عنوان کے تحت ڈرامہ لکھو۔'' بیئر کی بوتلوں کی شرط لگ گئی۔ منٹو نے'' کیا میں اندر آسکتا ہوں''؟ ڈرامہ لکھ دیا۔

ایک بار کسی مصنف نے ریڈیو پر اپنا پروگرام کینسل کر دیا۔ ہر طرف ہلچل مچ گئی، کہ اس پروگرام کو کیسے پورا کیا جائے۔ منٹو کو کہا گیا، کہ وہ کوئی فیچر یا ڈرامہ لکھ دے۔

وہ غصے سے بولا'' میں نہیں لکھ سکتا۔ مشین کو بھی وقت چاہئے۔''

اس کی منت کی گئی۔ ایک دوست نے ٹائپ رائٹر کھول کر کاغذ چڑھایا اور منٹو کو کہا،'' یار لکھ دو ناں! ہم باہر بیٹھ کر انتظار کرتے ہیں۔''

منٹو تھوڑی دیر تک ٹائپ رائٹر کے سامنے بیٹھا رہا اور کاغذ کو گھورتا رہا۔ پھر اُس نے عنوان جمایا'' انتظار''۔

یہ ڈرامہ اس کے بہترین ڈراموں میں سے ہے۔ اس میں اس نے تکنیکی اور نفسیاتی نظریئے سے تجربہ کیا۔ ایک نوجوان اپنی محبوبہ کو خط لکھ رہا ہے، کہ وہ بیٹھا اس کا انتظار کر رہا ہے۔ یہ نوجوان دو نفسیاتی موضوع پر بولتا ہے۔ ایک شعور اور دوسرا لاشعور۔ دونوں میں سسپنس بھرے باہم ٹکراؤ والے مکالمے ہیں۔ لاشعور والا نوجوان شعوری نوجوان کو ٹوکتا، روکتا، بحث کرتا اُس کے ساتھ باتیں کرتا ہے اور اس کے من کی اندرونی تہیں کھولتا ہے۔

اس قسم کا ناٹکی احساس اور کردار کی خود وضاحت منٹو کی ادبی تخلیق کی خاصیت تھی۔ ایک دفعہ ریڈیو اسٹیشن کے ڈائریکٹر مسٹر ایڈوانی نے منٹو کے کسی فقرے پر اعتراض کیا۔ اور اُس کو بدلنے کے لئے کہا۔ اُن دنوں اے۔ ایس۔ بخاری ڈائریکٹر جنرل تھے۔ اور ایڈوانی بڑے رسوخ والا اور رُعب والا ڈائریکٹر، منٹو نے بھری مجلس میں کہا' ایڈوانی صاحب کو اُردو ڈرامہ لکھنے کی سمجھ تو کہاں، اُردو میں ڈرامہ پڑھنا بھی نہیں آتا۔ اور میرے ڈرامے میں غلطیاں نکال رہے ہیں۔''

بخاری صاحب تک جا پہنچی۔ منٹو نے بخاری کو کہا'' میں نے جو کچھ کہا ہے، وہ سچ ہے۔ جس کا نام ہی ایڈوانی ہے اس کو اُردو کا کیا پتہ۔''

بخاری صاحب ہنسنے لگے۔ معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

میں دہلی سے لاہور چلا گیا۔ کچھ ماہ بیکار رہا۔ ۱۹۴۲ء میں میرا پنجابی ناولٹ اور ڈرامہ ''لو ہائٹ'' چھپا اور لاہور ریڈیو اسٹیشن نے مجھے بطور آرٹسٹ رکھ لیا۔

یہاں راجندر سنگھ بیدی کام کرتا تھا، دلکش آواز والی آپا شمیم (موہنی داس) تھی۔ امتیاز علی تاج اور رفیع احمد پیر کو ڈرامہ پر ڈیوس کرنے آتے۔ ملکہ پکھراج اسٹوڈیو میں بیٹھی پان چباتی اور گاتی۔ بے حد تخلیقی ماحول تھا۔ ان محفلوں میں منٹو کا اکثر ذکر آتا۔

لاہور کے اُردو رسالے، ادبِ لطیف، کا ایڈیٹر اور مالک چودھری نذیر احمد تھا۔ نذیر احمد پنجاب کے کسی گاؤں کا ارائیں تھا۔ اور اس کا نام تھا نذیرا۔ چوتھی جماعت پاس، درمیانہ قد، تگڑا جسم، چمکتے دانت اور وہ ٹیٹھ پنجابی بولتا۔ اس نے اپنے چچا برکت علی کے ساتھ مل کر'' مکتبہ اردو'' کی بنیاد رکھی۔ جو سارے ہندوستان کا سب سے بڑا اور مقبول پبلشنگ ہاؤس بن گیا۔ وہ نذیرا، سے نذیر احمد اور پھر چودھری نذیر احمد بن گیا۔

چودھری نذیر خود ہر کہانی پڑھتا اور پرکھتا۔ صرف منٹو ایسا ادیب تھا۔ جس کی کہانی کے انتظار میں وہ کئی دفعہ پرچہ لیٹ کر دیتا۔ وہ منٹو کو خطوط لکھتا، تاریں بھیجتا، اور جب منٹو کی کہانی بمبئی سے آتی، تو خوشی سے ہنستا اور کہتا، '' اب میرا پرچہ مکمل ہو گیا۔''

جب منٹو کی کہانی ''بُو'' کے چھپنے کے بعد اُس پر فحاشی کا مقدمہ چلا تو اس کو تاریخ بھگتنے کے لئے لاہور آنا پڑا۔

ضلع کچہری بہت سارے ادیب منٹو کے حق میں گواہی دینے کے لئے گئے تھے۔ میں نے پہلی بار اُس کو وہاں ہی دیکھا۔

پتلا لمبا جسم جس میں بید جیسی لچک تھی، چوڑا ماتھا، کشمیری تیکھا ناک اور تیز آنکھوں پر چشمہ، اُس نے سفید قمیض، شیروانی، لٹھے کی شلوار اور زری کا جوتا پہنا ہوا تھا۔ سر غرور سے اونچا۔ اُس نے بے پرواہی

کے ساتھ ہمیں دیکھا۔

وہ عصمت چغتائی کے پاس کھڑا تھا۔اور ہم سارے کچہری کی آواز کے انتظار میں تھے۔ پروفیسر کنہیالال کپور نے ہم سب کا تعارف کروایا۔مگر منٹو کے مُنہ سے شکریہ کا کوئی روایتی لفظ نہ نکلا۔ نہ ہی کسی طرح کی خوشی کا اظہار۔ اتنے میں چودھری نذیر جلدی سے آیا،''چلو آواز پڑ گئی ہے۔''

ادیبوں کا یہ جھنڈ جج کے کمرے میں داخل ہوا،تو سب نے ''بُو'' کی فنکارانہ خوبیوں کو بیان کیا۔اور یہ کہا کہ اس میں کوئی بات اعتراض کے قابل نہیں اور یہ ادبی شاہکار ہے۔

پنجابی ادیبوں میں سب سے زیادہ قابلِ احترام سردار گور بخش سنگھ پریت لڑی والے تھے جنہوں نے خود پیار کی کہانیاں لکھیں تھیں اور سماجی بغاوت کا جھنڈا اٹھایا تھا۔ جب ان کو منٹو کی اس کہانی کے حق میں گواہی دینے کے لئے کہا،تو انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہ کہانی فحش ہے۔ جب عصمت اور منٹو کو پتہ چلا،تو وہ بہت حیران ہوئے۔ منٹو نے کہا''حیرانی کی بات ہے،کہ پنجابی میں اس طرح کے ادیب بھی ہیں۔اس زبان کے ادب کا خدا ہی مالک ہے۔''

گواہیاں ختم ہوئیں۔جج نے اگلی پیشی کی تاریخ دے دی۔

ضلع کچہری کے ماحول سے منٹو کی طبیعت بیزار ہوگئی۔ جگہ جگہ ٹوٹے ہوئے بنچ،لوہے کی کُرسیاں، گرد و غبار،وکیلوں اور منشیوں کی قانونی سودے بازی۔ عجیب قسم کی گھبراہٹ اور پریشانی۔سب ادیب ملزم نظر آرہے تھے۔

منٹو نے کہا''نذیر، میں گھر جاؤں گا تانگہ منگوادو۔''

''کِسی اور نے چلنا ہے؟ صرف ایک۔''

میں نزدیک کھڑا تھا۔فوراً آگے بڑھا اور اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

راستے میں تھوڑی سی باتیں ہوئیں۔

وہ بولا''یہ لوگ خواہ مخواہ مجھے ہیرو بنا رہے ہیں۔ مجھے جیل سے ڈر لگتا ہے۔ ہر دفعہ بمبئی سے یہاں آنا بہت مشکل ہے۔ بہت مہنگا ——— یہی جرمانہ کافی ہے۔

فلمی کہانی کا سکرین پلے تیار کر رہا تھا،کہ یہاں سے چودھری کا تار گیا ——— تم اب کیا کر رہے ہو ——— ؟

میں نے اپنے بارے میں تھوڑا سا بتایا۔

اُس کا مجھ پر بہت رُعب تھا۔

نیلا گنبد آیا۔ تو میں اُتر گیا۔ وہ بولا ''میں سیدھا گھر جاؤں گا۔ ———— صفیہ بھی آئی ہوئی ہے۔ میں نے جا کر چودھری کے لئے افسانہ ختم کرنا ہے۔''

پھر وہ یکدم بولا ''شام کو تم میری طرف آ جانا، تب تک میں افسانہ ختم کر لوں گا۔''

مجھے چھوڑ کر وہ چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے ساری بات کا جائزہ لیا۔ اس کی آواز باریک اور گرم تھی، جس میں اُس کی شخصیت کی پوری شدّت شامل تھی۔ یہ آواز نہ لیڈروں جیسی تھی، نہ درویشوں جیسی، بلکہ اس میں بے تابی اور رونگار تھی۔

وہ میرے ساتھ پنجابی میں ہی بات چیت کر رہا تھا۔

شام کو میں منٹو کو ملنے گیا۔ وہ فیروز پور روڈ کے علاقے میں کسی رشتے دار کی کوٹھی میں ٹھہرا ہوا تھا۔ نوکر نے کہا، کہ میں ڈرائنگ روم میں بیٹھوں، کیونکہ منٹو صاحب کہانی لکھنے میں مصروف ہیں۔ یہ وہی کہانی تھی جو 'ادب لطیف' میں ''راج بھیا'' کے نام سے چھپی، پھر ''میرا نام رادھا ہے'' کے نام سے۔ اس میں اُس نے پرتھوی راج کپور کی سخت گیری کا مذاق اُڑایا تھا۔

دس منٹ کے بعد منٹو ساتھ کے کمرے سے نکلا۔ تپاک سے پوچھا، ''چائے پیو گے؟''

پھر اس نے آواز دی ''صفیہ! کیا کر رہی ہو؟ اِدھر آؤ''

اس کی بیوی آئی۔ منٹو نے تعارف کرایا۔ اتنے میں کچھ اور ادیب آ گئے۔ چودھری نذیر بھی آ گیا۔ کسی کے گھر محفل تھی۔ وہ منٹو کو لینے آئے تھے۔

منٹو نے مجھے کہا، ''اچھا۔ پھر کل کو ملنا۔ میں ''مکتبہ اُردو'' میں ہوں گا۔''

منٹو کے پاس قلم نہیں تیز نشتر تھا۔ جس سے وہ سماج کی ناڑیوں میں سے گندہ خون نکالتا تھا۔ وہ حکیم نہیں تھا۔ سرجن تھا۔ اُس کی تیز نگاہ سماج کو دیکھنے کے لئے ڈبل لینز کا کام کرتی تھی۔ اُس کے بیان میں رس تھا۔ سب جانتے تھے کہ وہ ان سے کہیں بہتر لکھتا ہے۔ سب اس کے فن کا لوہا مانتے تھے۔

''وہ مکتبہ، اُردو میں بیٹھا اپنی کتاب کے اشتہار کی عبارت دیکھ رہا تھا۔ جس میں لکھا تھا۔''منٹو اس دور کا سب سے بڑا افسانہ نگار ہے۔ چیخوف کے برابر کا، جذبوں کو ابھارنے والا اور جادُو پھونکنے والا اس کے افسانے فن کی بلندیوں کو چھوتے ہیں..........''

منٹو بولا''اوئے چودھری یہ کیا بکواس لکھی ہے!''

اس نے سارے تعریفی لفظ کاٹ دیئے۔ اور کتاب کا اشتہار خود بنایا۔ اس میں لکھا! منٹو بکواس لکھتا ہے! منٹو کو لوگ فحش کہتے ہیں۔ مگر منٹو کو ایک بار پڑھنا شروع کردیں، تو کہانی ختم کئے بغیر اس کو چھوڑ نہیں سکتے۔''

اشتہار میں، 'بکواس' اور 'فحش'، موٹے لفظوں میں تھے۔

وہ باتیں، جو اُس کے مخالف کہنا چاہتے تھے۔ اس نے خود ہی لکھ دیں۔ تاکہ لوگوں کو جھٹکا لگے۔

اس کو میٹھے میٹھے لفظوں سے، میٹھے مضمونوں سے، میٹھے رسمی فقروں سے چڑ تھی۔ ایک دفعہ کسی نے اس کی ایک بڑی ہستی کے ساتھ ملاقات کرائی۔ اُس آدمی نے کہا،''منٹو صاحب آپ کو مل کر بہت خوشی ہوئی۔''

منٹو نے جواب دیا،'' آپ کو مل کر مجھے بالکل خوشی نہیں ہوئی۔''

یہ انداز یہ کڑوا سچ، یہ چونکا دینے والا منتر اُس کے مزاج کا حصہ تھا۔

چودھری نذیر نے مجھے بتایا کہ منٹو کیلاش ہوٹل میں بیٹھا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ میں وہاں چلا جاؤں۔

کیلاش ہوٹل انار کلی میں تھا، تین منٹ کا راستہ۔ میں ہوٹل کی سیڑھیاں چڑھ کر پہلی منزل پر پہنچا۔ منٹو تین ادیبوں کے ساتھ بیٹھا شراب پی رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا''بس ابھی چلتے ہیں۔ تم پیو گے؟''

میں نے کہا،''نہیں''

ایک ادیب بولا''منٹو صاحب آپ کی کہانیاں کمال ہیں۔ 'ہتک' اور کالی شلوار،......تو شاہکار ہیں۔ کوئی بھی ایسی اعلیٰ کہانی..........................۔

منٹو بولا،'' بکواس بند کر۔ تم نے شراب پینی تھی، پی لی۔ اب دفع ہو جاؤ۔''

میں سہم گیا۔ وہ لوگ اٹھ کر چلے گئے۔

منٹو بولا،''میں تمہارا انتظار کر رہا تھا کہ یہ تینوں حرامزادے اپنی ٹیبل سے اٹھ کر یہاں آ بیٹھے۔ دو دو پیگ پی کر بہکنے لگے۔ میری تعریف کر کے تیسرا پیگ پینا چاہتے تھے۔ چلو چلیں۔''

میں ساتھ چل پڑا۔

راستے میں پوچھا، "ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"عبدل باری کے پاس۔"

مجھے یاد نہیں، کہ ہم عبدل باری کے گھر گئے۔ یا وہ ہمیں کسی اور جگہ ملا۔

میں نے عبدل باری کو کئی ادبی اور سیاسی محفلوں میں دیکھا تھا۔ وہ سانولے رنگ کا جرنلسٹ تھا، اور دنیا بھر کے حوالے دے کر لیکچر دیتا۔ اُس کے خشک لیکچر سن کر مجھے کبھی اُس آدمی کو ملنے کی خواہش نہ ہوئی۔

مگر منٹو اس کو ڈھونڈتا پھرتا تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ عبدل باری...... اس کا ادبی گورو تھا۔

ہم تینوں ایک اعلیٰ پشاوری تانگے میں بیٹھے۔ میں اور عبدل باری اگلی سیٹ پر کوچوان کے ساتھ اور منٹو عادت کے مطابق زری والا جوتا پہنے پچھلی سیٹ پر ٹانگیں پسارے بیٹھا تھا۔

تانگہ مال روڈ پر دوڑنے لگا۔

بڑے ڈاکخانے سے گزر کر تانگہ رُکا اور باری نیچے اُترا۔ منٹو نے بٹوہ نکالا اور اس میں سے ایک سبز نوٹ اس کو دیا۔ باری بھولا ناتھ کی دوکان پر گیا۔ ہم دونوں تانگے میں ہی بیٹھے رہے۔ دس منٹ گزر گئے۔ منٹو نے بے تابی کے ساتھ کہا، "یہ جاہل میرا وقت ضائع کر رہا ہے۔ اتنی دیر؟ کیا ہیرے خرید رہا ہے؟ بکواس!"

اتنے میں باری نظر آیا۔ وہ بھاری تیز قدموں کے ساتھ چلتا ہوا تانگے میں آ کر بیٹھ گیا۔

اس کے ہاتھ میں جانی واکر کی بوتل کا لمبا ڈبہ تھا۔

منٹو نے پوچھا، "ٹھیک ہے؟"

باری بولا، "ہاں۔"

تانگہ پھر سرپٹ دوڑنے لگا۔ ہم میوزیم اور گورنمنٹ کالج کے سامنے سے گزر کر راوی روڈ پر جا رہے تھے۔ کیا یہ لوگ بوٹنگ کے لئے جا رہے ہیں؟ شام ڈھل چکی تھی۔ بتیاں جل چکی تھیں۔ یہ کہاں جا رہے تھے۔؟ مجھے بالکل علم نہ تھا، کہ ان کی منزل، ہیرا منڈی ہے، جہاں رنڈیوں کے چکلے تھے۔

شاہی مسجد کے قریب بازار میں تانگہ رُکا۔

باری نے تانگے والے کو پیسے دیئے اور ہم تینوں حُسن کے بازار میں داخل ہوئے۔

میں اس سے پہلے کبھی ادھر نہیں آیا تھا۔ اس کی وجہ کوئی سماجی بندش نہیں تھی۔ مجھے ویسے ہی رنڈیوں

اور دلّو ں کے کاروباری ماحول سے ڈر لگتا تھا۔ بچپن سے میرے ذہن میں یہی تصویر تھی کہ یہ لوگ جھگڑالو اور پیسے کے پیر ہوتے ہیں۔ یہاں چھرے چل جاتے ہیں۔ اس خوف کے پیچھے ایک غیبی انجانی دنیا میں پہلا قدم رکھنے کی سنسنی اور کپکپاہٹ بھی پوشیدہ تھی۔ مگر اس وقت منٹو میرے ساتھ تھا، اس لئے مجھے ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ جیسے کوئی مگر مچھ کی پیٹھ پر بیٹھ کر دریا کی سیر کر رہا ہو۔

بازار میں چمک اور گہما گہمی تھی۔ سیخ کباب، پان، پھولوں کے ہار اور تماش بینوں کی رونق، اس گہما گہمی میں عجیب سرسراہٹیں، خاموش اشارے اور گھورتی ہوئی نظریں تھیں۔ سودے بازی کا کام خاموشی سے چل رہا تھا۔

میں نے دیکھا کہ باری ایک طرف کھڑا کسی پٹھان کے ساتھ آہستہ آہستہ باتیں کر رہا تھا۔ پٹھان کے مہندی رنگے گل مُچھے مجھے نظر آئے۔ پھر دونوں ہمارے پاس آئے اور باری نے رنڈی کا ریٹ طے کرنے کی ہدایت کی۔

منٹو غصّے سے بولا، ''تم خود ہی یہ معاملہ سیٹل کرو، بیوقوف! جاؤ!''

منٹو کو اس قسم کی سودے بازی بُری لگتی تھی۔

اتنے میں باری اور پٹھان آ گئے۔

پٹھان بولا ''چلو، اس کوٹھے پر بہت اچھا مال ہے۔''

ہم چاروں سیڑھیاں چڑھ گئے۔ بالکونی سے سے گزر کر کمرے میں داخل ہوئے تو ایک پٹھان رنڈی بیٹھی تھی۔ پچیس کے پیٹے میں ہوگی۔ چہرے کے نقش موٹے، اس نے بالوں میں تیل تھوپا ہوا تھا اور ان میں چمبیلی کی کلیاں، گھٹیا ریشم کے نیلے دھبوں والی قمیض اور ساٹن کی شلوار اور منہ میں پان کا بیڑہ۔

''آؤ بیٹھو۔''

پٹھان بھی ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ اس کا گل مچھوں والا ہنکار یا ہوا چہرہ نرم لگنے والا۔ وہ بہت حلیم تھا اور حکم کا بندہ۔ وہ چکلے کے اس اڈے کی رنڈیوں کا چیف دلاّ تھا۔

منٹو نے ایک نظر کے ساتھ ہی اس رنڈی کے تھل تھل کرتے جسم کو دیکھا۔

ایک نوکر آیا اس نے تین گلاس رکھ دیئے۔

منٹو بولا، ''سوڈا منگواؤ۔ اور کھانے کے لئے تکّے اور کباب، تم کیا کھاؤ گے؟''

میں ان دنوں میٹ نہیں کھاتا تھا دو ایک بار میٹ کھانے کی کوشش کی تھی۔ جب چبایا تو ربڑ کی طرح لگا۔

میں نے کہا' میں آملیٹ کھاؤں گا۔''

منٹو نے جیب میں سے دس دس روپے کے کرارے نوٹ نکالے اور پٹھان کو دیئے۔ دس منٹ کے بعد وہ اور اس کا نوکر میٹ، کباب اور آملیٹ کی پلیٹیں لے کر آ گئے، ساتھ ہی سوڈے کی بوتلیں اور برف۔ ایک پلیٹ میں لیموں اور پیاز اس نے باقی پیسے واپس کیے۔ تو منٹو نے کہا'' رکھ لو ان کو۔''

باری نے بوتل کھولی اور تین گلاسوں میں شراب ڈال کر سوڈا اور برف ڈالی۔

میں نے کہا'' میں نہیں پیتا۔''

باری کے سانولے چہرے پر پہلی بار مسکراہٹ آئی،'' بھئی شراب تو ثواب کی چیز ہے۔ پی لو۔''

منٹو بولا،'' یہ نہیں پیتا۔''

پھر وہ رنڈی کی ران پر دھپا کر بولا،'' تم پی لو، میری جان۔''

رنڈی نے ترچھی آنکھوں سے منٹو کی طرف دیکھا، اور موٹی مسکراہٹ پھینکی۔ پھر گلاس اٹھا کر پینے لگی۔

منٹو اور باری نے فوراً ہی اپنے گلاس خالی کر دیئے۔ پھر ڈبل پیگ تیار کیئے۔

گھونٹ بھر کر منٹو نے کہا،'' اب مال دکھاؤ۔''

رنڈی نے پٹھان کو اشارے سے کچھ کہا۔ پٹھان تھوڑی دیر کے بعد ایک سجی سجائی رنڈی اندر لے آیا۔ وہ سامنے بیٹھ گئی۔ منٹو نے اس کو غور سے دیکھا، میں بھی اس کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا! پتلی دبلی، چہرے پر گلال تھوپا ہوا۔ آنکھوں میں بہت زیادہ کاجل، جارجٹ کی جامنی ساڑھی۔ اُس نے مسکرا کر پوچھا۔

'' آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟''

'' تمہاری ماں کے گاؤں سے۔'' منٹو بولا۔'' تم کہاں کی ہو؟''

منٹو کے دو تین سوالوں کے بعد رنڈی رد کر دی گئی۔

پٹھان کے اشارے سے وہ چلی گئی۔ اس کے بعد وہ دوسری لایا، پھر تیسری تینوں ہی منٹو کو

دیئے۔منٹو کی دلچسپی بڑھی۔مگر ساتھ ہی ایک اور جذبہ بھی کام کررہا تھا۔اُس نے پوچھا،''یہ کالا چشمہ رات کے وقت کیوں لگا رکھا ہے، میری جان؟''

وہ بولی،''آپ کے حُسن سے کہیں میری آنکھیں نہ چندھیا جائیں۔''

منٹو نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا،''میری جان، تمہارے ساتھ بستر میں بہت مزہ آئے گا، مگر پہلے دیکھ تو لوں تم ہو کیا؟''

یہ کہہ کر اس نے اچانک اس کا کالا چشمہ اُتار لیا۔

رنڈی نے آنکھیں جھپکائیں۔ایک آنکھ بھینگی تھی۔

منٹو بولا،''اگر تم چشمے کے بغیر آئی ہوتی تو میں تمہیں ضرور محبت کرتا۔تمہاری اس بھینگی آنکھ پر فدا ہو جاتا۔مگر چوری میں برداشت نہیں کرسکتا۔''

یہ رنڈی بھی رد کر دی گئی۔

رات کے گیارہ بج چکے تھے۔میٹ اور کباب اور آملیٹ تین دفعہ آچکے تھے۔منٹو پانچ پیگ پی چکا تھا۔اس کی آنکھوں کی پُتلیاں پھیل گئی تھیں، مگر اس کی باتوں میں وہی چمک اور رنگینی تھی۔

وہ چھٹا پیگ ڈالنے لگا، تو رنڈی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا،''آپ کو میری قسم اور نہ پئیں،''

میں نے منٹو کو کہا،''اور نہ پئیں یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔اس کو ہمدردی ہے۔''

وہ بولا،''ہمدردی؟ سالی چار پیگ بچانا چاہتی ہے اپنے دلے کے لئے۔اگر صاف کہہ دے تو میں اس کے لئے بوتل منگوا سکتا ہوں۔مگر یہ حرامزادی ہمدردی کا ڈھونگ رچاتی ہے۔''

اس نے پیگ بھرا اور نئے گھونٹ کا مزہ لینے لگا۔

رنڈی نے پھر منٹو کا ہاتھ پکڑ لیا،''اللہ جانتا ہے، آپ بہت اچھے لگتے ہیں۔''

منٹو نے اس کی ران پر دھپا مارا،''میری جان تم دنیا کی سب عورتوں سے زیادہ حسین ہو۔تم قلوطرہ

ہو، ہیلن ہو۔"

منٹو نے پٹھان کو جتنی بار نوٹ دیئے اس کا حساب نہ لیا۔ ہر دفعہ پٹھان باقی پیسے رکھ لیتا تھا۔ منٹو بے دردی کے ساتھ کرارے نوٹ پھینک رہا تھا۔

مجھے منٹو کے اندر بابو گوپی ناتھ نظر آیا۔ اس کی کہانی کا کردار، جو رنڈیوں کے کوٹھوں پر جاتا ہے اور سب کچھ جانتے ہوئے بھی روپیہ لٹاتا ہے۔ اس کو رنڈیوں اور دلّوں کی دنیا پسند ہے۔ یا درگاہوں اور مزاروں پر پیروں فقیروں کی، مگر بابو گوپی ناتھ بے نیاز ہے۔ منٹو اس کا ہی عکس تھا۔ یا یہ کہنا چاہئے کہ بابو گوپی ناتھ میں بسی ہوئی انسانیت منٹو ہی کی روح تھی۔

منٹو کی روح میں عجیب ویرانگی تھی۔ وہ رنڈیوں کی دنیا میں رہتا ہوا بے تعلق تھا۔ مگر وہ ان چکلوں میں چھپی ہوئی انسانیت اور رنڈی کے دل میں بسی عورت کو دیکھتا تھا۔ عورت میں رنڈی اور رنڈی میں عورت دیکھتا تھا۔

جسم کی منڈی میں وہ روح کا بیوپاری تھا۔

(۲)

دوسرے دن گیارے بجے منٹو ریڈیو اسٹیشن آیا۔ ان دنوں جُگل کشور مہرہ اسٹیشن ڈائریکٹر تھا۔ بڑا صاحب، جس سے سارا عملہ کانپتا تھا۔ لچکیلا جسم، چہرے پر چیچک کے مدہم داغ، بھیڑیئے جیسی آنکھیں، اور ایکٹروں جیسی منجھی ہوئی آواز، ٹویڈ کا کوٹ پہنے، منہ میں سگار، ساتھ السیشن کتا، وہ ریڈیو اسٹیشن آتا۔

میں اپنے کمرے میں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ چپراسی نے آکر کہا کہ منٹو صاحب بلا رہے ہیں۔ میرے پاس منٹو کا نوٹوں کا بٹوہ تھا۔ جو اس نے پہلی رات مجھے سنبھال دیا تھا۔

میں باہر نکلا، تو منٹو نے اونچی آواز میں کہا، "جُگل! میں جا رہا ہوں۔"

اتنے میں مہرہ صاحب باہر آئے، اور منٹو کو کہنے لگے، "ٹھہرو یار، اکٹھے چلتے ہیں۔"

منٹو بے پرواہی سے بولا، "تم ریس کھیلنے جاؤ۔ مجھے ریس کا کوئی شوق نہیں، بور۔ میں چلتا ہوں۔"

میں نے منٹو کو اس کا بٹوہ واپس کیا۔ اس نے روپے نہ گنے، صرف بمبئی کے ٹکٹ دیکھے مجھے کہنے لگا، "آج شام میں واپس جا رہا ہوں۔"

شام کو میں ریلوے اسٹیشن پہنچا، فرنٹیر میل میں اس کی دو سیٹیں ریزرو تھیں۔ صفیہ اس کے ساتھ

تھی۔اس نے سوٹ کیس اور لاہور سے خریدی ہوئی چیزوں کے بنڈل سیٹوں کے نیچے رکھ دیئے۔

ہم دونوں پلیٹ فارم پر کھڑے تھے۔منٹو کہنے لگا، چودھری ابھی تک نہیں آیا۔سگنل ڈاؤن ہو گیا ،اور وہ پتہ نہیں کہاں ہے۔''

تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر بولا،''اس گدھے کو وقت کا کوئی اندازہ نہیں۔گاؤں سے نکلا ،تو سیدھا لاہور، آرائیں کا آرائیں رہا،ابھی تک نہیں آیا___ میں نے بڑی غلطی کی کہ سارے کپڑے دھونے کے دے دیئے۔چھ شلواریں، چھ قمیصیں ،اچکن___وہ الو کا پٹھا ابھی تک نہیں آیا۔''

گارڈ نے سیٹی دی۔منٹو بڑبڑایا،اس گدھے کا کچھ پتہ ہی نہیں۔''

اتنی دیر میں چودھری نذیر کپڑوں کا بنڈل اٹھائے ہانپتا ہوا آ گیا۔بڑی مشکل سے پہنچا ہوں۔ پاس کھڑے ہو کر کپڑے استری کروائے۔''

منٹو نے غصے سے گھورا،''گاڑی چلنے والی ہے۔اور تم اب آئے ہو؟''

چودھری نے جلدی سے کپڑے گاڑی میں رکھے۔نیچے اُترا تو گاڑی چل پڑی۔جب گاڑی پلیٹ فارم سے نکل گئی،تو وہ ماتھے کا پسینہ پونچھتا ہوا بولا،''بڑا حکم چلاتا ہے۔جیسے میں اس کے باپ کا نوکر ہوں۔''

ہم دونوں آہستہ آہستہ چلنے لگے۔

وہ بولا،''اپنے آپ کو نوابزادہ سمجھتا ہے۔مجھ سے کپڑے لے کر مجھ پر ہی دھونس۔یہاں آیا تو میں نے اس کو ناول لکھنے کے لئے دو ہزار کی رقم پیشگی ادا کی۔اس نے ایک ہزار میرے سامنے دیکھتے ہی دیکھتے لٹا دیئے۔ہر جگہ بل ادا کرنے کو آگے۔آخر روپیہ آتا،تو ہم ہی سے ہے۔۔''

وہ بڑبڑاتا رہا۔جب اس کا غصہ ٹھنڈا ہوا،تو وہ بولا،''بلونت میں اس آدمی کے نخرے برداشت کرتا ہوں، کیونکہ یہ منٹو ہے اور کسی سالے کی میں کیا پرواہ کرتا ہوں۔میرے پاس بڑے بڑے جج، پروفیسر اور ڈائریکٹر آتے ہیں۔کہ میں ان کی کوئی کتاب چھاپوں، میں نہیں چھاپتا۔وہی چھاپتا ہوں۔جس کو میں پرکھ کر خود چھاپنے کے قابل سمجھوں۔مگر منٹو کہانی کا خُدا ہے۔کسی وقت شاید میرا نام اسی لئے رہ جائے کہ میں منٹو کے کپڑوں کا بنڈل اٹھا کر ریل گاڑی پر اس کو سوار کرانے آیا تھا۔یہ مختلف قسم کا رائٹر ہے۔

اس کے بعد چودھری مکتبہ اُردو چلا گیا۔

ایک دفعہ منٹو اچانک لاہور آیا۔وہ مکتبہ اُردو میں ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھا تھا۔اُس نے ریشمی

کرتا، لٹھے کی تنگ موری کی شلوار اور تلے دار جوتی پہنی ہوئی تھی۔

فکر تونسوی مکتبہ اُردو کے پیچھے کمرے میں بیٹھا اکثر کتابوں کے پروف پڑھتا اُس نے کہا، ''منٹو صاحب! آپ نے اس دفعہ آنے کی خبر ہی نہ دی۔''

منٹو نے پاؤں کی ایڑھی مارتے ہوئے کہا، ''بمبئی میں نرگس اسٹوڈیو میں آئی، تو اس نے سفید ساڑھی اور تلے دار جوتی پہنی ہوئی تھی۔ کرسی پر بیٹھی ہوئی وہ اس طرح ایڑی مار رہی تھی۔ اس کو کیا پتہ کہ ساڑھی کے ساتھ تلے دار جوتی نہیں پہنی جاتی۔ مجھے بڑی تکلیف ہوئی۔ میں نے یہاں آ کر کُرتہ اور شلوار سلوائی اور جوتی خریدی۔ اب جا کر اس کو کہوں گا، ''دیکھ! تلے دار جوتی اس طرح پہنی جاتی ہے۔

اس کے مزاج میں اس قسم کا شاہی ٹاٹھ بھی تھا۔

منٹو جہاں رہا، اس نے وہاں کے ماحول میں ڈوب کر کہانیاں لکھیں۔ بمبئی کے ناگپاڑہ پولس اسٹیشن اور رنڈیوں کے فارس روڈ اور فلم اسٹوڈیوز کی جان پہچان مجھے لاہور بیٹھے ہوگئی تھی۔ 'کالی شلوار' کی رنڈی سلطانہ دہلی کے اجمیری گیٹ کے باہر جی۔ بی۔ روڈ پر ایک کوٹھے پر رہتی تھی۔ سامنے ریلوے کا یارڈ، جہاں بے شمار ریل کی پٹریاں بچھی ہوئی تھیں۔ اب بھی وہاں کوٹھوں کی قطار ہے اور منٹو کا بیان کیا ہوا سین اور رنڈی کے دل کی کیفیت اُسی طرح ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

''دھوپ میں لوہے کی یہ پٹریاں چمکتیں، تو سلطانہ اپنے ہاتھوں کو دیکھتی، جن پر نیلی نیلی رگیں بالکل ان پٹریوں کی طرح اُبھری ہوئی تھیں۔ اس لمبے اور کھلے میدان میں ہر وقت انجن اور گاڑیاں چلتی رہتیں۔ کبھی اِدھر کبھی اُدھر، ان انجنوں اور گاڑیوں کی ٹھک ٹھک پھک پھک ہر وقت گونجتی رہتی — کبھی کبھی جب وہ کسی گاڑی کے ڈبے کو جس کو انجن نے دھکا دے کر چھوڑ دیا ہو، پٹریوں پر اکیلا چلتا دیکھتی، تو اس کو اپنا خیال آتا۔ وہ سوچتی کہ اس کو بھی کسی نے زندگی کی پٹری پر دھکا دے کر چھوڑ دیا ہے۔

اور وہ خود بخود چلی جا رہی ہے۔۔۔۔

موٹے موٹے انجن اِدھر اُدھر دھکیلتے رہتے ہیں۔ سلطانہ کو کئی دفعہ یہ انجن سیٹھوں کی طرح محسوس ہوتے، جو کبھی کبھی انبالے اس کے کوٹھے پر آیا کرتے تھے۔''

منٹو کی مندرجہ بالا سطریں اُردو ادب میں کلاسیک بن گئی ہیں۔ اس بیان میں زندگی کے اشارے، اداسی اور ماحول میں بیت رہے واقعات کا ذہنی تبدیلیوں کے ساتھ میل ہے۔

جب دیس کی تقسیم کے بعد منٹو لاہور چلا گیا، تو اس نے پاکستان کے بارے میں اور فسادوں کے بارے میں لکھا تو کڑوے سچ کا زہر پینے سے کبھی جھجکا نہیں تھا۔ وہ کھری بات منہ پر کہہ دیتا۔ کبھی جذباتی رعایت نہ کرتا۔

کسی دوست نے پوچھا، ''منٹو تم کتنے مسلمان ہو۔''

اس نے جواب دیا، ''جب اسلامیہ کالج اور ڈی۔اے۔وی کالج کا فٹ بال کا میچ ہو رہا ہو اور اسلامیہ کالج گول کر دے، تو میرا دل خوشی سے اچھل پڑتا ہے۔ اتنا میں مسلمان ضرور ہوں۔''

مگر دوستی کے معاملے میں یہ بات نظر نہیں آئی۔ اس کے بہترین دوست شیام، اشوک کمار اور مُکر جی تھے۔ وہ بار بار اُن کا ذکر کرتا ہے۔

فٹ بال کے میچ والی بات شاید اُس نے اس لئے کہی، کہ کئی ہندو ادیب جو ترقی پسند ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔ اور اندر سے کٹر ہندو تھے۔ کھل کر یہ بات نہیں کہہ سکتے تھے۔ منٹو نے اُس جذبے کے بارے میں لکھ کر جو ہمارے لاشعور میں لرزتا ہے اور جس پر ہمارا شعوری طور پر کوئی بس نہیں ہوتا۔ ہم کو ایک گہرے سچ کے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔

موت کے بارے میں اس کا نظریہ مختلف — تھا۔ اس نے کہا، ''ایک آدمی کی موت ٹریجدی ہے۔ ایک لاکھ انسان مر جائیں، تو یہ قدرت کا بڑا مذاق ہے۔''

اس نے پنجاب کے بٹوارے قتل اور زنا کے ننگِ انسانیت واقعات پر کہانیاں لکھیں ''ٹوبہ ٹیک سنگھ''، ''ٹھنڈا گوشت'' اور ''کھول دو'' کی عظمت سے سب واقف ہیں۔

اس نے ''سیاہ حاشیے'' میں فرقہ وارانہ فساد کی درندگی بیان کی ہے۔ یہ سیاہ لطیفے ہیں، چھوٹی چھوٹی کہانیاں،، جن میں لقمان کی کہانیاں اور پنچ تنتر جیسی تیکھی اور الٹی عقلمندی ہے۔ اس نے غنڈہ گردی، قتل اور انسانی بیوقوفی پر مذاق کیے ہیں۔ اس قسم کا سیاہ مذاق بھارتی ادب میں پہلی دفعہ آیا۔

اس کے کئی سالوں کے بعد یورپ میں بلیک ہیومر یا سیاہ مذاق کو فلموں میں فلیتی نے پیش کیا اور ادب میں فاکنز نے۔ منٹو ان سے پہلے بین الاقوامی ادب کی شاہراہ پر کھڑا نئے راستے نکال رہا تھا۔

کئی دفعہ منٹو کے کرداروں کے نام بھی اصلی ہوتے تھے۔ یہ کردار اتنے دلچسپ اور نرالے ہیں کہ ان کی حقیقت اور فلمی روپ میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔

''بابو گوپی ناتھ،'' میں عبدالرحیم سینڈو بہت عجیب کردار ہے اور اس کی زبان بھی اُوٹ پٹانگ، وہ فلموں میں ایکسٹرا کا کام کرتا تھا۔ آج بھی بمبئی کے فلم اسٹوڈیو میں آپ عبدالرحمٰن سینڈو کو پہچان سکتے ہیں وہ اپنی بات چیت میں بے معنی اور بے ڈھنگ الفاظ استعمال کرتا ہے۔ جن کا جادوئی اثر دھماکے کی طرح پھٹتا ہے۔ مثلاً بابو گوپی ناتھ سے منٹو کا تعارف کراتے ہوئے کہتا ہے۔''منٹو صاحب انڈیا کے رائٹر نمبرون ہیں۔ کہانیوں میں اس طرح کی کنٹینوٹی ملاتے ہیں کہ بڑوں بڑوں کا دھڑن تختہ ہوجاتا ہے— کیوں منٹو صاحب ہے ناں اینٹی کی پینٹی پو؟''

یہ الفاظ کسی زبان کے نہیں، مگر جب منٹو نے ان کا استعمال کیا۔ تو یہ نئی ایجاد کی طرح چمکنے لگے۔ اور اُردو ادب کا حصہ بن گئے۔

''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' میں بھی اس طرح کے جادوئی منتر سے کردار کے لاشعور کو اجاگر کرتا ہے۔ پاگل خانے میں ہندو، سکھ اور مسلمان پاگل بند کئے ہوئے ہیں۔ ملک کی تقسیم کے بعد ان کو بھی باقی چیزوں کی طرح تقسیم کیا جا رہا ہے۔ ایک پاگل سکھ عجیب بے تکی باتیں کرتا ہے۔ وہ حیران ہے کہ وہ ہندوستان میں تھا اور پاکستان کس طرح چلا گیا۔ اور پاکستان کہاں سے آ گیا؟ اور اس کا گاؤں ٹوبہ ٹیک سنگھ کدھر گیا؟ اور اب اس نے کہاں جانا ہے؟ وہ بار بار یہ محاورہ الاپتا ہے،''اوگڑ گڑ دی، لالٹین دی، دال دی ہندوستان دی، تیری ماں دی.................'' یہ الفاظ اس کی بکھری ہوئی ذہنیت کا ردِ عمل ہیں۔

ایک بار منٹو بمبئی کی الیکٹرک ٹرین میں بیٹھا فلمستان جا رہا تھا، کہ راستے میں اس نے ایک نام پڑھا جس کے الٹے سیدھے جوڑے تھے اور جو شاید برکت اللہ یا حنیف اللہ لکھا ہوگا، مگر چھپا ہپ ٹلا تھا۔ اس نے دو چار دفعہ یہ الفاظ منہ میں ہی دہرائے اور اس کو یہ اچھا لگا کہ اسٹوڈیو جا کر فلم ڈائریکٹر کے ساتھ کسی کہانی پر بحث ہوئی تو منٹو سے اس کی رائے پوچھی گئی۔ منٹو نے کہا،''ٹھیک ہے، مگر یہ کہانی ہپ ٹلا نہیں۔''

اشوک کمار نے ہاں میں ہاں ملائی اور کہا،'' کہانی ہو، تو ہپ ٹلا ہونی چاہیے۔

لفظ کا کوئی مطلب نہ تھا۔ مگر جی کو بات سمجھ آگئی، کہ کہانی بہترین نہیں۔ اس کے بعد فلمی دنیا میں فلم کی بناوٹ مکالمے، سچوئشن اور کلائمکس کے لئے 'ہپ ٹلا' لفظ مروج ہو گیا۔

اگست ۱۹۴۷ء میں جب قتل اور خون کا بازار گرم ہوا اور جگہ جگہ فساد برپا ہو گئے۔ تو میں لاہور سے ایک قمیض پتلون کے ساتھ بھٹنڈہ آ گیا۔ پتہ چلا، کہ وہ آخری گاڑی تھی، جس نے صحیح سلامت ستلج کا پل پار کیا۔ بھٹنڈہ پہنچا تو یہاں بھی فساد شروع ہو گئے۔ میں اس خونی ماحول میں نہیں رہنا چاہتا تھا۔ جہاں میرے بچپن کے دوست فضل مراثی اور اس کی بہن نوراں قتل ہو گئے تھے۔

دہلی آیا، تو یہاں بھی خون خرابہ، ایک مہینہ یہاں رہ کر بے کاری اور غیر یقینی مستقبل کو دیکھتے ہوئے سوچا کہ بمبئی جانا چاہئے۔

مجھے ملک راج آنند کا پتہ یاد تھا۔ اپنا چھوٹا سا سوٹ کیس اور بستر میں نے وکٹوریہ بگھی میں رکھا اور کوچوان کو کف پریڈ چلنے کو کہا، جہاں ملک راج آنند رہتا تھا، اس نے بڑے خلوص کے ساتھ اپنے پاس ٹھہرایا۔

یہاں ادبی اور کلچرل محفلیں جمتی تھیں۔ کرشن چندر، علی سردار جعفری اور بمبئی کے پینٹر اور ڈانسر اور ترقی پسند دانشور آتے اور امن کے بارے میں باتیں کرتے۔

شام ہوتے ہی ایک چھپا ہوا ڈر لرزنے لگتا۔ پاکستان بننے کے بعد مسلمان جا رہے تھے۔ اکا دکا قتل ہو رہے تھے۔

میں نے منٹو کو ٹیلیفون کیا، وہ بولا، ''تم کب آئے؟''

میں نے اس کو اپنے بارے میں بتایا اور کہا کہ میں اس کو ملنا چاہتا ہوں۔

وہ بولا، ''آج شام کو گھر آ جانا،'' جانتے ہو نا میرا گھر؟ بائیکلا میں، کلیئر روڈ پر۔''

اس نے مجھے اپنے گھر کا نمبر اور پہچان بتائی۔

شام کو کرشن چندر اور چند اور دوست ملنے آ گئے اور باتیں ہونے لگیں۔ اندھیرا چھا گیا۔ جب میں نے کہا، کہ میں نے منٹو کو ملنے جانا ہے۔ تو سب نے کہا، ''تم یہاں کے راستے نہیں جانتے رات پڑ چکی ہے۔ خطرہ ہے، کل چلے جانا۔''

مجھے ڈر بھی لگ رہا تھا۔ میں نہ گیا۔

دوسرے دن منٹو کو ٹیلیفون کیا، تو وہ اونچی گرم آواز میں بولا،"اوئے! کل شام میں تمہارا انتظار کرتا رہا، تم آئے کیوں نہیں؟"

میں نے جواب دیا، کرشن چندر آ گیا تھا اور ملک راج آنند بھی تھا۔ میں نہ آ سکا وہ اسی گرم آواز میں بولا، اوئے کون ہوتا ہے، ملک راج آنند اور کرشن چندر تم کو علم نہیں، کہ منٹو یہاں تمہارا انتظار کر رہا ہے!"

میں نے معافی مانگی اور شام کو آنے کا وعدہ کیا۔

وہ بولا،"میرے ساتھ کھانا کھانا اور یہاں ہی سو جانا، سارا گھر خالی پڑا ہے۔ صفیہ چلی گئی ہے۔ میں بھی چلا جاؤں گا۔

شام کو جب میں کلیئر روڈ پہنچا، تو بتیاں جل اٹھی تھیں۔ سیڑھیاں چڑھ کر پہلی منزل پر اس کے فلیٹ کے دروازے پر دستک دی۔ وہ اونچی گرم آواز آئی،"کون ہے؟"

میں نے اپنا نام بتایا۔ تھوڑی دیر کے بعد باورچی نے دروازہ کھولا اور میں داخل ہوا۔ منٹو لکڑی کی کرسی پر ٹخنوں کے بَل بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ شراب کی بوتل میز پر پڑی تھی۔

وہ بولا،"صفیہ کو خط لکھ رہا ہوں۔ بس دو لفظ اور — تم یہاں بیٹھ جاؤ۔" وہ اسی پوز میں تختی گھٹنوں پر رکھے لکھتا رہا۔ خط ختم کر کے بولا،"اچھا ہوا تم آ گئے۔ میں اکیلا تھا۔ اکیلے پن سے مجھے بڑی وحشت ہوتی ہے۔ شراب پیو گے؟"

میں نے کہا،"نہیں۔"

اس نے شراب گلاس میں اُنڈیلی، گھونٹ بھرا اور کہنے لگا۔"میرے باورچی نے مُرغ بھونا ہے۔ اب تم گوشت کھانے لگ گئے ہو ناں؟"

"ہاں۔"

"خط سناؤں؟ صفیہ کا لاہور سے خط آیا تھا۔ لکھتی ہے۔ یہاں لکشمی بلڈنگ میں بہت اچھا فلیٹ مل گیا ہے۔ اعلیٰ فرنیچر...... ریفریجریٹر...... بہت خوش ہے...... عورت! اوئے، سالی تم کس چیز پر خوش ہو؟ منٹو تو یہاں بیٹھا ہے۔ میرے بغیر اس ریفریجریٹر کا کیا مطلب — بکواس — میں جل بھن کر کباب ہو گیا ہوں۔"

اس کے بعد اس نے اپنا خط سنایا۔ اس خط میں اس کی اپنی ویرانگی کا ذکر تھا۔ باورچی کا، بمبئی کے

حالات کا، اپنے اکیلے پن کا، اور لکشمی بلڈنگ کے ریفریجریٹر کو گالیاں وہ اس بات کی شکایت کررہا تھا۔ کہ وہ بمبئی کی دنیا چھوڑ کر فلموں کی یہ زندگی اور دوستوں کے پیار کو تیاگ کر لاہور جارہا تھا۔ صفیہ اور اپنی بچیوں کی خاطر، اور وہ گن گا رہی تھی ریفریجریٹر کے! اس خط میں ایک خاوند اور باپ کا جذبہ تھا اور اس اُداسی کا ذکر، جو ایک اُجڑے گھر میں ہوتی ہے۔۔۔ اس کا اپنا فلیٹ اس ذہنی حالت کا ساتھی تھا............

......بیوی اور بچے پاکستان میں اور وہ بمبئی میں......

اس نے ایک گلاس اور بھرا، اس کی آنکھیں اور ذہن تیز ہو گیا۔

وہ بولا،''میرے دوست پوچھتے ہیں، کہ میں پاکستان کیوں جارہا ہوں؟......کیا میں ڈرپوک ہوں؟ مسلمان ہوں؟ مگر وہ میرے دل کی بات نہیں سمجھ سکتے۔ میں پاکستان جارہا ہوں۔ تاکہ وہاں ایک منٹو ہو، جو وہاں کی سیاسی حرامزادگیوں کا پردہ فاش کر سکے۔ ہندوستان میں اُردو کا مستقبل خراب ہے۔ ابھی سے ہندی چھا رہی ہے۔۔۔ میں لکھنا چاہتا ہوں تو اُردو میں ہی لکھ سکتا ہوں۔ چھپنا چاہتا ہوں تاکہ ہزاروں تک پہنچ سکوں۔ زبان کی اپنی منطق ہوتی ہے......کئی بار زبان خیالات بھی ہوتی ہے۔۔۔ اس کا تعلق لہو سے ہے۔..........ایک منٹو بمبئی میں رہا، دوسرا لاہور ہوگا..............''

رات کو دیر تک وہ باتیں کرتا رہا۔

میں اس کمرے میں سویا

دوسرے دن میں منٹو کے پاس رہا۔

ایک ہفتے کے بعد میں دہلی آ گیا

پھر پتہ چلا کہ منٹو لاہور چلا گیا

لاہور میں جا کر اس نے بے شمار کہانیاں لکھیں۔

اُس نے حکومت سے ٹکر لی۔ فرقہ پرستوں کے خلاف لکھا، اور امریکہ کے چچا سام کے نام خطوط لکھے، جن میں شدت کی طنز تھی۔ وہ نڈر اور باغی طبیعت کا مالک تھا۔ سماج کے جھوٹے اور دوغلے پن کو ننگا کرنے میں ماہر۔

وہ دنیا کا چیلنج قبول کر سکتا تھا۔ مگر دوست کا وار نہیں سہہ سکتا تھا۔

پاکستان میں ۱۹۵۰ء میں ترقی پسند ادیبوں نے ......

جاری کیا، کہ منٹو کی کوئی کہانی کسی رسالے میں نہ شائع کی جائے۔ یہ سرکلر دہلی بھی آیا۔ سب سے افسوسناک بات یہ تھی، کہ منٹو کا جگری اور پیارا دوست احمد ندیم قاسمی اس مہم کا جنرل سکریٹری تھا۔

منٹو پر اس کا بہت گہرا اثر ہوا۔ وہ اپنی دُنیا میں بیگانہ ہو گیا۔

مالی پریشانی اور دوستوں کی بے رُخی کی وجہ سے وہ زیادہ شراب پینے لگا۔ ایک بوتل کی خاطر وہ کہانی لکھ دیتا۔ کئی دفعہ اس نے ایک دن میں تین تین کہانیاں لکھیں اور ان کو پبلشروں کے پاس بیچنے لگا۔

کہانیوں کا ایک مجموعہ چھپا اور اس میں اس نے سلسلہ وار تاریخیں بھی درج کیں۔ اس کے دیباچے میں اس نے لکھا، ''داد اس بات کی چاہتا ہوں کہ میرے دماغ نے پیٹ میں گھس کر کیا کیا کرامتیں دکھائیں۔''

وہ بے حد پتلا دُبلا ہو گیا۔ شراب کے بغیر کوئی چیز ہضم نہیں ہوتی تھی۔ عجیب جنون کی حالت طاری ہو گئی۔ اس کے علاج کے لئے اس کو پاگل خانے لے جایا گیا۔ پاگل خانے میں رہتے ہوئے بھی اس کی تخلیقی روانی میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ لگاتار لکھتا رہا۔ اس کی کہانی 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' پاگل خانے کے ذاتی تجربوں کا ہی نچوڑ ہے۔

یہ کہانی تقسیم شدہ انسانیت کے متعلق دُنیائے ادب میں ایک شاہکار ہے۔

منٹو کو اس بات کا احساس تھا کہ وہ ایک بڑا افسانہ نگار ہے۔ اس نے اپنی قبر کا کتبہ بھی خود ہی لکھ دیا تھا۔

''یہاں منٹو دفن ہے۔ افسانہ لکھنے کا فن اُس کے ساتھ ہی دفن ہو گیا۔

یہ پیشین گوئی سچی ثابت ہوئی۔

☆☆☆

راجہ مہدی علی خاں

میرا پیارا دوست: منٹو

سعادت حسن منٹو ـــــ میرا دوست، میرا محسن تھا۔ ہم لوگ کئی سال ایک ساتھ رہے ہیں۔ اُس کی خوشگوار یاد ہمیشہ میرے سینے میں کلبلاتی رہی ہے۔ میرے دوست جناب کیول دھیر نے جب منٹو پر ایک مضمون لکھنے کے لئے مجھے مدعو کیا تو منٹو کی یاد نے ـــــ چاہت نے ـــــ میرے سینے میں سر اُبھارا۔ میں منٹو پر کچھ بھی لکھنے کے لئے بیٹھ گیا ہوں۔ میں یہ نہیں سوچ رہا کہ اُس پر کیا لکھوں؟ کوئی غیبی طاقت خود بخود ہی مجھ سے لکھوائے جا رہی ہے ـــــ میں اتنا ضرور سوچ رہا ہوں کہ یہ غیبی طاقت کہیں منٹو ہی تو نہیں۔ ضرور یہ منٹو ہی ہے ـــــ میرا پیارا دوست منٹو!

مجھے وہ دن یاد آرہے ہیں جب ہم لوگ ایک ساتھ رہتے تھے۔ ایک ساتھ کام کرتے تھے۔ آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ـــــ فلمستان بمبئی میں ـــــ شراب خانے میں ـــــ بمبئی کی چالوں میں ـــــ غلیظ ماحول میں۔

وہ دن کتنے پیارے تھے۔ کتنے اچھے تھے۔ اُفق کے اُس پار سورج کب نکلتا اور کب غروب ہو جاتا ـــــ جیسے اس کا کچھ بھی علم تو نہیں۔ بس مستی تھی۔ زندگی تھی جو اپنے محیط کے گرد چکر کاٹ رہی تھی۔

میں سوچ رہا ہوں کہ یہاں منٹو کے فن کا ذکر کروں یا اُس کی شخصیت کا۔؟

نہیں ـــــ اس کے ادب کو تو آپ نے پڑھا ہے۔ گہرائی سے اُس کا مطالعہ بھی کیا ہے۔ میں یہاں اُس کی شخصیت کے بارے میں کچھ لکھوں گا جس کے بارے میں ممکن ہے آپ بہت کم جانتے ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کچھ بھی نہ جانتے ہوں۔ تو آیئے! اُس کی شخصیت پر کچھ دیر باتیں کریں۔

منٹو کی شخصیت میں سب سے نمایاں اس کی خود پسندی تھی، وقار تھا جسے وہ ہر قیمت پر قائم رکھتا تھا۔ وہ جو کچھ کہہ دیتا ـــــ جو کچھ لکھ دیتا وہ آخری اور اٹل ہوتا اُس کی مرضی کے بغیر ایک لفظ کا ہیر پھیر بھی اُس کی قوتِ برداشت سے باہر ہوتا۔ مجھے آل انڈیا ریڈیو دہلی کا وہ واقعہ یاد آرہا ہے جب میں منٹو، کرشن

چندر، راجندر سنگھ بیدی، ن۔م۔ راشد اور اوپندر ناتھ اشک سب ایک ساتھ دہلی ریڈیو میں ملازم تھے۔ کرشن چندر ڈرامہ پروڈیوسر تھا۔ اشک ہندی سیکشن میں تھا۔ منٹو ریڈیو کے لئے ڈرامے اور فیچر لکھتا تھا۔ ایک بار کرشن چندر چھٹی پر گیا ہوا تھا۔ منٹو کا کوئی ڈرامہ پروڈیوس کیا جانے والا تھا۔ کرشن کی جگہ ایک معاون (جو نیا نیا لکھنؤ سے دہلی تبدیل ہو کر آیا تھا) کام کر رہا تھا۔ ان دنوں اشک اور منٹو میں خوب چلتی تھی۔ اشک اس کوشش میں رہتا تھا کہ کس طرح وہ منٹو کو نیچا دکھائے لیکن اُسے ایسا کوئی موقع ہاتھ نہیں لگا تھا۔ جب کرشن چھٹی پر چلا گیا تو اشک کی بن آئی۔ اُس نے اُس نئے معاون کو چائے وغیرہ پلا کر اپنے ساتھ کر لیا۔ جب منٹو کا ڈرامہ اُس معاون کی میز پر آیا تو اشک کے کہنے پر اُس نے اس میں بہت سی تبدیلیاں کر دیں۔ اشک جانتا تھا کہ منٹو اس حرکت کو کبھی برداشت نہ کر سکے گا۔ اور اس بات پر طوفان برپا ہو جائے گا۔ اور ہوا بھی یہی۔ جب منٹو کو اس بات کا علم ہوا تو اس نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ ڈرامہ بنا کانٹ چھانٹ کے ہی پروڈیوس ہوگا ورنہ نہیں ہوگا۔ آخر کار بات اسٹیشن ڈائریکٹر تک پہنچی۔ فیصلہ منٹو کے خلاف ہوا۔ منٹو کی خودداری کو ٹھیس پہنچی۔ اس کی خود پسندی کو دھکا لگا جسے وہ برداشت نہیں کر سکا۔ اُس نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ موجودہ شکل میں اس کا ڈرامہ پروڈیوس نہیں ہوگا۔ یہی نہیں ــــ اپنی خود پسندی کی خاطر منٹو نے ریڈیو کی نوکری کو بھی خیر باد کہہ دیا۔

اُس کی خود پسندی کی ایک اور مثال ہے ــــ جب منٹو لاہور میں تھا تو اُس نے پاکستان میں امریکی پالیسی پر بھی کڑی نکتہ چینی کی تھی۔ اس نے لکھا تھا ــــ ''امریکہ سے جو فوجی معاہدہ ہو رہا ہے ــــ کیوں پاکستان کو غلام بنانے کے منصوبے باندھے جا رہے ہیں۔'' ساتھ ہی منٹو نے چچا سام کے نام بہت سے خطوط لکھ ڈالے جن میں امریکی پالیسی پر کڑی نکتہ چینی کی گئی تھی۔ سیاسی حلقوں میں کھلبلی مچ گئی۔ پاکستان میں امریکہ کے ہائی کمشنر نے منٹو کے پاس ایلچی بھیجا اور اُسے کہلوایا ــــ ''اگر تم ہمارے اخبار کے لئے مضمون لکھو تو تمہیں ایک مضمون پر پانچ سو روپئے معاوضہ دیا جائے گا۔''

منٹو جانتا تھا کہ اُسے ایک افسانے پر بیس پچیس روپے مشکل سے معاوضہ ملتا ہے اور اسے ایک مضمون پر پانچ سو روپے معاوضہ مل سکتا ہے۔ اُسے مالی مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑ رہا تھا۔ لیکن خود پسندی کے جذبے نے دولت کو ٹھکرا دیا اور واضح الفاظ میں کہہ دیا ــــ ''منٹو فروخت نہیں ہو سکتا۔'' یہ تھی

منٹو کی خودداری — جس نے اس کی عظمت میں چار چاند لگا دیئے۔

منٹو کی دوست نوازی اور رحم دلی بے حد مشہور ہے۔ دوستوں کی خاطر وہ جان کی بازی تک لگا دینے کے لئے تیار رہتا تھا۔ جب بھی کسی دوست پر کوئی مصیبت نازل ہوتی منٹو اس کی مدد کے لئے پیش پیش رہتا۔ منٹو بمبئی میں فلمستان میں ملازم تھا تو اُس نے نہ صرف مجھے دہلی ریڈیو سے بمبئی بلوا لیا اور فلمستان میں ایک اچھی نوکری دلا دی بلکہ اوپندر ناتھ اشک کو بھی — جس نے دہلی ریڈیو میں اسے نیچا دکھانے کی کوشش کی تھی فلمستان میں پانچ سو روپے ماہوار کی نوکری دلا دی۔

منٹو کو غریب اور محتاج مریضوں کا علاج کرانے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ ایسے کئی مریضوں کا علاج کراتے ہوئے میں نے اُسے دیکھا ہے جن سے اس کی کوئی جان پہچان تک نہ تھی۔

منٹو اگر کبھی اپنے کسی دوست کو تکلیف میں دیکھتا تو تڑپ اٹھتا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار میں بیمار پڑ گیا۔ حلق میں سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ کھانے پینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ شام کا وقت تھا۔ منٹو مجھے ملنے کے لئے میرے گھر آیا۔ میری غیر حالت دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔ جھٹ سے مجھے اسپتال لے گیا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ مجھے خناق (ڈفتھیریا) ہو گیا ہے۔ اُن دنوں ہم لوگوں سے اشوک کمار (فلمی اداکار) کے بھی بہت گہرے مراسم تھے۔ منٹو نے جب میرے بارے میں اشوک کو بتایا تو اُس نے متعدی امراض کے ہسپتال میں مجھے داخل کرا دیا۔ جب تک میں صحت یاب نہیں ہو گیا۔ منٹو دن رات میری خدمت کرتا رہا۔

منٹو نہایت ہی محنتی انسان تھا۔ ایک مشین کی طرح دن رات میں۔ نے اُسے کام کرتے دیکھا ہے۔ جب وہ آل انڈیا ریڈیو دہلی میں تھا تو فیچر یا ڈرامے اس نے کبھی قلم سے نہیں لکھے تھے۔ ایک دفعہ وہ ٹائپ رائٹر پر بیٹھ جاتا۔ اس کا دماغ دوڑتا رہا کرتا۔ اور انگلیاں چلتی رہتیں۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے فیچر یا ڈرامہ تیار ہو جاتا۔ یہ صرف منٹو ہی کر سکتا تھا۔ کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی تک اُن دنوں منٹو کے حیرت انگیز مشینی دماغ کے بارے میں سوچتے رہ جاتے تھے۔

منٹو جیسا بیباک اور نڈر ادیب اب شاید کبھی اردو ادب کو نہ ملے۔ سماجی مسئلہ ہو یا سیاسی — منٹو نے ہمیشہ ہی بیباک ہو کر لکھا — بھلے ہی اس کے لئے اُسے جیل کی کوٹھریوں اور پاگل خانے کی آہنی سلاخوں کے پیچھے بند رہنا پڑے۔ منٹو نے سماج پر دل کھول کر نشتر زنی کی ہے۔ منٹو نے سماجی نقوش کو

اس قدر مانجھا، اتنا صاف کیا کہ وہ خود گرد و نواح کے ہجوم، رنگ و بو کا تاجدار دکھائی پڑتا ہے۔ منٹو جب ''ملکی تقسیم کے بعد پاکستان چلا گیا تو اُسے اپنی زندگی کے نہایت ہی بُرے دنوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس کے قلم میں تب بھی لرزش نہیں آئی۔ سیاسی ماحول پر طنز کرتے ہوئے اس نے لکھا تھا— ''حکومت اور رعایا کے باہمی اختلاط سے (جبری اختلاط کہنا صحیح ہوگا) بچے پیدا ہوتے ہیں لیکن بڑے سیفٹی ایکٹ اور آرڈی نینس قسم کے جن کی شکل و شباہت حکومت سے ملتی ہے نہ رعایا سے۔ میں ان کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ سوائے اس کے کہ یہ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ میری سمجھ سے بہت سی باتیں بالاتر ہیں۔ میں امریکی زر پرستانہ ملک گیری کی ہوس سمجھ سکتا ہوں۔ مجھے رُوس کے ہتھوڑے اور اس کی درانتی کے نشان کا اصل مفہوم سمجھ میں آ جاتا ہے لیکن یہاں میرے ملک پاکستان میں جو کچھ ہو رہا ہے میرے فہم و ادراک سے بالاتر ہے۔ ہوسکتا ہے جو کچھ آج میری نظروں کے سامنے ہو رہا ہے بہت اونچا ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بہت نیچا ہو۔ امریکہ سے جو فوجی امداد لینے کا معاہدہ ہو رہا ہے اس کو ایک افسانہ نگار کیا سمجھے گا؟ ترکی سے پاکستان کا جو معاہدہ ہوا ہے اس پر ایک کہانی لکھنے والا کیا تبصرہ کر سکتا ہے؟ وہ تو یہ بھی نہیں پوچھ سکتا کہ لیاقت علی کے قتل کی تفتیش کا کیا حشر ہوا؟ اس کو یہ سوال کرنے کی جرأت بھی نہیں ہوسکتی کہ لیاقت علی خاں کے قاتلوں کو کیا سزا ہوئی؟ کہ آخر وہ بھی انسان تھا جو موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔؟''

ان مشکلات اور مالی پریشانیوں کے باوجود بھی منٹو کا قلم نڈر ہو کر گندگی، سماج، حکومت سب کو بے نقاب کرتا چلا گیا۔ حکومت نے اُس پر ظلم کئے۔ جھوٹے مقدمے چلائے۔ قانون کی آڑ میں اُس کی آواز کو کچل دینا چاہا— اُس کے قلم کو توڑ دینا چاہا لیکن منٹو ڈٹا رہا— وہ ان سب کے چہروں کو اسی طرح بے نقاب کرتا رہا۔ وہ گھبرایا نہیں۔ خوفزدہ نہیں ہوا۔ اس کے جذبات کی شدّت ماند نہیں پڑی— اس کے قلم کی روانی میں سُستی نہیں آئی۔ اُسے خود پر یقین کامل تھا— سچّائی اور ایمانداری کا لہراتا ہوا پرچم تھا— جسے کوئی جھکا نہیں سکا۔ وہ عظیم انسان اپنے اصولوں پر سے ہٹا نہیں۔ اُس نے کبھی کسی کی خوشامد نہیں کی۔ اپنے حقوق کے لئے ہمیشہ ہی وہ لڑا ہے۔ جھگڑا ہے۔

منٹو بہت اچھا— بہت پیارا دوست تھا— ایک نہایت ہی مخلص انسان تھا۔ ایک نڈر و بے باک ادیب تھا— ادبی و فلمی دنیا میں آج بھی ہر کوئی اس کی عظمت کا قائل ہے۔ اپنی مختصر سی زندگی میں اس نے

کافی شہرت حاصل کی۔ لیکن دراصل وہ نہایت ہی بدقسمت انسان تھا کیونکہ ادبی عظمتوں، لطافتوں ونزاکتوں کے اس تمام تر اعتراف، شہرت و نیک نامی کے باوجود یہ امر بھی کچھ المناک نہیں ہے کہ اس کی اپنی زندگی معاشی اعتبار سے ایک دُکھ بھری کہانی ہے۔ اور اس کہانی کا اختتام تب ہوا جب چند سال قبل نئی زندگی کا یہ علمبردار کچھ تو اپنے سماجی حالات کے اور کچھ اعتدال سے بڑھی ہوئی مے نوشی کے ہاتھوں وقت سے پہلے کس مپری میں دامن جھاڑ کر ـــ ہم سب سے روٹھ کر روپوش ہو گیا اس کی موت ہمارے ناخوشگوار سماجی حالات پر ایک گہرا طنز ہے۔

''منٹو کا سارے کا سارا ادب دم توڑتی ہوئی ہماری تہذیب کے مزار پر ایک کتبہ ہے ـــ اس کے ادب کے بارے میں اتنا ہی کہنا کافی ہوگا۔

آخر میں مجھے ایک ادیب کے یہ الفاظ یاد آ رہے ہیں ـــ ''ہر محفل میں ادیب کو تو جی بھر کر داد ملی تھی لیکن وہ ناکارہ انسان ـــ جو اس کی پُشت کے پیچھے چھپا ساتھ چلا آیا تھا ـــ خالی ہاتھ ٹرخا دیا گیا ـــ ادیب نے 'واہ' کی آرزو کی وہ مل گئی۔ انسان نے ''آہ'' کی تمنا کی وہ نہ ملی ـــ اور جب انسان کی ہار ہوئی تو وہ کھسیا کر رو دیا ـــ یہ ادیب تھا ـــ یہ انسان تھا ـــ سعادت حسن منٹو!!!''

☆☆☆

بدزبان

ہماری محفل سے اردو ادب کا سب سے بڑا بدزبان اُٹھ گیا۔ اور محفل سونی ہوگئی۔ وہ ایسا بدزبان تھا جس پر خوش زبانوں اور پاکیزہ بیانوں کو رشک آسکتا ہے۔ بدزبان بہت ہوئے ہیں جنہیں ہمارا گندا اور گھنوؤنا سماج ریگستان کی خاردار جھاڑیوں کی طرح پیدا کرتا ہے لیکن منٹو کو جو سلیقہ آتا تھا وہ کسی کو نصیب نہیں۔ اس نے کانٹوں سے پھول کھلائے تھے۔ اس نے بدزبانی کو ادب اور فن کا درجہ دے دیا تھا۔ جسے پڑھ کر کبھی غصہ آتا تھا کبھی پیار اور کبھی جھنجھلاہٹ پیدا ہوتی تھی لیکن بغیر پڑھے رہا بھی نہیں جاتا تھا۔ کوئی پرچہ آیا اور منٹو کی تحریر سب سے پہلے پڑھنا شروع کردی۔ اس میں اُس نے کس کو گالی دی ہے' کس کو لتاڑا ہے، سماج کے کس پہلو کو بے نقاب کیا ہے' منٹو کی کوئی کتاب آئی اور اس کو حاصل کرنے کے لئے کچھ ایسی بے تابی پیدا ہوئی جیسے کسی معشوقہ کا انتظار کیا جارہا تھا اور وہ یکا یک بغیر کسی اطلاع کے شہر میں آگئی ہے اور خدا کی خلقت اس کی طرف دوڑ رہی ہے اور آج وہ بدزبان چلا گیا ہے۔ تو ساری خلقت رو رہی ہے۔ اب وہ کوئی افسانہ نہیں لکھے گا۔ اب اس کی کوئی کتاب نہیں آئے گی۔ اب کوئی خفا نہیں ہوگا۔ کوئی مقدمہ نہیں چلایا جائے گا۔ اب پاگل خانے میں اتنا ذہین پاگل نہیں آئے گا۔ شراب خانے میں اتنا تلخ شرابی قدم نہیں رکھے گا۔ دوستوں کی محفل میں ایسا لڑ لڑ کر محبت کرنے والا نہیں بیٹھے گا۔ صرف اس بدزبان کی شگفتہ کلامی یاد رہے گی۔

منٹو ایک بے حد پیارے' انتہائی ذہین مگر جھلائے ہوئے بچے کی طرح تھا جسے اپنے باپ سے شکایت پیدا ہوگئی ہو' بھائیوں سے حسد ہوگیا ہو' جس نے کسی چھوٹی یا بڑی ناانصافی پر بگڑ کر اپنے سارے کھلونے توڑ ڈالے ہوں اور پیار کرنے والی ماں کے گلے میں بھی جس سے خود بھی اسے بے انتہا محبت رہی ہو' اپنی خود پسندی اور خودداری کی وجہ سے بانہیں ڈالنے میں تکلف کیا ہو اور اب سب کو یہ دکھا رہا ہو کہ مجھے ان کھلونوں

[illegible] ادیبوں کا [illegible] طرۂ امتیاز
ہے۔ لیکن منٹو نے اسے اس بلند سطح پر پہنچا دیا تھا جہاں سے اس نے اردو ادب کے بعض ایسے لافانی انسانوں کی تخلیق کی جن کا جواب کبھی نہیں پیدا ہو سکے گا۔ آنے والی نسلیں منٹو سے سیکھیں گی لیکن منٹو نہیں آئے گا۔ نئے ادیب منٹو سے یہ بھی سیکھیں گے کہ کیا لکھنا چاہئے اور کیسے لکھنا چاہئے اور یہ بھی سیکھیں گے کہ کیا نہیں لکھنا چاہئے اور کیسے نہیں لکھنا چاہئے۔ مگر ان میں سے کوئی منٹو کی طرح ٹیڑھا، تیکھا، تلخ، ترش اور شیریں نہیں ہوگا اور ماتم اسی کا ہے۔

منٹو نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا روسی اور فرانسیسی ادیبوں کے ترجموں سے کی جن کا اسلوب اور انداز فکر اس کی ابتدائی تحریروں میں نمایاں ہے۔ لیکن ان میں گورکی کے سوا کوئی ایسا نہیں تھا جو بورژوا عہد کی تنقیدی حقیقت نگاری سے آگے بڑھ سکا ہو۔ اس لئے منٹو کی ابتدائی ادبی ذہنی تشکیل اسی سانچے میں ہوئی۔

پھر وہ زمانہ بھی عجیب تھا۔ یورپ کی انحطاط پذیر سرمایہ داری بہت بڑے پیمانے پر فاشزم کا روپ اختیار کر رہی تھی اور بہت سے نوجوان باغیوں کو نراجیت کی طرف دھکیل رہی تھی۔ جو ادب اور آرٹ میں فرانسیسی دادا ازم اور سورریلزم کی شکلیں اختیار کر رہی تھی۔ یہ نظریئے اور تحریکیں دشمن کو نہ پہچاننے اور انسانیت کی تاریخی رفتار کو نہ سمجھنے سے پیدا ہو رہی تھیں۔ اور ہندوستان کا سڑا ہوا جاگیرداری نظام جس پر بیرونی شہنشاہیت کی کوڑھ اوپر سے جمی ہوئی تھی' انقلابی جدوجہد آزادی کے ساتھ ساتھ سیاسی دہشت پسندوں اور ادبی رومانی باغیوں کو بھی جنم دے رہا تھا۔ اس لئے منٹو کی اس وقت کی ذہنی تشکیل میں جب آج سے بیس برس پہلے میں اس سے پہلی بار علی گڑھ میں ملا تھا' سب سے زیادہ اہم انقلاب روس' جلیاں والا باغ' بھگت سنگھ' کروپاٹکن' وکٹر ہیوگو' گورکی اور روموناف کی ایک کتاب Loithout Cherry Blossom تھی۔ اور گورکی کا اثر اس کے ابتدائی آوارہ گرد کرداروں کی حد تک تھا۔ شاید کچھ اور چیزیں

رہی ہوں جن کا مجھے علم نہیں اور ان سب کو منٹو نے اپنی ذاتی زندگی کی تلخیوں اور سماجی زندگی کی ناانصافیوں کے تلخ قوام میں گوندھنے کے بعد ایک نیا اور خالص اپنا قالب دیا جس کا نام افسانہ نگار سعادت حسن منٹو تھا، یہ اس کی اپنی اور صرف اپنی مکمل شخصیت تھی جو ہر چیز سے ٹکرا سکتی تھی، کسی سے سمجھوتہ نہیں کر سکتی تھی، کسی کے آگے سر نہیں جھکا سکتی تھی، کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلا سکتی تھی اور اپنا حق مانگنے سے بھی انکار کر سکتی تھی۔ بعد کے بیس سالوں میں نئے نئے اثرات آئے گئے۔ حالات کی پرچھائیاں پڑتی رہیں۔ گورکی، انقلاب روس، وکٹر ہیوگو اور جلیاں والا باغ دبے گئے، بھگت سنگھ، کروپاٹکن اور رومو ناف ابھرتے گئے جن میں سنہ 1940ء کے بعد سومرسٹ مام بھی شامل ہو گیا۔ آپ بھگت سنگھ کی دہشت پسندی سے نظریاتی اور عملی اختلاف کر سکتے ہیں لیکن اس کی سامراج دشمنی اور حب الوطنی پر انگلی نہیں اٹھا سکتے۔ اسی طرح آپ منٹو سے ادبی اور نظریاتی اختلاف کتنا ہی رکھیں، اس کے خلوص، دیانتداری، انسانیت دوستی، حب الوطنی اور سامراج دشمنی کا اعتراف کرنا پڑے گا۔ اس کے بعد یہ سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں رہ جاتی کہ منٹو اپنے سماج کے چیتھڑے اُڑا سکتا تھا، اس کی دھجیاں بکھیر سکتا تھا لیکن نہ تو اس کی تعمیر نو کر سکتا تھا اور نہ اس کی عریانی کو لباس دے سکتا تھا وہ اس عہد کی تنقیدی حقیقت نگاری کا ایک بہت بڑا معجزہ تھا اور ادبی دہشت پسندی کا کارواں سالار اور اس تنقیدی حقیقت نگاری اور ادبی دہشت پسندی پر اسے اس کی شرافت نفس اور انسانیت دوستی اکساتی رہتی تھی۔ چنانچہ 1940ء کے بعد اس نے اپنے افسانوں کی کامیابی کا یہ معیار بنالیا تھا کہ جس پر سب سے زیادہ ہنگامہ ہو وہ اس کا کامیاب ترین افسانہ ہے۔ ایک بار اس نے غالباً سنہ 1945ء یا سنہ 1946ء میں مجھ سے بمبئی میں کہا کہ ''سردار افسانہ لکھ کر مزا نہیں آیا۔ نہ کسی نے گالی دی نہ مقدمہ چلا۔''

وہ بیدی کی طرح اپنے دکھیارے کرداروں کے دل میں اتر کر انسانیت کے دل کی شرافت کی گواہی نہیں دے سکتا تھا، نہ عصمت چغتائی کی طرح معصوم گنہگاروں کے سروں پر ایسا آنچل ڈال سکتا تھا جو دامن مریم سے زیادہ پاکیزہ ہو اور نہ کرشن چندر کی طرح ایک ابلتے اور تڑپتے ہوئے سماج کی شاعرانہ حرکت کو قلم کی جنبش میں سمیٹ کر آنے والے خوب صورت مستقبل کا مژدہ سنا سکتا تھا۔ اسے دکھیاروں سے زیادہ مسخ شدہ روحوں سے دلچسپی تھی، صحت مندوں سے زیادہ مریضوں اور بیماروں کے دل ٹٹولنے میں مزا آتا تھا۔ آوارہ گردوں سے زیادہ اس کے ہیرو غنڈے اور لفنگے ہوتے تھے۔ اور ان سب کو اٹھا کر وہ سماج کے سر پر

انڈیل دیتا تھا، اور پھر اپنی تلخ ہنسی ہنستا تھا اور اگر کہیں اسے زہد وتقویٰ کا لبادہ نظر آجاتا تھا تو اسے یقین ہو جاتا تھا کہ اس کا پہننے والا جھوٹا ہے اور وہ اس لبادے کو پاش پاش کر کے اس آدمی کو ننگا کر دیتا تھا۔

منٹو کے ہاتھ میں یہ سماج سڑی ہوئی پیاز کی گانٹھ کی طرح تھا جس کے چھلکے وہ بڑی نزاکت اور چابکدستی سے اُتارتا جاتا تھا اور یہ کہہ کہہ کر ہنستا جاتا تھا کہ دیکھو تمہارا سماج پیاز کے بدبودار چھلکوں کے ڈھیر سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہ گانٹھ ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ اس کے کچھ چھلکے ابھی تک باقی ہیں اور سخت اور ٹھوس چیز ہونے کا دھوکا دے رہے ہیں۔ لیکن وہ انگلیاں جو بڑی فن کاری سے اس کے چھلکے اُتار سکتی تھیں آج قبر میں ٹھنڈی پڑی ہوئی ہیں اور ہر ادیب یہ خواہش کر سکتا ہے کہ کاش اس کی انگلیوں کو منٹو کی انگلیوں کا یہ جادو ایک دن ہی کے لئے نصیب ہو جاتا۔

منٹو کی عظمت اس میں ہے کہ اس نے اس سماج کے سامنے اس کی ننگی تصویر لا کر کھڑی کر دی ہے۔ اس نے چکلوں سے، بازاروں سے، شراب خانوں سے، گھروں کی چار دیواری اور دفتروں سے، سماج کے تمام نہاں خانوں سے انسانی لاشوں کو باہر نکالا اور منظرِ عام پر کھڑے ہو کر کہا ''دیکھو یہ وہ جانور ہیں جو کبھی انسان تھے''، لیکن منٹو کی ٹریجڈی اس میں تھی کہ وہ ان شکلوں کو نہ دیکھ سکا۔ جنہیں منظرِ عام پر لا کر وہ یہ کہہ سکتا ''دیکھو یہ وہ انسان ہیں جو کبھی جانور تھے''۔ وہ حقیقت کو اس کی مکمل اور اصلی شکل میں نہیں دیکھ سکا۔ صرف ایک مسخ شدہ پہلو کو دیکھ کر احتجاج کر کے رہ گیا۔ اور یہ چیز آدمی کو تھوڑا سا سنگدل بنا دیتی ہے۔ جس طرح ہم عام زندگی میں مفلسی، مظالم اور غلاظت کو دیکھتے دیکھتے اس کے عادی ہو جاتے ہیں اور اسے برداشت کرنے لگتے ہیں اور سڑک کے کنارے مرے ہوئے آدمی کو وہیں پڑا چھوڑ کر گزر جاتے ہیں۔ بھوکے کو بھوکا دیکھ کر بھی خود کھانا کھاتے رہتے ہیں، اسی طرح ادب میں بھی مسخ شدہ کرداروں کی تصویر کشی کرتے کرتے ادیب اتنا عادی ہو جاتا ہے کہ بعض اوقات انتہائی مظالم اور بڑی سے بڑی ٹریجڈی بھی اسے متاثر نہیں کر سکتی۔

اسی وجہ سے منٹو نے اچھے افسانوں کے ساتھ بُرے افسانے کی بھی تخلیق کی ہے۔ اگر اس نے ایسی شاہکار کہانیاں لکھی ہیں جیسے نیا قانون، ترقی پسند قبرستان، موتری، کھول دو، موذیل، ٹوبہ ٹیک سنگھ وغیرہ تو سجاد ظہیر کے الفاظ میں ایسے ''دردناک مگر فضول'' افسانے بھی جیسے بو اور ہتک اور ایسے چونکا دینے والے مگر مہمل افسانے بھی جیسے ''سرکنڈوں کے پیچھے'' جہاں اس نے انسان کا گوشت پتیلی میں پکوا دیا۔ کبھی اس کی

انسانیت اتنی لطیف ہو جاتی تھی کہ ریل میں بیٹھے ہوئے بچے کے دل کی دھڑکنوں کو سمجھ لیتا تھا جس کا باپ اس کے ساتھ کھیل نہیں سکتا' اور کبھی منٹو میں اتنی کلیت آ جاتی تھی کہ اتنی بڑی ٹریجڈی کا مذاق اڑانے پر اتر آتا تھا جیسے سنہ 1947ء کے فسادات۔ وہ انسانی اعمال میں کھو کر ان سے دلچسپی لینے لگتا تھا اور محرکات سے غافل ہو جاتا تھا۔ ایسا ادیب اپنی ذاتی اور گھریلو زندگی میں بھی بیک وقت اتنا ہی نرم دل اور سنگ دل ہو سکتا ہے۔

پھر ایسا ادیب ایک فرد بن جاتا ہے۔ دوست اور دشمن دونوں سے الگ اور اس کی خود پسندی نہ اسے ترقی پسندوں کے ساتھ آنے دیتی ہے اور نہ رجعت پرستوں میں جانے دیتی ہے۔ چنانچہ منٹو بھی ان دونوں سے الگ رہ کر فیصلے صادر کرنے کا عادی ہو گیا تھا اور یہ فیصلے افسانوں کا روپ اختیار کر لیتے تھے۔ وہ فیصلے کبھی غلط ہوتے تھے' کبھی صحیح' کبھی خوب صورت اور کبھی بدصورت۔

فنی اعتبار سے منٹو اپنا جواب آپ تھا۔ اس کی زبان میں جو سادگی اور پرکاری تھی جو اثر تھا کردار نگاری میں جو تیکھا پن اور نوک پلک تک کا احساس تھا۔ پلاٹ میں جو گٹھاؤ تھا اور کہانی میں جو کہانی پن تھا اور اسٹائل میں بلا کے طنز کی تلخی کے ساتھ جو شاعرانہ مٹھاس تھی وہ کسی کے پاس نہیں۔ وہ دو جملوں میں کردار بنا کر کھڑے کر دیتا تھا اور جس طرح چاہتا تھا کہانی کہتا تھا۔ اس کی کہانی پڑھ کر یہ احساس مشکل ہی سے ہوتا تھا کہ یہ پڑھنے کے لیے لکھی گئی ہے وہ ایسی معمولی اور عظیم معلوم ہوتی تھی جیسے پہاڑی چشمہ بہہ رہا ہو درخت اگا ہوا ہو۔ اس کا وجود بے چون و چرا تسلیم کرنا پڑتا تھا۔ اور یہ معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ یہ فن کار کی پہچان ہے۔

وہ حساس تھا اس لئے دو بار پاگل خانے گیا' بے باک تھا اس لئے کئی بار عدالت کے سامنے کھڑا ہوا۔ خود سر تھا اس لئے دشمنوں سے ٹکراتا رہا، غیور تھا اس لئے بھوکا مرتا رہا، ازل کا پیاسا تھا اس لئے شراب پیتا رہا اور زندہ رہنے کی تاب نہ لا سکا اس لئے مر گیا۔ لیکن فن کار تھا اس لئے مر کے بھی زندہ ہے۔ آپ آخر میں پوچھیں گے وہ بدزبان کیوں تھا؟ اس لئے کہ اس سماج نے اس سے بدزبانی کی تھی اور اس جیسے لاکھوں کروڑوں انسانوں سے بدزبانی کی تھی۔ اس کی بدزبانی سے نقصان کم پہنچا ہے فائدہ زیادہ

چند یادیں

منٹو سب کے دوست تھے۔ وہ دوست بننے یا بنانے میں چنداں تکلیف نہ برتتے۔ پہلے تعارف ہی میں یارِ غار نظر آتے۔ پاکستان بنا تو ابتدائی دنوں میں وہ ساحر لدھیانوی کے ہمراہ دفتر ''آزاد'' میں تشریف لائے۔ میں ان دنوں ''آزاد'' کا ایڈیٹر تھا مصافحہ کیا اور بے تکلف ہو گئے۔۔۔۔ وہیں ترقی پسند کانفرنس کی صدارات کے لئے ان کا نام تجویز ہوا۔ میں نے چائے پیش کی تو مسکرائے۔۔۔ انہیں شعر وشاعری سے کچھ واجبی ہی سا تعلق تھا۔ پھر بھی جوش کا ایک شعر چائے کی پیالی کے منہ پر طمانچے کی طرح رسید کیا۔

ادب کر خراباتی کا جس کو جوشؔ کہتے ہیں
کہ یہ اپنی صدی کا حافظ و خیام ہے ساقی

میں خاموش ہو رہا۔ میرے لئے سگریٹ کا دھواں ہی پریشان کن ہے اور یہاں شراب کی طلب تھی۔۔۔ ساحر نے خدا جانے کان میں کیا کہا کہ مطالبہ کبابوں پر آٹھہرا۔ میں نے ملازم سے کہا۔ وہ کباب لے آیا اور سیر ہو کر چلے گئے۔

اگلے دن علی الصبح پھر موجود تھے۔

''بھئی یہ خطبہ تیار ہو گیا۔ ذرا ایک نظر ڈال لو۔ تم لوگ خطیب ہو؟'' میں نے کہا۔۔۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ منٹو کا خطبہ، اور میں دیکھوں؟ اصرار کیا۔۔۔ ''نہیں، ایک نظر۔۔۔ پبلک کا معاملہ ہے۔''

ظاہر ہے کہ اس میں ان کا تیکھا انداز بیان موجود تھا۔ میں نے صاد کیا تو قہقہہ لگایا اور کہا۔

''اچھا' ایک دس روپے نکالو۔''

میں نے دس روپے کا نوٹ نذر کیا۔ ایک رڈی کاغذ کی طرح اُٹھایا اور چلے گئے۔

میں سورج چھپتے ہی ساحر کے ہاں پہنچا، تو میز پر بوتل رکھی تھی اور تنکوں سے شادکام ہورہے تھے۔

منٹو دیکھتے ہی اچھلے۔ آ گئے! تمہارا نوٹ کارگر ہوگیا۔ بلاواسطہ نہ سہی بالواسطہ ہی۔

انہوں نے یہ الفاظ اس تیزی سے کٹے پھٹے لہجہ میں کہے کہ میں نے سوچے سمجھے بغیر کوئی مصرع جڑ دیا۔ منٹو نے پیگ حلق سے نیچے کیا، اور میں ان کے شگفتہ چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ جو شراب سے اور بھی نکھر رہا تھا۔

اسے کہتے ہیں:۔

مال حلال بود بجائے حرام رفت

میں نے منٹو سے ازراہِ شرارت کہا اور منٹو نے کھٹ سے مصرع پلٹا۔ او بے نہیں

مال حرام بود بجائے حلال رفت

اور پھر خود ہی اس کی ''توضیح'' میں لگ گئے۔ ''حرام۔۔۔۔حرمت سے ہے، اور حلال سے مراد صبوحی۔ اور اب اس پر غور کرلو۔ تم صحافی اور خطیب لوگ الفاظ استعمال نہیں کرتے ان سے چار چار نکاح پڑھاتے ہو۔'' منٹو کے حواس اور زبان دونوں بے قابو تھے۔

ان میں اور اختر شیرانی میں بہت سی باتیں مشترک تھی۔ مثلاً دونوں شراب کی نذر ہو گئے۔ دونوں نے اس طرح پی کہ ان کی زندگی میں سے شراب نکال دی جائے تو ایک چوتھائی رہ جاتی ہے۔ دونوں میں انا تھی۔ اختر تو رکھ رکھاؤ کی بات بھی کر لیتے تھے مثلاً عدم مل گئے تو اس سے کہا۔۔۔۔۔

''عدم، تم غزل کے بادشاہ ہو، میں نظم کا شہنشاہ۔''

لیکن منٹو میں یہ تکلف بھی نہ تھا۔ یعنی اپنے سوا کسی کو شاذ ہی مانتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو اس برصغیر کا سب سے بڑا افسانہ نویس سمجھتے تھے اور ان کا یہ دعویٰ کسی حد تک درست بھی تھا لیکن اپنے معاملہ میں وہ

خاوند'' کوئی منفرد ادیب گوارا نہیں کر سکتا۔ انہیں نعرہ بازی سے سخت نفرت تھی وہ بے تحاشہ اور بے روک لکھنے کے عادی تھے ان کا خیال تھا کہ جب تک زندگی کی مکروہ صورتوں کو سامنے نہ لاؤ اور عوام کو ان کی زبان میں انہی کے زخم نہ دکھاؤ۔ یہ معاشرہ کبھی اصلاح پذیر نہیں ہوگا وہ اس دور میں وعظ کے قائل نہیں بلکہ طنز کے قائل تھے۔ ان کا نظریہ تھا کہ برہنہ معاشرے کو برہنہ گوئی ہی سے زچ کیا جا سکتا ہے۔

ایک دفعہ میں نے ان کے کسی فیچر پر تعارفی نوٹ میں لکھا کہ منٹو مومن کی طرح سوچتا اور کافر کی طرح لکھتا۔ ہے تو بہت خوش ہوئے اور کہا۔۔۔۔۔'' یہ بات تم نے ٹھیک لکھی ہے۔''

وہ اس تیزی سے لکھتے تھے جیسے کوئی بدیہہ گو شاعر شعر کہتا ہے۔ ان آخری برسوں میں انہیں مختلف الاصل ضرورتوں نے خاصا پریشان کر رکھا تھا۔ ان کا کوئی تیس روپے روز کا خرچ تھا۔ جب تک پورا نہ کر لیتے چین نہ پڑتا۔ اس ضرورت ہی نے انہیں زود نویس بنا ڈالا۔ انہوں نے ایک ایک نشست میں طویل سے طویل افسانہ ہی ختم نہیں کیا بلکہ بسا اوقات ایک ہی نشست میں کئی افسانوں کا مجموعہ لکھ ڈالا۔ ناشر کے پاس لے گئے۔ پیسے کھرے کئے اور دوسرے مجموعہ کی تیاری میں لگ گئے۔

ان کا یہ اصول تھا کہ پہلے مختلف رسائل و جرائد کے پاس علیحدہ علیحدہ قیمت پر افسانے بیچتے۔ پھر کسی ناشر کے پاس ان کا مجموعہ! اور اس طرح ایک معقول رقم پیدا کر لیتے۔ لیکن جو کماتے اس کا بہت بڑا حصہ شراب کی بھینٹ چڑھ جاتا۔ ان کی زندگی انہیں اللّلے تللوں کا ایک دلچسپ مرقع تھی۔

میں انہیں تب سے جانتا ہوں، جب وہ پہلے پہل لاہور آئے اور باری علیگ کے ساتھ چنگڑ محلہ میں لدھیانہ لانڈری کے اوپر تین یا چار روپے ماہانہ کرایہ کی ایک کوٹھری میں رہنے لگے۔ یہ ان کے کھلنڈرے پن کا زمانہ تھا۔ اردو بک اسٹال کے یعسوب الحسن ''پیر مغاں'' تھے۔ انہوں نے اس ''چنڈال چوکڑی'' کی معیت ہی میں شاہد و شراب کے تجربے شروع کئے اور بمبئی پہنچ کر تو اتارو ہو گئے۔

ایک دفعہ نگینہ بیکری میں منٹو کا ذکر ہو رہا تھا۔ باری مرحوم بھی موجود تھے کہنے لگے ''کل تک تو منٹو ہمارے ساتھ محض ایک یار باش تھا، آج وہ سب سے بڑا افسانہ نگار ہے۔ اس کی شہرت پر رشک آتا ہے۔

میں ان سے بمبئی میں ملا تو۔۔۔۔وہ موڈ میں نہ تھے اور میں بھی کچھ غیر حاضر سا تھا۔ پاکستان بنا، تو لاہور کی ملاقاتیں دوستانہ سانچے میں ڈھلنے لگیں۔

ترقی پسند کانفرنس گزر گئی۔ میں نے ''آزاد'' چھوڑ دیا۔ ''چٹان'' نکالا۔ ایک روز دفتر میں بیٹھا تھا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، گھرر گھرر گھرر۔۔۔ شورش دوڑو، دو چار دس آدمی ساتھ لے آؤ، یہ بحالیات والے مکان خالی کروانا چاہتے ہیں۔۔۔ لیکن بحالیات والوں کی سمجھ میں یہ بات جلد ہی آ گئی کہ منٹو کون ہے۔ اور اس سے مکان خالی کرانا بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنا ہے۔

جن دونوں میں ''اس بازار میں'' لکھ رہا تھا، منٹو سے اکثر ملاقات ہوتی تھی۔ ایک دن مجھے کہنے لگے، تم نے بہت دن لگا دیئے۔ اگر تم نہیں لکھ سکتے تو اس نام سے میں لکھوں گا۔ اور اس بازار ہی پر لکھوں گا۔

میں نے کہا۔۔۔ ''منٹو صاحب، میرا اور آپ کا نقطہ نگاہ مختلف ہے۔ آپ شوق سے لکھئے میں کوئی اور نام رکھ لوں گا۔''

جب میری کتاب مکمل ہو گئی، تو ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا۔۔۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ اس پر دیباچہ لکھیں اور یہ ان کا دوستانہ اخلاص تھا لیکن سچی بات یہ ہے کہ میں ان سے ڈرتا تھا، خدا معلوم وہ کیا لکھ دیں۔

وہ اپنے نظریات میں بالخصوص طوائف کے مسئلہ میں سخت گیر تھے۔ ان کا بس چلتا تو عورت کے اس خونِ عزت کو جو آئے دن فروخت ہوتا ہے ان ''سفید داڑھیوں'' پر مل دیتے جو طوائف کے وجود پر نیزوں کی طرح تن جاتی ہیں لیکن چوری چھپے اس کی تخلیق کرتی ہیں۔

پار سال قدرت اللہ شہاب پنجاب میں محکمہ صنعت کے ڈائریکٹر تھے۔۔۔۔ انہوں نے ادیب کی حیثیت سے ایک ادیب کے کرب کو محسوس کیا اور الاٹ منٹوں کی تجدید کے موقع پر ایک برف خانہ میں ان کا حصہ بھی رکھا۔

منٹو کو دفتری اطلاع ملی تو سخت پریشان ہوئے۔۔۔ برف خانے گئے تو۔۔۔ حصہ داروں نے پھٹکنے پر ہاتھ نہ دھرنے دیا اور کہا ''صاحب! اپنے حصے کی برف فروخت کرنے کا خود انتظام کر لو۔''

ذرا غور فرمایئے۔ سعادت حسن منٹو ریڑھی پر برف لادے پھر رہے ہیں اور ایک آدھ ''ادبی چربہ'' بھی ساتھ ہے۔

ایک دم مجھے فون کیا۔۔۔ کہاں ہو، جیتے ہو، مر گئے ہو، تو ند کیوں بڑھ رہی ہے۔ بڑے یہ ہو

اور بڑے وہ ہو۔اور تان اس پر ٹوٹی کہ۔۔۔۔میرے حصے کی برف بکوادیا کرو۔

لیکن اگلے دن معلوم ہوا کہ برف خانے ہی پر دو حرف بھیج چکے ہیں۔شہاب کے ہاں گئے اور اپنا حصہ واپس کرآئے۔مجھ سے کہنے لگے "سخت پتھر تھا" اٹھ نہ سکا، چوم کے چھوڑ دیا۔"

موت سے کوئی تین دن پہلے "کافی ہاؤس" میں تشریف لائے۔ہم معمول کے مطابق منڈلی لگائے بیٹھے تھے۔میرا شانہ جھنجھوڑتے ہوئے کہا، "اٹھو"۔۔۔۔میں نے اعتراض کیا۔۔۔ایک گالی، دو گالیاں، تین گالیاں۔۔۔۔اور پھر "بارالیس توں تے توں مر ہی جاندا تے اچھا سی۔" اور کرم آباد میں مجھے ریڈیو نے بتایا کہ۔۔۔آج سعادت حسن منٹو انتقال کر گئے۔انا للہ وانا الیہ راجعون

☆☆☆

منٹو صاحب

اس مضمون کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ منٹو صاحب کی زندگی میں اور دوسرا حصہ ان کے انتقال کے بعد لکھا گیا۔

(1)

اس وقت سر میں شدید درد ہے، نہ جانے یہ جی کیوں چاہتا ہے کہ درد بڑھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں اس وقت منٹو پر کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ ڈرتا ہوں کہ درد کی نوعیت نہ بدل جائے۔ اس لئے کہ میں نے منٹو کے افسانے پڑھتے ہوئے عموماً سر کے بجائے دل میں درد محسوس کیا ہے۔ میرے علاوہ اور بھی کئی ایک ایسی اذیت میں مبتلا ہوں گے۔ بعضوں کے دل میں ان کے انداز بیان کی رنگینی اور چٹ پٹے پن سے درد ہوتا ہوگا۔ بعضوں کے دل میں ان کے انداز بیان سے ان کی تحریروں کے تاثر اور اس کے بھرپور وار سے درد ہوتا ہے۔ میرا شمار کن میں ہے؟ یہ میں آپ کو پھر کبھی بتاؤں گا۔ اس لئے کہ میں اس وقت منٹو کے فن کی بجائے ان کی شخصیت پر کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ منٹو کے فن پر لکھنے کا موقع ہمیشہ کی طرح نقادانِ کرام کو سونپتا ہوں۔ ورنہ وہ محاورہ صادق آئے گا کہ چھوٹا منہ اور بڑی بات۔

ایک دن انارکلی میں ایک صاحب کو افسانوی انداز میں پیدل چلتے دیکھا تو ذہن میں آیا کہ اسے منٹو ہونا چاہئے۔ یہ خیال اس لئے بھی ذہن میں آسکتا تھا کہ منٹو صاحب بمبئی سے لاہور آچکے تھے۔ چند دنوں بعد ایک صاحب ہمارے دفتر کے سامنے سے سائیکل پر گزرے، سائیکل بالکل نئی تھی۔ صاحب سائیکل نے ہمارے دفتر کے اندر کچھ اس نئے انداز سے دیکھا کہ ذہن میں پھر آیا کہ وہ منٹو گیا۔

ابھی تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ برادرم احمد ندیم قاسمی آئے اور انہوں نے بتایا میں آپ کے پاس ٹھیک وقت پر پہنچ جاتا۔ لیکن راستے میں منٹو صاحب مل گئے تھے۔ اس لئے آدھ گھنٹہ ان سے باتوں میں گزر گیا۔

کچھ دنوں بعد جب پھر ندیم صاحب آئے تو ان کے ہمراہ ایک اور صاحب بھی تھے۔ وہی جن کو میں نے انار کلی میں دیکھا تھا یا دفتر کے سامنے سائیکل پر گزرتے دیکھا تھا۔

ندیم صاحب نے تعارف کرایا۔ ''آپ سعادت حسن منٹو ہیں''۔ اور میری طرف اشارہ کر کے ''آپ طفیل صاحب ہیں۔''

منٹو صاحب میں سو خوبیوں کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ موجود ہوں' تو دوسرا لاکھ کوشش کرے' وہ کسی کو بولنے نہیں دیں گے۔ باتیں ان کی دلچسپ اور معلوماتی ہوتی ہیں۔

''وہ میرے پاس پہلی مرتبہ آئے تھے اور آتے ہی انہوں نے باتیں شروع کر دی تھیں اس لئے مجھے موقع ہی نہ مل سکا کہ پانی وانی کے لئے پوچھتا۔ پھر بھی میں نے ان کے مسلسل بیان میں یہ بات چھوڑ دی۔ منٹو صاحب چائے پئیں گے؟

منٹو صاحب اس وقت نان اسٹاپ موڈ میں تھے۔ اس لئے انہیں میری مروت بھی ناگوار گزری اور جھٹ بولے کہ ''ہٹاؤ یار' اس وقت چائے سے زیادہ گرم باتیں ہو رہی ہیں۔۔۔۔''

باتوں کا تسلسل تو ٹوٹ ہی چکا تھا اس لئے کسی اور طرف چل نکلے اور ندیم صاحب سے کہا۔ حیدر آباد دکن میں کئی ایک کو یہ فکر تھی اور ہے کہ میری شادی عصمت سے ہونی چاہیے تھی نہ جانے یہ لوگ ایسی باتیں کیوں سوچتے ہیں۔ جب یہ بات میری بیوی نے سنی تو وہ کباب ہو گئی۔ اس لئے کہ دونوں کی آپس میں بڑی دوستی ہے۔ پھر حق زوجیت پر بھی آنچ آ رہی تھی۔ اس لئے اس کا کباب ہونا برحق تھا''۔ پھر۔۔۔ ''ارے یار' بمبئی کا کیا پوچھتے ہو۔'' اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے' بڑے ٹھاٹ سے دن گزارے ہیں۔ ڈیڑھ دو ہزار کی آمدنی تھی۔ بڑی قدر تھی ہر کوئی منٹو منٹو کرتا تھا۔ مملکت خداداد میں آئے تو پبلشروں کے پاس خود جانا پڑا کہ بھئی ہماری کتاب چھاپ لو۔ کئی بار جی چاہا کہ بیچ سڑک کھڑا ہو کر پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگاؤں' پھر سوچتا ہوں کہ لوگ مجھے پاگل کہیں گے۔۔۔''

اس تذکرے پر منٹو صاحب ذرا افسردہ ہو گئے اور شاید افسردگی ہی دور کرنے کے لئے انہوں نے اپنا خوبصورت سگریٹ کیس نکالا' ایک سگریٹ ندیم صاحب کو دیا ایک خود اپنے باریک باریک لبوں پر لٹکایا'' جیب سے ماچس نکال ہی رہے تھے کہ ایک دم میری موجودگی کا خیال آیا اور بولے۔ ''بھئی معاف کرنا''۔ اور سگریٹ کیس میری طرف بڑھا دیا۔

ندیم صاحب نے مشکل کشائی کی اور کہا کہ یہ نہیں پیتے۔ منٹو صاحب پینے کے لفظ کو لے اُڑے۔

''ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں، سگریٹ پینا کیا ہوتا ہے۔ پینا تو وہ ہوتا ہے۔۔۔۔۔''

پھر ندیم صاحب سے پوچھا'' قاسمی صاحب آپ نے میرا مضمون'' سویرے جو کل آنکھ میری کھلی'' پڑھا ہے''؟ ندیم صاحب نے حسب عادت جی ہاں کہا۔ چھڈ یار او مضمون کیہ اے' بکواس اے۔

منٹو صاحب کی یہ عادت ہے کہ اگر ان کی کسی چیز کی تعریف کی جائے تو وہ عموماً یہی جواب دیتے ہیں' یا صرف اتنا کہہ دیں گے بس ٹھیک ہے۔ پھر خود ہی اس مضمون کی تعریف شروع کر دیں گے اور وہ بھی حوالے دے دے کر مثلاً اس میں وہ فقرہ بڑا اچھا تھا کہ

''صبح کا وقت تھا، عجب بہار تھی اور عجب سیر تھی۔ قریب قریب ساری دکانیں بند تھیں۔ ایک حلوائی کی دکان کھلی تھی۔ دکان کی طرف بڑھا تو کیا دیکھتا ہوں بجلی کا پنکھا چل رہا ہے۔ لیکن اس کا منہ دوسری طرف ہے۔ میں نے حلوائی سے کہا'' یہ الٹے رخ پنکھا چلانے کا کیا مطلب ہے''؟ اس نے گھور کر مجھے دیکھا اور کہا'' دیکھتے نہیں ہو''۔۔۔۔ میں نے دیکھا۔۔۔۔ پنکھے کا رخ قائداعظم محمد علی جناح کی تصویر کی طرف تھا''۔

''ایک دم شور برپا ہو گیا دیکھتا ہوں کہ لڑکے ہاتھوں میں کاغذ کے بنڈل لئے چلا رہے ہیں اور اندھا دھند بھاگ رہے ہیں۔ بھانت بھانت کی بولیاں سننے میں آئیں۔ اخبار بک رہے تھے۔ تازہ تازہ اور گرما گرم خبریں۔ دہلی میں جوتا جل گیا۔ لکھنؤ میں فلاں کوٹھی پر کتوں نے حملہ کر دیا پاکستان کے ایک نجومی کی پیشگوئی۔ کشمیر دو ہفتوں میں آزاد ہو جائے گا''۔

اس وقت انہوں نے یہ فقرے بغیر کسی ربط کے سنائے تھے۔ یہاں ان کی کتاب سے نقل کر دیئے گئے ہیں۔

اس کے بعد بھی رکے کہاں۔ کہنے لگے آج کل عجیب موڈ ہے۔ افسانہ لکھنا چاہتا ہوں تو مضمون ہو جاتا ہے اگر مضمون لکھنا چاہوں گا تو ڈرامہ ہو جائے گا نہ جانے اس وقت مجھے بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا اور جھٹ سے بول پڑا۔

اگر آپ نے بیک وقت ڈرامہ افسانہ اور مضمون لکھنا چاہا تو آپ سوالیہ نشان بن کر رہ جائیں گے۔

اس فقرے پر منٹو صاحب محظوظ ہوئے اور کہا ''اچھا اے' اچھا اے''۔ چونکہ انہیں اپنے پہ کوئی چبکتی ہوئی بات گوارا نہیں ہوتی' اس لئے ذرا سوچ کر بول ہی پڑے ''بات تو آپ نے اچھی کہی ہے' بدقسمتی سے میری اور آپ کی بے تکلفی نہیں ہے اس لئے جواب ارسال کرنے سے معذور ہوں۔''

ندیم صاحب سمجھ گئے کہ یہ اس وقت کس قسم کا جواب دے سکتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے مسکرا کر کہا ''آپ انہیں کوئی جواب نہ دیں۔ یہ ذرا اور قسم کے آدمی ہیں''۔ اور قسم سے اس وقت نہ جانے ان کی مراد کیا تھی۔ لیکن منٹو صاحب کی باتوں کا رخ قسموں کی طرف چل نکلا اور کہا ''آپ نے میرا مضمون ناک کی قسمیں پڑھا ہوگا۔ وہ' وہ' ہاں وہی

آئی جوان کی ناک تو آتی چلی گئی

میں نے اس مضمون میں ناک کی قسمیں گنوائی ہیں۔ اس مضمون میں ایک شعر بھی کوٹ کیا ہے جو مجھے ناک کی مناسبت سے بڑا پسند ہے۔ وہ کیا ہے تنکا بھئی وہ تنکا۔ ہاں!

ناک میں نیم کا فقط تنکا
شوخی چالاکی اقتضا سن کا

اس کے بعد انہوں نے اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے' موٹے موٹے شیشوں والی عینک میں سے دیکھ کر ندیم صاحب سے پوچھا ''آپ یہاں بیٹھیں گے''؟

ندیم صاحب نے اپنا تکیہ کلام دہرایا ''جی ہاں'' تو آپ کھڑے ہو گئے اور کہا اچھا بھئی میں چلتا ہوں۔

پھر تو ان سے اکثر ملاقاتیں رہیں۔ قریب قریب روز۔ عموماً ان کی ملاقاتوں کا انداز یہ ہوتا ہے کہ مسلسل ملاقاتیں بخشیں گے۔ کبھی کبھی اچانک ناپید ہو جائیں گے۔ بات صرف اتنی ہو گی کہ ملاقاتوں کا رخ کسی اور کی طرف مڑ جائے گا۔ ان کا یوں روپوش رہنا چند دنوں کا یا زیادہ سے زیادہ چند ہفتوں کا ہوگا۔ تانگے سے اُترتے ہی دور سے السلام علیکم کے ساتھ ملاقات پھینک دیں گے۔ پھر یہ کہیں گے ''دس روپے یا پندرہ روپے دوائی کے لئے دینا''۔ جو دینے پڑتے ہیں۔ لوگ دوائی اس لئے پیتے ہیں کہ صحت یاب ہوں۔ لیکن یہ دوائی اس لئے پیتے ہیں کہ صحت اور خراب ہو۔ ان کی دوائی کا نام شراب ہے۔ پہلے

یہ دوائی کو پیتے ہوں گے۔اب دوائی انہیں پی چکی ہے اور کسی دن بیٹھے بٹھائے ہم یہ سن لیں گے کہ منٹو صاحب کا انتقال ہو گیا۔۔۔

یہ سب جانتے ہوئے کہ منٹو اردو کا ممتاز افسانہ نگار ہے' جو ان کی اس حیثیت سے منکر ہیں' مجھے ان کی رائے سے اتفاق نہیں۔لیکن ایک بار ایسا ہی ہوا کہ منٹو صاحب نے ایک افسانہ مجھے نقوش کے لئے دیا جس کا نام ''نطفہ'' تھا' میں نے وہ افسانہ پڑھا تو مجھے پسند نہ آیا۔ڈرتے ڈرتے اس کا اظہار ان سے کیا۔

منٹو صاحب نے بُرا نہ مانا بلکہ ایک اور افسانہ لکھ دیا۔میری نظر میں وہ بھی پہلے جیسا ہی تھا۔جب منٹو صاحب کو دوسرے افسانے کے متعلق بھی میری رائے کا علم ہوا تو انہوں نے کہا کہ کل ایک اور افسانہ لکھ دوں گا اور اس وقت تک لکھتا رہوں گا جب تک کہ آپ یہ نہ کہہ دیں کہ یہ افسانہ مجھے پسند ہے۔

اس کے بعد انہوں نے مجھے ایک ایک دن کے وقفے سے دو افسانے دیئے وہ دونوں مجھے بے حد پسند آئے۔ایک کا نام ''موذیل'' تھا اور دوسرے کا نام ''سڑک کے کنارے''۔

مندرجہ بالا واقعہ کے اظہار کا میرے نزدیک سوائے اس کے اور کوئی مقصد نہیں کہ اتنا بڑا لکھنے والا اتنے بڑے دل گردے کا بھی مالک ہے۔ہر فن کار کو اپنی ادنیٰ سے ادنیٰ تحریر بھی بڑی عزیز ہوتی ہے اور وہ اس کی شان میں ایک حرف بھی سننے کے لئے تیار نہیں ہوتا اور پھر منٹو ایسا فنکار جو فنکار بھی ہے اور منہ پھٹ بھی۔اس وقت انہوں نے نہ مجھے یہ طعنہ دیا کہ میں بہت بڑا لیکھک ہوں اور نہ ہی یہ ثابت ہونے دیا کہ منہ پھٹ بھی ہوں۔

ویسے ان کی زبان کے آگے کوئی خندق نہیں۔کبھی کبھی پی کر آ جائیں گے اور کہیں گے ''کل آپ نے فلاں صاحب کے سامنے کیا بکواس کی تھی' میری جان! میرے اور اس کے تعلقات اور قسم کے ہیں۔ معاف کرنا۔وہ بھی حرام زادہ' میں بھی حرام زادہ' پر آپ کو کیا پڑی تھی کہ وہی بات آپ اس سے بھی کہہ دیں جو میں نے آپ سے چھپا کر کہی تھی۔ویسے میں ڈرتا نہیں ہوں' وہ میرا کیا کر لے گا' میری جان! آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔معاف کرنا آپ کو پتہ نہیں کہ آپ نے بڑی کمینہ حرکت کی...

بعض اوقات جب منٹو اور شراب مل کر بولتے ہیں تو اس وقت منٹو پر بھی پیار آتا ہے اور اس کی باتوں پر بھی۔ لیکن ایسے مواقع ذرا کم ہی آتے ہیں۔ عموماً وہ پی کر واہی تباہی بکتے ہیں وہ اپنی انہی باتوں کی بدولت دو بار پاگل خانے جا چکے ہیں۔

پہلی مرتبہ منٹو صاحب راضی خوشی خود ہی گئے تھے۔ دوسری مرتبہ زبردستی ان کے گھر والوں نے بھیجا۔ ان کی دوبارہ واپسی پر میں نے ان سے پوچھا تھا کہ منٹو صاحب آپ کس خوشی میں مینٹل ہاسپٹل جاتے اور آتے ہیں۔

کہنے لگے کہ بھئی پہلی مرتبہ تو خود بڑے چاؤ سے گیا تھا کہ وہاں جا کر ذرا شراب چھوڑ آؤں۔ سنا تھا کہ وہاں اس انداز سے علاج کیا جاتا ہے کہ آدمی آسانی کے ساتھ شراب ترک کر دیتا ہے لیکن وہاں جا کر جو طبیعت صاف ہوئی وہ بیان نہیں کر سکتا۔ دوسری مرتبہ گھر والوں نے زبردستی بھجوا دیا حالانکہ میں نے ان کی بڑی منت سماجت کی۔ لیکن ایک نہ سنی۔ وہاں پہنچ کر میں نے ڈاکٹروں سے کہا کہ میرا ذہنی معائنہ کرایا جائے اس لئے کہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ لیکن ڈاکٹروں نے بھی ایک نہ سنی۔ کل میرے ایک دوست مجھے ملنے آئے تھے، تو میں ان کے ساتھ چلا آیا۔ وہ مجھے ڈھونڈتے ہوں گے، ڈھونڈا کریں پاگل کہیں کے۔

منٹو صاحب کا مزا اس وقت آتا ہے جب ان سے عریانی یا فحاشی کے موضوع پر گفتگو کی جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھے بڑی حیرت ہے کہ لوگوں نے میرے وہ بے شمار افسانے نظر انداز کر دیئے جن میں جنس کا تذکرہ تک نہیں۔ میں نے جنسی افسانے تو شاید چند ایک ہی لکھے ہیں۔ باقی تو سب افسانے ہیں۔ جن حضرات کو میرے افسانوں میں فحاشی نظر آتی ہے، وہی دکان دکان پھرتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ منٹو کی کوئی نئی کتاب آئی۔ ان کا خیال ہے کہ میری تحریریں یا تو وہ حضرات پڑھتے ہیں جنہیں میرے فن سے پیار ہے یا ''اعتراض ہے'' تاکہ مجھے برا بھلا کہہ سکیں۔ میں بھی وقت آنے پر ہر ایک کا قرضہ چکا دیتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنی کتاب کا انتساب یوں کیا تھا:

''ایڈیٹر دین و دنیا کے نام جس نے مجھے سب سے زیادہ گالیاں دیں۔''

اب جی چاہتا ہے کہ قبلہ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے نام بھی ایک کتاب معنون کر دوں۔ اس لئے کہ موصوف نے میرے خلاف لکھ لکھ کر میرے افسانوں کی قدر کی ہے۔ اگر میں اپنی زندگی میں ایسا نہ کر سکا، تو بہت ممکن ہے کہ حشر کے دن مولانا موصوف دامن گیر ہوں اور مجھے ندامت ہو۔

بھئی ان محترم ہستیوں کا تذکرہ چھوڑو۔ میرے دوست قاسمی صاحب نے بھی میرے نام ایک کھلی چھٹی لکھ دی۔ میرا بڑا دل چاہا کہ میں بھی بند لفافہ لکھ کر چھپوا دوں۔ لیکن قاسمی صاحب کی شرافت آڑے آ گئی۔ عسکری نے سیاہ حاشیے پر دیباچہ لکھ دیا تو پھر لوگوں نے اڑا دیا کہ مجھ پر عسکری چھایا ہوا ہے۔ حالانکہ وہ خود اتنا سیدھا سادھا اور بھولا بھالا ہے کہ اپنے اوپر تو چھا نہیں سکا' مجھ پر کیا چھاتا۔

پہلے ترقی پسند میری تحریروں کو اچھالتے تھے اور فخر کرتے تھے کہ منٹو ہم میں سے ہے۔ اب یہ کہتے ہیں کہ منٹو ہم میں سے نہیں ہے۔ مجھے نہ ان کی پہلی بات پر یقین تھا' نہ موجودہ پر ہے۔ پہلے ترقی پسند کہتے تھے کہ منٹو ہم میں سے ہے۔ میں کہتا تھا' ٹھیک ہے۔ اب مجھے حلقہ ارباب ذوق والوں نے اپنا ممبر بنالیا ہے۔ میں کہتا ہوں ٹھیک ہے۔

مجھ سے کوئی پوچھے کہ منٹو تم کس جماعت میں سے ہو تو میں عرض کروں گا کہ میں اکیلا ہوں' ہر معاملے میں اکیلا ہوں۔ جس دن میرا کوئی ثانی پیدا ہو گیا' میں لکھنا چھوڑ دوں گا۔ ویسے کوئی جماعت میرے نام کو اپنی جماعت کی فہرست میں شامل کر کے فخر کر سکتی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

اب منٹو صاحب میں یہ کمزوری راہ پا گئی ہے کہ وہ ہر ایک سے کہیں گے کہ کل فلاں صاحب ملے تھے اور انہوں نے میرے فلاں افسانے کی بڑی تعریف کی۔

پرسوں کراچی سے ایک صاحب آئے تھے نہ جانے ان کا نام کیا تھا وہ کہتے تھے کہ منٹو صاحب میں نے آپ کی ساری کتابیں پڑھی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ میں آپ کو اردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار مانتا ہوں۔

کل فلاں صاحب نے شیخوپورہ سے دو کنستر گھی کے اس لئے بھجوا دیئے کہ وہ مجھے بڑا رائٹر سمجھتے ہیں۔

میں نے مال روڈ پر ایک دکاندار کو اپنی دو تصویریں فریم کے لئے دی تھیں۔ کوئی صاحب محبت کے اظہار کے طور پر وہاں سے فریم کے روپے دے کر میری دونوں تصویریں لے گئے۔

میرا یہ سگریٹ کیس گم ہو گیا تھا۔ اس کے دوسرے دن ایک صاحب اسے لئے ہوئے آ پہنچے اور کہا منٹو صاحب السلام علیکم! یہ اپنا سگریٹ کیس رکھیے۔ مجھے فلاں جگہ پڑا ہوا ملا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ آپ کو کیسے علم ہوا کہ میں یہاں رہتا ہوں وہ کہنے لگے۔ واہ آپ کو بھلا کون نہیں جانتا۔

ادھر ممتاز شیریں میرے فن پر کتاب لکھ رہی ہیں۔ ادھر میرے افسانوں کا انگریزی میں ترجمہ

چھپ رہا ہے۔

ایک دن ایک صاحب نے لکشمی مینشن میں افیون کھالی۔ ڈاکٹر بلایا گیا۔ ڈاکٹر نے قے کرانے کے لئے کوئی دوا تجویز کی۔ مگراس نے دوائی پینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں مرنا چاہتا ہوں۔ شور جو مچا تو میں بھی پہنچا' میں نے کہا بھئی دوا کھالو اس نے کہا۔ تم کون ہو؟ میں نے کہا میں منٹو ہوں۔ اس نے اسی حالت میں کہا۔ بڑا اچھا ہوا کہ میں نے آپ کو مرنے سے پہلے دیکھ لیا۔ میں آپ کو بہت بڑا رائٹر سمجھتا ہوں۔ چنانچہ میں نے اسے حکم دیا کہ تمہیں دوائی پینا ہوگی۔ چنانچہ اس نے دوا پی لی۔

ایک دن میں انارکلی اور مال روڈ کے درمیان بیہوش ہوگیا۔ مجھے کچھ خبر نہیں کہ کیا ہوا۔ بس اتنا یاد ہے کہ کچھ ایسے معلوم ہوا کہ کسی نے میری گردن پر کلہاڑا مارا ہے۔ اور میں بیہوش' کوئی آدھ گھنٹے کے بعد ہوش آیا تو دیکھا کہ ایک سائیکلوں کی دکان میں لوہے کی کرسی پر بیٹھا ہوں۔ ایک ہجوم میرے اردگرد سب منٹو منٹو کر رہے ہیں۔

میں نے کہا ''ماجرا کیا ہے''

انہوں نے جواب دیا ''آپ کو چوٹ تو نہیں لگی''

''میرے کپڑے کیوں گیلے ہیں''؟

''اب آپ کی طبیعت کیسی ہے''؟

میں نے سٹپٹا کر کہا ''کیا بکواس کر رہے ہو؟ تم لوگوں نے میرا جلوس کس سلسلے میں نکالا ہے۔

بعد میں معلوم ہوا کہ میں بیہوش ہوگیا تھا۔ اس لئے لوگوں نے پانی کے چھینٹے مار مار کے مجھے ہوش میں لانا چاہا تھا۔ یہ بھی علم ہوا کہ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ مجھے مرگی کا دورہ پڑا ہے اسلئے مجھے خوب خوب جوتیاں سونگھائی گئیں۔

جب میں نے یہ بات سنی تو مجھے خطرہ پیدا ہوا۔ ناک کو ہاتھ لگا کے دیکھا کہ کوئی چھوٹی سی جوتی اس کے اندر تو نہیں رہ گئی۔ یہی وجہ تھی کہ میں ایک دم گھبرا کے اٹھ کھڑا ہوا۔ لوگوں سے کہا ''میں گھر جانا چاہتا ہوں، تانگہ منگوادو''۔

تانگہ منگوایا گیا۔ اب سب مصر کہ ہم منٹو صاحب کو گھر چھوڑنے جائیں گے۔ ہم منٹو صاحب کو گھر چھوڑنے جائیں گے۔ چنانچہ میں ان لوگوں میں سے تین صاحبان کو ساتھ لے کر گھر کی طرف

تانگے پر چل دیا۔ ان میں سے ایک صاحب نے کہا۔ منٹو صاحب میری خوش قسمتی ہے کہ آج آپ سے اس ڈرامائی انداز میں ملاقات ہوگئی۔ میں آپ کو دنیا کا بہترین افسانہ نگار مانتا ہوں۔ میں نے فلاں فلاں مغربی افسانہ نگاروں کو پڑھا ہے۔ لیکن آپ کے سامنے سب ہیچ ہیں۔

میں نے ان صاحب سے کہا کہ میں کیا ہوں بس افسانہ نگار ہوں۔ اب تو میں افسانہ نگار بھی نہیں ہوں۔ افسانہ نگار اس وقت ہوتا ہوں جب میرے ہاتھ میں قلم ہوتا ہے۔ جب میرے ہاتھ میں قلم نہیں ہوتا' اس وقت میں کچھ نہیں ہوتا۔ اب افسانے کہاں ہیں جنہیں لکھوں۔ افسانے اُدھر رہ گئے۔ جو افسانے ادھر تھے انہیں بھی مار بھگایا یا ادھر ان کے ساتھ کچھ اور کرلیا گیا۔ وہاں ایک سڑک پر کئی افسانے ملتے تھے۔ یہاں کئی سڑکوں پر ایک افسانہ نہیں ملتا۔ اب یہ افسانہ تھوڑا ہے کہ سعادت حسن منٹو مال روڈ کے قریب بیہوش ہوگیا اور لوگوں نے اس کی پانی کے چھینٹوں اور جوتوں سے تواضع کی۔ میری جان! یہ افسانہ تھوڑا ہے کہ۔۔۔۔۔

ایک بار کسی صاحب نے ان کے افسانے 'موذیل' کی بات چھیڑ دی۔ منٹو صاحب گویا ہوئے۔ وہ افسانہ میں نے تھوڑا ہی لکھا ہے۔ وہ تو موذیل نے لکھوایا تھا۔ بھئی مجھے افسانہ لکھتے وقت کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ مجھے کیا لکھنا ہے۔ قلم دوات سنبھالتا ہوں تو کاغذ کے اوپر 786 لکھ دیتا ہوں۔ پھر سوچتا ہوں کہ افسانہ لکھنا ہے' افسانہ لکھنا ہے، افسانہ لکھنا ہے۔ کیا لکھوں' کیا لکھوں' معاً ایک بات سمجھ میں آتی ہے۔ مثلاً وہ درخت کے نیچے کھڑی تھی۔ پھر قلم رکھ دیتا ہوں' سگریٹ پیتا ہوں' یا پیشاب کرنے چلا جاتا ہوں' یا پان کھانے کے لئے نکل جاتا ہوں۔ واپس آکر "وہ" سے پوچھتا ہوں کہ بتا اب تو کیا کہتی ہے۔ وہ جو کچھ مجھ سے کہتی جاتی ہے۔ میں لکھتا جاتا ہوں۔ وہ جدھر جاتی ہے میں اس کے ساتھ ساتھ جاتا ہوں' البتہ میں اسے کنکھیوں سے دیکھتا جاتا ہوں کہ وہ شکل وصورت کے اعتبار سے کیسی ہے۔ اس میں قابلِ غور کون کونسی سی باتیں ہیں۔ اس کے سینے کا ابھار کیسا ہے۔ وہ جب ہنستی ہے تو اس کے گالوں میں گڑھے پڑتے ہیں یا نہیں وہ جب چلتی ہے تو اس کا انداز کیا ہوتا ہے۔ جب وہ مسکراتی ہے تو کہیں دل لوٹ کے تو نہیں لے جاتی۔۔۔ یہ مرحلہ میرے لئے نازک ہوتا ہے کہ جب وہ دل لوٹنے پر آتی ہے تو خود لٹتی بھی ہے یا نہیں۔ بس اس کا علم مجھے نہیں ہوتا۔ جب افسانے کا آخری حصّہ آتا ہے تو ان تمام کرداروں سے پوچھتا ہوں کہ بھئی اب بتاؤ تمہاری کیا کیا مرضی ہے؟ تم میں سے کس کس کو مار دیا جائے یا تم میں سے کس کو کیا

کر دیا جائے۔ بعض کردار مرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ میں کہتا ہوں جاؤ تمہیں زندگی بخشی۔ پھر دوسرے کردار سے مشورہ کرتا ہوں وہ جو کچھ کہتا ہے اس پر صاد کر دیتا ہوں۔ ان میں سے جو کوئی مرنے کے لئے راضی ہوتا ہے اسے مار دیتا ہوں یا وہ سالا اور سالی جو کچھ بھی کرنا چاہے میں اسے مطلق نہیں روکتا۔ البتہ آخری فقرہ منٹو سوچتا ہے اور افسانہ مکمل ہو جاتا ہے۔ مثلاً موذیل کا پہلا فقرہ ''ترلوچن نے پہلی مرتبہ۔۔۔ برسوں میں پہلی مرتبہ رات کو آسمان دیکھا تھا''۔ میرا ہے اور پھر آخری فقرہ ''لے جاؤ اپنے اس مذہب کو'' میرا ہے۔ باقی سب کچھ موذیل کا ہے۔

پھر موذیل کے وجود پر بحث ہوگی ''بمبئی میں ایک یہودن تھی۔ بڑی بڑی رانوں والی، دھڑلے کی عورت، وہ اسکرٹ کے نیچے کچھ نہیں پہنتی تھی۔ افسانے لکھتے وقت وہ دماغ میں ابھری۔ اس کا نام بھول گیا تھا تو میں نے سوچا کہ ہمارے فلیٹ کے سامنے بھی تو ایک یہودن رہتی تھی اور اس کا نام موذیل تھا۔ ادھر بڑی بڑی رانوں کا تصور ذہن میں ابھرا۔ ادھر موذیل کا نام، تو بس افسانہ ہوگیا۔ میرا اس میں کون سا کمال ہے۔ اگر کوئی کمال ہے تو موذیل کا ہے۔۔۔۔۔۔ آ۔۔۔۔

ویسے اس سلسلے میں منٹو صاحب نے جو کچھ تحریری طور پر فرمایا ہے۔ وہ بھی سن لیجیے، مزے کی باتیں ہیں:

> ''اب آپ کو کیا بتاؤں کہ میں افسانے کیونکر لکھتا ہوں۔ یہ بڑی الجھن کی بات ہے۔ اگر میں کس طرح کو پیش نظر رکھوں تو یہ جواب دے سکتا ہوں کہ اپنے کمرے میں صوفے پر بیٹھ جاتا ہوں۔ کاغذ قلم پکڑتا ہوں اور بسم اللہ کر کے افسانہ لکھنا شروع کر دیتا ہوں۔ میری تین بچیاں شور مچا رہی ہوتی ہیں، میں ان سے بھی باتیں کرتا ہوں، ان کی تمام باہم لڑائیوں کا فیصلہ بھی کرتا ہوں۔ اپنے لئے سلاد بھی تیار کرتا ہوں۔ کوئی ملنے والا آجائے تو میں اس کی خاطر داری بھی کرتا ہوں۔ مگر افسانہ لکھے جاتا ہوں۔ میں افسانہ نہ لکھوں تو مجھے ایسا احساس ہوتا ہے کہ میں نے کپڑے نہیں پہنے یا میں نے غسل نہیں کیا۔۔۔ میں افسانہ نہیں لکھتا۔ حقیقت یہ ہے کہ افسانہ مجھے لکھتا ہے۔ میں بہت کم پڑھا لکھا آدمی ہوں۔ یوں تو میں نے بیس سے اوپر کتابیں لکھی ہیں۔ لیکن مجھے بعض اوقات حیرت ہوتی ہے یہ کون ہے جس نے اس قدر اچھے افسانے لکھے ہیں، جس پر

آئے دن مقدمے چلتے رہتے ہیں۔ جب قلم میرے ہاتھ میں نہ ہو تو میں صرف سعادت حسن ہوتا ہوں' جسے نہ اردو آتی ہے' نہ فارسی' نہ انگریزی' نہ فرانسیسی۔۔۔۔ بعض اوقات میں بیوی کے کہنے پر قلم یا پنسل اُٹھاتا ہوں اور لکھنا شروع کر دیتا ہوں۔ دماغ بالکل خالی ہوتا ہے۔ لیکن جیب بھری ہوتی ہے۔ خود بخود کوئی افسانہ اچھل کے باہر آ جاتا ہے۔ میں خود کو اس لحاظ سے افسانہ نگار نہیں جیب کترا سمجھتا ہوں۔ جو اپنی جیب خود ہی کاٹتا ہے اور آپ کے حوالے کر دیتا ہے۔۔۔ مجھ جیسا بھی بیوقوف دنیا میں کوئی اور ہوگا''؟

ایک مرتبہ میں نے منٹو صاحب کی ضمانت دی۔ اس کا حال آپ نے منٹو صاحب کی زبانی سنا ہوگا۔ میرے اور ان کے بیان میں بدیہی فرق یہ ہوگا کہ وہ ایک بڑے لکھنے والے ہیں اور میرا لکھنے والوں میں شمار ہی نہیں۔ الحمدللہ کہ میرا لکھنے میں شمار نہیں' ورنہ میں بعض اولوالعزم' ادبا و شعرا'' کی طرح کسی کو خاطر میں نہ لاتا۔ ہر ادیب کے متعلق یہی کہتا کہ فلاں کیا لکھتا ہے۔ فلاں کی زبان ٹھیک نہیں۔ فلاں کا مشاہدہ ناقص ہے' فلاں جاہل ہے۔

ایسے اساتذہ کی موجودگی میں کون کس کے منہ لگے۔ ہاں تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ میں نے منٹو صاحب کی ضمانت دی۔

میرا منجھلا بھائی سخت بیمار تھا۔ میں اس کی دوائی کے سلسلے میں ڈاکٹر کے پاس آیا ہوا تھا اور اس کی کیفیت بیان کر رہا تھا' وہاں یہ پیغام ملا کہ ہاجرہ بہن آئی ہیں اور آپ کو بلا رہی ہیں۔

میں نے سوچا کہ ایک خاتون دفتر میں بیٹھی نہ رہے۔ چل کر پہلے ان کی بات سن لو۔ پھر دوائی لے جاؤں گا۔

ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ ابھی آیا۔ میں اپنے بھائی کی بیماری سے سخت پریشان تھا۔ پھر بھی بر بنائے تکلف بہن سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ میں اصرار کر رہا تھا کہ میں آپ کو چائے پلاؤں گا اور وہ کہہ رہی تھیں کہ ہرگز ہرگز نہ پیوں گی اور طفیل کی چائے تو کبھی نہ پیوں گی کہ اتنے میں منٹو صاحب تشریف لے آئے۔ وہ تانگے میں سوار تھے۔ انہوں نے میری طرف اشارہ کر کے آواز دی ''ذرا ادھر آنا'' میں ذرا ادھر گیا' منٹو صاحب ذرا ادھر آئے اور ہمارا آمنا سامنا دفتر اور سڑک کے درمیان ہوا۔ منٹو

صاحب نے کہا کہ ذرا میرے ساتھ آؤ اور میری ضمانت دے دو۔ میں اپنے چند دوستوں کے پاس گیا تھا، ان میں سے کوئی نہیں ملا۔ (اس وقت میرے لئے یہ فیصلہ مشکل تھا کہ یہ اس وقت یہاں مجھے اپنا دوست سمجھ کر آئے ہیں یا دشمن سمجھ کر) ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی کہا کہ کل پانچ ہزار روپے کی ضمانت ہے۔

میں نے یہ عذر کیا کہ میں تو گھر سے بھائی کی دوا لینے کے لئے آیا ہوں۔ اس لئے آپ یہ کام کسی اور کے سپرد کر دیں۔ بہت ممکن ہے کہ میری پانچ ہزار کی ضمانت بھی منظور نہ کی جائے۔

اس پر منٹو صاحب نے کہا کہ آپ آدھ گھنٹے میں واپس آ جائیں گے اور ساتھ ہی کئی سوال جڑ دیئے۔ ''آپ کا ذاتی مکان ہے؟ آپ کا بینک بیلنس تو اتنا ہوگا'' جب میں نے نفی میں جواب دیا تو کہنے لگے آ جاؤ ہو جائے گی ضمانت' آخر اتنے بڑے ادارے کا مالک پانچ ہزار کی بھی ضمانت نہیں دے سکتا۔

ہاجرہ بہن نے بھی لقمہ دیا۔ چلے جایئے نا آخر ہرج ہی کیا ہے۔

چنانچہ دھڑکتے دل کے ساتھ اور ذہن میں گھریلو پریشانیاں لئے منٹو صاحب کے ساتھ تانگے میں بیٹھ گیا۔ تانگے میں نصیر انور اور حنیف رامے موجود تھے۔ اب تانگہ انارکلی سے نسبت روڈ پہنچا اور راستے میں باتیں ہو رہی ہیں۔ ''کل جو تھانے دار میرا وارنٹ لے کر آیا تھا۔ بڑا شریف آدمی تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ کل صبح خود تھانے میں اپنے ایک ضمانتی سمیت حاضر ہو جاؤں گا۔ اب آپ جائیں اور مجھے آرام کرنے دیں۔ چنانچہ انہوں نے میری بات مان لی اور میں رات بھر آرام کرتا رہا''۔ کبھی نصیر انور کہتے ''منٹو صاحب آپ ایسے افسانے کیوں لکھتے ہیں۔ جن پر مقدمے کی نوبت آئے۔ کبھی میں کہتا ہوں کہ منٹو صاحب اگر آپ کو وقت مقررہ پر حاضر عدالت ہونا ہے تو مجھ سے ضمانت دلوایئے ورنہ مجھے پریشان نہ کیجئے گا۔

جس وقت ہم نسبت روڈ سے میکلوڈ روڈ پر پہنچے تو منٹو صاحب نے کہا ''اگر اس وقت طفیل صاحب بھی نہ ملتے تو بڑی مشکل ہوتی''۔ اس پر نصیر انور نے کہا آپ کی مشکل تو حل ہو گئی۔ اب آپ طفیل صاحب کے لئے مشکل پیدا کر رہے ہیں۔

اس پر منٹو صاحب ہنسے اور کہا ''نہیں نہیں، ہرگز نہیں۔ آخر مجھے ایک بار تو کراچی جانا ہی ہے تاکہ یہ ٹنٹا ختم ہو''۔ اب تانگہ میکلوڈ روڈ سے قلعہ گوجر سنگھ کی طرف مڑا۔ بالآخر تانگہ ڈسٹرکٹ پولیس کے سامنے جا کر رکا۔ ہم نے دفتر میں جا کر اپنی آمد کی غرض بتائی۔ وہاں میرے بھی ایک ملنے والے مل گئے۔ انہوں نے

جب یہ سنا کہ میں ایک ضمانت کے سلسلے میں یہاں آیا ہوں تو انہوں نے کوشش کی کہ ضمانت جلد سے جلد ہو جائے۔ حالانکہ اس وقت میرا دل یہ چاہتا تھا کہ وہ کچھ ایسا ہیر پھیر کریں کہ تھانیدار صاحب میری ضمانت ہی قبول نہ کریں۔ وہ میرے دل کی گہرائیوں تک پہنچ کر یہ اندازہ نہیں کر سکتے تھے کہ میں یہاں محض مروت کی بنا پر آ گیا۔ اس لئے کہ مجھ سے ایک بڑے لکھنے والے کی دلآزاری نہیں دیکھی جاتی تھی۔

چنانچہ جب ضمانت ہوگئی۔ دوسرے لمحے منٹو صاحب نے فیصلہ سنا دیا کہ میں کراچی نہیں جا سکوں گا اس لئے کہ صحت خراب ہے۔ ڈاکٹری سرٹیفکیٹ بھجوا دوں گا۔ ان کے منہ سے اس وقت یہ فقرہ سن کر میں حیران رہ گیا۔ اس لئے کہ وہ کراچی نہیں جا رہے تھے۔ حیرانی اس لئے بھی ہوئی کہ میں نے ان کی صحت اس دن سے اچھی پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

اس وقت مجھے منٹو صاحب پر بڑا غصہ آیا۔ حالانکہ غصہ مجھے اپنے اوپر آنا چاہیے تھا۔ بہ فرض محال اگر اس وقت مجھے اپنے اوپر غصہ آ جاتا تو کیا ہوتا۔ بالآخر تانگے پر پھر سوار ہوئے اور تانگے کا رخ ہمارے دفتر کی طرف کرا دیا گیا۔ راستے میں پاکستان ٹائمز اور امروز کا دفتر آیا تو تانگہ رکوا دیا گیا۔ اوپر پہنچے جس کسی نے سنا کہ میں نے منٹو صاحب کی ضمانت دی ہے تو سب نے یہی کہا کہ منٹو صاحب وقت مقررہ پر حاضر عدالت نہ ہوں گے، منٹو صاحب ان ریمارکس پر ہنستے رہے اور کہتے رہے "نہیں یار کیوں نہ جاؤں گا۔ حالانکہ وہ اس سے پہلے مجھے کہہ چکے تھے کہ نہیں جاؤں گا"۔

بالاخر ایک بات میرے ذہن میں آئی اور میں نے منٹو صاحب سے کہا "اگر میں کل صبح کے لئے دو سیٹیں بک کرا دوں۔ تو کیا آپ اور نصیر انور کراچی چلے جائیں گے"؟ منٹو صاحب نے میری اس پیشکش کو قدرے تکلیف کے ساتھ قبول کر لیا۔ بعد ازاں منٹو صاحب سے گزارش کی گئی کہ آپ گھر تشریف لے جائیں۔ میں سیٹیں بک کرانے کا بندوبست کرتا ہوں۔

چنانچہ پاکستان ٹائمز کے دفتر سے اپنے دفتر تک پیدل آیا۔ اپنی سائیکل سنبھالی، سائیکل پر سوار ہوا تو بھائی کی بیماری اور اس کی دوا پھر یاد آ گئی۔ سائیکل کے پہیے کے ساتھ ساتھ میرا دماغ بھی گھومنے لگا۔

سیٹیں بک کرانے میں بڑی دشواری ہوئی ریزرویشن آفس سے معلوم ہوا کہ چار دن تک کوئی سیٹ خالی نہیں۔ ادھر دقت یہ تھی کہ منٹو صاحب کی دوسرے دن عدالت میں حاضری تھی۔ چنانچہ شوکت تھانوی صاحب کے پاس ریڈیو اسٹیشن پہنچا۔ انہوں نے پہلے تو خوب سخت سست کہا۔ لیکن پھر یہ انتظام

کرادیا کہ اگر ہم لوگ کل صبح سات بجے اسٹیشن پر پہنچ جائیں تو سیٹوں کا انتظام ہو جائے گا۔

میں نے اس کی اطلاع منٹو صاحب کو دے دی اور ان کی بیگم اور ہمشیرہ سے بھی کہا کہ انہیں صبح تک تیار کر دیجئے گا تا کہ میری ذمہ داری ختم ہو۔

رات کو جب گھر پہنچا تو گھر والوں نے شکایت کی کہ بھائی اتنا بیمار ہے اور تمہیں دوا تک پہنچانے کی فرصت نہیں۔ مجھے بڑی ندامت ہوئی۔ لیکن میں ان سے کیا کہتا کہ مجھ پر آج کیا بیتی ہے۔ رات بھر کبھی بھائی کی بیماری کا خیال آتا رہا۔ کبھی منٹو صاحب کی کرم فرمائیوں کا۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ میں ایسے مواقع پر بجائے اختر شماری کے زخم شماری کرتا ہوں۔ چنانچہ رات بھر یہ مشغلہ جاری رہا۔ صبح 5 بجے گھر سے چل نکلا تو وہ اور پریشان ہو گئے۔ اس لئے کہ میں سردیوں میں رات کے گیارہ بجے سے پہلے سونے کا اور صبح 9 بجے سے پہلے اٹھنے کا عادی نہ تھا۔

ان کے استفسار پر میں نے صرف اتنا کہا کہ میرا ایک دوست کراچی جا رہا ہے اسے اسٹیشن تک چھوڑنے جا رہا ہوں۔ ابھی آ جاؤں گا اور بھائی کی دوا بھی لاؤں گا۔ جب بھاٹی دروازے کے باہر پہنچا تو سوچا کہ تانگے میں بیٹھ کر منٹو صاحب کے ہاں پہنچوں۔ پھر خیال آیا میں بہت سویرے جا رہا ہوں، جلدی پہنچ گیا تو منٹو صاحب کو تکلیف ہو گی۔ ادھر یہ بھی دھڑکا، اگر میں نے جلدی پہنچنے میں ذرا سی غفلت کی تو منٹو صاحب گھر سے بھاگ جائیں گے، پیدل ہی چل نکلا۔ اپنے بجائے ان کی تکلیف کا زیادہ خیال رہا۔

راستے میں کتوں نے بھی بھونک کر استقبال کیا۔ سوچتے ہوں گے کہ اس شکل وصورت کا انسان آج ادھر کیسے۔ ایک آدھ جگہ بھنگی نے بھی سڑک صاف کرتے ہوئے کہا ''ہٹ جاؤ بابو جی'' اس وقت بڑا جی چاہا کہ ذرا اس کے پاس رکوں۔ اس کی خیرت اور اس کے بال بچوں کا احوال پوچھوں۔ پھر نہ جانے ہمت کیوں نہ ہوئی اس کے باوجود جب منٹو صاحب کے مکان پر پہنچا ہوں تو کافی سویرا تھا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ ان کی بیگم نے دروازہ کھولا، منٹو صاحب کو جگایا تو منٹو صاحب آنکھیں ملتے ہوئے آئے اور السلام علیکم سے استقبال کیا۔ اس وقت ان کے گلے میں ایک بڑی سی گرم چادر لپٹی ہوئی تھی، جیسے مفلر لپیٹا جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد نصیر انور بھی آ پہنچے۔ تانگہ منگوایا گیا، ان کی ہمشیرہ، بیگم اور بچیوں نے ہمیں وداع کیا اور خیریت سے واپسی کی دعا مانگی۔

اسٹیشن پر سیٹوں کا انتظام ہو چکا تھا۔ جب سامان گاڑی میں رکھ دیا گیا تو منٹو صاحب نے شراب

کی بوتلوں کو نکال کر ایسی جگہ رکھ دیا' جہاں ہر آتے جاتے کی نظر پڑتی تھی۔ میں نے منٹو صاحب سے کہا ایسا نہ کیجئے۔ انہوں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک چھوٹی سی سبز رنگ کی کاپی نکال کر دکھائی کہ میرے پاس شراب کا پرمٹ ہے۔ یہ بات ان کے منہ ہی میں تھی کہ گاڑی چلی چھک چھک چھک۔

دوسرے دن اخبار میں آیا کہ منٹو صاحب عدالت میں حاضر ہوئے تو جان میں جان آئی۔

ایک وقت منٹو صاحب پر یہ بھی آیا کہ جب وہ ایک دم بیٹھے بٹھائے کہنے لگے "ارے بھئی سنو تاتن تاتن تاتوم تاتوم" (پتہ نہیں کیا الا بلا) جو صاحب منٹو صاحب کے پاس بیٹھے ہیں۔ وہ پریشان کہ ایک دم انہیں کیا ہو گیا۔ ادھر سے استفسار ہوگا کیا سنیں۔ منٹو صاحب کہیں گے ریڈیو' ارے بھئی کہاں سے؟ جواب ملے گا ادھر آؤ اور میرے کانوں کے ساتھ اپنے کان لگا دو۔ آ رہی ہے نا آواز واہ کیا گلا پایا ہے کمبخت نے پھر ہاتھ کے اشاروں سے سر کے اتار چڑھاؤ کا ساتھ دیں گے۔ کبھی کبھی اٹھ بیٹھیں گے اور کبھی کھڑے کھڑے بیٹھ جائیں گے۔ ساتھ ہی تبصرہ بھی۔ "ہائے ظالم نے مار ڈالا۔ یا مظالمی نے مار ڈالا۔ واہ وا، بھئی واہ وا، شاباش، ہائے۔۔۔" اگر اس وقت شرارت سے کسی نے کہہ دیا کہ منٹو جو کچھ آپ سن رہے ہیں وہ ہمیں سنائی نہیں دیتا۔ اس لئے ہمیں کاغذ پر لکھ کر بتاتے جایئے تو وہ کاغذ اور قلم سنبھالتے ہوئے یہ مشورہ بھی دیں گے کہ کانوں میں تیل ڈالا کرو اور سر کی مالش کرایا کرو۔ اور ساتھ ہی لکھنا شروع کر دیں گے۔ پہلے دو تین پنجابی گیت لکھیں گے' پھر کہیں گے کہ اب اردو کے گانے سنیئے" وہ بھی تین چار لکھ ڈالیں گے۔۔۔ یہ ریڈیو دو تین مہینے تک منٹو صاحب کے کانوں میں بجتا رہا۔ جسے صرف ان کی اکیلی جان سنتی رہی اور لوگوں کو یہ لکھ کر یا خود سنا کر سناتے رہے۔ پھر نہ جانے کیوں ان کے کان کے ریڈیو کے والوز خراب ہو گئے اور ریڈیو بجنا بند ہو گیا۔

انہی دنوں کا ذکر ہے کہ ایک دن شام کے قریب ان کے گھر گیا تو باہر سے دیکھا کہ منٹو صاحب گا رہے ہیں۔ کبھی ہاتھوں کو کانوں تک لے جا رہے ہیں اور کبھی سر کے ساتھ ساتھ ہاتھوں کو نچا رہے ہیں۔ میں باہر کھڑا کافی دیر تک یہ تماشا دیکھتا رہا۔ آخر تابہ کے' تنگ آ کر آواز دی۔ ان کا نوکر باہر آیا تو میں نے کہا "ذرا منٹو صاحب کو بلا دیجئے"۔ اس نے جا کر منٹو صاحب سے کہا کہ کوئی صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔ منٹو صاحب نے جواب دیا ان سے جا کر کہہ دو اس وقت منٹو صاحب نہیں آ سکتے' گانا

گا رہے ہیں۔

پھر خود ہی چلے آئے اور دروازہ کے قریب آ کر عینک کو ٹھیک کرتے ہوئے کہا ''کون ہے''؟ اچھا آپ ہیں۔ بھئی معاف کرنا' میں اس وقت گا رہا تھا۔ آؤ تم بھی گانا سنو۔ میں نے پوچھا اور کون کون ہے؟ کہنے لگے کوئی نہیں ہے۔ گھر ہی کے لوگ ہیں۔ آؤ' آؤ' آؤ۔

مقدموں کی بھر مار نے اب انہیں سنبھلنے پر مجبور کر دیا ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ اب ان سے افسانے نہیں سنبھلتے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس عرصے میں جو کچھ لکھا ہے وہ بحثیت مجموعی ان کی ناکام تحریریں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ افسانہ بعد میں لکھتا ہوں۔ مقدمہ پہلے چل جاتا ہے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ جی چاہتا ہے لکھنا وکھنا چھوڑ دوں اور پاکستان اور ہندوستان سے دور کہیں چلا جاؤں۔ وہاں بیٹھ کر خوب جی کھول کے افسانے لکھوں اشاعت کے لئے انہیں یہاں بھجوادوں تا کہ سارے پبلشر اندر ہو جائیں۔ اپنی تو جان چھوٹے۔ میں سفید کو سفید کہنے پر مجبور ہوں۔ حکم ہوتا ہے کہ نہیں سفید کو سیاہ کہو۔ سیاہ کو سفید کہو۔ اگر سیاہ اور سفید دونوں نظر آ رہے ہوں تو کچھ نہ کہو چپ رہو۔ پگھلا ہوا سیسہ نگل لو۔ یا خودکشی کر لو۔۔۔ پھر مجھے جو سزائیں ملتی ہیں وہ بھی انگریز بہادر کے زمانے کی۔ میں تو ایک ہی طرح کی سزائیں بھگت بھگت کے بور ہو چکا ہوں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ مملکت پاکستان میں مجھے اسلامی سزائیں ملتیں' تا کہ ورائٹی ہی کی وجہ سے دل کی ڈھارس رہتی۔ لیکن یہاں تو معاملہ وہی ہے کہ جو تھا۔ انگریز بڑی سیانی قوم ہے۔ وہ یہاں سے اپنا جسم بچا کر لے گئی ہے لیکن اپنی روح چھوڑ گئی ہے۔ بعض اوقات میرا جی چاہتا ہے کہ ایک ہپ ٹلا (یہ ان کا خاص لفظ ہے) قسم کا افسانہ لکھوں جس میں سماج اور مملکت کے تمام ناسوروں کو ایک ساتھ چھیڑ دوں۔ خوب خوب نشتر زنی کروں۔ اس کے بعد بھرپور نمک پاشی کروں۔ انجام کار اپنے آپ کو گولی مار دوں اور یہ سمجھ لوں کہ مقصد ادا ہو گیا۔

منٹو صاحب پنجابی بولنے میں بڑی آسانی محسوس کرتے ہیں۔ جب انہیں شبہ ہو جائے کہ مخاطب تو اہل زبان ہے تو ان سے استفسار کریں گے۔

اس پر منٹو صاحب کہیں گے ''معاف کیجئے گا جب میں اردو میں بولتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میرا منہ پک گیا ہے یا پک رہا ہے۔ اردو بولتے ہوئے میرے جبڑے دکھنے لگتے ہیں۔ تالو اور زبان کے نیچے جو جگہ ہے وہ مجھے چتاپ چتاپ کرتی معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے میرے بھائی معاف کرنا' میں پنجابی ہی میں بات کروں گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مجھے اردو سے کوئی بیر ہے۔ سوچتا ہوں کہ جب لکھتا اردو میں ہوں تو پنجابی میں باتیں کروں۔ اگر آپ چاہیں تو میں اردو میں بھی باتیں کر کے اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال سکتا ہوں۔

منٹو صاحب عموماً گھر میں ملتے ہیں یا تانگے میں ہوتے ہیں۔ کسی تانگے کی پچھلی سیٹ پر دور سے کوئی بیمار لیٹا ہوا نظر آئے۔ جو الٹے رخ ٹیک لگا کے لیٹا ہو' تو فوراً کوئی رائے قائم نہ کر لیجے گا۔ تانگے کے قریب آنے کا انتظار کر لیجے گا۔ بہت ممکن ہے وہ منٹو صاحب ہوں۔ اگر ان کے دو ایک ہم بوتل و ہم گلاس ساتھ ہوں تو وہ اگلی سیٹ پر بیٹھیں گے اور اپنے ان قدردانوں سے کہتے جائیں گے کہ میں ایک بہت بڑا افسانہ لکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن ڈرتا ہوں کہ مقدمہ چل جائے گا۔ اگر مقدمہ نہ چلا تو مجھے دکھ ہو گا۔ اس لئے کہ میرے ذہن میں خواہ مخواہ یہ آئے گا کہ اپنی حکومت تو فرائض منصبی سے بھی بیگانہ ہو گئی۔۔۔ یا مجھے یہ سوچنا پڑے گا کہ وہ افسانہ بڑا ہی تھرڈ کلاس ہے ورنہ حکومت ضرور ایکشن لیتی۔

منٹو صاحب میں ذاتی طور پر بڑی خوبیاں ہیں۔ لیکن شراب نے ان میں کئی کمزوریاں پیدا کر دی ہیں۔ پہلے مجھے ان پر غصہ آتا تھا' اب ترس آتا ہے۔ میں تو ان کے فن پر ان کی تمام کمزوریوں کو نثار کر سکتا ہوں۔ کسی اور کا حال خدا جانے۔ عمر کے آخری دنوں میں مرحوم یہ چاہتے تھے کہ ان کی زندگی ہی میں ان پر کوئی اچھا رسالہ نمبر چھاپ دے۔ اس سلسلے میں اوروں کے پاس بھی گئے ہوں گے۔ میرے پاس بھی آئے اور جو میری اور ان کی اس بارے میں گفتگو ہوئی تھی۔ وہ مندرجہ ذیل ہے۔

''یار منٹو نمبر نکالو''

''جی''!

''میں کہتا ہوں نقوش کا منٹو نمبر نکالو''

''آج یہ آپ کیسی باتیں۔۔۔''

''تمہارا خیال یہ ہے کہ میں نشہ میں ہوں اور بکواس کر رہا ہوں''

''آخر اتنی جلدی کیا ہے۔ چھپ جائے گا''

''میں اس کا انتظار نہیں کر سکتا کہ پہلے مر کے دکھاؤں۔ پھر نمبر چھپے''

''مرنے کا نام نہ لیجیے۔ ابھی آپ کو بڑی۔۔۔''

''اب جی کر بھی کیا کروں گا۔ اب تو میں خود مرنے پر راضی ہو گیا ہوں''

''اچھا! یہ بتائیے' اس نمبر میں کیا کیا ہوگا''؟

''اب تک مجھے جتنی گالیاں ملی ہیں' وہ سب سے پہلے چھپیں گی اور جتنے بیوقوفوں نے میری تعریف کی ہے وہ سب سے آخر میں چھپے گی۔ بیچ میں میرے تین چار غیر مطبوعہ افسانے اور اسکیچ ہوں گے۔ بہرحال تمہیں زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ نمبر تمہیں میں مرتب کر دوں گا''۔

''اگر آپ مرتب کر دیں گے تو میں کیا کروں گا''؟

''تم جھک مارنا''

''اس صورت میں تو آپ خود ہی ایک مجموعہ مرتب کر لیں اور اسے کتابی صورت میں چھاپ لیں''۔

میں چاہتا ہوں' نقوش کا منٹو نمبر نکلے''

''تو پھر آپ کا ا

رسائل سے بہتر تسلیم کیا گیا۔ اس میں مرحوم کی بیس تو غیر مطبوعہ کہانیاں تھیں دس نمائندہ افسانوں کا انتخاب بھی مرحوم کا اپنا تھا۔ فن پر لکھنے والوں میں ممتاز شیریں، وقار عظیم، محمد حسن عسکری، عابد علی عابد، ابواللیث صدیقی، عبادت بریلوی اور ممتاز حسین تھے۔

شخصیت پر لکھنے والوں میں عصمت چغتائی، اوپندر ناتھ اشک، احمد ندیم قاسمی، ہاجرہ مسرور، ابوسعید قریشی، غلام عباس اور راقم الحروف تھے۔

منٹو نمبر پر تبصرہ کرنا میرے فرائض میں شامل نہیں ہے۔ لیکن ایک بات کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں۔

جب میں نے منٹو نمبر کے لئے مضامین فراہم کرنے شروع کیے تو قدرت اللہ شہاب کو بھی دعوت دی۔ جسے انہوں نے منظور کرتے ہوئے یہ لکھا کہ مضمون جلد بھیج دوں گا اور وہ ایک خط کی صورت میں ہوگا۔ جو منٹو آپ کو عالم بالا سے لکھیں گے۔ یہ خیال مجھے بہت پسند آیا۔ اس لئے کہ اس میں منٹو کی پوری شخصیت آسکتی تھی۔ اور وہ تمام مسائل بھی آسکتے تھے جو منٹو سے متعلق ہوسکتے تھے۔

جب شہاب صاحب اپنی مصروفیات کی بنا پر وقت نہ نکال سکے، تو میں نے اسی انداز میں جو کچھ لکھا۔ اسے یہاں پیش کرتا ہوں۔ جو "منٹو کا ایک خط" کے نام سے منٹو نمبر میں چھپ چکا ہے۔ اس خط میں میں نے کوشش کی تھی کہ منٹو کا اسلوب بھی آسکے۔ کامیابی خدا معلوم!

برادرم السلام علیکم!

مجھے یہاں آئے ہوئے ساڑھے تین مہینے گزر چکے ہیں۔ لیکن میں تمہیں اپنی خیریت کا خط تک نہ لکھ سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ماحول میرے لئے نیا تھا۔ بہر حال اس ماحول سے یقیناً بہتر ہے۔ جس میں میں نے 42 برس تک جھک ماری تھی۔۔۔ وہاں جب تک رہا سولی پہ لٹکتا رہا۔

جب سے یہاں آیا ہوں، نہ صفیہ نے مجھ سے کوئی فرمائش کی ہے اور نہ ہی نکہت، نزہت اور نصرت میں سے کسی نے، ورنہ اکثر یہ ہوتا تھا۔ ابا فلاں چیز لاؤ، فلاں چیز لاؤ۔ تمہیں تو علم ہے کہ مجھے اپنی بچیوں سے بے انتہا محبت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب ان کی فرمائش اپنی تنگدستی کی بنا پر پوری نہیں کر پاتا تھا۔ تو خون کے آنسو رویا کرتا تھا۔ حتیٰ کہ بعض منحوس سال ایسے بھی آئے تھے کہ بچی کی سالگرہ تھی اور جیب

میں پھوٹی کوڑی نہیں۔

ایسے ماحول میں کب تک رہ سکتا تھا۔قدرت تو مجھے ایسے انسان کش ماحول میں اور رکھنا چاہتی تھی۔لیکن میں نے خود ایسے وسائل اختیار کر لئے تھے کہ آپ کے جہنم زار سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

میں جب تک وہاں رہا۔آپ لوگوں ہی کے غموں میں گھلتا رہا۔نہ صرف گھلتا رہا۔بلکہ آہستہ آہستہ معدوم ہی ہو رہا تھا۔

یہاں ہر وقت یہی دعا کیا کرتا ہوں کہ یہ زندگی میرے ہم عصر افسانہ نگاروں کو جلد نصیب ہو۔اس لئے کہ وہاں رہ کر میں نے جیسی ان کی زندگی بسر ہوتے دیکھی تھی۔وہ تو مجھ سے بھی بدتر تھی۔جب مجھی کو وہاں سے آنا پڑا۔تو نہ جانے وہ کیوں رکے ہوئے ہیں۔

آپ کے تمام لکھنے والوں سے تعلقات ہیں، جو لاہور میں موجود ہیں۔ان سے زبانی کہہ دیں جو لاہور سے باہر ہیں۔انہیں بذریعہ خط مطلع کر دیں کہ وہ سب کے سب بیوی بچوں سمیت میرے پاس آجائیں۔میں نے یہاں تمام ابتدائی معاملات طے کر لئے ہیں۔اس لئے کسی کو تکلیف نہ ہوگی۔

زمانے نے میری قدر کی اور نہ دوسرے اہل قلم کی۔تمہیں علم ہے اگر ہم لوگ ہی تمہارے ہاں نہ ہوتے تو سوائے علم، ادب اور آرٹ کے سب کچھ ہوتا۔

یہاں جو بھی پہنچ گیا ہے۔مزے میں ہے۔اکثر قلمکاروں سے ملاقات رہتی ہے۔سب میری ہی طرح پھولے بیٹھے ہیں۔بعض نے تو تمہارے نمائش آباد کی شان میں ایسی ایسی ہجویات سپرد قلم کی ہیں کہ جب تک کلیجہ کو دونوں ہاتھوں سے نہ تھام لیا جائے۔سنی ہی نہیں جاسکتیں۔اگر وہ چھپ گئیں، تو تمہارے ہاں کے بعض سر پھرے سر بازار پیٹیں گے۔

بہرحال ہجویات کا وہ مجموعہ جب بھی شائع ہوا تمہیں اس کا ایک نسخہ ضرور بھیجوں گا نقوش میں اس پر تبصرہ کر دینا۔

تمہارے ہاں کے ادیب اور تمہارے پڑوسی ملک کے ادیب اپنے اپنے ناخداؤں سے جو بڑی خوشگوار قسم کی امیدیں وابستہ کیے بیٹھے ہیں۔وہ سراسر حماقت ہے۔ان خوشگوار قسم کی امیدوں کے پیٹ میں تو صرف بہن خوش فہمی لمبی تانے سو رہی ہے۔

تمہارے ہاں کی سیاست تو بڑی دھڑن تختہ قسم کی ہے۔ آج کوئی وزیر ہے تو کل جیل میں ہے۔ اگر کوئی چند دن پہلے جیل میں تھا اور ساتھ ہی غدار وطن بھی، تو آناً فاناً وزیر ہو جاتا ہے۔ یہاں پر میرے احباب جب تمہارے ہاں کی سیاست کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں تو یقین جاننا' میں مارے شرم کے پانی پانی ہو جاتا ہوں۔

تمہیں علم ہے کہ مجھ پر آپ کے ہاں پانچ مقدمے صرف فحاشی کے جرم میں چلے تھے۔ حالانکہ میں نے کوئی فحش تحریر نہیں لکھی تھی۔ اس ضمن میں مجھ پر کیا کیا ستم نہیں ڈھائے گئے تھے۔ کبھی وارنٹ نکلے، کبھی گرفتار ہوا، کبھی دوستوں سے اُدھار مانگ کر جرمانہ ادا کیا۔ اس کے باوجود میں نے انصاف زندہ باد کا نعرہ لگایا تھا۔ اگر میں کچھ دن اور وہاں رہ جاتا تو بہت ممکن تھا مجھ پر قتل، ڈاکہ زنی اور زنا بالجبر کے جھوٹے مقدمے بنا دیئے جاتے۔ جہاں ناکردہ گناہوں کی سزا ملتی ہو، وہاں کون مسخرہ رہے۔

اگر حکومت کے عتاب سے بچ جائیں تو نقاد پیچھا نہیں چھوڑتے۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ میں ساری عمر نقادوں سے دور بھاگا ہوں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ بعض نقاد بھی مجھ سے دور بھاگتے ہیں۔ اصل میں یہ لوگ وہ ہیں جو بگڑے ہوئے افسانہ نویس اور بگڑے ہوئے شاعر ہوتے ہیں۔ یہ لوگ جب تخلیق کی قوت سے محروم ہو جاتے ہیں تو تنقید میں علامہ بن جاتے ہیں۔ مجھے ان سب سے خدا واسطے کا بیر رہا ہے۔ اس لئے کہ جب یہ قلم ہاتھ میں لے کر بیٹھتے ہیں تو اچھی بھلی چیز میں سو سو عیب نکالتے ہیں۔ لیکن ان حضرات کو اپنی تحریر کے عیوب کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ خدا کے لئے مجھے ان بے تحاشا لکھے پڑھوں سے بچانا۔ ایسا نہ ہو کہ میرے موجود نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنے اپنے قلم تیز کر لیں اور میرے فن کی دوشیزگی کا جھٹکا کر دیں۔

آج ادب جبھی ترقی کرے گا کہ جو نقاد کہے، اس کا الٹا کیا جائے۔ نقادوں کا منشا بھی یہی ہوتا ہے لیکن اسے میرے سوا سمجھا کوئی نہیں ہے۔

کاش مجھے یہاں کوئی نقاد مل جائے تاکہ میں اس سے تنقیدی بحث کر سکوں۔ تنقیدی بحث کرتے ہوئے اگر کسی نے ان تین لفظوں کا صحیح استعمال کر لیا تو سمجھ لیجئے بازی لے گیا۔ وہ تین الفاظ یہ ہیں اگر، مگر اور لیکن۔

جب تک نقاد تخلیق کی قوت ... [illegible]

اس پر ایمان لانا پڑے گا۔

یہاں شراب طہور عام ہے۔ پانی نہ پیجئے شراب طہور نوش کر لیجئے۔ تمہارے ہاں تو بڑی تھرڈ کلاس قسم کی شراب ملتی تھی اور اس جگر پاش شراب کے لئے بھی مجھے کیا کیا جتن نہیں کرنے پڑتے تھے۔ بعض اوقات اس نامراد کے لئے ذلیل تک ہوا۔ دوستوں میں میری عزت نہ رہی۔ جدھر جاتا تھا، احباب منہ موڑ لیتے تھے۔ راستہ تک چھوڑ کر انجام بن جاتے تھے۔ اگر کسی سے مڈبھیڑ ہو جاتی تو وہ میرے منہ پر جھوٹی قسمیں کھا کھا کر کہتا تھا کہ میری جیب میں دھیلہ تک نہیں ہے۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ اس کی جیب میں دھیلہ چھوڑا اتنے روپے ہیں کہ وہ مجھے اس خانہ خراب کی کئی بوتلیں خرید کر دے سکتا ہے۔ میں شراب کو خانہ خراب اس لئے کہتا ہوں کہ اس کی بنا پر کئی بار خانہ میں خرابی پیدا ہوئی تھی۔

ایک بڑی خطرناک مگر راز کی بات کہتا ہوں اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔ ورنہ پٹو گے۔ یہاں جتنی لڑکیاں ہیں وہ سب ہزاروں برس پرانی ہیں۔ لیکن ان کمبختوں کا جسم اور بانکپن تقدس توڑ ہے۔ اس مسئلہ پر تم سے بات کرنا قطعی حماقت ہے۔ اس لئے کہ تم اس مسئلے میں نرے چغد واقع ہوئے ہو۔ تمہاری چغدیت کا احترام کرنے کے باوجود میں یہ کہوں گا کہ ان سب میں ایسی پروقار کشش اور سپردگی سی پائی جاتی ہے کہ تمہارے ہاں کی لڑکیاں ان کے سامنے بالکل بکواس ہیں۔

یہاں ایسے ایسے جمال آور لڑکے بھی ہیں کہ تمہارے ہاں کا کوئی شاعر اور ادیب دیکھ لے تو اس کم بخت کے بے ہوش ہونے کے قطعی امکانات موجود ہیں۔ بہت ممکن ہے جانبر ہی نہ ہو سکے۔

میں ساری عمر ادبی تخلیقات کے سلسلے میں اپنے ہم عصروں سے شرمندہ نہیں ہوا تھا۔ اس لئے بھی کہ میرے مقابلے ہی کا کون تھا۔ لیکن یہاں آیا تو غالب نے بڑا پریشان کیا۔ بڑا پھبتی باز ہے'' کہنے لگا''۔ تو تو میرا چور ہے۔ میرے شعروں سے تو نے اپنے افسانوں کے عنوان چنے۔ کتابوں کے نام تک جب نہ سوجھے تو میرے شعروں کو دھر رگڑا اور حسن کشی ایسی کہ میرے بارے میں جو فلمی کہانی لکھی، اس میں بجائے میری شکر گزاری کے اظہار کے میری کسی خوبی کا ذکر تک نہیں کیا۔ بلکہ الٹی میری کمزوریاں گنوا کے رکھ دیں کہ میں بڑا وہ تھا، رنڈی باز تھا، جوا کھیلتا تھا اور اس کی پاداش میں جیل تک ہو گئی تھی۔ وغیرہ وغیرہ۔

تمہیں علم ہے کہ میں تمام لکھنے والوں میں صرف غالب ہی کو تو مانتا تھا۔ جب اس نے بھی مجھ سے ایسی ایسی باتیں کیں تو میں نے دل میں کہا۔ لعنت ہو سعادت حسن منٹو تمہاری حقیقت نگاری پر۔

لیکن غالب ہے بڑا زندہ دل قسم کا انسان، میری اتنی زیادتی کے باوجود گاڑھی چھنتی ہے۔ ہم اکثر ایک ساتھ پیتے ہیں اور پیتے ہی میں جب ہم حقیقت آشنا ہو جاتے ہیں اور ہماری انا بیدار ہوتی ہے تو غالب کہتا ہے میں تم سے بڑا افسانہ نگار ہو سکتا تھا۔ لیکن میں نے اسے فضول چیز سمجھ کر ہاتھ ہی نہیں لگایا تھا۔ اور میں اس سے کہتا ہوں شعر کہنا کون سا کمال ہے مرزا صاحب میری تو نثر کی ہر ہر سطر میں ایک شعر کیا پوری غزل کی غزل پنہاں ہوتی ہے۔۔۔ بات دونوں کی غلط ہے۔ اس کا علم اسے بھی ہے اور مجھے بھی۔ لیکن ہم اپنی اپنی انا کا کیا کریں۔

چچا سام کا دبدبہ تو تمہارے ہاں دن دوگنی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔ مبارک ہو!

بڑوں کی عزت ضرور کرنی چاہیے۔ لیکن سعادت مندی کے معنیٰ یہ بالکل نہیں کہ تم اپنی ننھی سی جان بھی خطرے میں ڈال دو۔ میں نے یہ خبر بد بھی سنی ہے کہ اب تو تمہارے ہاں کا سارا کام وہی کرتے ہیں اور تم سب الوؤں کی طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھے اندھیرے کے منتظر ہو۔ اتنی تن آسانی اچھی نہیں ورنہ پچھتاؤ گے۔ حتیٰ کہ تم لوگوں نے اپنی خودداری تک کو قفل لگا کے الماریوں میں رکھ دیا ہے۔

مصیبت یہ ہے کہ میں یہاں سے چچا سام کے نام کوئی خط نہیں لکھ سکتا۔ ورنہ میں ان سے اپنی حدود میں رہنے کی درخواست ضرور کرتا۔ دعا کرو کہ وہ خود ہی میرے پاس جلد سے جلد آ جائیں تاکہ تمہاری جان چھوٹے۔ میں ان سے نمٹ ہی لوں گا فراڈ کو فراڈ ہی پچھاڑ سکتا ہے۔

میں نے یہ بھی سنا ہے کہ جب سے یہاں آیا ہوں تمہارے ہاں میرا بڑا سوگ منایا گیا۔ خدا کی قسم یہ

کے خیال کے مطابق [illegible] یہاں کوئی نہیں ہے۔ [illegible]
کچھ لکھ دیا ہے۔ بڑی ہپ ٹلار پورٹ ہے۔ اس میں اپنے ایک دوست کی خوب ڈٹ کر مخالفت بھی کی ہے۔ اور اس کا جو معاشقہ اندر ہی اندر چل رہا تھا۔ اس کا بھی کچا چھٹا لکھ دیا ہے۔

حتیٰ کہ میں نے رپورٹ میں یہ بھی لکھ دیا ہے کہ یہاں جو داڑھی نہ منڈوانے کا دستور ہے، وہ بعض نستعلیق قسم کی طبیعتوں پر گراں گزرتا ہے۔ اس لئے اس کی اجازت ہونی چاہیے کہ جس کا دل چاہے داڑھی رکھے جس کا دل چاہے نہ رکھے۔

اتنے بڑے حاکم کے سامنے اتنا کہہ دینا اور کسی قسم کی جھجک محسوس نہ کرنا، خالہ جی کا گھر نہ تھا۔ تمہارے ہاں ایسی کوئی کھری بات ذرا سے وزیر اعظم کے سامنے کہہ دیتا میری زبان گدی سے نکلوا دی جاتی۔

اطلاعاً عرض ہے۔ یہاں میری کتاب ''گنجے فرشتے'' کافی پسند کی گئی ہے۔ ہو سکے تو میری بیوی بچوں کا خیال رکھنا۔

خاکسار

سعادت حسن منٹو

20اپریل1995ء

☆☆☆

مہدی علی صدیقی

منٹو اور میں

سن 53' کا ابتدائی زمانہ۔ میں اپنے کام میں مصروف تھا۔ اجلاس اہلِ معاملہ سے بھرا ہوا تھا۔ اتنے میں میرے پیش کار نے مجھ سے کہا ''ان صاحب کو اپنے کیس کی جلدی ہے۔''

میں نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ ایک میانہ قد خوش شکل آدمی' قدرے بیمار' مگر زیادہ پریشان' شیروانی کے اوپر کے بٹن کھلے، گلے میں گلو بند لپٹا' کسی قدر پھنسی ہوئی اور رکتی آواز میں مجھ سے مخاطب تھا۔

''میں سعادت حسن منٹو ہوں' لاہور سے آیا ہوں' بہت بیمار ہوں' مجھے اقبال جرم ہے' جلد فیصلہ کر دیجئے۔''

ایک اور صاحب منٹو کے پیچھے کھڑے تھے' بالکل اسی طرح جیسے منٹو کو حراست میں لئے ہوں۔ یہ ان کے ضامن تھے یا ضامن کے ایستادہ' تاکہ منٹو کو' اپنے سامنے مقدمہ سے فارغ کرا دیں۔

میں نے کہا'' آپ لوگ تشریف تو رکھئے۔''

منٹو نے کہا۔ جی؟''

میں نے پھر کہا'' آپ تشریف رکھئے۔''

منٹو بادل ناخواستہ پیش کار کے پیچھے بینچ پر بیٹھ گئے۔ میں نے ان کے مقدمے کی مثل اٹھائی اور مطالعہ میں مصروف ہو گیا۔ منٹو پر الزام تھا'' نیچے' اوپر' اور درمیان'' لکھنے اور شائع کرنے کا۔ مجھے ان کے مقدمے کا علم کچھ عرصے سے تھا۔ میں نے اس کے لئے اپنے آپ کو تیار کیا تھا۔

میں نے ادبی مشاغل کبھی ترک نہیں کئے۔ مگر افسانوی ادب خصوصاً اردو افسانوی ادب کے متعلق میرا علم حاضر نہ تھا۔ اس لئے میں نے دو چار ماہ افسانے ہی افسانے پڑھے۔ منٹو کے مضامین کے جتنے مجموعے مل سکے ان کا بغور مطالعہ کیا۔ البتہ اس خاص افسانے اور تنقیدوں کے پڑھنے سے احتراز کیا۔ یہ اس لئے کہ میں پہلے سے کوئی رائے قائم نہ کرلوں۔ اب آپ اندازہ کیجئے کہ جب منٹو نے اقبالِ جرم کی

آڑلی، تو مجھ پر کیا گزری ہوگی؟

اس درمیان میں میں نے منٹو کو کنکھیوں سے دیکھنے کی کوشش کی، مگر وہ بینچ سے غائب تھے اور بے تابی سے اجلاس کے باہر برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ وہ پھر اندر آئے اور کہنے لگے۔

''اب میرا کیس ختم کیجئے۔''

میں نے کہا ''بہت اچھا، آپ تشریف تو رکھئے۔''

یہ کہہ کر میں نے مقدمات سرسری کے رجسٹر کی خانہ پری شروع کر دی۔ منٹو بینچ پر بیٹھے تھے مگر برابر پہلو بدل رہے تھے۔ اندراج ختم کر کے میں نے حسب ضابطہ ان کا اقبال جرم قلمبند کر لیا۔ سب کا خیال تھا کہ میں فوراً بھاری سا جرمانہ عائد کر دوں گا مگر منٹو کو خصوصاً بڑی ناامیدی ہوئی جب میں نے کہا:

''منٹو صاحب میں تجویز کل سناؤں گا۔''

وہ مصر ہوئے کہ حکم فوراً دیا جائے۔ ان کے خیال میں ان کے اقبال اور مجسٹریٹوں کے وجود کا مقصد ہی فوت ہوا جا رہا تھا اور میں چاہتا تھا کہ افسانہ پڑھ لوں اس پر غور کر لوں۔ یہ جانچ لوں کہ وہ قانون کی تعریف کے لحاظ سے واقعی فحش ہے یا نہیں۔ یقین کیجئے کہ ۔۔۔۔ انصاف میں خلوص فکر و عمل کو بڑا دخل ہے۔ خودرائی اور لفظی ضابطہ پرستی انصاف کے منافی ہیں۔ یہ محض رنگ زمانہ ہے کہ جو ہر عرض قربان کر دیا جاتا ہے۔

قصہ مختصر منٹو کو قہر درویش بر جان درویش، دوسرے دن تک انتظار پر آمادگی ظاہر کرنا پڑی۔

دوسرے دن اجلاس پر بیٹھ کر میں نے مختصر سی تجویز لکھی۔ منٹو معہ اپنے ساتھی کے اسی طرح عالم بے تابی میں حکم سننے آئے تھے۔ میں نے پوچھا:۔

''منٹو صاحب، آپ کی مالی حالت کیسی ہے؟''

کہنے لگے۔ بہت خراب۔''

میں نے پوچھا۔ آج تاریخ کیا ہے؟''

کسی نے کہا ''پچیس''

میں نے کہا ''منٹو صاحب آپ کو پچیس روپیہ جرمانہ۔''

پہلے وہ سمجھے نہیں اپنے دوست سے کہنے لگے۔'' یہ تاریخ پوچھتے ہیں یا فیصلہ سناتے ہیں؟''

مگر ضامن صاحب زیادہ مستعد تھے وہ فوراً جرمانہ ادا کرنے چلے گئے اور منٹو پھر برآمدے میں ٹہلنے لگے۔ کچھ دیر بعد مجھے منٹو اور اس کے ساتھی پھر کمرے میں نظر آئے۔ میں نے کہا:

''ارشاد۔۔۔۔؟''

ان کے ساتھی نے فرمایا ''ہم لوگ آپ کو تکلیف دینے آئے ہیں۔''

میں نے بلا کسی تکلف کے دعوت قبول کر لی۔ اجلاس پر بیٹھ کر کسی رسمی رد و قدح کا موقعہ نہیں رہتا اور پھر میں خود منٹو سے بے تکلفانہ ملاقات کا خواہش مند تھا کیونکہ میری دانست میں پریم چند کے بعد منٹو اردو ادب کا سب سے بڑا افسانہ نگار تھے۔

میں شام کو سیدھا دفتر سے زیلن کافی ہاؤس پہنچ گیا۔ کافی ہاؤس کھچا کھچ بھرا تھا۔ میں سیڑھیوں کے قریب منتظر تھا کہ منٹو اور اس کے ساتھی آ گئے۔ منٹو سرخوش تھے مگر بالکل ہوش میں۔ بات کرتے کرتے البتہ رک جاتے مگر تسلسل کلام نہ ٹوٹتا۔ کبھی مجھ سے مخاطب ہوتے کبھی بیچ میں اپنے ساتھیوں سے میرے اوپر تنقیدی جملے کہتے جاتے۔ مگر ہر لفظ خلوص میں ڈوبا، تصنع سے پاک تھا۔ دماغ اور خیالات میں کوئی محفوظات، یا مغالطے پوشیدہ نہ تھے۔ گفتگو میں نہ مرعوب کرنے کی خواہش تھی نہ مرعوب ہونے کی۔ اچھے کو اچھا اور بُرے کو بُرا کہنے میں کوئی باک نہیں تھا۔ انہوں نے اچھے اور بُرے کا جو معیار قائم کر رکھا تھا وہ رسوم و قیود سے آزاد تھا مگر تھا ایک مستقل معیار جو زمانے کے ساتھ بدلنے والا نہ تھا۔

غرض، اس وقت مجھے اپنی عمر میں پہلی مرتبہ ایک حقیقت پرست، بے ریا اور بے باک، بلند پایہ آرٹسٹ کا ایسا نقشہ نظر آیا جو آج تک دل اور دماغ میں محفوظ اور زندہ ہے اور زندگی بھر رہے گا۔ گفتگو طویل تھی مگر دلچسپ۔

کہنے لگے ''آپ شراب نہیں پیتے؟''

میں نے کہا ''جی نہیں۔''

''ملّا ہیں، بالکل؟''

''جی نہیں۔ مسلمان۔''

ہنسنے لگے۔ ان کے ساتھی نے میرے لئے کافی منگوائی۔ مجھے معلوم ہوا کہ یہ لوگ کسی ''بار'' سے دلچسپ صحبت چھوڑ کر محض میری خاطر آئے ہیں۔ میں نے معذرت کی کہ دراصل میزبانی تو مجھے کرنی

چاہیے تھی کہ میں مقامی آدمی ہوں۔

منٹو نے کہا ”جی نہیں، آپ تو مہاجر معلوم ہوتے ہیں۔“

میں نے کہا ”پھر بھی ہوں تو میں کراچی میں۔“

پھر مجھ سے پوچھنے لگے ”آپ نے ہمیں اجلاس پر بیٹھنے کے لئے کیوں کہا۔ مجھ سے تو کسی مجسٹریٹ نے ایسا برتاؤ نہیں کیا۔“

میں نے جواب دیا۔ میں بد اخلاقی کو عدالتی آداب کا جزو نہیں سمجھتا۔“

اس پر فوراً ہنسے اور اپنے ساتھی سے کہنے لگے ”آدمی شریف معلوم ہوتا ہے۔“

کچھ دیر بعد کہنے لگے ”میں نے آپ کی تجویز نہیں پڑھی۔ کیا لکھا ہے آپ نے؟“

میں نے ان کے ہاتھ میں نقل دے دی۔ غور سے پڑھتے رہے اور ختم کرنے کے بعد اپنے ساتھیوں سے اس طرح مخاطب ہوئے، گویا میں موجود نہیں ہوں۔ ”پڑھا لکھا آدمی ہے۔ بہت پڑھا لکھا ہے۔ اچھا جی، آپ نے کہاں تک تعلیم پائی ہے؟“

میں نے اپنی تعلیمی اسناد سنائے۔

پھر ہنسے اور کہنے لگے ”دیکھا نا میں نے کہا تھا کہ بہت پڑھا لکھا ہے اور انگریزی اچھی لکھتا ہے۔ بہت اچھی۔“

”کیوں جی“ آپ نے مجھے سزا کیوں دی؟“

مجھے اس وقت احساس ہوا کہ یہ شخص پکا آرٹسٹ ہے۔ منٹو کو احساس نہ تھا کہ انہوں نے کوئی فحش چیز

اس وقت گو میں نے کوئی صاف جواب دینا مناسب خیال نہیں کیا۔ لیکن حقیقت اور اظہار حقیقت میں کچھ نہ کچھ فرق ہوتا ہی ہے اور رکھا ہی جاتا ہے ورنہ ستر پوشی کا کیا جواز ہے؟ وظائف جنسی کی ادائی کے لئے انسان خلوت کیوں ڈھونڈتے ہیں؟ رمزیت اور فن کارانہ متانت کو ادبی محاسن میں کیوں شمار کیا جاتا ہے؟ ادیب فوٹو گرافر نہیں، پینٹر ہوتا ہے اور فوٹو گرافر بھی اعضاء اور افعال جنسی کی تصویریں نہیں لیتے پھرتے۔ میں نے پھر ٹال کا جواب دیا۔ ''یہ میں آپ کو پھر کبھی بتلاؤں گا کہ میں نے کیوں سزا دی؟''

منٹو نے کہا ''آپ وعدہ کر لیجئے۔''

میں نے کہا ''وعدہ'' ہے۔''

میں منٹو کی زندگی میں یہ وعدہ پورا نہ کر سکا۔ مگر آج کر رہا ہوں۔ ''قانون یہ نہیں چاہتا کہ ادب اپنے تقاضوں کو یا مقاصد کو پورا نہ کرے۔ قانون یہی چاہتا ہے کہ ان مقاصد کو انسان کے لئے مفید ہونا چاہئے۔ اگر مقصد مفید نہ ہو یعنی خالی شہوانی خدمات کو برانگیختہ کرنا مقصود ہو یا شہوانی جذبات کو برانگیختہ کرنا مقصود تو نہ ہو مگر موضوع یا الفاظ ایسے ہوں جن سے کمزور، مریض یا ناپختہ ذہن شہوانی لذت کشی میں مبتلا ہو جائیں تو قانون اس عبارت کو غیر مفید اور فحش قرار دیتا ہے۔'' ''نیچے، اوپر اور درمیان'' میں فعل جنسی کے مبادیات اور پس منظر کا تذکرہ ہے۔ سوسائٹی کے تین طبقوں میں یہ امور کتنے مختلف ہوتے ہیں، ان کی تفصیل ہے۔ قانون کی رائے میں یہ موضوع کچھ مفید نہیں۔ خواہ یہ واقعات صحیح ہوں۔ قانون یہ بھی سمجھتا ہے کہ عام ذہن، سماجی طبقات کے اختلافات کی عکس کشی کا حسن دیکھنے کی جگہ جنسی تلذذ میں مبتلا ہو جائیں گے، قانون کا یہ اندیشہ اور یہ رائے کچھ ایسی غلط تو نہیں۔ ممکن ہے بلکہ یقین ہے کہ ادیبوں کو میری اس رائے سے شدید اختلاف ہوں گے لیکن میں فحش کے قانونی معیار کو اس سے زیادہ صراحت سے واضح نہیں کر سکتا اور نہ اس معیار کی صحت کا کوئی بہتر جواز پیش کر سکتا ہوں۔ حقیقت یہ تھی کہ میں ادبی نقطہ نظر سے بھی افسانے کو فحش سمجھتا تھا لیکن اس وقت اس تفصیل میں جانے کا محل نہ تھا۔

ڈیڑھ دو گھنٹے کافی ہاؤس میں صحبت گرم رہی۔

پرست تھے اور قدر دان دوست تھے۔ ان کے خط اسی سلسلے کے ہوتے۔ ان کا آخری خط میرے نام 17 جنوری 55ء یعنی انتقال سے ایک دن پہلے کا خط لکھا ہوا ہے۔ یہ مجھے ان کے انتقال کے بعد ملا۔ مدیر افکار کے اصرار پر کہ وہ اس کا عکس شائع کریں گے میں انہیں یہ خط دے رہا ہوں۔

لیکن منٹو کے اور میرے مختصر مگر پر خلوص تعلقات کی عزیز ترین نشانی ایک اور ہی چیز ہے۔ ''نیچے اوپر اور درمیان'' کے مقدمے کا قصہ انہوں نے ''پانچواں مقدمہ'' کے عنوان سے نقوش میں لکھنا شروع کیا۔ اس کی صرف پہلی قسط چھپی تھی جس میں عدالت میں پہنچنے تک کا واقعہ آیا ہے۔ معلوم نہیں یہ مضمون وہ مکمل کر سکے یا نہیں۔ اس کے دوسرے حصہ میں وہ یقیناً میری ذات سے متعلق اپنے خیالات ظاہر کرتے۔ میں نے پہلی قسط پڑھی تھی اور مجھے دوسری قسط کا انتظار تھا۔ اس انتظار کی مدت بڑھتی گئی۔

سن 54ء کے آخری زمانے میں مجھے معلوم ہوا کہ منٹو نے ایک تازہ مجموعۂ مضامین شائع کیا ہے جس کا نام ہے ''نیچے اوپر اور درمیان'' مجھے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی جب لوگوں نے بتلایا کہ منٹو نے یہ مجموعہ میرے نام سے معنون کر دیا ہے۔ ان کی پر خلوص محبت اور بے تکلف اعتبار کا اس سے بہتر ثبوت ملنا مشکل ہے۔ میں ایک غیر معروف سا آدمی خوش ہوں کہ شاید یونہی میرا نام ''نوادرادبی'' کے روپ میں کچھ دنوں ادبی دنیا میں رہ جائے۔

کچھ دن ہوئے منٹو کے پس ماندگان کی امداد کے سلسلے میں ایک جلسہ ہوا تھا۔ یہ یقیناً بڑا مستحسن اقدام ہے لیکن میرا خیال ہے کہ اردو ادب کی جو خدمت منٹو نے کی ہے اس کا اعتراف مستقل یادگاروں کی شکل میں بھی ہونا چاہئے۔ بلدیہ لاہور مرحوم کے مکان پر کتبہ لگوا سکتی ہے جن ناشرین اور فلمی اداروں نے منٹو کی تصنیفات سے فائدہ اٹھایا ہے انہیں چاہئے کہ اردو کی بہترین افسانوی تصنیف کے لئے ایک سالانہ انعام دینے کی غرض سے سرمایہ فراہم کریں۔ اس انعام کو ''منٹو پرائز'' کا نام دیا جائے۔ اور ایک نمائندہ کمیٹی اسے سال بھر کی بہترین افسانوی تصنیف کے صلے میں عطا کیا کرے۔ اس قسم کے کئی انعام مغربی ممالک میں دیئے جاتے ہیں، اور انہیں قواعد کو یہاں بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اگر منٹو کے احباب اور پسند کرنے والے اس تجویز کو مناسب سمجھیں اور اس کو روبہ عمل لانا چاہیں تو اس سلسلے میں میری خدمات حاضر ہیں۔

شاید اسی طرح میں منٹو کے احسان کا بدل ادا کر سکوں۔ ☆☆☆

میرزا ادیب

ایک زندگی، ایک طوفان: منٹو

یہ واقعہ اس زمانے کا ہے جس پر اب وقت کے گرد و غبار کی بے شمار کثیف تہیں جم چکی ہیں۔

اختر شیرانی مرحوم کا مکان کئی اہل قلم کے لئے اہم مقام بن گیا تھا۔ ان کے شاگرد وہاں عقیدت مندانہ جذبات لے کر جاتے تھے۔ احباب ملاقات کے لئے پہنچتے تھے اور بعض لوگ ان کی رومانی نظمیں پڑھ کر اس درجہ متاثر ہو جاتے تھے کہ انہیں بس ایک نظر دیکھنے کے لئے ہی کھنچے چلے جاتے تھے۔ ایک دن میں وہاں پہنچا تو اختر صاحب کے پاس دو شخصوں کو دیکھا۔ ایک تو وہ صاحب تھے جو ان کے ہم وطن تھے اور جنھوں نے بعد میں اختر صاحب کو اس زندۂ جاوید نظم کی تحریک دلائی تھی۔ جس کا پہلا مصرعہ ہے......

او دیس سے آنے والے بتا

کس حال میں ہیں یارانِ وطن

صاحب اختر صاحب کے ساتھ ان کی چارپائی پر ہی بیٹھے تھے۔ پاس کرسی پر ایک نوجوان۔ ان

صاف معلوم ہوتا تھا، یہ بحث محض بحث کے لئے ہے۔ اختر صاحب نوجوان کر چڑا رہے تھے اور وہ نوجوان کسی صورت بھی اپنی ہار ماننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ کچھ دیر کے بعد فیصلہ یہ ہوا کہ وہ نوجوان اختر صاحب کی ایک شاندار دعوت کرے گا جس میں چائے کے ساتھ باقر خانی ہوگی۔ اس پر اختر صاحب نے طرح دی۔

''ہاں دیکھو باقر خانی کے ساتھ قلچے بھی ہوں۔''

''نہیں صاحب، قلچے نہیں ہوں گے۔ بات یہ ہے کہ قلچے کو چائے میں ڈالا جاتا ہے۔' نوجوان نے فی البدیہہ کہا۔

اختر صاحب نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا اور ابھی فضا میں قہقہے کا ارتعاش باقی ہی تھا کہ نعرہ مارا۔

''کالے......!''

اور چند لمحوں کے بعد کالے صاحب ایک پلیٹ میں پان کے دو ننھے ٹکڑے لے کر آ گئے اور یوں بحث ختم ہوگئی۔

اختر صاحب نے میری طرف توجہ نہیں کی تھی۔ اب جو دیکھا مجھے تو کہنے لگے۔''مرزا ان سے ملو، مسٹر ۷۸۶۔''

''کیا جی!''

''ان کا اصلی نام ہے ۷۸۶ اور لقب ہے سعادت حسن منٹو!''

اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنا لمبا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔

''تو وہ افسانہ......''اس نے ہاتھ میری طرف بڑھایا اور بات اختر صاحب سے کی۔

''بھئی ترجمہ دو، کسی روسی افسانے کا۔''

'''تو کیا اوریجنل افسانہ لکھنا چھوڑ دوں؟''

''مجھے ترجمہ دو۔''

''وہ بہت اچھا افسانہ ہے۔''

''ہوگا!''

اختر صاحب پھر بحث کرنے کے موڈ میں تھے اور وہ پھر شکست تسلیم کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

پندرہ بیس منٹ بعد وہ چلا گیا۔ فضا میں اس کے جاتے ہی سناٹا چھا گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ سارا ہنگامہ لپیٹ کر اپنے ہمراہ لے گیا ہے۔ اختر صاحب اپنے لمبے سے رجسٹر پر جھک پڑے۔ وہ اپنی نظمیں ایک لمبے سے رجسٹر پر لکھا کرتے تھے۔ جس کی جلد ٹوٹ چکی تھی۔ ٹونک سے آنے والے صاحب خاموش طبع بزرگ تھے اور میں تو ہوں ہی کم گو۔ پھر بھی مجھے اس خاموشی سے الجھن ہونے لگی۔

اختر صاحب سے پوچھا

''یہ صاحب کون ہیں؟''

''مسکرا کر بولے۔ ''مسٹر ۷۸۶ اور کون!''

میں نے استفسار کیا۔ ''وہ کیسے؟''

وہ خاموش رہے۔ پھر بولے۔ ''وہ کیسے یہ ایک بھید ہے اور بھید کبھی کھولا نہیں کرتے!''

دوسرے دن میں ''ادبِ لطیف'' کے دفتر میں خلاف معمول دیر سے پہنچا۔ میز پر پن لگے رائٹنگ پیڈ کے بڑے خوبصورت نیلے کاغذ پڑے تھے۔ فوراً اٹھا لیے۔ بڑی خوبصورت تحریر تھی۔ پہلے کاغذ کی پیشانی پر درج تھا ۷۸۶۔ اس کے نیچے ''بمبئی کا خدا'' اور بائیں کونے میں سعادت حسن منٹو!''

میں نے افسانہ پڑھا۔ بہت دلچسپ لیکن اختتامی حصہ ناقابلِ فہم۔ دوبارہ پڑھا۔ پھر بھی یہی حالت رہی۔ اس بات کا اندازہ ضرور ہوتا تھا کہ اب تک اردو میں جتنے بھی افسانے پڑھے ہیں ان سے یہ افسانہ کافی حد تک مختلف ہے۔ لیکن افسانہ نگار آخر میں کہنا کیا چاہتا ہے۔ یہ چیز پلے نہ پڑی۔

اسی شام بڑے ڈاک خانے کے سامنے جا رہا تھا کہ ابوسعید قریشی نظر آئے۔ ان کے ساتھ وہی نوجوان تھا۔ میں قریشی صاحب کی طرف بڑھا تو وہ فوراً بول اٹھا۔ ''افسانہ پڑھا...... پسند آیا!''

میں ذرا ہچکچایا تو کہنے لگا۔ ''کوئی اور افسانہ دے دوں گا۔ کب چاہیے آپ کو؟''

میرا تلخ تجربہ یہ تھا کہ جب کسی شخص کی تخلیق رد کی جاتی ہے یا اسے ٹالنے کی کوشش کی جاتی ہے تو وہ استفسارات کا ایک لامحدود سلسلہ شروع کر دیتا ہے۔...... اس میں خرابی کیا ہے؟...... معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے اسے بے حد پسند کیا تھا وغیرہ وغیرہ...... مگر سعادت حسن منٹو دوسروں سے بہت مختلف تھا۔

اس کے بعد اس سے ملاقات موہنی روڈ پر، راعین بلڈنگ کے سامنے ہوئی۔ میں وہاں کسی صاحب سے ملنے گیا تھا اور منٹو راعین بلڈنگ کی ایک عقبی عمارت کے ایک حصہ میں رہتا تھا۔ اس کے

ہاتھ میں ایک بڑا سا لفافہ تھا۔ سیاہ رنگ کا۔

''کیا حال ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بیمار ہوں، سینے میں تکلیف ہے۔ ٹی۔ بی کا خدشہ ہے۔ یہ ایکسرے ہیں۔ افسانہ کے پیسے دلوایئے۔ پرسوں مل جائے گا افسانہ۔ علاج کے لئے پیسے چاہیں۔ اس نے ایک ہی سانس میں اتنی ساری باتیں کہہ دیں۔

اس وقت اس کا چہرہ زرد دکھائی دیتا تھا۔ اس کے ساتھ عباس صاحب تھے۔ یہ وہی عباس ہیں جو باری علیگ، خلش کاشمیری اور ابوسعید قریشی کی طرح منٹو کے بہت ہی قریبی دوست تھے اور ایک زمانے میں اردو کے منفرد افسانہ نگار کی حیثیت سے ابھرے تھے۔ بعد میں خبر نہیں افسانہ نگاری نے عباس کو چھوڑ دیا یا عباس نے افسانہ سے قطع تعلق کر لیا۔ آج تک دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکے۔ تو بات کر رہا تھا منٹو سے ملاقات کی۔ اس کمزور اور مضمحل منٹو کی جس کے ساتھ عباس صاحب تھے اور جس کے ہاتھ میں چھاتی کے ایکسرے تھے۔ وہ جا رہے تھے اور میں بھی ان کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

منٹو جلیاں والا باغ کا قصہ سنا رہا تھا۔ اسی قصے نے کافی مدت بعد منٹو کے ایک نہایت خوبصورت اور موثر افسانے کی شکل اختیار کر لی تھی۔

مجھے ابھی تک وہ تاثرات یاد ہیں۔ جو قصہ سناتے وقت منٹو کے چہرے پر چھا گئے تھے جس وقت وہ جنرل ڈائر کے حکم پر گولیوں کے برسنے کی بات کر رہا تھا تو اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور پتلی پتلی باہیں فضا میں لہرانے لگی تھیں۔

اس دن مجھے اندازہ ہوا تھا کہ یہ نحیف و نزار جسم کتنے طوفانوں کی آماجگاہ ہے۔

چند ہفتے گزر گئے۔ میں اختر کے پاس بیٹھا تھا۔ کہنے لگے۔ ''وہ ملاتم سے مسٹر ۷۸۶؟''

''جی ہاں! افسانہ دیا تھا۔ بمبئی کا خدا'' ......واپس دے دیا ہے۔''

''اچھا مجھے بھی یہی افسانہ دیا تھا۔ اٹھان بہت اچھی ہے۔ دراصل اس پر روسی اور فرانسیسی افسانہ نگاروں کا گہرا اثر ہے مگر ایک بات یاد رکھو مرزا۔''

''جی!''

اختر صاحب پان چباتے رہے۔

''سعادت حسن تو بڑا اچھا نام ہے۔ مگر یہ منٹو کیا ہوا؟''

وہ اپنی بات بھول گئے۔ ''کیا بے ہودہ لفظ ہے!''

''شاید خاندانی لقب ہے۔'' مجھے اس وقت معلوم نہیں تھا کہ منٹو کشمیریوں کی ایک ذات ہوتی ہے۔

''مرزا یہ سعادت حسن اردو کا ایک بہت بڑا افسانہ نگار بنے گا ایک دن!'' اختر صاحب کو اپنی بات یاد آ گئی اور انھوں نے کہہ دی۔ اختر صاحب نے کبھی کسی شخص کے متعلق کوئی پیش گوئی نہیں کی تھی۔ کم سے کم مجھے کوئی ایسا واقعہ یاد نہیں جب انھوں نے صراحتاً کسی ہم عصر کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہو۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ ایک نو وارد بساط ادب کے بارے میں یہ الفاظ کہہ رہے تھے۔

''منٹو بمبئی چلا گیا۔

اس کا نام ہفت روزہ ''مصور'' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے نمایاں ہونے لگا۔ اس کی تخلیقی قوت اردو افسانے پر چھپٹ پڑی۔ اس کی ہنگامہ پسند طبیعت جا بجا ضرب کاری کے جوہر دکھانے لگی۔ فلم ڈائریکٹر اے۔ آر۔ کاردار اور بشیر مہدی اس کے پے در پے حملوں کے خاص طور پر نشانہ بنے۔ موقر رسائل و جرائد میں اس کے افسانے پڑھ کر سوچتا تھا، منٹو کتنا بڑا افسانہ نگار ہے۔ مصور کی ورق گردانی کرتا تھا تو ''بال کی کھال'' اور منٹو کا صفحہ دیکھ کر حیران ہو جاتا۔ سوچتا منٹو کتنا بڑا لڑاکا ہے۔ ہر ایک سے لڑتا پھرتا ہے۔

شیکسپیئر نے جولیس سیزر کی زبانی کہلوایا ہے۔ ''میں آیا۔ میں نے دیکھا۔ میں نے فتح کر لیا۔'' منٹو کے بارے میں بھی یہ کہا جا سکتا ہے۔ وہ آیا۔ اس نے افسانے لکھے...... وہ دنیائے ادب پر چھا گیا۔ ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک اس کے افسانوں کی دھاک بیٹھ گئی۔

ہفت روزہ ''دین دنیا'' نے متواتر اس کے خلاف لکھا۔ اسے عریاں نگار ثابت کیا۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ یہی عریاں نگار اردو افسانے کی آبرو نہیں بن گیا تھا...... ''مصور'' کے ایڈیٹر سعادت حسن منٹو کی مقبولیت اور افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کی ادبی شہرت، دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے آگے بڑھ رہی تھیں۔ وہ ایک طوفان تھا جو کبھی تو سمٹ کر بے اختیار اس کے قلم سے ٹپک پڑتا تھا اور کبھی ''مصور'' کے اوراق سے اس طرح چھلک کر پھیل جاتا تھا کہ دیواریں کانپنے لگتی تھیں۔ اسے انسان سے محبت تھی۔ مگر اس نے انسان کو شرر کے ہیرو کے طور پر قبول نہیں کیا تھا۔ اس کا انسان مرزا رسوا کا امراؤ جان ادا تھا۔ انسان وہی کچھ تو نہیں ہے جیسے خدا نے اسے بنایا ہے۔ انسان وہ کچھ بھی تو ہے جیسے انسان

ہے۔ طاق پر جلتے ہوئے چراغ کی ضیاء گستری اپنی جگہ مسلم، مگر دھوئیں کے وہ داغ جو چراغ کے عین اوپر نمایاں ہوگئے ہیں، کیا وہ اس کے مقدس شعلے کے پروردہ نہیں ہیں؟ مگر یہ کیا...... میں نے اس کے فن کے متعلق کیا کہنا شروع کردیا ہے۔ میرا ارادہ تو صرف راکھ کے ان ڈھیروں کو کریدنا ہے جن کے سینوں میں یادوں کی کچھ چنگاریاں چھپی پڑی ہیں۔

منٹو "مصور" سے الگ ہوکر آل انڈیا ریڈیو دہلی چلا گیا اور "مصور" کے ادارتی فرائض میرے سپرد ہوگئے۔ میں بمبئی پہنچا تو وہاں کی وسیع دنیا دیکھ کر ڈر گیا اور جب پہلے دن اڈلفی چیمبر کی تیسری منزل میں اس کمرے سے متعارف ہوا جسے "مصور" کا دفتر کہتے تھے تو کوئی شخص بھی مجھے خیر مقدم کہنے پر آمادہ نہیں تھا۔

چودھری علی محمد...... "مصور" کے ہیڈ کاتب ایک میز پر بیٹھے تھے۔ ان کی نوکدار مونچھیں اور راجہ غضنفر علی خاں جیسا طرہ بزبان حال کہہ رہے تھے۔ میں کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں۔ ان کے ساتھی محمد نقی آنکھیں جھکائے مسکرا رہے تھے۔ ان کی مسکراہٹ میں بڑی گہری طنز تھی۔ یہ صورت حال بڑی ناخوشگوار تھی۔

فضا کو سمجھنے کی کوشش کی تو محسوس ہوا یہاں تو ہر گوشے میں سعادت حسن منٹو چھپا بیٹھا ہے۔ گفتگو ہوتی تھی تو منٹو کی، لطیفے ہوتے تھے تو منٹو کے......اور تعریف ہوتی تھی تو منٹو کی دریا دلی، خوش خلقی اور جدّت پسندی کی! "منٹو کہتا تھا۔"

"منٹو نے لکھا تھا۔"

منٹو کی کیا بات ہے۔"

منٹو تو میرے لئے مس ڈوموریئر کی ری بیکا بن گیا تھا۔

آہستہ آہستہ میری خاموش طبعی، کم آمیزی اور فرض شناسی نے فضا کو کچھ ہموار کیا۔ دفتر کے لوگ میرے ساتھ تعاون کرنے لگے۔ لیکن منٹو کی ہر دلعزیزی کو کون چھین سکتا تھا؟ ۴۱ یا ۴۲ء کو میں بمبئی سے واپس آگیا۔

بے روزگار تھا۔ کرشن چندر کو میری بے کاری کا علم ہوا تو انھوں نے مجھے لکھا۔ "دہلی آجاؤ۔ دیکھ لو یہاں جم سکتے ہو یا نہیں۔

میں دہلی پہنچا وہاں اتفاق سے کئی ممتاز اہل قلم جمع ہوگئے تھے۔ کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک، ن۔م۔ راشد، وشوامتر عادل، ابوسعید قریشی، وہاں پہنچ کر پہلے چند لمحوں میں، میں نے جو باتیں سنیں، وہ

منٹو ہی کے بارے میں تھیں۔

ایک منٹو کے متعلق کہی گئی تھی......دوسری منٹو نے دوسرے کے بارے میں کہی تھی!

منٹو نے اپنا ڈرامہ ن۔م۔راشد کو دیا۔

راشد صاحب ''ڈائریکٹر آف پروگرامز'' تھے۔

دوسرے دن منٹو نے پوچھا۔''میرا ڈراما......کیا رائے ہے اس کے متعلق؟''

''اس کا کاغذ بہت اچھا ہے۔''راشد نے مسودے کے کاغذ پر انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

منٹو اور اشک میں عام طور پر ٹھنی رہتی تھی۔ منٹو ہر روز اشک کے بارے میں کوئی نہ کوئی لطیفہ مشہور کر دیتا تھا۔''اوپندر ناتھ اشک نے ایک بلی پال رکھی ہے وہ صبح اپنی پیاری بلی کو ہمسایوں کے گھروں میں بھیج دیتا ہے۔ بلی کہیں نہ کہیں دودھ کے چار گھونٹ پی کر لوٹتی ہے تو اشک اسے دبا کر دودھ نکال لیتا ہے اور اس دودھ سے چائے بنتی ہے جو اشک اور اس کا خاندان اپنے ناشتے میں پیتا ہے۔'' یہ لطیفہ آج بھی زندہ ہے۔ اشک کا ذکر آتا ہے تو منٹو کا یہ لطیفہ بھی یاد آجاتا ہے۔ منٹو پھر بمبئی چلا گیا اور قیام پاکستان کے بعد لاہور آیا۔ یہاں اس کی فلمی مصروفیتیں بہت کم تھیں۔ اس لئے اس نے اپنی بیشتر توجہات ادب پر مرتکز کر دیں۔اس کے قلم سے ایسی تخلیقات نکلیں جو لازوال ہیں۔''کھول دو''،''ٹھنڈا گوشت''،''بابو گوپی ناتھ''،اس منجدھار میں''ٹوبہ ٹیک سنگھ''۔

منٹو کی شراب نوشی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔سب جانتے ہیں کہ وہ پیتا تھا اور بہت زیادہ پیتا تھا۔ ہر حالت میں پیتا تھا ہر قیمت پر پیتا تھا۔لیکن میں اس منٹو کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ جو بلا نوشی کے باوجود بعض انتہائی ناشائستہ حرکتوں کے باوجود اور زندگی کے کئی تقاضوں کو نظر انداز کرنے کے باوصف ایک ذمے دار شوہر اور ایک شفیق باپ بھی تھا۔ وہ نارمل حالات میں جو کچھ کماتا تھا۔ اپنی رفیقہ حیات کے ہاتھ پر رکھ دیتا تھا۔اس فرض سے وہ اس وقت معذور ہوا جب اس کی کمزوری نے اس پر پوری طرح قبضہ کر لیا۔ اپنی بچیوں سے تو اسے اتنی محبت تھی کہ بہت کم باپوں کو اپنی اولاد سے ہوگی۔ جب اس کا پہلا بچہ مرا تو اس نے جو خط مجھے لکھا اس کے ایک ایک لفظ سے ایک سچے باپ کا ہمہ گیر غم اور دردو کرب ظاہر ہوتا ہے۔ بعد کے صرف تین منظر میری یادوں میں محفوظ ہیں اور غالباً محفوظ رہیں گے۔

''ادب لطیف'' کے افسانے کے لئے میں اس کے ہاں پہنچا...... وہاں حسن عسکری صاحب بھی

بیٹھے تھے۔ منٹو کی بیگم صاحبہ محترمہ صفیہ بھی ایک طرف کوچ میں دھنسی ہوئی تھیں۔ منٹو اپنی سب سے چھوٹی بچی سے پیار کر رہا تھا۔ کبھی رومال سے اس کا ناک صاف کرتا، کبھی اسے گود میں لے کر پیشانی چومتا، کبھی اس سے بچوں کے انداز میں باتیں کرنے لگتا۔ یہی وہ لمحے ہوتے ہیں جب ماں کو سب سے زیادہ مسرت ہوتی ہے۔

اس کے بعد میں نے منٹو کو دیکھا۔ وائی ایم سی۔ اے کے پاس، وہ تنہا کھڑا تھا۔ کمر جھکی ہوئی، سینے پر ہاتھ رکھ کر بُری طرح کھانس رہا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ’’کیا بات ہے منٹو صاحب!‘‘

’’کچھ نہیں......؟ تانگے کو بلانا یار!‘‘

آخر میں، میں نے اس وقت دیکھا جب وہ کفن میں چھپا ہوا اپنے مکان کے آگے چارپائی پر پڑا تھا۔ میں نے سوچا...... کیا یہ وہی طوفان ہے، جسے منٹو کہتے ہیں! میری نظریں کفن پر جمی تھیں...... شاید میں خیال کر رہا تھا۔ طوفان ابھی کفن پھاڑ کر باہر نکل آئے گا...... طوفان کبھی چند گز کپڑے سے بھی رک سکتا ہے! میں سوچتا رہا...... اور اس وقت چونکا جب یہ طوفان چار کندھوں پر سوار...... اپنی آخری منزل کو جا رہا تھا۔

☆☆☆

اُٹھاؤ بوتل اور چلو منٹو کے پاس

بالآخر 18 جنوری 1955ء کو سعادت حسن منٹو کا گوشت ہمیشہ کے لئے ٹھنڈا ہو گیا۔

جہاں تک منٹو کی موت کا تعلق ہے میرا خیال ہے کہ وہ ٹھیک وقت پر اس کو اس دنیا سے اٹھا لے گئی۔ اگر اس کی موت اس پر یہ احسان نہ کرتی تو مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے پیچھے اس قدر وسیع و عریض ہر دلعزیز اور اپنا چمکیلا نام نہیں چھوڑ سکتا تھا کیونکہ منٹو جب سے پاکستان آیا تھا اپنے نام کو چاندی کے سکے ہی طرح استعمال کر رہا تھا۔ یہ چاندی کا سکہ ادب کے بازار میں بڑی تیزی سے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں آتا اور جاتا تھا اور اس کی وجہ سے اس سکے پر لوگوں کے ہاتھوں کے پسینے اور میل کی تہیں چڑھتی جا رہی تھیں۔ اس پر زنگ لگ رہا تھا اور اس کی چمک مدھم پڑھتی جا رہی تھی۔ اگر اس چاندی کے سکے کی سرکیولیشن اسی طرح جاری رہتی تو بہت جلد منٹو کا نام ایک کھوٹا سکہ بن کر ایک دوسرے کو دھوکہ دینے کے لئے استعمال کیا جاتا۔

آخری عمر میں منٹو نے اپنے نام کی دوکان کھول لی تھی جہاں بیٹھ کر وہ پندرہ بیس پچیس اور پچاس روپیہ کرایہ پر اپنا نام بیچا کرتا تھا اور کثرتِ استعمال کے باعث اس کا نام دن بدن از کار رفتہ ہوتا جا رہا تھا۔ غالباً موت بھی منٹو کے افسانوں کی بڑی عاشق تھی۔ اسے منٹو کی یہ حرکت بُری لگی اور وہ اس وقت اسے اپنے ساتھ لے گئی جب کہ اس کے نام میں ابھی چمک دمک باقی تھی۔

منٹو کے اس دنیا سے چلے جانے کی خبر سن کر مجھے دکھ تو بہت ہوا لیکن تعجب قطعاً نہیں ہوا۔ اس سے میری آخری ملاقات کراچی میں ہوئی تھی جب وہ فحش نگاری کے مقدمے میں ماخوذ لاہور سے کراچی آیا تھا۔ اس وقت اسے دیکھ کر میں یہ سمجھ گیا تھا کہ اب اس کے چل چلاؤ کا دور شروع ہو چکا ہے اور مجھے کسی بھی دن اس خبر کو سننے کے لئے تیار رہنا چاہیئے کہ منٹو دوزخ یا جنت کے دروازے پر کھڑا دروازہ کھنکھٹا رہا

ہے۔۔۔۔۔" کھول دو"۔

میں یہ تو دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں منٹو کا بڑا قریبی اور گہرا دوست ہوں اور نہ ہی میرا شمار منٹو کی قبر کے نئے نئے ان گنت مجاوروں میں کیا جا سکتا ہے۔ البتہ یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اب سے دو سال پہلے جب مجھے چھ مہینوں کے لئے لاہور جانا پڑا تو شاید ہی کوئی شام ایسی آئی ہو جب منٹو مجھے، نصیر انور یا احمد راہی یا منیر نیازی یا اے حمید کو ساتھ لے کر کھلی چھت والے تانگے میں سوار لاہور کی زندگی سے بھرپور سڑکوں پر نہ گھومتا رہا ہو۔

اس کی بیشتر شامیں اس ہوٹل کے کمرے میں گزرتیں جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا۔ منٹو پر ان دنوں اس کے گھر والوں کی طرف سے پینے پر بڑی سخت پابندیاں عائد تھیں۔ اس لئے اس نے میرے کمرے کو جائے پناہ اور شراب خانہ بنا رکھا تھا۔ ان دنوں روز روز کی ملاقات اور درمیان میں شراب کی ایک بوتل کے باعث اس سے میری خطرناک اور شرمناک حد تک بھی بے تکلفی ہو گئی تھی۔ یعنی ان ملاقاتوں میں ایسے بھی مواقع آئے ہیں جب میں نے منٹو کو دیکھ کر یہ محسوس کیا ہے جیسے اس کے جسم پر کپڑے کا ایک چیتھڑا بھی نہیں ہے۔

منٹو سے مجھے جو قرب حاصل رہا ہے اسے گہری دوستی نہیں کہا جا سکتا البتہ اس تعلق کو جان پہچان کی وہ آخری منزل قرار دیا جا سکتا ہے جہاں سے دوستی کا آغاز ہوتا ہے۔ منٹو سے جان پہچان سے دوستی کی منزل تک پہنچ جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ منٹو مجھ سے کبھی منٹو کی طرح نہیں ملا۔ وہ جب بھی مجھ سے ملنے آتا منٹو کو کہیں چھوڑ کر صرف سعادت حسن کی حیثیت سے آتا تھا۔ اور جب کبھی میں اس سے ملا کبھی جلیس بن کر نہیں ملا۔ ہمیشہ ابراہیم حسن بن کر ملا۔ مجھے یاد ہے کہ منٹو سے میری واقفیت کے سارے دوران صرف ایک بار ادب پر کچھ بے ادب قسم کی گفتگو ہوئی تھی۔

ان دنوں منٹو کی ایک کتاب مشہور فلم ایکٹرس نور جہاں سے متعلق شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد میں نے منٹو سے کہا:

"تمہاری یہ کتاب "نور جہاں سرور جہاں" محض بکواس ہے اب تم ہتک، گوپی ناتھ، کھول دو اور موذیل جیسے افسانے کیوں نہیں لکھتے؟ یہ نور جہاں وغیرہ کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟"

منٹو نے کہا:

"یار اب گوپی ناتھ کے مقابلے میں نور جہاں آسانی سے بکتی ہے۔"

میں نے کہا:

''نور جہاں سے زیادہ تم بکتے ہو۔ سعادت۔ مجھے یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ تم اب ادب کی شاہراہ پر گوپی ناتھ، خوشیا، سوگندھی اور موذیل جیسے یادگار مجسّمے نصب کرنے کے بجائے پرانے بغداد کے بردہ فروش تاجر کی طرح آوازیں لگاتے ہوئے، اپنے دوستوں کا صحیح صحیح تعارف کراتے ہوئے انہیں سربازار نیلام کر رہے ہو۔''

منٹو اس بات سے سٹپٹا گیا تھا۔ یہ اس کی عادت تھی جب اس کے سامنے اس کی تحریر کی برائی کی جاتی تو وہ بڑے غصے میں آجاتا تھا اور لڑنے کے لئے تیار ہو جاتا تھا۔ آخری زمانے میں وہ حد درجہ خوشامد پسند ہو گیا تھا۔ بہت لوگ اس کے منہ پر اس کی تعریفیں کر کے اس سے ناجائز فائدے اٹھاتے تھے (اور اب تک اٹھا رہے ہیں) لیکن اس کے باوجود جب کچھ وقت گزر جاتا اور منٹو اپنے کمرے میں واپس آتا تو پھر سیدھے میرے پاس آتا' اور کہتا:

''ادب ودب سب بکواس ہے۔ انسان بڑی چیز ہے۔ اٹھاؤ گلاس اور مارو جھک۔''

منٹو سے قریب رہنے کے دوران میں نے بڑی شدت کے ساتھ یہ محسوس کیا کہ وہ غلط قسم کے احساس برتری میں مبتلا تھا۔ وہ ہمیشہ اٹھتے چلتے پھرتے اور لکھتے کوئی ایسی بات کہتا اور لکھتا اور کوئی ایسی حرکت کرنا ضروری سمجھتا تھا جس سے اس کے اردگرد کے لوگ ایک دم چونک پڑیں اور اس کو اپنے سے مختلف اعلیٰ اور افضل تصور کریں۔ اس عادت کے باعث پیدا ہونے والے سینکڑوں واقعے ہیں لیکن ایک واقعہ مجھے بڑا یاد آتا ہے۔

میں منٹو کے ساتھ جب بھی لاہور کی سڑکوں پر نکلتا تھا تو وہ تانگے میں ہمیشہ آگے کوچوان کے ساتھ بیٹھتا تھا اور میں' نصیر انور یا منیر نیازی پیچھے بیٹھتے تھے۔ میں نے اس کے آگے یا پیچھے بیٹھنے کی بات کو اہمیت نہیں دی تھی لیکن ایک دن جب منٹو کافی چہکا ہوا تھا' مجھ سے بولا:

''میں نہ صرف افسانہ نگاری کے میدان میں تم سے آگے رہتا ہوں بلکہ لاہور کی سڑکوں پر بھی تم سے آگے ہی رہتا ہوں۔''

بات سچی تھی اس لئے مجھے ناگوار نہ گزری لیکن مجھے ایک شرارت سوجھی۔ راستے میں ایک جگہ منٹو ایک کام سے تانگے سے اُترا تو میں فوراً اگلی نشست پر جا بیٹھا۔ منٹو جب کام سے فارغ ہو کر تانگے کے پاس آیا تو بولا:

تم میری جگہ پر بیٹھے۔۔۔۔پیچھے جا بیٹھو۔

میں نے کہا:

''اب تم پیچھے بیٹھو۔ میں تو نہیں بیٹھوں گا۔''

منٹو کو بڑا غصہ آیا۔ لیکن میں نے یہ ٹھان لی تھی کہ میں ہرگز وہاں سے ہٹوں گا نہیں۔ بڑی دیر تک ہم دونوں میں بڑی جھک جھک ہوتی رہی، آخر کار منٹو نے ایک دوسرا تانگہ لیا اور اس میں کوچوان کے ساتھ بیٹھ گیا اور کوچوان سے بولا:

''اگلے تانگے سے آگے بڑھا کر لے چلو۔''

چنانچہ جب اس کا تانگہ ہمارے تانگے سے آگے نکل گیا تو وہ بڑا خوش ہوا اور بڑے فاتحانہ انداز میں پلٹ پلٹ کر مسکراتے ہوئے مجھے دیکھتا تھا۔

منٹو کے کردار کے بارے میں بے شمار لوگوں کو جو اسے شخصی طور پر نہیں جانتے تھے اس کی تحریروں کے باعث، بڑی غلط فہمی ہے کہ وہ بڑا اغلط قسم کا شرابی اور بے حد آوارہ عورتوں کا بڑا رسیا تھا۔ منٹو سے ملنے سے پہلے اس کے بارے میں میری بھی یہی رائے تھی۔ لیکن جب میں منٹو سے ملا اور ملتا رہا تو پہلے پہلے مجھے بڑا تعجب ہوا۔ وہ سچ مچ بہت شراب پیتا تھا۔ کبھی کبھی جب آسمان پر خوب بادل چھائے ہوئے ہوتے اور مینہ برس رہا ہوتا تو پھر دن شام اور رات کو آہستہ آہستہ شراب کی خالی بوتلوں میں بھرتا رہتا تھا۔ شراب کی بوتلوں کے علاوہ اس کی کہانیوں میں ہمیں اکثر و بیشتر آوارہ اور ننگی عورتیں نظر آتی ہیں۔ فحش گالیوں کا شور سنائی دیتا ہے۔ اس کا افسانہ ایک ایسا غلیظ کمرہ نظر آتا ہے جہاں ایک گندے بستر پر کوئی بے شرم عورت نیم عریاں لباس میں لیٹی ہے اور کوئی مرد پسینہ پسینہ کھڑا ہے۔ میز پر شراب کی بوتل کھلی پڑی ہے۔ سگریٹوں کا دھواں پھیلا ہوا ہے اور کمرے میں دھما چوکڑی سی مچی ہوی ہے۔ لیکن منٹو کے افسانے سے باہر لاہور کی ہال روڈ کے عقب میں واقع لکشمی مینشن کے کونے کے فلیٹ کا دروازہ کھٹکھٹایئے تو اندر سے وہ منٹو باہر نکلتا تھا جو بے حد صاف ستھرے کپڑے پہنا ہوا ہے۔ ایک ویل فرنشڈ مکان میں رہتا ہے۔ ایک بے حد شریف بیوی کا وفادار شوہر اور تین پیاری پیاری ننھی بچیوں کا باپ ہے۔ اس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھیئے تو وہ یہ تک گوارا نہیں کر سکتا کہ کوئی سگریٹ کی راکھ ایش ٹرے کے بجائے فرش پر جھاڑ دے۔ ایسا ہی ایک بار کرنے پر منٹو نے میرے ہاتھ میں ایک جھاڑو پکڑا دی تھی کہ یہ فرش صاف کرو۔

نشے کو کہانیوں کی شکل میں اپنے اردگرد بکھیرتا رہا لیکن زندگی کے ہر معاملے میں تلوّن مزاج اور عجلت پسند منٹو ڈسٹلری کی شراب کی طرح زندگی کی شراب کو بھی جلد جلد پیتا گیا۔ اور ساٹھ ستر اسی نوے اور شاید ایک سو سال تک نشہ دینے والی وہ بوتل اس نے صرف 43 سال میں ختم کردی اور منٹو کے رشتہ داروں اور عقیدت مندوں نے اس خالی بوتل کو کوڑا کرکٹ کے ڈھیر پر پھینکنے کے بجائے احتراماً میامی صاحب کے قبرستان میں مٹی کے ایک ڈھیر تلے چھپا دیا۔ بوتل تو چھپ گئی لیکن اس کا نشہ جس کا نام منٹو ہے ادب کی دنیا پر بدستور طاری ہے اور ہمیشہ چھایا رہے گا۔

منٹو جب بھی شراب پیتا تھا تو یہ دعویٰ ضرور کرتا تھا کہ میں شراب پیتا ہوں۔ شراب مجھے نہیں پی سکتی حالانکہ منٹو کو یہ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ شراب آہستہ آہستہ اسے پیتی جارہی ہے بالآخر 18 جنوری کو شراب منٹو کو بالکل ہی پی گئی۔ اب منٹو اتنی دور چلا گیا ہے کہ اس کمزور اور پتلی پتلی ٹانگوں والے منٹو کا ادیب باری اور فلم اسٹار شیام کی محفل میں نہ پھنس گیا ہو تو یقیناً وہ اس دنیا میں واپس آنے کے لئے تڑپ رہا ہوگا۔ فرشتوں سے جھگڑا کر رہا ہوگا اور اس نے وہاں بھی خوب دھما چوکڑی مچا دی ہوگی۔

اگرچہ منٹو مر گیا ہے لیکن کبھی کبھی رات کو میں دیر تک لکھتا پڑھتا رہتا ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ دبے پاؤں آیا ہے اور میرے دروازے کی کنجی کے سوراخ سے جھانک رہا ہے۔

بہرحال منٹو پاکستان اور ہندوستان کی ان چند شخصیتوں میں سے ایک ہے جو مر بھی گئے ہیں اور نہیں بھی مرے۔۔۔ اس لئے اس کو ہمیشہ کے لئے خدا حافظ کہنے کو جی نہیں چاہتا البتہ روز کی طرح یہ جملہ زبان پر آتا ہے۔

''اچھا بھئی سعادت حسن منٹو۔۔۔۔ اب میں چلا۔''

☆☆☆

خالی بوتل، بھرا ہوا دل

ایک عجیب حادثہ ہوا ہے۔ منٹو مر گیا ہے۔ وہ ایک عرصہ سے مر رہا تھا۔ کبھی سنا کہ وہ پاگل خانے میں ہے۔ کبھی سنا کہ کثرت شراب نوشی سے اسپتال میں پڑا ہے۔ کبھی سنا کہ یار دوستوں نے اس سے قطع تعلق کرلیا ہے۔ کبھی سنا کہ وہ اور اس کی بیوی بچے فاقوں پر گزر کر رہے ہیں۔ بہت سی باتیں سنیں۔ ہمیشہ بُری باتیں سنیں۔ لیکن یہ یقین نہ آیا۔ کیونکہ اس عرصے میں اس کے افسانے برابر آتے رہے۔ اچھے افسانے بھی اور بُرے افسانے بھی۔ جنہیں پڑھ کر منٹو کا منہ نوچنے کو جی چاہتا تھا اور ایسے افسانے بھی جنہیں پڑھ کر اس کا منہ چومنے کو جی چاہتا تھا۔ یہ افسانے منٹو کی خیرت کے خط تھے۔ میں سمجھتا تھا جب تک یہ خط آتے رہیں گے منٹو خیرت سے ہے۔ کیا ہوا اگر وہ فاقے کررہا ہے۔ اس برصغیر کی تین چوتھائی آبادی نے ہمیشہ فاقے کئے ہیں۔ کیا ہوا اگر وہ پاگل خانے چلا گیا۔ اس مختل اور مجنون سماج میں منٹو ایسے ہوش مند کا پاگل خانے جانا کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ اچنبھا تو اس بات پر ہے کہ وہ آج سے بہت پہلے پاگل خانے کیوں نہیں گیا۔ مجھے ان تمام باتوں سے نہ تو کوئی حیرت ہوئی، نہ کوئی اچنبھا ہوا۔ منٹو افسانے لکھ رہا ہے۔ منٹو خیریت سے ہے۔ خدا اس کے قلم میں اور زہر بھر دے!

مگر آج جب ریڈیو پاکستان نے یہ خبر سنائی کہ منٹو حرکت قلب کے بند ہو جانے سے چل بسا تو دل اور دماغ چلتے چلتے ایک لمحہ کے لئے رک گئے۔ دوسرے لمحے میں یہ یقین نہ آیا۔ دل اور دماغ نے باور نہ کیا کہ کبھی ایسا ہوسکتا ہے۔ ایک لمحہ کے لئے منٹو کا چہرہ میری نگاہوں میں گھوم گیا۔ اس کا روشن فراغ ماتھا، وہ تیکھی استہزائیہ مسکراہٹ، وہ شعلے کے طرح بھڑکتا ہوا دل! کبھی بجھ سکتا ہے؟ دوسرے لمحہ میں یقین کرنا پڑا۔ ریڈیو اور اخبار نویسوں نے مل کر اس کی تصدیق کردی۔ منٹو مر گیا ہے۔ آج کے بعد وہ کوئی افسانہ نہ لکھے گا۔ آج کے بعد اس کی خیرت کا کوئی خط نہیں آئے گا۔

آج سردی بہت ہے' اور آسمان پر ہلکا سا ابر چھایا ہوا ہے۔ مگر اس ابر میں بارش کی ایک بوند بھی نہیں ہے۔ میری آنکھ میں آنسوؤں کا ایک قطرہ بھی نہیں۔ منٹو کو رلانے سے انتہائی نفرت تھی۔ آج میں اس کی یاد میں آنسو بہا کر اسے پریشان نہیں کروں گا۔ میں آہستہ سے اپنا کوٹ پہن لیتا ہوں اور گھر سے باہر نکل جاتا ہوں۔

عجیب اتفاق ہے، جس روز منٹو سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ اس روز میں دتی میں تھا۔ جس روز وہ مرا ہے اس روز بھی دلی میں موجود ہوں۔ اسی گھر میں ہوں جس میں آج سے چودہ سال پہلے وہ میرے ساتھ پندرہ دن کے لئے رہا تھا۔ گھر کے باہر وہی بجلی کا کھمبا ہے جس کے نیچے ہم پہلی بار بغل گیر ہوئے تھے۔ یہ وہی انڈر ہل روڈ ہے' جہاں آل انڈیا ریڈیو کا پرانا دفتر ہوا کرتا تھا۔ جہاں ہم دونوں کام کیا کرتے تھے۔ یہ میڈن ہوٹل کا بار ہے' یہ موری گیٹ میڈس کا گھر ہے۔ یہ جامع مسجد کی سیڑھیاں ہیں جس میں ہم کباب کھاتے تھے۔ یہ اردو بازار ہے۔ سب کچھ وہی ہے' اسی طرح سے ہے۔ سب جگہ اسی طرح سے کام ہو رہا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو بھی کھلا ہے۔ میڈن ہوٹل کا بار بھی' اردو بازار بھی' کیونکہ منٹو ایک بہت معمولی آدمی تھا۔ وہ ایک غریب ادیب تھا' وہ وزیر نہ تھا کہ کہیں کوئی جھنڈا اس کے لئے سرنگوں ہوتا۔ وہ کوئی سٹہ باز بلیک مارکٹیا بھی نہیں تھا کہ کوئی بازار اس کے لئے بند ہوتا۔ وہ کوئی فلم اسٹار نہ تھا کہ اسکول اور کالج اس کے لئے بند ہو جاتے۔ وہ ایک غریب ستائی ہوئی زبان کا غریب اور ستایا ہوا ادیب تھا۔ وہ موچیوں، طوائفوں اور تانگے والوں کا ادیب تھا۔ ایسے آدمی کے لئے کون روئے گا؟ کون اپنا کام بند کرے گا؟ اس لئے آل انڈیا ریڈیو کھلا ہے، جس نے اس کے ڈرامے سینکڑوں بار براڈ کاسٹ کئے ہیں۔ اردو بازار بھی کھلا ہے، جس نے اس کی ہزاروں کتابیں بیچی ہیں اور آج بھی بیچ رہے ہیں۔ آج میں ان لوگوں کو بھی قہقہہ زدہ دیکھتا ہوں جنہوں نے منٹو سے ہزاروں روپے کی شراب پی ہے۔ منٹو مر گیا ہے تو کیا ہوا۔ بزنس بزنس ہے۔ ایک لمحہ کے لئے کام نہیں رکنا چاہئے۔ وہ جس نے ہمیں اپنی ساری زندگی دے دی، اسے ہم اپنا ایک لمحہ نہیں دے سکتے۔ سر جھکائے ایک لمحہ کے لئے اس کی یاد کو ہم اپنے دلوں میں بھی تازہ نہیں کر سکتے۔ شکر کے ساتھ' عاجزی کے ساتھ' دلی ہمدردی کے ساتھ اس بے قرار روح کے لئے جس نے "ہتک" "نیا قانون" "کھول دو" "ٹوبہ ٹیک سنگھ" ایسے درجنوں بے مثل اور لازوال افسانے تخلیق کئے جس نے سماج کی نچلی تہوں میں گھس کر وہ پسے ہوئے، کچلے ہوئے سماج کی ٹھوکروں سے مسخ شدہ،

کردار تعمیر کئے کہ جو اپنی نادر مصوری اور حقیقت نگاری میں گورکی کے لوئر ڈ یتھز (Lower Depths) کے کرداروں کی یاد دلاتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان لوگوں نے گورکی کے لئے عجائب گھر بنائے، مجسّمے نصب کئے۔ شہر تعمیر کئے اور ہم نے منٹو پر مقدمے چلائے، اسے بھوکا مارا، اسے پاگل خانے میں پہنچایا۔ اسے ہسپتالوں میں سڑایا اور آخر میں اسے یہاں تک محدود کر دیا کہ وہ کسی انسان کو نہیں، شراب کی ایک بوتل کو اپنا دوست سمجھنے پر مجبور ہو جائے۔

یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہم نے غالب کے ساتھ یہی کیا تھا۔ حسرت کے ساتھ یہی کیا تھا۔ پریم چند کے ساتھ یہی کیا تھا۔ آج منٹو کے ساتھ بھی یہی سلوک کریں گے کیونکہ منٹو کوئی ان سے بڑا ادیب نہیں ہے جس کے لئے ہم اپنے پانچ ہزار سال کے کلچر کی پرانی روایت کو توڑیں۔ ہم انسانوں کے نہیں مقبروں کے پجاری ہیں۔ آج دتی میں مرزا غالب کی پکچر چل رہی ہے۔ اس تصویر کی کہانی اس دلی میں موری گیٹ میں بیٹھ کر منٹو نے لکھی تھی۔ ایک روز ہم منٹو کی تصویر بنائیں گے اور اس سے لاکھوں روپے کمائیں گے جس طرح آج ہم منٹو کی کتابوں کے جعلی ایڈیشن ہندوستان میں چھاپ چھاپ کر ہزاروں روپے کما رہے ہیں وہ روپے جن کی منٹو کو اپنی زندگی میں سخت ضرورت تھی۔ وہ روپے آج بھی اس کی بیوی اور بچوں کو عسرت و ذلت سے بچا سکتے ہیں۔ مگر ہم ایسی غلطی نہیں کریں گے۔ اگر ہم قحط کے دنوں میں چاول کے نرخ بڑھا کر ہزاروں انسانوں کے خون سے اپنا نفع بڑھا سکتے ہیں تو کیا اسی منافع کے لئے ایک غریب ادیب کی جیب نہیں کتر سکتے۔ منٹو نے جب جیب کترا لکھا تھا اس وقت اسے معلوم نہیں تھا کہ ایک دن اسے جیب کتروں کی ایک پوری قوم سے واسطہ پڑے گا۔

منٹو ایک بہت بڑی گالی تھا، اس کا کوئی ایسا دوست نہیں تھا جسے اس نے گالی نہ دی ہو۔ کوئی پبلشر ایسا نہ تھا جس سے اس نے لڑائی مول نہ لی ہو۔ کوئی مالک ایسا نہ تھا جس کی اس نے بے عزتی نہ کی ہو۔ بظاہر وہ ترقی پسندوں سے خوش نہیں تھا نہ غیر ترقی پسندوں سے، نہ پاکستان سے نہ ہندوستان سے، نہ انکل سام سے نہ روس سے۔ جانے اس کی مضطرب بے قرار، بے چین روح کیا چاہتی تھی۔ اس کی زبان بے حد تلخ تھی۔ انداز بیان تھا تو کسیلا اور خاردار، نشتر کی طرح تیز اور بے رحم۔ لیکن آپ اس کی گالی کو، اس کی تلخ کلامی کو، اس کے تیز نوکیلے خاردار الفاظ کو ذرا سا کھرچ کر تو دیکھے اندر سے زندگی کا میٹھا میٹھا رس ٹپکنے لگے گا۔ اس کی نفرت میں محبت تھی، عریانی میں ستر پوشی، آبرو باختہ عورتوں کی داستان میں اس کے ادب کی عفت پنہاں تھی۔ زندگی

نے منٹو سے انصاف نہیں کیا لیکن تاریخ ضرور اس سے انصاف کرے گی۔

منٹو بیالیس سال کی عمر میں مرگیا۔ ابھی اس کے کچھ کہنے اور سننے کے دن تھے۔ ابھی ابھی زندگی کے تلخ تجربوں نے' سماج کی بے رحمیوں نے' مروجہ نظام زندگی کے تضاد نے اس کی بے تحاشا انفرادیت وتراجیت اور ناطرفداری کو کم کرکے اس سے ٹوبہ ٹیک سنگھ ایسی کہانی لکھوائی تھی۔ غم منٹو کی موت کا نہیں ہے۔ موت ناگزیر ہے۔ میرے لئے بھی اور تمہارے لئے بھی۔ غم ان ناتخلیق کردہ شہ پاروں کا ہے جو صرف منٹو ہی لکھ سکتا تھا۔ اردو ادب میں اچھے سے اچھے افسانہ نگار پیدا ہوئے لیکن منٹو دوبارہ پیدا نہیں ہوگا۔ اور کوئی اس کی جگہ لینے نہیں آئے گا۔ یہ بات میں بھی جانتا ہوں اور راجندر سنگھ بیدی بھی، عصمت چغتائی بھی، خواجہ احمد عباس بھی اور اوپندر ناتھ اشک بھی۔ ہم سب لوگ اس کے رقیب، اس کے چاہنے والے، اس سے جھگڑا کرنے والے' اسے پیار کرنے والے' اس سے نفرت کرنے والے' اس سے محبت کرنے والے رفیق اور ہم سفر تھے۔ اور آج جب وہ ہم میں نہیں ہے ہم میں سے ہر ایک نے موت کے شہتیر کو اپنے شانے پر محسوس کیا ہے۔ آج ہم میں سے ہر ایک کی زندگی کا ایک حصہ مرگیا ہے۔ ایسے لمحہ جو پھر کبھی واپس نہ آسکیں گے۔ آج ہم میں سے ہر شخص منٹو کے قریب ہے اور ایک دوسرے کے قریب تر۔ ایسے لمحے میں اگر ہم یہ فیصلہ کرلیں کہ ہم لوگ مل کر منٹو کی ذمہ داریوں کو پورا کریں گے تو اس کی خودکشی رائیگاں نہیں جائے گی۔

آج سے چودہ سال پہلے میں نے اور منٹو نے مل کر ایک فلمی کہانی لکھی تھی "بنجارا" منٹو نے آج تک کسی دوسرے ادیب کے ساتھ مل کر کوئی کہانی نہیں لکھی تھی۔ نہ اس سے پہلے نہ اس کے بعد۔ لیکن وہ دن بڑی سخت سردیوں کے دن تھے۔ میرا سوٹ لپٹا ہوا تھا اور منٹو کا سوٹ بھی لپٹا ہوا تھا۔ منٹو میرے پاس آیا اور بولا:

"اے کرشن' نیا سوٹ چاہتا ہے؟"

میں نے کہا "ہاں"

"تو چل میرے ساتھ۔"

"کہاں؟"

"بس زیادہ بکواس نہ کر' چل میرے ساتھ۔"

ہم لوگ ایک ڈسٹری بیوٹر کے ہاں گئے۔ میں وہاں اگر کچھ کہتا تو واقعی بکواس ہی ہوتا۔ اس لئے

میں خاموش رہا۔ وہ ڈسٹری بیوٹر فلم پروڈکشن کے میدان میں آنا چاہتا تھا۔ منٹو نے پندرہ بیس منٹ کی گفتگو میں اسے کہانی بیچ دی اور اس سے پانچ سو روپے نقد لے لئے۔ باہر آ کے اس نے ڈھائی سو مجھے دیئے اور ڈھائی سو خود رکھ لئے۔ پھر ہم لوگوں نے اپنے اپنے سوٹ کے لئے بڑھیا کپڑا خریدا' اور عبدالغنی ٹیلر ماسٹر کی دکان پر گئے۔ اسے سوٹ جلدی تیار کرنے کے لئے تاکید کی۔ پھر سوٹ تیار ہو گئے پہن بھی لئے گئے مگر۔۔۔۔۔ سوٹ کا کپڑا درزی کو دینے اور سلنے کے دوران میں جو وقفہ آیا۔ اس میں ہم باقی روپے گھول کر پی گئے۔ چنانچہ عبدالغنی کا اُدھار رہا۔ اور اس نے ہمیں سوٹ پہننے کے لئے دے دیئے۔ مگر کئی ماہ تک ہم لوگ اُس کا اُدھار نہ چکا سکے۔

ایک دن منٹو اور میں کشمیری گیٹ سے گزر رہے تھے کہ ماسٹر عبدالغنی نے ہمیں پکڑ لیا۔ میں نے سوچا آج صاف صاف بے عزتی ہو گی۔ ماسٹر عبدالغنی نے منٹو کو گریبان سے پکڑ کر کہا۔

''وہ ''ہتک'' تم نے لکھی ہے؟

منٹو نے کہا ''لکھی ہے تو کیا ہوا؟ اگر تم سے سوٹ اُدھار لیا ہے' تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم میری کہانی کے اچھے ناقد بھی ہو سکتے ہو۔۔۔۔۔ یہ گریبان چھوڑو۔''

عبدالغنی کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ آئی۔ اس نے منٹو کا گریبان چھوڑ دیا اور اس کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھ کر کہنے لگا۔

''جا تیرے پیسے معاف کئے۔''

وہ پلٹ کر چلا گیا۔ چند لمحوں کے لئے منٹو بالکل خاموش کھڑا رہا۔ وہ اس تعریف سے بالکل خوش نہیں ہوا۔ بڑا رنجیدہ اور خفا خفا سا نظر آنے لگا۔

''سالا کیا سمجھتا ہے۔ مجھے ہراساں کرتا ہے۔ میں اس کی پائی پائی چکا دوں گا۔ سالا سمجھتا ہے ''ہتک'' میری اچھی کہانی ہے' ہتک؟ ہتک تو میری سب سے بُری کہانی ہے۔''

لیکن نہ میں نے نہ منٹو نے عبدالغنی کو پیسے دیئے۔ نہ اُس نے ہم سے لئے۔ آج مجھے جب یہ واقعہ یاد آیا، میں اس وقت عبدالغنی کی دکان ڈھونڈھتا ڈھونڈھتا کشمیری گیٹ پہنچا۔ مگر عبدالغنی وہاں سے جا چکا تھا۔ کئی برس ہوئے پاکستان چلا گیا تھا۔ کاش آج عبدالغنی ٹیلر ماسٹر مل جاتا' اس سے منٹو کے متعلق دو باتیں کر لیتا' اور کسی کو تو اس بڑے شہر میں اس فضول کام کے لئے فرصت نہیں ہے۔

شام کے وقت میں ظ۔انصاری ایڈیٹر ''شاہراہ'' کے ساتھ جامع مسجد سے تیس ہزاری اپنے گھر کو آرہا تھا۔ راستے میں میں اور ظ۔انصاری آہستہ آہستہ منٹو کی شخصیت اور اس کے فن پر بحث کرتے رہے۔ سڑک پر گڑھے بہت تھے' اس لئے بحث میں بہت سے نازک مقام بھی آئے۔ایک بار پنجابی کوچوان نے چونک کو پوچھا۔

''کیا کہا جی۔منٹو مر گیا؟''

ظ۔انصاری نے آہستہ سے کہا۔''ہاں بھائی'' اور پھر اپنی بحث شروع کر دی۔

کوچوان دھیمے دھیمے اپنا تانگہ چلاتا رہا۔

لیکن موری گیٹ کے پاس اس نے اپنے تانگے کو روک لیا' اور ہماری طرف گھوم کر بولا۔

''صاحب! آپ لوگ کوئی دوسرا تانگہ کر لیجئے۔میں آگے نہیں جاؤں گا۔''

اس کی آواز پر ایک عجیب سی رقت تھی۔

پیشتر اس کے کہ ہم کچھ کہہ سکتے۔ وہ ہماری طرف دیکھے بغیر اپنے تانگے سے اترا' اور سیدھا سامنے کی بار میں چلا گیا۔

☆☆☆

احمد ندیم قاسمی

سعادت حسن منٹو

منٹو کے مزاج و کردار کے بارے میں اکثر لوگ شدید غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں جبکہ میں نے اندر باہر سے اتنے صاف ستھرے انسان کم ہی دیکھے ہیں۔ جب تک منٹو سے میری ملاقات نہیں ہوئی، وہ مجھے خطوں میں لکھتا رہا کہ مجھ سے مل کر آپ کو مایوسی ہوگی۔ مجھے حیرت ہوتی تھی کہ وہ ایسی باتیں کیوں لکھتا ہے۔ پھر جب منٹو سے ملاقات ہوئی تو نہ صرف یہ کہ مجھے کسی قسم کی مایوسی نہیں ہوئی بلکہ مجھے اس کی شخصیت کے متعدد پہلو نہایت پیارے لگے۔ اس میں اگر کوئی خامی تھی تو صرف یہ تھی کہ وہ شراب کا عادی تھا مگر یہ خامی ایسی تو نہیں تھی کہ مجھے اس سے مایوسی ہوتی۔ ہماری سیاست اور ادب کے بڑے بڑے زعما اس عادت میں مبتلا رہ چکے ہیں مگر ان کی بڑائی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ دوسری خامی ــــ اگر اسے خامی کہا جا سکتا ہے ـــــــ یہ تھی کہ اس کی انا کی دھار بہت تیز تھی۔ مگر یہ انانیت اس پر جچتی تھی کیونکہ وہ ایک بڑا تخلیق کار تھا۔ منٹو سے ملاقات کے بعد اس کی موت تک کے چودہ پندرہ برسوں میں اس کی شخصیت کے ایسے ایسے خوشگوار پہلو میرے سامنے آئے کہ اس کے مزاج و کردار کے بارے میں شبہات کا اظہار کرنے والوں پر مجھے رحم آتا ہے۔

میں نے اسے ہمیشہ سفید رنگ کے صاف ستھرے کرتے پاجامے میں دیکھا۔ سرما میں وہ سوٹ بھی استعمال کر لیتا تھا۔ وہ اعلیٰ معیار کے کاغذ پر افسانہ لکھتا تھا اور ہر افسانے کا آغاز ۷۸۶ کے ہندسوں سے کرتا تھا۔ کہتا تھا 'یہ اللہ تعالیٰ کا ٹیلی فون نمبر ہے! اس کے سامنے درجن بھر ترشی ترشائی پنسلیں ہر وقت موجود رہتی تھیں۔ میں نے ایک بار پوچھا بھی کہ ایک دم اتنی بہت سی پنسلیں کیوں؟ منٹو نے مجھے بتایا ''لکھتے لکھتے جب پنسل کی نوک موٹی ہو جائے تو اسے تراشنے میں وقت ضائع ہوتا ہے اور سلسلۂ خیال

بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ سو گھسی ہوئی پنسل ایک طرف رکھ کر میں دوسری پنسل اٹھالیتا ہوں۔''

میں تاریخیں یاد رکھنے کے معاملے میں بہت کوتاہ ہوں۔ میرا خیال ہے یہ ۱۹۴۰ء کا واقعہ ہے جب منٹو نے بمبئی کے ایک فلم پرڈیوسر شیراز سیٹھ سے میرا ذکر کیا اور مجھے اس کی آنے والی فلم ''دھرم پتنی'' کے مکالمے اور گانے لکھنے کو کہا اس طرح منٹو نے ایک ضرورت مند دوست کی مدد کی۔ خود اسے اس کام میں کوئی مالی فائدہ حاصل نہیں ہو رہا تھا۔ اگر کوئی فائدہ اسے ہوا تو اس کا یہ اطمینان تھا کہ اس سے ایک دوست کی ضروریات آسانی سے پوری ہو جائیں گی۔ ''دھرم پتنی'' کا مصنف ایک مرہٹہ ادیب ''کھانڈے کر'' تھا۔ میں اُن دنوں ملتان میں ایکسائز سب انسپکٹر تھا۔ منٹو بمبئی میں ایک فلمی ہفت روزہ ''مصور'' کا ایڈیٹر تھا۔ اس ہفت روزہ میں وہ میری غزلیں اور نظمیں ایک آرٹسٹ ''فیض'' سے باقاعدہ مصور کرا کے اور بہت نمایاں کر کے چھاپتا تھا۔ وہاں امرتسر کے آغا خلش کاشمیری اس کے معاون کار تھے۔ اُن دنوں مشہور موسیقار رفیق غزنوی کے ساتھ منٹو کے گہرے مراسم تھے۔ وہ خطوں میں مجھے مطلع کرتا تھا کہ رفیق تمہارے فلاں کلام کی تعریف کر رہا تھا۔ ایک بار منٹو نے مجھے گلبرٹ کا ایک آپرا بھیجا کہ اس کا منظوم اُردو ترجمہ کر دو۔ یہ بمبئی ریڈیو سے نشر ہوگا اور اس کا ہدایت کار رفیق غزنوی ہوگا۔ میں نے یہ آپرا لکھا۔ منٹو نے اسے بے حساب پسند کیا۔ رفیق غزنوی نے اس کی دھنیں بنا کر اسے نشر بھی کیا۔ مجھے اس کا معاوضہ بھی ملا۔ بعد میں یہ آپرا رسالہ ''ادب لطیف'' میں شائع بھی ہوا۔ شاید اس وقت ''ادب لطیف'' کے مدیر میرے محترم دوست راجندر سنگھ بیدی تھے۔

منٹو نے طے کیا کہ وہ بمبئی سے دہلی آئے گا۔ مجھے مشورہ دیا کہ میں ملتان سے دہلی پہنچوں۔ اس نے مجھے لکھا کہ وہ دہلی کے چاوڑی بازار میں کرپا رام کے انگریزی فلمی ہفت روزہ کے دفتر میں میرا انتظار کرے گا۔ میرا تانگہ جب دہلی کے چاوڑی بازار میں داخل ہوا تو ہر دروازے اور ہر دریچے میں مجھے عورتیں بال سکھاتی یا بالوں میں کنگھی کرتی نظر آئیں۔ میرا ماتھا ٹھنکا، میں نے کوچوان سے پوچھا یہ کیا قصہ ہے۔ وہ سمجھا کہ میں'' جو پنجابی شلوار اور شیروانی میں ملبوس تھا' ایک بڑا زمیندار ہوں اور بسلسلۂ عیاشی دہلی آیا ہوں ورنہ ریلوے اسٹیشن سے سیدھے طوائفوں کے بازار چاوڑی کا رخ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ کوچوان نے جواب میں صرف مسکرا دینا کافی سمجھا۔ آخر میں نے کرپا رام کے ہفت روزہ کا بورڈ

دیکھ لیا۔ اُترا اور دفتر میں داخل ہوا تو میں نے منٹو کو فوراً پہچان لیا۔ مجھے دیکھتے ہی گورا چٹا، دبلا پتلا، بڑی بڑی اور ذہین آنکھوں والا صاف ستھرے سفید کرتے پاجامے میں ملبوس نوجوان میری طرف بڑھا۔ ہم نے معانقہ کیا اور یوں گفتگو شروع کی جیسے ہم ایک دوسرے کو عرصے سے جانتے ہیں۔ تصویروں کے باہمی تبادلے میں ہم نے ایک دوسرے کو ''دیکھ'' بھی لیا تھا اور باہمی خط وکتابت کے ذریعے ایک دوسرے کو پہچانتے بھی تھے۔ شام سے پہلے ہمیں نئی دہلی کے ایک اعلیٰ درجے کے سنیما ہاؤس کی بالائی منزل پر منتقل کر دیا گیا۔ وہاں تین کمرے ہماری تحویل میں تھے۔ میں ایک کمرے میں مکالمے لکھتا رہتا تھا۔ ناشتے اور کھانے وغیرہ کا انتظام تسلی بخش تھا۔ وہیں میں نے دیکھا کہ منٹو وہسکی پیتا ہے مگر یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ اتنی نہیں پیتا کہ اسے سنبھالنا مشکل ہو جائے۔ وہ تازہ دم ہونے کے لئے وہسکی کے ایک پیگ سے وہی کام لیتا تھا جو میں چائے کی ایک پیالی سے لیتا تھا۔ میں نے دس بارہ روز کے قیام کے دوران میں اسے کبھی ''آؤٹ'' نہیں دیکھا بلکہ اس حالت میں اس کی ذہانت دوچند ہو جاتی تھی اور وہ بعض ادیبوں اور شاعروں کے اندازِ گفتگو کی نقلیں خوب اُتارتا تھا۔ انہی دنوں سنیما ہال کے ''بار'' میں عاشق حسین بٹالوی سے ملاقات ہوئی تو منٹو ان کی آواز اور ان کے انداز کی ایسی ہو بہو نقل کرنے لگا تھا کہ حیرت ہوتی تھی۔

میں مکالمے اور گانے لکھنے میں اور وہ میرے مکالمے اور گانے ٹائپ کرنے اور بعض مقامات کی تصحیح میں مصروف تھا۔ جب منٹو نے ذرا سی تشویش کی حالت میں کہا کہ ''میں مصوّر کے لئے ہفتہٴ رواں کا میٹیریل تو دے آیا تھا مگر اب میرے پاس نئے شمارے کے لئے اداریہ اور ادارتی نوٹ اور مزاحیہ کالم ''بال کی کھال'' لکھنے کا وقت ہی نہیں۔ کیوں نہ شاہد لطیف کو بلالوں۔ وہ علیگڑھ میں موجود ہے اور میرا پرانا دوست ہے۔''

اس وقت شاہد لطیف اور عصمت چغتائی کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ شاہد لطیف آیا۔ منٹو نے اسے ''مُصوّر'' کا اداریہ اور کالم لکھنے کے لئے الگ کمرے میں بٹھا دیا اور ہم دونوں اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔ دو ایک گھنٹے کے بعد منٹو نے شاہد لطیف سے اس کے کام کی رفتار کا پوچھا تو وہ بولا ''یار منٹو!۔۔۔ مجھ سے تو ابھی ایک سطر تک نہیں لکھی جا سکی۔ میں نے اس طرح کا کام کبھی نہیں کیا نا''۔ منٹو نے ناگواری

''مصور'' کا اداریہ اور ادارتی نوٹ اور مزاحیہ کالم'' ''بال کی کھال'' لکھ کر منٹو کے حوالے کر دیئے ...
نے اس کے مطالعے کے بعد اعلان کیا کہ ''مزہ آگیا۔'' پھر شاہد لطیف کو تنگ کرتا رہا کہ پنجابی ذہن کتنا الرٹ اور ترقی یافتہ ہے اور تم اُردو والے کولہو کے بیل ہو۔۔۔شاہد سنتا رہا اور ہنستا رہا۔ دو روز کے بعد وہ واپس علی گڑھ چلا گیا۔

ایک اور موقعے پر بھی منٹو کی پنجابیت کی رگ پھڑکی تھی۔ شاہد احمد دہلوی نے جب سنا کہ میں دہلی میں ہوں اور منٹو کے ہاں ٹھہرا ہوں تو انہوں نے ہم دونوں کو اپنے ہاں دعوت پر بلایا۔ اس دعوت میں دہلی کے اُس دور کے سبھی قابلِ ذکر اہلِ قلم موجود تھے۔ ظاہر ہے شعر و ادب کے موضوعات پر اُردو میں گفتگو ہوتی رہی مگر جب منٹو اور میں آپس میں کوئی بات کرتے تھے تو پنجابی میں کرتے تھے۔ شاہد صاحب نے اس کا بُرا مانا۔ بولے'' آپ دونوں اُردو کے ادیب ہیں۔ ہم سے اُردو ہی میں بات چیت کر رہے ہیں مگر آپس میں پنجابی بول رہے ہیں۔۔۔اُردو بولیے۔'' منٹو کو یہ بات بُری لگی۔ شاہد احمد سے مخاطب ہو کر کہنے لگا'' شاہد صاحب! پنجابی اُردو سے زیادہ قدیم زبان ہے اور اس کا ذخیرۂ الفاظ بھی اُردو سے زیادہ ہی ہوگا۔ مثال کے طور پر اگر میں ایلومونیم کا یہ کٹورا سمینٹ کے فرش پر گراؤں تو پنجابی میں اسے'' چب'' پڑ جائے گا۔ اُردو میں کیا پڑے گا؟''۔۔۔۔ دوستوں نے اُردو کے ایک سے زیادہ الفاظ پیش کئے مگر سب'' چب'' کے مقابلے میں ہار گئے اور منٹو اتنا خوش ہوا جیسے اس کے ہاتھ میں فتح کا جھنڈا آگیا ہے اور وہ اسے ادبائے دہلی کے سروں پر لہرا رہا ہے!

اُس وقت تک منٹو اور کرشن ایک دوسرے کے لئے اجنبی تھے چنانچہ جب کرشن'' نئے زاویے'' کی پہلی جلد مرتب کرنے لگا تو میرے پاس آیا اور منت کی کہ منٹو کا ایک تازہ افسانہ دلوا دو۔ میں نے منٹو سے درخواست کی تو اس نے فوراً اپنا شاہکار افسانہ'' ہتک'' مجھے بھجوا دیا اور کہا کہ لکھنے کے بعد میں نے اسے دیکھا نہیں۔ تم دیکھ لینا۔ کوئی لفظ رہ گیا ہو تو لکھ دینا اور یہ کرشن کے حوالے کر دینا۔ کرشن یہ افسانہ پا کر بے حد خوش ہوا تھا۔ بعد میں منٹو کو کرشن سے لگاؤ تو یقیناً پیدا ہو گیا مگر اُردو کے بڑے افسانہ نگاروں میں سے وہ راجندر سنگھ بیدی کو اپنے ذہن کے زیادہ قریب سمجھتا تھا۔

اس کے پاس ایک پورٹیبل اُردو ٹائپ رائٹر تھا۔ وہ اسے بریف کیس کی طرح اٹھائے پھرتا رہتا۔ ریڈیو سٹیشن پر لکھنے کے بجائے ٹائپ کرتا تھا۔ میرے سامنے کا واقعہ ہے کہ ریڈیو سٹیشن کا آئندہ ماہ کا پروگرام مرتب ہو رہا تھا جب منٹو سے پوچھا گیا کہ اس کے آئندہ ریڈیو ڈرامے کا عنوان کیا ہوگا۔ منٹو سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا ''کبوتری'' لکھ لیجئے۔ بعد میں اس نے بتایا کہ محض عنوان کے حوالے سے اسے پورا ڈرامہ لکھنا پڑ گیا تھا۔ اس کے ساتھ اکثر یہی ہوا کہ عنوان پہلے دے دیا اور بعد میں اس عنوان کے گرد ڈرامے کی عمارت تعمیر کی۔

جب منٹو ریڈیو سے وابستہ ہوا تو کرشن چندر، راشد، اوپندر ناتھ اشک اور کئی دوسرے معروف شاعر اور ادیب ریڈیو سروس میں ملازم تھے۔ انہی دنوں منٹو اور کرشن چندر نے ایک فلمی کہانی ''بنجارا'' لکھی۔ اس کا سکرین پلے اور مکالے بھی مکمل کر لیے۔ مجھے ملتان سے اس کے گیت لکھنے کے لئے بلوا بھیجا۔ منٹو کا وہ چھوٹا سا مگر صاف ستھرا مکان مجھے اب تک یاد ہے۔ منٹو جس کمرے میں بیٹھ کر لکھتا تھا وہ مختصر تو تھا مگر انتہائی سادگی اور خوش ذوقی کا نمونہ تھا۔ منٹو میز کرسی کی بجائے فرش پر بیٹھ کر اور سامنے ایک ڈیسک رکھ کر لکھتا تھا۔ ڈیسک کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ وہ اس میں وہسکی مقفل کر دیتا تھا۔ اُن دنوں منٹو کی بڑی بہن اس کے ہاں ٹھہری ہوئی تھیں۔ ان کی چھوٹی سی پیاری سی بیٹی جب بھی ماموں ماموں پکارتی ہوئی آتی تو وہسکی کی بو فوراً سونگھ لیتی اور کہتی ''ماموں گندے، ماموں گندے!'' منٹو گھبرا کر کوئی چیز اس کے حوالے کر کے کمرے سے نکال دیتا اور کہتا ''یہ لڑکی مجھے باجی کے سامنے شرمندہ کرائے گی!''

بنجارا کے میوزک ڈائریکٹر فیروز نظامی تھے۔ وہ بھی ریڈیو ہی سے متعلق تھے۔ انہوں نے میرے لکھے ہوئے گانے بہت پسند کئے۔ بہزاد لکھنوی بھی ریڈیو سے وابستہ تھے۔ جب انہوں نے میرے لکھے ہوئے گیت سنے اور منٹو نے بتایا کہ ندیم نے دو دنوں میں یہ دس خوبصورت گیت لکھ ڈالے ہیں تو بہزاد صاحب کو یقین نہیں آیا تھا۔ البتہ جب کرشن چندر نے تائید کی تو تب انہوں نے میرے ساتھ گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔

اب منٹو، کرشن اور مجھے ''منورنجن پکچرز'' کے مالک سیٹھ کے پاس جا کر یہ گیت سنانے تھے اور کہانی،

مکالموں اور گیتوں کا مشترکہ چیک وصول کرتا تھا۔ اُن دنوں روپے کی قیمت آج کے روپے سے ایک سوگنا زیادہ تھی چنانچہ ہمیں کہانی' مکالموں اور گانوں کے دو ہزار روپے ملنے تھے اور یہ خاصی بڑی رقم تھی۔ منٹو نے مجھے سمجھایا کہ ''اگر سیٹھ کسی لفظ پر تمہیں ٹوکے تو فوراً مان جانا۔ تم شاعروں کی انا بہت تیز ہوتی ہے۔ اس سے بحث نہ کرنے لگنا ورنہ معاوضے کی رقم کھٹائی میں پڑ جائے گی۔ وہ جو بھی کہے' تم کہنا کہ آپ کا ارشاد بالکل درست ہے!''

سیٹھ نوجوان تھا مگر اس پر چربی اتنی افراط سے چڑھی ہوئی تھی کہ اس کی ٹھوڑی سے اس کے گھٹنوں تک ایک خاصا بڑا گنبد ابھرا ہوا تھا۔ میں نے گیت سنائے۔ اس نے پسند کیے مگر ایک لفظ پر اٹکا۔ بولا ''تمنا و منا کو چھوڑو۔ یہاں آشا رکھو' تمنا کو سنیما ہال کی چھوٹی کلاس والا نہیں سمجھے گا۔'' میں نے منٹو کے مشورے کے مطابق کہنا چاہا کہ آپ کا ارشاد درست ہے مگر مجھ سے پہلے منٹو بول پڑا۔ ''سیٹھ صاحب یہاں تمنا ہی ٹھیک ہے۔ جس چیز کا علم نہ ہو اس پر نہیں بولا کرتے۔ یہ شاعری ہے' کھتونی نہیں ہے' آشا واشا نہیں چلے گا۔ تمنا ہی ٹھیک ہے اور اگر نہیں ہے ٹھیک تو ہمیں اجازت دیجیے۔'' سیٹھ گھبرا گیا۔ بولا ''تم بات بہت چیخ کر کرتا ہے منٹو۔ اور اتنی بڑی بڑی آنکھیں نکال کر کرتا ہے کہ تم سے ڈر لگتا ہے۔ چلو تمنا ہی رہنے دو۔ آگے چلو۔'' دو ہزار روپے کا بیئرر چیک لے کر ہم سیٹھ کے بنگلے سے نکلے تو منٹو نے اسے فوراً کیش کرانے کے عزم کا اظہار کیا کرشن نے کہا کہ اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ کل کیش کرالیں گے جبکہ ندیم کو ابھی تین چار روز کے بعد رخصت ہونا ہے۔ مگر منٹو بولا ''تم فلمی سیٹھوں کی ذہنیت سے واقف نہیں ہو۔ کیا پتہ وہ اپنی نیت بدل لے۔ ایک منٹ کی تاخیر کا خطرہ بھی مول نہیں لینا چاہیے۔ اور پھر ندیم کو اس گھیرے دار شلوار اور اس کی مولویانہ شیروانی سے بھی چھٹکارا دلانا ہے۔ ندیم کے حصے کی رقم سے اس کے لئے کوٹ پتلون کا کپڑا خرید کر فوراً ٹیلر ماسٹر کے حوالے کرنا ہے۔ یہ اتنی بھاری شلوار پھڑکاتا ہوا جب ہمارے ساتھ چلتا ہے تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ بڑا جاگیردار ہے اور ہم اس کے مزارعے ہیں!''

چاندنی چوک کے ایک بنک سے چیک کیش کرایا گیا۔ برابر برابر کا تقسیم کا مرحلہ آیا تو منٹو نے کہا کہ ہم مقامی ہیں اس لئے کرشن اور میں چھ سو ساٹھ' چھ سو ساٹھ لیں گے۔ ندیم ملتان سے آیا ہے اس لئے اس کے حصے میں چھ سو اسی روپے آئیں گے۔ پھر ہم تینوں کپڑے کی ایک دکان پر گئے۔ میرے لئے کوٹ

پتلون کا کپڑا خریدا گیا۔ پھر یہ کپڑا درزی کے حوالے کیا گیا اور جب ہم منٹو کے گھر پہنچے تو وہاں سیٹھ صاحب کا منشی موجود تھا۔ وہ بولا "سیٹھ نے کہا ہے ہم نے فلم بنانے کا پروگرام ملتوی کر دیا ہے۔ چیک واپس کر دیجئے۔ خبر ہے کہ جاپان بھی جنگ میں کود پڑا ہے اور اس نے پرل ہار بر پر امریکہ کے سمندری جہازوں کی ایسی تیسی پھیر دی ہے" تب منٹو نے فاتحانہ انداز سے ہم دونوں کی طرف دیکھا۔ پھر سیٹھ کے منشی سے کہا "سیٹھ سے کہو کہ اس کے چیک کی پرل ہار بر پر بھی حملہ ہو چکا ہے اور وہ کیش ہو کر خرچ بھی ہو چکا ہے۔۔۔۔" اور کرشن اور میں حیران ہوتے رہے کہ منٹو کس بلا کا دوراندیش ثابت ہوا ہے!

آل انڈیا ریڈیو دہلی نے جدید اُردو شعراء کو اپنے ہاں مدعو کیا اور ایک یادگار مشاعرہ براڈ کاسٹ کیا۔ اس مشاعرے میں جو شعراء شامل تھے ان میں سے مجھے جن اصحاب کے نام یاد ہیں وہ یہ ہیں: فیض، راشد، میرا جی، تاثیر، حفیظ جالندھری، تصدق حسین خالد، اسرار الحق مجاز، روش صدیقی۔ میں بھی مدعو تھا۔ میں نے اپنی ابتدائی نظم "نیا سازنئی تان" پڑھی۔ مشاعرے کے بعد منٹو جہاں بھی بیٹھتا تھا' یہی اعلان کرتا تھا کہ ندیم کی نظم سب سے بہتر تھی۔ یہ سب منٹو کی محبت کی کارفرمائی تھی۔

اس مشاعرے سے پہلے مدعو شعراء کے اعزاز میں پطرس بخاری مرحوم نے (جو اُس وقت آل انڈیا ریڈیو کے شاید ڈائریکٹر جنرل تھے) ریڈیو اسٹیشن کے وسیع لان میں ایک ظہرانہ دیا۔ دہلی کے تمام قابل ذکر اہم قلم اور بے شمار امراء ورؤسا وہاں موجود تھے۔ ایک الگ میز پر منٹو' کرشن' راشد اور دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ میں بھی موجود تھا۔ اچانک منٹو نے حفیظ جالندھری کا ذکر چھیڑ دیا اور بولا: "اسے اپنے بڑا ہونے کا بہت زعم ہے۔ میں اس کا یہ زعم توڑنا چاہتا ہوں۔ اس نے اتنے بہت سے لوگوں کے سامنے مجھے یوں مخاطب کیا ہے جیسے میں ابھی اسکول کا بچہ ہوں اس نے مجھے "منٹو صاحب" کہنے کی بجائے کہا: "کیسے ہو برخوردار سعادت"۔۔۔ یعنی میں ابوالاثر ہوں اور تم برخوردار ہو۔ ذرا دیکھنا میں اس کی کیسے خبر لیتا ہوں" یہ کہہ کر وہ اس مرکزی میز کے پاس گیا جہاں بخاری صاحب کے ساتھ حفیظ صاحب اور دیگر سینئر شعرا کے علاوہ دہلی کے شرفا بھی موجود تھے۔ وہ چھوٹتے ہی بولا "حفیظ صاحب آپ کے ایک شعر نے مجھے بہت دنوں سے پریشان کر رکھا ہے۔ اس میں اتنی گہرائیاں اور ساتھ ہی اتنی بلندیاں ہیں کہ میرا ذہن اس کے مفہوم کو گرفت میں لانے سے قاصر ہے۔ مجھے تو یہ فلسفیانہ شعر معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہو تو

مجھے اس کا مطلب سمجھا دیجئے۔'' حفیظ صاحب منٹو کے اس اسلوبِ گفتگو سے بہت خوش ہوئے۔ بولے ''ہاں برخوردار سعادت! بولو۔ وہ شعر کون سا ہے؟'' اور منٹو بولا ''شاہنامۂ اسلام کا شعر ہے مگر نہایت گمبھیر ہے۔ اور شعر یہ ہے:

یہ لڑکا جو کہ لیٹا ہے، وہ لڑکی جو کہ لیٹی ہے

یہ پیغمبر کا بیٹا ہے' وہ پیغمبر کی بیٹی ہے!

حفیظ صاحب فوراً منٹو کی نیت تک پہنچ گئے۔ اُٹھ کھڑے ہوئے اور خود اپنے آپ کو بُرا بھلا کہنے لگے۔ بخاری صاحب نے بڑی مشکل سے انہیں خاموش کرایا اور منٹو ہمارے پاس واپس آ کر بولا: ''برخوردار سعادت کا کمال دیکھا!''

اسی طرح ایک بار اسے مولانا چراغ حسن حسرت کو چھیڑنے کی سوجھی۔ مولانا اُردو خبروں کے شعبے سے وابستہ تھے۔ منٹو، کرشن' میرا جی' دو ایک دوسرے اصحاب اور میں مولانا کے پاس پہنچے۔ انہوں نے ہماری مدارات کی۔ چائے منگوائی' اور ہماری سعادت مندی کی تعریف کرنے لگے۔ تب منٹو نے انہیں چھیڑنے کے لئے مودبانہ عرض کیا۔ ''حسرت صاحب! یہ جو علامہ اقبالؒ کی شاعری ہے' تو کیا یہ واقعی شاعری ہے؟ مجھے تو وعظ سا معلوم ہوتی ہے''۔ بس پھر کیا تھا' حسرت صاحب نے منٹو کو اور ساتھ ہی ہم سب کو ایسی کھری کھری سنائیں اور علامہ اقبالؒ کی عظمتوں کا ایسا قصیدہ پڑھا کہ ہم ان کی مدارات کو ادھورا چھوڑ کر بھاگ آئے۔

مولانا چراغ حسن حسرت اور منٹو کے درمیان مجھے ایک اور چپقلش یاد آ رہی ہے۔ فیض صاحب ایم۔ اے۔ او کالج امرتسر کے طلباء کی ایک ٹیم کو علیگڑھ یونیورسٹی دکھانے جا رہے تھے۔ دہلی میں رُکے تو منٹو نے ان کے اعزاز میں ایک ہوٹل میں ایک محفل ناؤنوش برپا کی۔ دہلی ریڈیو سے وابستہ سبھی شعراء واد با وہاں موجود تھے۔ شراب نوشی کا آغاز ہوا تو مولانا حسرت نے مجھ سے پوچھا۔ ''کیا آپ نہیں پیتے؟'' میں نے عرض کیا ''جی نہیں۔'' بولے' ہاں آپ تو مسجد شاہی کے خطیب مولانا غلام مرشد کے بھائی ہیں نا۔ بہرحال آپ اگر اس محفلِ کفار میں شریک ہیں تو کوئی کام اپنے ذمے لیجیے۔ سوڈے کی بوتلیں ہی کھول

دیا کیجئے ...'' ... محفل کا آغاز ہوا۔ جب گپ شپ عروج پر پہنچی تو

حسرت صاحب نے فرمایا ''خوش قسمتی سے اتنے اچھے اچھے شاعر موجود ہیں۔ ایک ایک غزل ہو جائے۔'' شعراء کے غزلیں سنانے کا دور ختم ہوا تو حسرت صاحب نے کہا ''ایک ایک غزل اَور۔'' منٹو بولا ''نہیں، غزل نہیں، اب نظم کا دور ہے۔ آخر راشد سے بھی تو کچھ سننا ہے۔'' حسرت صاحب بولے ''وقت آنے والا ہے جب آگے آگے قافیہ ہوگا اور پیچھے پیچھے راشد صاحب لپکے آرہے ہوں گے مگر قافیہ انہیں پکڑائی نہیں دے گا۔ جب وہ قافیہ پکڑ لیں گے تو ان سے بھی غزل سن لیں گے۔ فی الحال ایک ایک غزل اور ہو جائے۔'' منٹو نے ضد کی کہ نہیں، اب نظم ہوگی، حسرت صاحب گرجے ''غزل ہوگی۔'' منٹو کڑکا ''نظم ہوگی۔'' دونوں نے غزل ہوگی، نظم ہوگی کی رٹ لگا دی اور بدقسمتی سے دونوں مجھ سے مخاطب تھے۔ کہیں تحت الشعور میں جانتے تھے کہ محفل میں صرف یہ شخص ہوش میں ہے۔ دونوں شدید غصے میں تھے۔ منٹو کشمیری ہونے کے باوجود بولا ''اگر میرے پاس کوئی ایسی کیمیائی چمٹی ہو جس کی مدد سے تمہارے دماغ میں سے رتن ناتھ سرشار کے فسانۂ آزاد کے سارے محاورے اور روزمرے نکال دوں، تو تم سیدھے سادے ''ہاتو'' بن کر رہ جاؤ۔'' تب حسرت صاحب نے کہا۔ ''سومرسٹ مائم کے نقلچی! دو چار افسانچے کیا لکھ لیے کہ ہم بڑوں کے منہ آتے ہو۔۔۔۔'' تب میں نے حسرت صاحب کی منت کی کہ خدارا غصہ تھوک دیجئے۔ پھر منٹو سے عرض کیا کہ سارا ہوٹل آپ کی تیز دھار آواز سے گونج رہا ہے اور مہمانِ خصوصی فیض صاحب کی پوزیشن خراب ہو رہی ہے۔ اور پھر کچھ بھی ہو، حسرت صاحب عمر میں تو آپ کے سینئر ہیں۔ تب میں دونوں کا معانقہ کرانے میں کامیاب ہوگیا اور قہقہوں کے درمیان یہ دعوت ختم ہوئی۔

ریڈیو اسٹیشن پر بھی لوگ منٹو سے محبت کرتے تھے مگر وہ کبھی کو چھیڑنے سے باز نہیں آتا تھا۔ ایک بار ن۔م۔راشد سے کہنے لگا ''تم جب کہتے ہو کہ اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے، تو کیا کبھی تم نے مغربی رقص کیا ہے؟ میں نے کیا ہے اس لیے آؤ۔ میرے ساتھ دو چار سٹیپس (Steps) رقص کرو۔ ابھی بھرم کھل جائے گا۔'' کرشن چندر پر نظر پڑتی تھی تو کہتا تھا ''یہ شخص ہر انسان کو خوش رکھنا چاہتا ہے۔ بھئی کسی کے ساتھ تو تھوڑی بہت کشیدگی بھی ہونی چاہئے۔ کرشن، تم تو [illegible]

اس کے پاس بیٹھا تھا جب اس دور کا ایک معروف شاعر وشوامتر عادل مجھ سے ملنے آیا، بولا ''جب میں نے سنا کہ آپ دہلی آئے ہوئے ہیں اور منٹو کے ہاں ٹھہرے ہیں تو میں ایک لفظ کا تلفظ معلوم کرنے حاضر ہوگیا۔ یہ بتایئے کہ لفظ گنڈیری ہے یا ڈال پر تشدید ہے اور اسے گنڈّیری لکھنا چاہیے۔'' منٹو نے پوچھا کہ یہ لفظ کہاں استعمال کرو گے۔ عادل نے بتایا کہ یہ لفظ اس کی ایک نظم میں وارد ہو رہا ہے۔ عادل بھی شاید ریڈیو ہی سے وابستہ تھا اس لئے منٹو بے تکلفی سے بولا ''احمق آدمی! جس نظم میں تم گنڈیری لاؤ گے، وہ بھی کوئی نظم ہوگی؟ تم شاعری کے بجائے گنڈیریوں کا خوانچہ کیوں نہیں لگا لیتے!''

میں ۱۹۴۶ء میں آل انڈیا ریڈیو پشاور سے وابستہ ہوگیا۔ وہاں میرا کام وہی تھا جو دہلی ریڈیو میں منٹو انجام دیتا رہا تھا۔ قیامِ پاکستان سے کچھ پہلے یا کچھ بعد منٹو لاہور آ گیا تو مجھے لکھا کہ وہ ایک دوست کے ہمراہ پشاور آ رہا ہے۔ وہ آیا اور اپنے دوست کے ساتھ میرے پاس ہی ٹھہرا۔ اس کا یہ دوست امرتسر کے ایک معروف کاروباری خاندان کا فرد تھا۔ ان دونوں نے شاید کسی الاٹمنٹ کے سلسلے میں پشاور کا سفر اختیار کیا تھا۔ میں نے منٹو کی ہر ممکن مدارات کی اور شام سے پہلے اس کے لئے وہسکی کا بھی بندوبست کیا۔ اس کے بعد وہ جب بھی مجھ سے ملا، یہی کہتا تھا کہ ''آخر وہسکی کی بوتل خریدنے کا جرمانہ تمہیں کیوں ادا کرنا پڑے جب کہ تم ایک قطرہ چکھنے کے بھی گنہگار نہیں ہو۔ میرے حالات سدھر جائیں تو میں تمہیں وہسکی کی اس پشاور والی بوتل کی قیمت ہر صورت میں ادا کروں گا۔'' میں نے ہمیشہ منت کی کہ منٹو صاحب، آپ مجھے کانٹوں میں کیوں گھسیٹتے ہیں۔ اور وہ کہتا تھا کہ ''کانٹوں میں تو میں گھسٹ رہا ہوں!'' ہم سب جانتے ہیں کہ کسی بھی شراب نوش سے اس انتہا کی خوش اخلاقی کی توقع نہیں کی جا سکتی، مگر یہ منٹو تھا۔ منفرد اور سربرآوردہ۔ وہ پشاور میں تین روز میرے ہاں رُکا۔ میرے ہمراہ ریڈیو اسٹیشن پر بھی جاتا رہا۔ وہاں کے ڈائریکٹر سجاد سرور نیازی سے بھی اس کا تعارف تھا اور پھر وہاں ن۔م۔ راشد اور حمید نسیم بھی موجود تھے۔ دلچسپ محفلیں رہیں، میرے اندازے کے مطابق منٹو الاٹمنٹ کی اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا ورنہ اسے گزر بسر کے لئے بعد میں اپنے افسانے اونے پونے نہ بیچنے پڑتے۔

میں بھی ۱۹۴۸ء کے شروع میں لاہور آ گیا۔ یہاں میں نسبت روڈ پر اپنی منہ بولی بہنوں ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور کے خاندان کے ساتھ، اس خاندان کے ایک فرد کی حیثیت سے پندرہ سولہ برس

مقیم رہا۔ منٹو یہاں کئی بار مجھ سے ملنے آیا۔ میں ۱۹۴۸ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین پنجاب کا سیکریٹری تھا۔ منٹو کے ہاں میں جب بھی گیا' وہاں محمد حسن عسکری کو موجود پایا۔ عسکری ترقی پسند ادب کی تحریک کے سخت مخالف تھے اس لئے مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ وہ روشن خیال منٹو کو فرانس کے منفیت پسندوں اور لا یعنیت نوازوں سے متاثر کرنے کی کوشش کریں گے' چنانچہ میں نے پشاور سے فارغ بخاری اور رضا ہمدانی کی ادارت میں شائع ہونے والے مشہور ادبی رسالے ''سنگِ میل'' میں ''منٹو کے نام'' ایک کھلا خط لکھا جس میں منٹو کی حیرت انگیز تخلیقی صلاحیتوں کے اعتراف کے ساتھ ہی میں نے اسے خبردار کیا کہ وہ عسکری کے بے معنویت اور ساتھ ہی ماورائیت کے رجحانات سے متاثر نہ ہو۔ منٹو میرا یہ خط پڑھے بغیر' غصے میں بھرا ہوا میرے ہاں آیا۔ اس نے اندر کمرے میں بیٹھنے سے بھی انکار کردیا۔ دروازے ہی میں کھڑے کھڑے اس نے اپنی چیختی ہوئی آواز میں کہا ''تم نے مجھے کھلا خط لکھا ہے نا احمد ندیم قاسمی' میں تمہارے نام بند چٹھی لکھوں گا۔'' (وہ مجھے ہمیشہ میرے پورے نام سے مخاطب کرتا تھا) میں نے کہا کہ آپ جو چاہیں لکھیں مگر کیا آپ نے میرا یہ خط پڑھا بھی ہے؟ معلوم ہوا کہ اس نے خط تو نہیں پڑھا مگر اسے اس کے بعض دوستوں نے بتایا ہے کہ میں نے اس خط میں اس کے خلاف زہر اگلا ہے۔ میں لپک کر ''سنگِ میل'' کا وہ شمارہ اٹھا لایا جس میں منٹو کے نام میرا خط چھپا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ اسے پڑھنے کے بعد جو چاہیں کہئے گا یا لکھئے گا۔ منٹو رسالہ لے گیا۔ دو تین روز کے بعد میں خود لکشمی مینشنز میں اس کے گھر گیا اور پوچھا ''میرا لکھا خط پڑھ لیا آپ نے؟'' منٹو کے چہرے پر سکون تھا اور آسودگی کی مسکراہٹ تھی۔ بولا ''ہاں پڑھ لیا۔ نرا فراڈ ہے!'' (فراڈ منٹو کا محبوب لفظ تھا) میں سمجھ گیا کہ منٹو میرا خط پڑھ کر خوش ہوا ہے۔ وہ مجھے ڈرائنگ روم میں لے گیا اور چائے سے میری مدارات کی۔ کہنے لگا مجھے اتنا کمزور نہ سمجھو کہ میں عسکری کی منفیت پسندی کے وعظ یا تمہارے ترقی پسندی کے لیکچر سے متاثر اور مرعوب ہو سکتا ہوں۔ میں وہی لکھتا رہوں گا جو میں دیکھتا ہوں اور سوچتا ہوں اور محسوس کرتا ہوں۔ عسکری شریف آدمی ہے' دروازے پر آواز دیتا ہے ''میاؤں'' یعنی میں آجاؤں۔ کچھ دیر وہ میری کسی ننھی بچی سے لاڈ پیار کرتا ہے۔ پھر اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور کہتا ہے ''میاؤں'' یعنی میں جاؤں!۔۔۔ اور تم کہتے ہو کہ وہ مجھے بھٹکا رہا ہے!''۔۔۔۔۔

اُس روز میں نے منٹو کو بہت خوش دیکھا۔ اس نے ایک واقعہ بھی سنایا: ''ایک عقیدت مند میرے پاس روزانہ آتا ہے اور میرے سارے سگریٹ پی جاتا ہے۔ آج میں ہیڈن روڈ سے سگریٹ کا نیا پیکٹ خرید کر گھر آیا تو فوراً بعد دروازے پر سے اس عقیدت مند کی آواز آئی۔ میں نے سگریٹوں کا نیا نویلا بھرا ہوا پیکٹ نیچے فرش پر پھینک دیا۔ پھر اسے اندر بلایا۔ بیٹھتے ہی اس نے سگریٹ طلب کیا۔ میں نے کہا پیکٹ ابھی ابھی ختم کر کے پھینکا ہے۔ وہ پڑا ہے۔ وہ بولا ''کوئی بات نہیں، کبھی کبھار سگریٹ پئے بغیر بھی آپ سے گفتگو کرنی چاہئے۔'' وہ گفتگو کرتا رہا۔ پھر جانے کے لئے اٹھا۔ دروازے پر جا کر پلٹا اور فرش پر پڑا ہوا سگریٹ کا پیکٹ اٹھا کر یہ کہتے ہوئے جیب میں ڈال لیا۔ ''بچے کھلیں گے۔۔۔'' ہم دونوں اس واقعے پر خوب ہنسے اور بعد میں ہماری اس ہنسی میں صفیہ بھابھی بھی شامل ہو گئیں۔

میں منٹو کی صفائی پسندی کا ذکر تو کر چکا ہوں۔ ایک روز وہ میرے گھر آیا۔ میں نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا جو آج کل شاعر خالد احمد کا ڈرائنگ روم ہے۔ سگریٹ پیتے ہوئے اس نے کمرے کی دیواروں کو حیرت سے دیکھا اور بولا ''یہ سفیدی کس نے کی ہے؟'' میں نے کہا ''سفیدی کرنے والے نے کی ہے۔ اور کون کرتا۔'' منٹو نے کہا ''نہایت نالائق آدمی تھا کہ جہاں جہاں سے برش گزرا، اپنے نقوش چھوڑتا چلا گیا۔ سارے کمرے کا ناس مار دیا اس کم بخت نے۔ تم شاعر ہو کر بھی ایسے بیہودہ کمرے میں بیٹھے ہو۔ اِدھر آؤ میرے ساتھ۔'' منٹو اٹھ کھڑا ہوا اور مجھے بازو سے کھینچتا ہوا باہر لے آیا۔ ''چلو آؤ۔'' میں نے پوچھا ''کہاں منٹو صاحب؟'' بولا ''تم چلو تو سہی۔'' وہ مجھے اپنے گھر لے آیا اور ڈرائنگ روم کی دیواریں دکھا کر بولا ''اسے کہتے ہیں سفیدی۔'' واقعی دیواروں پر نہایت معیاری سفیدی ہوئی تھی۔ پھر منٹو نے کہا ''جانتے ہو یہ سفید کس نے کی؟ میں نے کی۔'' میں نے شبے کا اظہار کیا تو وہ اندر سے صفیہ بہن کو بلا لایا انہوں نے کہا۔ ''یہ سفیدی سعادت ہی نے کی ہے۔ میں روکتی رہی مگر وہ کہتے رہے کہ دیکھتی جاؤ۔ ایسی نفیس سفیدی کروں گا جیسا نفیس افسانہ لکھتا ہوں۔'' اور منٹو میرے افسانوں کا حوالہ دیئے بغیر بولا۔ ''اور میں ندیم کے ہاں ایسی سفیدی دیکھ کر آ رہا ہوں جیسے کسان نے کھیت میں ہل چلایا ہو!''

صفیہ بہن نے میرا بہت دفاع کیا مگر ان کی کوشش بیکار رہی کیونکہ انہوں نے میرے کمرے کی سفیدی دیکھی نہیں تھی۔ اس سے چند سال پہلے بھی بہن نے دہلی میں بڑی استقامت سے میرا دفاع کیا

میں رسالہ ''ساقی'' (دہلی) کے لئے اپنا ایک افسانہ ''السلام علیکم'' ساتھ لایا تھا۔ شاہد صاحب کے ہاں جانے سے پہلے منٹو نے اسے پڑھا مگر اس کا آخری پیرا پڑھ کر مجھ سے باقاعدہ الجھنے لگا۔ ''یوں ختم کی جاتا ہے اتنا عمدہ افسانہ؟ یوں بیڑا غرق کیا جاتا ہے ایسی اچھی تحریر کا؟ تم نے تو انجام تک پہنچ کر سارے افسانے کا ناس مار دیا۔'' صفیہ نے منٹو کی اس تنقید کا بہت بُرا مانا۔ ایک تو میں ان کا مہمان تھا۔ پھر منٹو کا ہم سن افسانہ نگار تھا۔ صفیہ بہن منٹو سے لڑائی پر تل گئیں۔ میں نے بھی اپنا نقطۂ نظر واضح کیا مگر منٹو نے ہماری ایک نہ مانی اور قلم ہاتھ میں لے کر میرے افسانے کا آخری صفحہ لکھ ڈالا۔ پھر بولا ''اب پڑھو۔'' میں نے پڑھا تو واقعی افسانہ تاثر کے لحاظ سے کہیں سے کہیں پہنچ گیا تھا۔ (منٹو کا مکمل کیا ہوا میرا یہ افسانہ میرے افسانوں کے مجموعے ''بگولے'' میں شامل ہے)۔

میں ''نقوش'' کے لئے منٹو سے افسانہ لینے گیا تو اس نے دو تازہ افسانے میرے حوالے کر دیئے۔ ایک ''ٹھنڈا گوشت'' اور دوسرا ''کھول دو۔۔۔'' بولا ''دونوں پڑھ لو۔ جو اچھا لگے وہ لے جاؤ۔ اگر ان میں سے کسی کے خلاف مقدمے کا خوف ہو تو یہ خوف ابھی سے ختم کر دو کیونکہ میں نے اپنے عزیز پروفیسر سعید اللہ سے بات کر رکھی ہے جو اسلامیہ کالج میں نفسیات کے استاد ہیں۔ وہ ہائی کورٹ تک میرا تمہارا دفاع کریں گے۔'' میں نے ''کھول دو'' پسند کیا اور اسے ''نقوش'' میں شائع کر دیا۔ اس کے خلاف مقدمہ تو نہ چلا البتہ ''ادبِ لطیف'' اور ''سویرا'' کے ہمراہ ''نقوش'' کو بھی سیفٹی ایکٹ کے تحت چھ ماہ کے لئے بند کر دیا گیا۔ ہر خیال کے ادیبوں نے اس بندش کی مخالفت کی۔ محمد حسن عسکری نے بھی پابندی اٹھوانے کی جدوجہد میں ہمارا ساتھ دیا۔ منٹو، عسکری اور میں حکومت کی پریس برانچ والوں سے بھی ملے مگر حکومت نے پابندی جاری رکھی۔

نومبر ۱۹۴۹ء میں لاہور کے اوپن ایئر تھیٹر میں کل پاکستان انجمن ترقی پسند مصنفین کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ اس میں انتہا پسندوں نے انتہا کر دی۔ جن بہت سے نامور ادباء و شعراء کے بائیکاٹ کی قرار داد، میری انفرادی مخالفت کے باوجود منظور کی گئی اس میں منٹو کا نام بھی شامل تھا۔ (عصمت کا نام شامل نہیں تھا۔ عصمت تو ترقی پسند ادب کی تحریک میں عملاً شامل تھیں۔ ان کے بائیکاٹ کا سوال ہی پیدا

نہیں ہوتا تھا)

منٹو نے اس بائیکاٹ کا شدید اثر لیا۔ ایک تو اس لئے کہ میں' اس کا دوست اس کانفرنس میں انجمن کا جنرل سکریٹری منتخب ہوا تھا۔ اور پھر اس لیے بھی کہ قرارداد کے ذریعے منٹو کو بالواسطہ طور پر فحش نگار اور رجعت پسند قرار دے ڈالا گیا تھا۔ میں منٹو کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہا تھا۔ منٹو بھی محمد حسن عسکری کی معیت میں ایک رسالہ ''اُردو ادب'' مرتب کرنے لگا اور اس کے پہلے ہی شمارے میں میری شاعری کے خلاف یوسف ظفر کا ایک مضمون شائع کر دیا جس میں یوسف ظفر نے میرے مجموعۂ کلام ''جلال و جمال'' میں شامل میری تصویر کو بھی ہدف بنایا تھا اور لکھا تھا کہ میں تصویر میں کیمرے کی طرف نہیں دیکھ رہا اس لئے ثابت ہوا کہ میں نے حقائق سے فرار اختیار کر رکھا ہے۔ ایک تقریب میں منٹو سے ملاقات ہوئی تو میں نے اس تنقید کی مضحکہ خیزی کا ذکر کیا۔ منٹو نے جواب دیا ''تم بائیکاٹ کی مضحکہ خیز قراردادیں منظور کراؤ گے تو ہم بھی تم پر مضحکہ خیز تنقید کریں گے۔'' میں نے منٹو کو یقین دلایا کہ میں جنرل سکریٹری ہونے کے باوجود اس قرارداد کا مخالف تھا، البتہ اکثریت کا ساتھ دینا پڑا۔ مگر منٹو یہ جواز ماننے کو تیار نہ تھا۔ پھر جب انجمن نے کراچی میں ۱۹۵۲ء کی کل پاکستان کانفرنس میں یہ قرارداد باقاعدہ واپس لے لی تو منٹو کا غصہ خاصا کم ہوا اور پھر سے ہماری ملاقاتیں ہونے لگیں۔

چند ملاقاتیں یادگار ہیں۔ ایک دن منٹو کسی کام سے میرے گھر آیا۔ اُس وقت عبدالمجید بھٹی مجھے اپنے ایک ناول کا ایک باب سنا رہے تھے منٹو نے مجھ سے بات کی اور جانے کے لئے اٹھا تو بھٹی نے کہا ''منٹو صاحب کچھ دیر تشریف رکھیے۔ میری شاعری سے تو کتابوں کے ناشرین واقف ہیں مگر انہیں معلوم نہیں کہ میں فکشن بھی لکھتا ہوں۔ میں ندیم صاحب کو اپنے ناول کا ایک باب سنا رہا ہوں کہ اگر وہ مناسب سمجھیں تو کسی ناشر سے اس ناول کی اشاعت کا بندوبست کرا دیں۔ آپ بھی سن لیجیے اور مجھے مشورہ دیجئے کہ کیا میرا اسلوب درست ہے یا قابلِ اصلاح ہے۔''

منٹو بولا۔ ''بھٹی صاحب! مجھے بہت اچھی طرح معلوم ہے کہ آپ جب سناتے ہیں تو سناتے ہی چلے جاتے ہیں اور آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں احمد ندیم قاسمی کی طرح احمق نہیں ہوں کہ آپ کے پھیر میں آجاؤں۔'' منٹو تو یہ کہہ کر چلا گیا اور مجھے دیر تک بھٹی سے معذرتیں کرنے کے لئے چھوڑ گیا۔

صرف ایک آدھ روپیہ ہوگا۔ میں نے اس کی منت کی کہ وہ چند لمحے بیٹھے، میں محلے میں کسی سے یہ رقم مانگ لاتا ہوں۔ مگر منٹو رکا نہیں بولا ''مجھے معلوم ہے تم ٹھیک کہہ رہے ہو اس لیے میں تمہیں کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کے لئے نہیں جانے دوں گا۔ میں کچھ اور بندوبست کر لیتا ہوں۔'' یہ کہہ کر منٹو چلا گیا۔

فوراً بعد شباب کیرانوی میرے گھر آنکلا۔ وہ اُس زمانے میں ایک فلمی رسالے ''ڈائریکٹر'' کا ایڈیٹر تھا۔ میں نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ اس نے جیب میں سے پچیس روپے نکال کر میز پر رکھ دیے اور بولا ''ڈائریکٹر کا سالنامہ نکال رہا ہوں۔ اس کے لئے آپ کا افسانہ درکار ہے۔'' میں نے کہا ''شباب صاحب! اول تو میرے پاس کوئی نیا افسانہ ہے نہیں اور اگر ہوگا بھی تو میں اسے فلمی رسالے ڈائریکٹر میں کیوں شائع کراؤں گا، کسی ادبی رسالے کو کیوں نہیں دوں گا۔'' مگر شباب نے میری بات نہ مانی۔ بولا

نے دیکھا کہ ادیبوں کے اس ہجوم میں منٹو سامنے میز پر بیئر کی بوتلیں رکھے پی رہا ہے۔ مجھے دیکھا تو میں نے زندگی میں پہلی بار اس کے چہرے پر گھبراہٹ اور ندامت دیکھی۔ اس نے صرف اتنا کہا ''تم یہاں کیسے آدھمکے احمد ندیم قاسمی!'' میں نے جواب میں صرف مسکرا دینا بہتر سمجھا اور منٹو کے پاس بیٹھ گیا۔

حلقۂ اربابِ ذوق میں منٹو نے ایک افسانہ پڑھا جو اس کے اعلیٰ معیار سے خاصا ہٹا ہوا تھا اور مجھے کمزور محسوس ہوا۔ زندگی کے آخری دور میں عجلت کی وجہ سے وہ اسی طرح کی کہانیاں لکھنے لگا تھا۔ اس پر تنقید کا سلسلہ جاری تھا جب منٹو بولا۔ ''یہ احمد ندیم قاسمی بھی میرے پاس بیٹھا ہے صدر صاحب! اس سے بھی تو افسانے کے بارے میں پوچھئے۔'' میں نے کہا ''یہ افسانہ منٹو کے اسلوب کی کامیاب نمائندگی کرتا ہے۔ وہی سلاست ہے وہی روانی ہے' وہی غیر ضروری عبارت آرائی سے انحراف ہے۔ البتہ منٹو نے جس طرح افسانے کو سمیٹا ہے، اس سے مجھے امریکہ کا او ہنری یاد آ گیا ہے جو ہر افسانے کے آخر میں تھیلے سے بلی نکالتا ہے۔''

منٹو کچھ نہ بولا۔ جب اجلاس ختم ہوا تو وہ میری کلائی جکڑ کر ایک طرف لے گیا اور بولا ''ایسی باتیں جلسوں میں نہیں کی جاتی ہیں۔ اور اگر تمہیں افسانے کے تھیلے سے بلی نکلنے کی شکایت ہے تو میں تمہیں تھیلے سے بلا نکال کر بھی دکھا سکتا ہوں۔'' میں نے منٹو سے معذرت کی' اسے گلے لگایا اور اس کے گھر تک اسے چھوڑنے آیا' جہاں ایک پیشہ ور شراب نوش اس کی راہ دیکھ رہا تھا۔ بعد میں اس نے اس شراب نوش پر ایک چونکا دینے والی کہانی لکھی اور شراب نوش نے اس کے ہاں آنا جانا چھوڑ دیا۔

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ جب وہ کسی کردار میں اپنی کوئی کہانی چھپی ہوئی دیکھتا ہے تو اس کے ساتھ تعلقات بڑھاتا ہے اور جب وہ اس کے شب و روز سے اچھی طرح باخبر ہو جاتا ہے تو اس کردار کے گرد اپنا افسانہ تعمیر کر لیتا ہے۔ پھر اگر اس کردار کو علم ہو جائے کہ منٹو نے اسے موضوع بنایا ہے تو منٹو اس سے یا وہ منٹو سے تعلقات منقطع کر لیتا ہے۔

ایک ایسا ہی کردار ایک معروف سیاسی شخصیت (خان) کا تھا۔ منٹو نے اس کے ساتھ چند دن گزارے اور پھر اس پر افسانہ لکھ ڈالا۔ یہ افسانہ شائع ہوا تو وہ خان میرے پاس غصے سے بھرا ہوا آیا۔ میں اس زمانے میں روزنامہ ''امروز'' کا مدیر تھا۔ اس نے پوچھا ''منٹو آپ کا دوست ہے؟'' میں نے

اثبات میں جواب دیا تو وہ بولا ''اس نے ہمارے خلاف افسانہ لکھا ہے۔ ہم اس کے دانت توڑ دے گا۔ وہ رہتا کدھر ہے؟'' میں نے محض اس لیے بے خبری کا اظہار کیا کہ خان صاحب بہت تاؤ میں تھے اور قبل اس کے کہ وہ منٹو تک پہنچیں، میں منٹو کو خبردار کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا کہ آج کل ہماری بول چال بند ہے اور سنا ہے اس نے مکان بھی بدل لیا ہے۔ خان صاحب طیش میں اٹھ کر چلے گئے۔ میں نے منٹو کے پاس جانے سے پہلے ایک مختصر سی سٹاف میٹنگ بلائی۔ میٹنگ ختم ہوئی تو میں اِدھر جانے کے لئے اٹھا' اُدھر وہی خان صاحب مسکراتے ہوئے میرے دفتر میں داخل ہوئے۔ بولے ''وہ آپ کا یار منٹو ہم کو مل گیا تھا۔ ہم ظہیر کاشمیری سے اس کا پتہ پوچھنے جا رہا تھا کہ منٹو ہی بیڈن روڈ پر مل گیا۔ ہم نے کہا ''اِدھر آؤ' تم نے ہمارے خلاف افسانہ لکھا۔'' منٹو بولا '' آپ کے خلاف نہیں لکھا آپ کے بارے میں لکھا ہے۔'' میں نے کہا '' کیا لکھا ہے؟'' وہ بولا ''یہی لکھا ہے کہ خان شراب پیتا ہے اور رنڈی بازی کرتا ہے۔'' میں نے گھبرا کر پوچھا ''پھر؟'' خان صاحب بولے ''پھر کیا' وہ تو اس نے ٹیک (ٹھیک) لکھا ہے نا۔۔۔''

منٹو ایک روز ''امروز'' کے دفتر میں آیا اور بولا ''میں نے زندگی میں پہلی بار پنجابی زبان میں کہانی لکھی ہے۔ تم اپنے اخبار میں پنجابی صفحہ چھاپتے ہو اس لئے یہ کہانی اس میں درج کر دو۔'' میں نے نہایت مسرت کا اظہار کیا اور مسودہ اس سے لے لیا۔ پنسل سے لکھا ہوا یہ افسانہ میں نے پڑھا تو اس میں منٹو مجھے فن کے اس اوج پر نظر آیا جس پر وہ برسوں پہلے پہنچ چکا تھا۔ میں نے دفتر سے اسے افسانے کا پیشگی معاوضہ دلوایا اور پروگرام یہ بنایا کہ یہ افسانہ چھاپنے سے پہلے ''پنجابی زبان میں منٹو کی پہلی کہانی'' کے عنوان سے اس کی خوب تشہیر کروں گا۔ مگر چند روز بعد ہی پولس میرے دفتر کی تلاشی لینے آدھمکی اور اس نے مسودات اتنی بے رحمی سے الٹے پلٹے کہ منٹو کی کہانی کہیں غائب ہو گئی۔ میں جب تک ''امروز'' میں رہا، پرانی فائلوں میں اسے تلاش کرتا رہا مگر وہ شاید پولس کے ہتھے چڑھ کر پار ہو گئی تھی!

آخری دنوں میں وہ ''ناخن کا قرض'' کے عنوان سے اپنے فن کے بارے میں معروف اہلِ فن سے ان کے تاثرات جمع کرتا پھر رہا تھا۔ میرے پاس آیا تو ایک کاغذ میرے سامنے رکھ دیا اور بولا'' میرے متعلق جو کچھ بھی تمہارے ذہن میں فوری طور پر خیال آئے وہ یہاں لکھ دو۔'' میں نے کہا ''میں منٹو کی سی بڑی اور محبوب شخصیت کے بارے میں لکھوں گا تو سوچ سمجھ کر لکھوں گا۔'' اسے غصہ آ گیا ''عجیب

فراڈ ہو۔ میں عبدالرحمن چغتائی اور ملکہ پکھراج اور امتیاز علی تاج سے ان کا فوری تاثر لکھوا کر لا رہا ہوں اور تم ایک دم آسمان پر جا بیٹھے ہو'' میں نے کہا ''منٹو صاحب! میرا تاثر آج شام تک آپ کی خدمت میں پہنچ جائے گا'' مان گیا۔ بولا ''شام تک نہ پہنچا تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔'' میں نے کہا ''پہلے آپ تھوڑے سے بُرے تو بنئے۔ پھر بُرائی کا کمپیٹیشن کرائیے گا۔'' وہ مسکرایا اور چلا گیا۔ شام سے پہلے میں نے اس کے ہاں اپنا تاثر پہنچا دیا۔ میں نے لکھا کہ میں منٹو کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ بلا کا ضدی ہے۔ اگر حکومت اس کے افسانے ''نیا قانون'' کے خلاف مقدمہ چلاتی تو وہ حکومت کو تنگ کرنے کے لئے ''نیا قانون'' سے بھی بڑے افسانے لکھتا۔ مگر کوتاہ اندیش حکومت نے اس کے افسانوں ''کالی شلوار'' اور ''ٹھنڈا گوشت'' اور ''دھواں'' کے خلاف کیس چلائے اور منٹو نے ضد میں آکر ایک سے ایک جنسی افسانے لکھے اور یوں منٹو کی ہمہ جہتی اور اس کے ہاں موضوعات کے تنوع کو نقصان پہنچا۔ منٹو کے آس پاس بیٹھے ہوئے لوگ بتاتے ہیں کہ جب اسے میرا لفافہ ملا تو اس نے جیسے نفرت سے اسے ایک طرف پھینک دیا۔ گھنٹہ بھر بعد اٹھا، ٹہلتا ہوا فرش پر پڑے لفافے کے پاس آیا۔ اسے اٹھایا' کھولا' پڑھا اور کمال آسودگی سے بولا ''یہ میرا یار احمد ندیم قاسمی نہ جانے کیا چیز ہے' میری سمجھ میں تو آتا نہیں'' اور اس نے میرا تاثر تہہ کر کے جیب میں ڈال لیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس نے میرا تاثر قبول کر لیا ہے۔

آخر میں ایک روز ایک ناشر کے ہمراہ وہ میرے پاس آیا۔ ناشر سے کہا کہ بوتل تھیلے سے نکال کر میز پر رکھ دو۔ اس نے وہسکی کی بھری ہوئی بوتل میز پر رکھی تو منٹو مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''اٹھئے احمد ندیم قاسمی صاحب! اس کمرے کی گلی میں کھلنے والی کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیجئے اور مجھے ایک گلاس اور ایک جگ میں پانی لا دیجئے۔ آج میں یہیں پیؤں گا اور آپ کے پورے محلے میں شراب کی بو پھیلاؤں گا۔''

میں نے اٹھ کر کھڑکی کھول دی۔ اوپر سے گلاس اور جگ لے آیا اور بولا ''بسم اللہ کیجئے۔'' اس نے حیرت سے مجھے اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے دیکھا جو صحت کی کمزوری کی وجہ سے کچھ اور موٹی لگ رہی تھیں۔ پھر اس نے ناشر کو رخصت کر دیا اور ایسی آواز میں بولا جیسے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہے ''میں تمہیں نہیں سمجھ سکا۔ تم مجھے نہیں سمجھ سکے۔ پھر ہم آپس میں دوست کیوں ہیں۔''

اُس روز میں نے پہلی بار دیکھا کہ منٹو کا شیو بڑھا ہوا ہے اور اس کے پاجامے کی کریز بھی جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی ہے۔ میں نے کہا" دیجیئے۔ میں بوتل کھولوں؟" منٹو ہنسا" تم کیا خاک بوتل کھولو گے۔ تم کھولو گے تو کھلنے کے اس دھماکے کو سارا محلّہ سنے گا۔" پھر وہ کھڑا ہوا۔ بولا" چلو آؤ میرے ساتھ بوتل کوٹ کے اندر چھپا لو۔" میں بوتل چھپا کر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ رستے میں وہ بولا" یہ جو تم ترقی پسندوں کے لیڈر بنے پھرتے ہونا' ان میں اگر کسی کو بھی معلوم ہو جائے گا کہ اس وقت منٹو کے پاس وہسکی کی پوری بوتل ہے اور وہ پینے جا رہا ہے تو بھکاریوں کی طرح میرا پیچھا کریں گے۔" میں خاموش رہا۔

گھر پہنچ کر اس نے بوتل مرکزی تپائی پر رکھی اور اندر پانی لینے چلا گیا تب صفیہ بہن چند سیکنڈ کے لئے آئیں اور مجھ سے کہا" ندیم بھائی! خدا کے لیئے انہیں خودکشی کرنے سے روک لیجئے۔ دُنیا میں صرف آپ ہی انہیں روک سکتے ہیں۔ وہ آپ کی عزت کرتے ہیں۔ وہ یونہی پیتے رہے تو بہت دن تک جی نہیں سکیں گے۔" منٹو آیا تو بولا۔" یہ کیا بہن بھائی میں کھسر پھسر ہو رہی ہے؟" صفیہ اندر چلی گئیں اور منٹو نے بوتل کھول کر شراب گلاس میں انڈیلنا چاہی تو میں نے صفیہ بہن کے ارشاد کے مطابق منٹو کو سمجھانے کی کوشش کی۔ اسے اس کی بیوی اور بیٹیوں کا واسطہ دیا۔ اس کی اندھا دھند شراب نوشی کے بارے میں جو باتیں ہر جگہ ہوتی تھیں، ان میں سے دو ایک کو دہرایا اور آخر میں ہاتھ باندھ کر فریاد کی کہ" منٹو صاحب! دیکھیے چھوڑ دیجیے اس مصیبت کو۔ چھوڑ نہیں سکتے تو کم کر دیجیے مگر خدا کے لئے اپنے اوپر متعلقین پر اور اپنے پیار کرنے والوں پر رحم کیجیے۔"

منٹو اس دوران میں دو تین پیگ چڑھا چکا تھا۔ اس کا رنگ بالکل مٹی ہو رہا تھا۔ وہ بولا" دیکھو احمد ندیم قاسمی، میں نے تمہیں دوست بنایا ہے۔ اپنے ضمیر کی مسجد کا امام مقرر نہیں کیا۔ مجھے وعظ نہ دیا کرو، سمجھے؟"

میں نے بے بسی سے اس طرف دیکھا جہاں صفیہ بہن پردے کے پیچھے میری باتیں سن رہی تھیں۔ میں کچھ دیر کے بعد وہاں سے اٹھ آیا اور پھر چند روز بعد میں منٹو سے محبت کرنے والے دوسرے دوستوں کے ہمراہ منٹو کا جنازہ اٹھائے جا رہا تھا۔

☆☆☆

محمد اسد اللہ

منٹو میرا دوست

میں نے منٹو کی شخصیت پر لکھنے کے لئے قلم اٹھایا ہے، میں نہیں جانتا کہ میں منٹو پر لکھنے کا حق ادا کرسکتا ہوں یا نہیں، منٹو نے کئی شاعروں، ادیبوں اور فلمی اداکاروں پر مضامین لکھے۔ان مضامین میں منٹو نے لکھنے کا حق ادا کیا یا نہیں مجھے اس سے بھی دلچسپی نہیں۔

بہر حال یہ ایک واقعہ ہے کہ اس دور کی بہت سی اہم شخصیتوں پر منٹو نے قلم اٹھایا تھا۔ان مضامین میں اپنے مخصوص انداز نگارش کو قائم رکھا تھا اور ان مضامین کو لوگوں نے سراہا بھی تھا اور ایک پبلشر (مکتبہ جدید) نے ان مضامین میں سے کچھ مضامین کو کتابی شکل بھی دے دی تھی۔(گنجے فرشتے) اور یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ ان مضامین میں سے بعض مضامین نے ایک محدود عرصہ تک ہی کے لئے سہی ایک قیامت برپا کر رکھی تھی، لیکن آج جب کہ منٹو ہمارے درمیان سے اٹھ گیا ہے۔میرے ذہن میں ان میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے۔میں یہ سطور صرف اس بنا پر لکھ رہا ہوں کہ مجھے منٹو کے مرنے کا بے حد غم ہوا ہے اور اظہارِ غم کا مجھے یہی طریقہ نظر آیا کہ اس کی ذات کے متعلق کچھ باتیں دوسروں کو سناؤں۔ کہتے ہیں کہ اپنے غم میں دُوسروں کو شریک کرنے سے غم غلط ہوتا ہے۔یہ خود غرضی سہی لیکن میں اسے کسی حد تک روا رکھنے پر مصر ہوں۔

میں آپ کو یہ بات بتلا دوں کہ میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ منٹو پر اس قدر جلد لکھنے کی نوبت آجائے گی۔مجھے اندیشہ تھا کہ منٹو اب زیادہ دیر تک ہمارے درمیان نہیں رہیں گے۔منٹو کے مرنے سے چند ہی روز پہلے کی بات ہے۔منٹو ہی کی زیر ترتیب کتاب ''ناخن کا قرض'' (جس کے متعلق میں آگے لکھوں گا) کے سلسلے میں ممتاز شیریں صاحبہ سے ملا تو میں نے انہیں مطلع کردیا تھا کہ ''محترمہ خوش فہمی میں رہنے کی ضرورت نہیں اب منٹو صاحب کا حال کچھ ٹھیک نہیں ہے کہ کس دن خاموش ہوجانے کی خبر لاہور سے اُڑتے اُڑتے کراچی پہنچ جائے۔'' اور ممتاز شیریں نے بے حد ہمدردانہ انداز میں مجھ سے منٹو

کی ذات اور صحت سے دلچسپی ظاہر کی تھی۔ یہی بات میں نے پروفیسر عزیز احمد اور ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری سے منٹو کی وفات سے صرف چھ سات روز قبل ہی کہی تھی۔ ان حضرات نے بھی بے حد افسوس کا اظہار کیا تھا۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے تو مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ خود منٹو کو خط لکھیں گے اور ان کے بارے میں تفصیلات دریافت کریں گے۔ محمد حسن عسکری صاحب کے گھر منٹو کا ذکر آیا تو حسن عسکری صاحب نے منٹو کا روز کا پروگرام پُوچھا اور اپنے شدید رنج وغم کا اظہار کیا۔ ان ساری باتوں کے باوجود جبکہ میں جانتا تھا کہ منٹو کے سر پر موت منڈلا رہی ہے اور منٹو ایک سے زائد بار موت کو چکر دے کر اپنی ذہانت کے بل بوتے پر جیتا چلا آیا ہے اور اب جب کبھی موت حملہ آور ہوگی شاید پسپا ہو کر نہ جائے گی اور منٹو چاہے کتنا ہی ذہین کیوں نہ ہو اب کی بار موت سے آنکھیں چار نہ کر سکے گا اور اگر اس نے آنکھیں چار کرلیں تو پھر بھی بازی اس کے ہاتھ میں نہ رہے گی......

اس کے باوجود ۱۸رجنوری ۵۵ء کی دوپہر جب میں اپنے دوست کے موٹر کے ہارن دینے پر میٹھا رام ہاسٹل کی سیڑھیوں سے اُتر رہا تھا تو میرے ایک دوست نے مجھے بتلایا کہ "میں ریڈیو پر منٹو کی وفات کی خبر سُن کر آ رہا ہوں"۔ مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا۔ میں اس خبر کو سننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ مجھ میں اب بھی اس کا حوصلہ نہ تھا۔ پچھلے سال جب منٹو میو ہسپتال لاہور میں زیر علاج تھا اور میں لاہور میں بیمار ہو کر

آرٹسٹ کی زندگی کے مختلف پہلو ہوتے ہیں۔ منٹو کی ذات میں بھی اتنے نادر پہلو دکھائی دیتے ہیں کہ ان کا احاطہ مشکل ہے۔ منٹو آج کا فنکار ہو یا نہ ہو میں ضرور جانتا ہوں کہ جب اخلاقیات کے غیر فطری پردے نگاہوں سے ہٹ جائیں گے اور توہم کے بادل چھٹ جائیں گے تو لوگ رجعت پسندی کی اندھیری کوٹھڑیوں سے آنکھیں ملتے باہر کھلے میدانوں میں نکل آئیں گے تو اس روز منٹو کو اس کا اپنا صحیح مقام مل جائے گا۔ اس مقام کا تعین کرنے کے بعد شاید لوگوں کو منٹو کی ذات کے متعلق جاننے کی جستجو ہو اور منٹو کی شخصیت چونکہ ایک انجمن کی رہی ہے اس لئے بھی شاید یہ دلچسپی زیادہ بڑھے۔ اسی خیال کے تحت میں نے منٹو کی زندگی ہی میں لوگوں سے کہنا شروع کیا تھا کہ میں منٹو پر ایک کتاب لکھوں گا جو ان کے فن پر نہیں ذات پر ہوگی...... اپنے اسی قول کو پورا کرنے کے لئے میں آپ کے آگے اس منٹو کو پیش کر رہا ہوں جسے میں نے دیکھا ہے۔

منٹو کو میں نے پہلی بار شاہد لطیف[1] کے گھر دیکھا تھا۔ میں عصمت چغتائی سے ملنے کے لئے شاہد لطیف کے گھر گیا تھا۔ وہاں پر شاہد اور منٹو بیٹھے پی رہے تھے۔ ہم ایک منٹ کے لئے ان کے پاس رُکے اور پھر اندر عصمت چغتائی کے پاس چلے گئے، کیونکہ اس وقت ان کے شغل میں کسی قسم کا خلل ڈالنا مناسب نہ تھا۔ اس سے پہلے میں نے حیدرآباد (دکن) سے منٹو کے نام ایک خط لکھا تھا جس میں اور دوسری باتوں کے علاوہ میں نے منٹو سے عصمت سے شادی نہ کر سکنے کی وجہ دریافت کی تھی۔

اس خط کے لکھنے کے کافی عرصہ بعد عصمت پر منٹو کا ایک مضمون نکلا۔ اس مضمون میں میرے خط کا بھی ذکر تھا[2]۔

گویا منٹو سے یوں واقفیت ہوئی۔

پاکستان آنے کے بعد منٹو سے ملنے کی خواہش مجھے کراچی سے لاہور لے گئی، لیکن مجھے بڑا دکھ ہوا جب ہندو پاک کے عظیم فن کار احمد ندیم قاسمی نے اپنے گھر "فسانہ خوانی" میں بڑے دُکھ کے ساتھ یہ بات بتلائی کہ منٹو ذہنی طور پر آجکل ایک عظیم مصیبت سے دوچار ہے اور اورینٹل ہاسپٹل میں زیر علاج ہے۔ میں منٹو سے ملنے کے لئے اورینٹل ہاسپٹل گیا۔ وہاں پر نہ جانے کیوں ڈاکٹر نے ملاقات کی اجازت

1: شاہد لطیف، عصمت چغتائی کے شوہر، بزدل، ضدی، آرزو وغیرہ کے ڈائریکٹر

2: عصمت پر منٹو نے یہ مضمون "نئے ادب کے معمار" سلسلہ کے لئے لکھا تھا جو شائع ہو چکا ہے۔

دینے سے انکار کر دیا۔ بہر حال مجھے بڑا دُکھ ہوا کہ اتنی دور سے لاہور پہنچ کر بھی منٹو سے مل نہ سکا۔

بارے ایک طویل عرصہ بعد حلقۂ ارباب ذوق لاہور کے ایک اجلاس میں یہ خواہش پوری ہوئی منٹو کو ایک کہانی (کہانی کا نام مجھے یاد نہیں شاید موذیل تھی) سنانی تھی۔ میں نیا نیا لاہور پہنچا تھا۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب مجھے حلقہ کے اجلاس میں لے گئے تھے۔ جب میں ہال میں عبادت صاحب کے ساتھ داخل ہوا کمرہ پر خاموشی طاری تھی۔ اور منٹو اپنی کہانی سنا رہے تھے۔ اس وقت بھی وہ مخمور تھے۔ اس حالت میں ان سے کیا ڈھنگ کی بات کی جا سکتی تھی؟

ڈھنگ کی بات نیا ادارہ دفتر ''سویرا'' میں ہوئی۔ منٹو گورنمنٹ کالج کے پروفیسر محمد صفدر کے ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ میں احمد راہی کے بلانے پر راہی صاحب سے ملنے دفتر ''سویرا'' پہنچا تھا۔ راہی صاحب غائب تھے اور ممتاز ریسٹورانٹ [1] گئے ہوئے تھے اور نذیر چودھری (مالک سویرا) کے پاس میرے نام رقعہ چھوڑ گئے تھے کہ میں بھی ممتاز ریسٹورنٹ چلا آؤں۔ میں پلٹ کر جانے لگا تو منٹو نے کہا۔

''یار ابھی آئے اور ابھی چلے؟''

''کہیے تو بیٹھ جاؤں؟ میرا نام اسد اللہ ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ منٹو ہیں۔'' یہ کہہ کر میں نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔

منٹو نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔''اسد اللہ یہ تو غالب کا بھی نام تھا اور جانتے ہو غالب میرا واحد محبوب شاعر ہے۔ آؤ یار بیٹھو گپ مارتے ہیں۔ بڑی مشکل سے صفدر کو پکڑ رکھا تھا۔''

''تو اب مجھے اجازت دے دیجئے'' صفدر صاحب نے اٹھتے ہوئے کہا اور وہ سائیکل اٹھا کر چلتے بنے۔

لاہور میں اس طرح اطمینان سے ملنے کا پہلا موقعہ تھا۔ میں نے اس دن ان کو اپنی بمبئی کی شاہد لطیف کے گھر کی پہلی ملاقات یاد دلائی۔ اپنے حیدرآباد کے خط کا ذکر کیا۔ منٹو سب کچھ بھول گئے تھے کہنے لگے''یار میرا حافظہ بڑا کمزور ہو گیا ہے۔''

تین گھنٹے تک نیا ادارہ میں گپ رہی۔ پھر نیا ادارہ سے ساتھ ہی اٹھے اور اُردو بازار سے تانگہ لیا

1: ممتاز ریسٹورانٹ انارکلی لاہور کا ہوٹل

اور تانگہ ۳۱ لکشمی مینشن ہال روڈ لاہور[1] کی طرف چل پڑا۔ تانگہ والے کے ساتھ آگے منٹو صاحب اور پیچھے ہم۔ راستہ میں بے شمار لوگوں نے منٹو صاحب کو سلام کیا۔ منٹو صاحب آگے جھک جھک کر سلام کا جواب دیتے اور تانگہ آگے بڑھتے ہی کہتے ''پتہ نہیں یار کون ہے؟'' لکشمی مینشن پہنچے اور پھر ۳۱ لکشمی مینشن منٹو کے مرنے تک ہماری صبح و شام کی منزل بن گیا۔

کراچی آنے سے پہلے لکشمی مینشن ہی میں قیام تھا۔ بڑے قریب سے، بڑے احترام سے اور بڑی جسارت سے اس عجیب و غریب شخصیت کا مطالعہ کیا ہے۔ بہت ہی قریب سے اس شخص کو ایک کتاب کی طرح پڑھا ہے۔ گھر پر دیر دیر تک گفتگو کی ہے۔ زندگی کے بارے میں ہزار ہا سوالات کیے ہیں۔ فن کے بارے میں بیسوں بار گفتگو کی ہے۔ خوش بھی دیکھا ہے اُداس بھی، پڑھتے بھی دیکھا ہے۔ لکھتے بھی۔ کھاتے بھی دیکھا ہے۔ اور پیتے بھی، گھر سے نکلے ہیں تو ساتھ بھٹکتے پھرے ہیں۔ لاہور کی سڑکوں پر کئی کئی گھنٹے تک ساتھ رہا ہے۔ بگڑتے بھی رہے ہیں۔ پھر تھوڑی ہی دیر بعد ''یار سب ٹھیک ہے'' بھی سنا ہے جس رنگ میں بھی دیکھا ہے اور جس موڈ میں بھی دیکھا ہے ایک ذہین آدمی کی حیثیت میں دیکھا ہے۔ اس عجیب و غریب شخصیت کے ساتھ لڑکوں سے ہاسٹلوں پر جا کر قرض مانگا ہے (ابھی وہ ہاسٹل قائم اور وہ طالب علم زندہ ہیں) شراب خانوں پر جا کر شراب خریدی ہے۔ لاہور کے ایک ایک پبلشر کی دکان اور گھر پر اس عجیب و غریب شخصیت کے ساتھ جانا ہوا ہے۔ جب اس عجیب و غریب شخصیت کی تعریف کی ہے تو سنا ہے ''نہیں یار میں کیا ہوں؟ میں تو کچھ بھی نہیں ہوں۔ ایف اے فیل ہوں۔ بڑی مشکل سے تیسری بار میٹرک کا امتحان پاس کیا ہے'' اور پھر ''لیکن یار اگر میں عظیم آدمی ہوں تو تُو بھی عظیم ہے۔'' اور پھر کبھی بُری گھڑی میں یہ کہہ دیا کہ ''منٹو صاحب اب آپ کی تحریر میں وہ پہلی سی بات نہیں'' تو اس کا جواب یہ سنا ہے'' تم بکواس کرتے ہو تم بھلا شارٹ سٹوری کیا ہے کیا جان سکتے ہو۔ تم تو فلسفہ پڑھو۔''

اس انسان کو بہت قریب سے دیکھا ہے جو بلا کا ضدی تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ من میں سما جائے تو دوسرے کی ہر بات ماننے والا بھی، نفاست پسند، مہمان نواز اور دوست پرست بھی جو اردو کا ادیب تھا اور جس کے جبڑے اردو بولنے سے دکھتے تھے جس کا مطالبہ ہوتا تھا کہ ''یار پنجابی بول اردو بولتے بولتے

---

[1] : منٹو کا گھر

جگا لیتا۔ وہ اپنے مخصوص صوفہ پر (جس پر بیٹھے ہوئے ان کی چند تصویریں شائع بھی ہوئی ہیں) بیٹھ جاتے اور پھر گپ شروع ہو جاتی اور ڈیڑھ بجے تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ ڈیڑھ بجے ایک چپاتی یا زائد کھالی تو دو چپاتی کھاتے اور پھر کاغذ قلم سے مسلح ہو کر بیٹھ جاتے۔ پہلے کاغذ کے اوپر ۸۶ ۷ لکھا جاتا اور پھر افسانہ لکھنا شروع کرتے۔ پتہ نہیں کیا لکھنا ہے لیکن لکھے جاتے اور جب چوتھا صفحہ شروع ہوتا تو کہتے'' جاؤ کپڑے بدل آؤ۔'' میں کپڑے بدل آتا تو دیکھتا منٹو صاحب مسرور ہیں چونکہ افسانہ مکمل ہو گیا ہے۔ جب خود اپنے ہاتھ سے نہیں لکھتے تو مجھ سے کہتے'' تم لکھتے جاؤ۔'' ایسی صورت میں آہستہ آہستہ لکھاتے۔ ابھی زبانی لکھانے میں روانی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ کہتے تھے'' تشفی نہیں ہوتی ہے۔'' ویسے بھی چونکہ پلاٹ تیار نہیں ہوتا تھا اس لیے لکھانے میں زیادہ وقت لیتے تھے۔ میں افسانہ ختم کرتا تو ہاتھ سے کاغذ قلم لے کر تاریخ اور نام اپنے ہاتھ سے لکھتے (مکتبہ کارواں اور ماہنامہ ڈائریکٹر اور لاہور کے اور کچھ پبلشروں کے ہاں میرے ہاتھ کے لکھے ہوئے مسودے موجود ہوں گے) اب تانگہ لیا جاتا مکتبہ کارواں آخری دلوں

ا: شوق تو ظہیر کاشمیری کو بھی بہت ہے لیکن ظہیر نے انگریزی پڑھی بھی بے حد ہے لیکن منٹو صاحب کا انگریزی بولنا عجیب سا لگتا تھا۔

۲: جمیل منٹو صاحب کا Typical نوکر جس کے بارے میں منٹو صاحب کہتے تھے کہ کبھی میں اس پر ناراض رہتا ہوں۔ کبھی وہ مجھ پر ناراض رہتا ہے۔

میں واحد منزل بن گئی تھی۔ مکتبہ کارواں کے مالک چودھری حمید جو فلاسفی میں ایم اے ہیں اور بڑی سوجھ بوجھ کے مالک ہیں، تانگہ دیکھتے ہی بیس روپیہ نکال رکھتے۔ کہانی لیتے بیس روپیہ دے دیتے۔ منٹو زور سے سلام کہہ کر تانگہ پر سوار ہو جاتے۔ تانگہ کا رخ انگلش وائن ہاؤس [1] کی طرف کر دیا جاتا۔ ساڑھے سترہ روپیہ کی منٹو صاحب شراب لیتے۔ ایک روپیہ تانگے والے کا ایک روپیہ کے کیپٹن سگریٹ، اور آٹھ آنے دن بھر کے لئے مولی وغیرہ خریدنے کیلئے، چھ بجے گھر پہنچتے۔ اب لوگ ملنے آ گئے ہوں تو گپ شروع۔ ہر جملہ سے پہلے" بکواس ہے۔" اور ہر جملہ کے بعد" بکواس ہے" ضرور کہا جاتا۔ بار بار اُٹھ کر اندر جاتے اور ایک گھونٹ پی آتے، ساڑھے دس بجے سے بستر پر کروٹیں بدلتے رہتے، نیم خوابی کے مریض تھے۔ جس دن شراب نہ ہو اس دن حالت دیکھنے کے قابل ہوتی۔

منٹو کی بیوی صفیہ کا منٹو سے ایک ہی مطالبہ تھا اور وہ مطالبہ یہ تھا کہ" افسانہ نگاری ترک کر دو" صفیہ نے مجھ سے بارہا کہا کہ" اسد صاحب میں سعادت صاحب سے صرف ایک بات کی درخواست کرتی ہوں یا تو وہ شراب پینا چھوڑ دیں یا پھر سرے سے لکھنا ترک کر دیں۔ چونکہ میں جانتی ہوں کہ اب ان کا لکھنا لکھانا صرف شراب ہی کے لئے رہ گیا ہے۔ اس لئے میں ان سے کہتی ہوں کہ لکھنا چھوڑ دیں۔ کوئی دوکان کھول لیں۔ اس سے ان کا پینا تو ختم ہو جائے گا۔"

صفیہ کہتی تھیں کہ" میں صرف سعادت صاحب کو پڑھا کرتی تھی۔ اب یہ جس قسم کی چیزیں لکھتے ہیں وہ قطعاً گھٹیا ہیں۔ اس سے ان کے نام پر حرف آتا ہے۔ اب یہ صرف شراب ہی کے لئے لکھتے ہیں۔ اس میں سے ایک پیسہ بھی مجھے نہیں ملتا۔ اب میں ان سے بار بار اسی لئے اس بات پر اصرار کرتی ہوں۔"

منٹو نے چھاپہ خانہ کے الاٹمنٹ کے لئے درخواست دی۔ حکومت نے منٹو کو برف خانہ الاٹ کر دیا۔ منٹو نے اسے ٹھیکہ پر بیس روپیہ روزانہ پر دے دیا۔ ٹھیکہ دار نے چند مہینے بعد سترہ روپیہ روزانہ کر دیئے۔ اور اس کے بعد ٹھیکہ دار کے بیان کے مطابق کاروبار چلنا بند ہو گیا۔ سترہ سے دس روپیہ ہو گئے۔ پھر بھی منٹو صاحب مطمئن تھے۔ صفیہ یہ سب کچھ دیکھ دیکھ کر خون کے آنسو روتی تھیں لیکن منٹو خود بچپن سے جوانی تک اس دور سے گزرے تھے کہ اب ان کے یہاں آنسوؤں کی بھی کوئی قیمت نہیں رہی تھی چاہے وہ

---

[1]: شراب کی ایک مخصوص دوکان جہاں سے روز منٹو شراب خریدا کرتے تھے۔ اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ دوکان ہائیکورٹ کے پاس ہی ہے۔

آنسوان کی اپنی صفیہ ہی کے کیوں نہ ہوں۔

صفیہ صاحبہ سے منٹو صاحب کی شادی ۱۹۳۹ء میں ہوئی۔ اس شادی کی ساری تفصیلات منٹو صاحب نے ''میری شادی'' کے عنوان سے لکھی ہیں (جوان کے تازہ مجموعے ''اُوپر نیچے درمیان'' میں شامل ہے)

منٹو صاحب کی بہن سے صفیہ کی دوستی تھی یہ شادی صفیہ صاحبہ کی والدہ اور منٹو صاحب کی والدہ نے مل کر طے کی تھی۔ اس میں منٹو صاحب کی کسی کوشش کا دخل نہیں تھا۔ منٹو صاحب من مانی کرتے رہے ہیں۔ صفیہ کی جیت منٹو صاحب کے آگے کبھی ہوئی ہو تو ہوئی ورنہ ہمیشہ منٹو صاحب اپنی ہی چلاتے تھے۔ دونوں کا اختلاف صرف ایک بات پر تھا اور وہ بھی منٹو صاحب کا پینا، منٹو صاحب کا پینا صفیہ کو بڑا ناگوار گزرتا تھا لیکن خود صفیہ کہتی تھیں کہ ''یہ پینا اگر خدا ہی چاہے تو ختم ہو ورنہ چھٹنے کے کوئی آثار نہیں۔'' جب شادی ہوئی منٹو ''مصور'' اخبار کے ایڈیٹر تھے اور صرف ساٹھ روپیہ معاوضہ پاتے تھے۔ پاکستان آنے کے بعد آمدنی بہت کم ہوگئی تھی۔ اس لئے بعض دفعہ منٹو بمبئی جانے کی سوچتے تھے۔ صفیہ پسند نہیں کرتی تھیں کہ وہ بمبئی چلے جائیں۔ کہتی تھیں ''وہ جائیں اپنی کہانیاں وغیرہ دے آئیں رہیں تو وہ پاکستان ہی میں، چونکہ پاکستان بنا ہی مسلمانوں کے لئے ہے اور ہندوستان جانے آنے کے لئے پاسپورٹ وغیرہ کی جو بکواس ہے وہ بڑی دقت طلب ہے اس لئے میں ان کا مستقل جانا پسند نہیں کرتی اگر پہلے کی طرح غیر منقسم ہندوستان ہوتا تو پھر بات ہی کیا تھی۔''

صفیہ کہتی تھیں کہ ''میں صرف منٹو صاحب ہی کو پڑھتی ہوں، ممی، نیا قانون، دس روپیہ آم، ٹوبہ ٹیک سنگھ مجھے ان کے یہ افسانے بہت پسند ہیں۔ میں مقدمے والے افسانوں سے بہت ڈرتی ہوں۔ اچھا لکھنے کو کہتی ہوں لیکن یہ میری کہاں مانتے ہیں''

صفیہ کا کہنا ہے کہ ''بمبئی میں ساری رقم مجھے لاکر دے دیتے تھے اور کچھ رقم اپنے لئے رکھ لیتے تھے۔ درمیان میں تھوڑے بہت میرے پاس سے چرا بھی لیتے تھے۔ بمبئی میں ساری ضروریات کی چیزیں میں ہی خریدا کرتی تھی۔ سگریٹ بھی میں ہی لا دیتی تھی۔ شراب کبھی میں لاتی کبھی وہ خود خرید لاتے۔ مستقل ان کی آمدنی ہزار بارہ سو روپیہ تھی۔ البتہ کبھی کتاب بک جائے تو پھر اس مہینہ دو ڈھائی ہزار ہو جاتے تھے۔ اس طرح اگر زیادہ پیسے بھی مل جائیں تو وہ زیادہ پیتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ وہاں ان کے دوست دوسری قسم کے دوست تھے۔ دوسرے یہ کہ وہاں ان کے معمولات خاص باقاعدہ ہو گئے تھے۔''

صفیہ کا بیان ہے کہ "میری خانگی زندگی میں منٹو کبھی دخل نہیں دیتے، البتہ جب گھر پر ہوں تو چاہتے ہیں کہ میں بھی باہر نہ جاؤں۔ اپنی گھریلو زندگی میں بے حد دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ جب ہم بمبئی میں تھے اور کبھی گھر بدلنا ہوتا تھا تو پھر میں سارا سامان باندھتی جاتی تھی اور یہ دوسرے گھر میں سامان پہنچاتے جاتے اور نہ صرف سامان پہنچاتے بلکہ ہر چیز قرینہ سے صحیح جگہ پر جماتے جاتے۔ گھر کو سجانا منٹو صاحب پر ختم ہے لیکن جب سے پاکستان آئے ہیں گھر کے کام میں قطعاً دلچسپی نہیں لی۔ یہاں آ کر تو ان کی زندگی ہی اور ہوگئی ہے۔"

صفیہ کا کہنا ہے کہ "ہماری آپس میں ایک دوسرے سے لڑائی اور اختلاف تو ہوتے رہے لیکن طلاق کا ذکر کبھی زبان پر نہیں آیا۔"

اپنی لڑکیوں کو بہت چاہتے تھے۔ منجھلی لڑکی سے تو انہیں بے حد پیار تھا، اس کی ذہانت کی خوب داد دیتے تھے اور اس کی شرارتوں کا اپنے دوستوں میں مزے لے لے کر ذکر کرتے تھے۔ اپنے رشتہ داروں سے ملنے کبھی نہیں جاتے تھے مگر کبھی وہ لوگ گھر پر آ جائیں تو بڑی اچھی طرح پیش آتے تھے۔ بھائیوں کے ساتھ کبھی مل کر نہیں رہے۔ ان کی اور ان کے بھائیوں کی عمروں میں کافی فرق ہے۔ ان کے بھائیوں کے لڑکے ان کی اپنی عمر کے برابر ہیں۔

صفیہ کا کہنا واقعی درست ہے کہ منٹو کی زندگی پاکستان آ کر دوسری ہی زندگی ہوگئی تھی اور اس میں بھی بڑی سچائی ہے کہ اب منٹو کا لکھنا لکھانا صرف شراب کے لئے مخصوص ہو کر رہ گیا تھا[1]

میو ہسپتال لاہور سے مرتے مرتے بچ کر جب واپس گھر آئے تو پچھلے دنوں میری آنکھوں کے آگے منٹو نے چالیس دن میں چالیس کہانیاں لکھیں اور سب کی سب مکتبہ کارواں کو دے دیں جس دن میں کراچی آ رہا تھا مجھ سے کہنے لگے "یار آج کا ایک دن اور ٹھہر جاؤ ایک عمدہ کہانی لکھوں گا"، اور واقعی اس دن ایک اچھی کہانی "اولاد" لکھی[2] اس کہانی کو لکھنے کی تحریک صرف ایک بات سے ہوئی۔ لکشمی مینشن کے چوکیدار نے آ کر کہا کہ "صاحب پاس کے فلیٹ میں کسی عورت نے چھاتیاں کاٹ لی ہیں"، اس ایک

---

[1]: اس بات سے کی تصدیق ایک اور واقعہ سے ہوتی ہے۔ ایک دفعہ میرے ایک دوست نے ان سے پوچھا "منٹو صاحب آپ ناول کیوں نہیں لکھتے؟" منٹو صاحب کا جواب تھا "یہاں روز پینے کے لئے پیسہ چاہیے، روز افسانہ لکھتے ہیں۔ روز کا روز معاوضہ مل جاتا ہے۔ اب ناول کون لکھے۔"؟

[2]: جواں کے تازہ مجموعے "شکاری عورتیں" میں شامل ہے۔

جملہ پر ''اولاد'' افسانہ لکھا گیا ہے۔ حالانکہ صرف پانچ منٹ پہلے منٹو مجھ سے کہہ رہے تھے ''یار جیب سے کوئی چیز نکل نہیں رہی ہے۔'' وہ کہتے تھے ''میرے ہاں کہانیاں دماغ میں نہیں جیب میں ہوتی ہیں۔'' پانچ منٹ بعد چوکیدار کا ایک جملہ سن کر واقعی جیب ہی سے کہانی نکالی ہوگی میں اور میرے دوست اظہار (جو کہانی لکھنے کے دوران میں آئے تھے) کہانی پڑھ کر حیران رہ گئے۔

میرے ایک دوست فرہاد زیدی کا بیان ہے کہ ایک دن وہ محمد طفیل صاحب کے پاس بیٹھے تھے کہ منٹو صاحب ٹانگہ میں سوار دفتر ''نقوش'' آ اُترے۔ دورانِ گفتگو میں منٹو صاحب نے کہا ''بس روز ایک افسانہ لکھ رہا ہوں۔ قلم اٹھاتا ہوں، کاغذ لیتا ہوں۔ لکھنا شروع کر دیتا ہوں کیا لکھنا ہے پتہ نہیں لکھتا جاتا ہوں۔ افسانہ ہو جاتا ہے۔ اب آپ کے سامنے کہیے تو افسانہ لکھ دوں اور تو اور آپ صرف ایک جملہ لکھ دیجئے۔ میں اسی کو آگے بڑھا کر افسانہ بنا دوں گا۔''

فرہاد زیدی نے کہا ''تو پھر منٹو صاحب یہ جملہ حاضر ہے۔''

''اس کے سارے جسم میں مجھے اس کی آنکھیں بہت پسند تھیں۔''

فرہاد صاحب کا کہنا ہے کہ یہ جملہ پڑھ کر منٹو صاحب نے واقعی کاغذ قلم سنبھال لیا اور افسانہ لکھنا شروع کر دیا۔ دفتر ہی میں بیٹھے بیٹھے افسانہ لکھ چکے تو افسانہ فرہاد زیدی کی طرف بڑھا دیا کہنے لگے ''دیکھ لیجئے افسانہ حاضر ہے۔'' [1]

زود نویسی کا خود بھی خوب شہرہ کرتے تھے۔ میرے ایک عزیز دوست اظہار حسین کاظمی صاحب بتلاتے تھے کہ منٹو صاحب ایک دن ریڈیو پاکستان لاہور تشریف لائے۔ اظہار صاحب سے ملاقات ہوئی تو کہنے لگے ''بس روز ایک افسانہ لکھتا ہوں۔ لکھتا ہی چلا جا رہا ہوں۔ چنانچہ وہ دیکھ لیجئے میری نئی کتاب مکتبہ جدید نے شائع کی ہے نا اس میں ہر افسانہ کے خاتمہ پر میں نے تاریخ ڈال دی ہے۔ اس سے آپ کو پتہ چل جائے گا کہ کون سا افسانہ کب لکھا ہے اور یہ کہ جملہ کتب میں نے کتنے عرصے میں لکھی ہے۔ بس جی صرف ایک مہینہ میں میں نے ساری کتاب لکھ دی ہے۔'' [2]

کراچی سے ''اُوپر نیچے درمیان'' والے مقدمہ سے نجات پا کر آئے تو دن میں ہزار بار مہدی علی

---

[1]: یہ افسانہ ان کے مجموعے ''سرکنڈوں کے پیچھے'' میں شامل ہے اور اس کا عنوان ''آنکھیں'' ہے۔

[2]: ''یزید''

صدیقی کا نام لیتے۔ حلقۂ اربابِ ذوق لاہور میں انہیں افسانہ پڑھنا تھا۔ مجھ سے کہنے لگے ''یار شہرت بخاری دوبار آ کر گیا ہے۔ افسانہ پڑھنا ہے۔ کچھ سوجھ نہیں رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

''جیب میں ہاتھ ڈالیئے شاید کچھ ہاتھ لگ جائے۔''

کہنے لگے ''اچھا تو پھر سامنے سے کاغذ قلم دو''

کاغذ قلم پیش کیا گیا تو لکھنے بیٹھ گئے۔ کچھ ہی دیر بعد کہنے لگے ''ہٹاؤ یار، افسانہ نہیں لکھتے کراچی آنے جانے کی روداد لکھتے ہیں۔'' چنانچہ ''پانچواں مقدمہ'' لکھنا شروع کیا۔

لکھنا ختم کیا تو حلقہ میں جانے کی تیاری شروع کی۔ حلقہ میں پہنچے اور مضمون پڑھنا شروع کیا۔ جب مضمون پڑھ چکے تو کہنے لگے ''بعض باتیں میں مہدی علی صدیقی کی ہدایت پر تحریر میں نہیں لا سکا تھا۔ چنانچہ اب آپ زبانی سنئے۔' منیر نیازی پاس ہی بیٹھے تھے۔ چپکے سے انہوں نے کہا ''سی آئی ڈی والے بھی بیٹھے ہوں گے۔ چُپ رہو کیوں سُناتے ہو۔''

''ہٹا یار مجھے پکڑ لیں گے نا۔ پکڑ لینے دو۔ چلو آزادی ہوگی۔ باہر کی مصیبتوں سے نجات ملے گی۔''

یہ کہہ کر سنانے لگے۔ ندیم قاسمی صاحب صدر جلسہ تھے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب نے ان سے کہا ''جلسہ کے باقاعدہ اختتام کا اعلان کر دیجئے۔ غیر رسمی نشست جاری رکھی جا سکتی ہے۔'' چنانچہ ندیم صاحب نے اعلان کر دیا۔ اب منٹو صاحب دلچسپ انداز میں کراچی کو روانگی کے متعلق محمد طفیل کی حیرانگی، کراچی کے دوستوں کی روداد، واپسی کی تفصیلات، نصیر انور[1] کی نئی شادی کرنے کی وجہ، جلد لاہور واپس لوٹنے کی ضد وغیرہ وغیرہ سُنا چکے تو آخر میں کہا ''بہرحال مہدی علی صدیقی نے یہ بھی کہا تھا کہ میں نے دُنیا کے بیشتر ادیبوں کو پڑھا ہے لیکن آپ نے جس قدر زیادہ اچھے افسانے لکھے ہیں اتنی تعداد میں تو کسی مغربی مصنف نے بھی نہیں لکھے۔'' یہ سُنا دیا تو پھر زور سے کہا ''اچھا بھائی سلام علیکم خدا حافظ'' یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور باہر نکل آئے۔

وائی، ایم، سی اے ہال کے نیچے اترے تو کچھ طالب علموں نے گھیر لیا اور باتیں کرنے لگے۔ ندیم صاحب بھی نیچے اُتر آئے تو ندیم صاحب نے روداد کے متعلق کچھ تعریفی جملے کہے۔ منٹو صاحب کہنے لگے ''یار ابھی ابھی لکھ کر لا رہا ہوں۔ کچھ تو حلقہ میں پڑھنا ہی تھا۔ بیٹھا سوچتا رہا کیا پڑھوں پھر بیٹھ کر لکھ دیا

---

[1] نصیر انور منٹو کے ایک عزیز دوست

اور ساتھ لیے چلا آیا۔ بڑی جلدی میں لکھا ہے۔''

اس پر ندیم صاحب نے کہا ''یاد ہے کہ جب میں ایڈیٹر ''ادب لطیف'' تھا اس وقت ''ادب لطیف'' کے سالنامہ کے لئے ''موتری''[1] آپ نے آدھ گھنٹہ میں لکھا تھا۔''

یہ زودنویسی شروع ہی سے تھی لیکن چونکہ اس وقت مشاہدہ بھی ساتھ ساتھ جاری تھا۔ ایک مخصوص اور محدود دائرے میں مقید ہو کر نہیں رہ گئے تھے اس لئے زودنویسی چل جاتی تھی۔ ایک دفعہ میں، منٹو صاحب اور صفیہ صاحبہ بیٹھے تھے۔ صفیہ صاحبہ نے کہا ''سعادت صاحب خُدا کے لئے اس قدر نہ لکھا کیجئے۔ آپ بہت خراب لکھنے لگے ہیں۔''

منٹو صاحب نے کہا ''غلط ہے تم بتلاؤ اسد، میں نے کون سی کہانی خراب لکھی ہے۔'' میں نے کہا ''میں اس سلسلہ میں کچھ نہیں کہوں گا۔ البتہ آپ میرے ایک سوال کا جواب دیں کہ اس طرف آپ نے جو کہانیاں لکھی ہیں وہ آپ کی سابقہ کہانیوں کے ہم پلہ ہیں۔؟''

''یار تم بھی بکواس کرنے لگے۔'' منٹو صاحب نے کہا:

''وہ کس طرح'' میں نے پوچھا۔

''بس کہہ دیا بکواس کرتے ہو۔ صفیہ کی گڈ بکس میں آنے کے لئے میری کہانیوں کی بُرائی کرتے ہو۔''

صفیہ صاحبہ نے اس پر کہا ''میرے گڈ بکس میں آنے پر میں کیا انعام دوں گی۔ میں اسد کو کیا فائدہ پہنچادوں گی؟ جو سچی بات ہے وہ کہہ رہا ہے گڈ بکس میں آنے کا کیا سوال''؟

منٹو صاحب کا ایک ڈرامہ ''اس منجدھار میں''[2] بڑی شہرت حاصل کر چکا ہے۔ بہت کم لوگ اس ڈرامہ کے شانِ نزول سے واقف ہوں گے۔ شاید لوگوں کو یہ سن کر حیرت ہو کہ اس قدر خوبصورت ڈرامہ صرف ایک عدد وسکی کی بوتل پر لکھا گیا ہے۔ نیا ادارہ کی ان کرسیوں پر جواب بھی نیا ادارہ میں پڑی ہیں۔ اُردو کے مایہ ناز ادیب کرشن چندر، کنھیالال کپور، راجندر سنگھ بیدی، دیوندر ستیارتھی، فکر تونسوی، ساحر لدھیانوی، اوپندر ناتھ اشک وغیرہ نے بھی یہیں بیٹھ کر لکھا ہے لیکن شاید ہی کسی نے ''اس منجدھار میں'' کی قسم کی کوئی چیز اس قدر کم وقت میں اور اس قدر کم معاوضہ پر لکھی ہو۔

1: جو نئے زاویے جلد دوم مرتبہ کرشن چندر میں بھی شریک ہے۔

2: ان کے مجموعے ''پھندنے'' میں شامل ہے۔

جب یہ ڈرامہ لکھ چکے تو وہاں سے سیدھے حلقۂ ارباب ذوق پہنچے۔ اس دن انہیں یہاں ڈرامہ پڑھنا تھا، حلقہ کی روایت ہے کہ ۴۵ منٹ ڈرامہ کے لئے مقرر ہوتے ہیں اس سے زائد وقت نہیں لیا جا سکتا۔ منٹو ڈیڑھ گھنٹہ تک مسلسل یہ ڈرامہ بیٹھے پڑھتے رہے سارا ہال اس ڈرامہ کی طرف کان لگائے ہوئے تھا۔ ڈیڑھ گھنٹہ کے دوران میں دو دفعہ انہوں نے پانی مانگا تو شاید لوگوں کی توجہ بٹی ہو۔ ڈرامہ ختم کرنے کے بعد صدر جلسہ نے حاضرین سے رائے مانگی تو سارا ہال خاموش تھا۔

آخر جناب صدر ہی نے سب کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا ''اس خوبصورت ڈرامہ پر بھلا کہا ہی کیا جا سکتا ہے۔'' جب گھر چلے آئے تو رات کو میں نے کہا ''منٹو صاحب واقعی ڈرامہ بے حد اچھا تھا۔'' کہنے لگے '' بکواس تھا۔'' پھر سلسلۂ کلام جاری رکھا، ''معلوم ہوتا تھا کہ کرشن چندر کی زبان ہے۔ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ منٹو کا قلم ہے۔ مجھے تو بکواس نظر آتا ہے۔ جس ڈرامہ میں شاعری ہو، وہ ڈرامہ تھوڑا ہی ہوا بکواس ہوئی۔''

میں حیران تھا کہ یہ منٹو صاحب بھی کیا چیز ہیں؟

ضد میں جواب نہیں رکھتے تھے وہ تو کہیے حکومت نے ''بو'' اور ''دھواں'' پر مقدمہ چلایا اگر حکومت ''نیا قانون'' اور ''نعرہ'' پر مقدمہ چلاتی تو پھر اردو ادب منٹو کے سارے اس قسم کے موجودہ افسانوں سے محروم ہو جاتا اور منٹو صرف ''نیا قانون'' اور ''نعرہ'' ہی قسم کے افسانے لکھتا رہتا، میں تو اس واقعہ کو اردو ادب کی بدقسمتی سمجھتا ہوں۔ میرے خیال میں منٹو کے افسانے ''نیا قانون'' اور ''نعرہ'' منٹو کے نمائندہ افسانے ہیں۔ میری یہ شدید خواہش رہی ہے کہ کاش حکومت ''نیا قانون'' اور ''نعرہ'' پر مقدمہ چلا دیتی اور اس کے نتیجہ کے طور پر ضدی منٹو صرف اسی قسم کے افسانے لکھتا رہتا۔

بلا کے ضدی اور سنکی تھے ایک دفعہ سیّد وقار عظیم صاحب نے ایک مضمون حلقۂ ارباب ذوق میں پڑھا عنوان تھا ''تقسیم کے بعد اُردو افسانہ'' اس میں منٹو کے بارے میں انہوں نے لکھا تھا کہ اس دور میں منٹو نے فنی اور ادبی نقطۂ نظر سے کمزور کہانیاں لکھی ہیں۔ بس منٹو صاحب بگڑ گئے۔ چند موقع اور مفاد ... جو شخص بھی منٹو صاحب سے ملتا۔ گھر رہوں یا راستہ میں، فرصت میں ہوں یا

بار بار سمجھانے پر بھی کہتے ہی رہے تو ایک دن میں نے انہیں سختی سے ٹوکا اور کہا ”آپ کس وہم کس مغالطے میں پڑ گئے ہیں۔ یہ گمان قطعی غلط ہے۔ تنقید کو برداشت کیجئے۔ لوگوں کو اپنے متعلق اپنا نقطۂ نظر بھی پیش کرنے دیجئے اور وقار عظیم جیسے باوقار ناقد کے بارے میں آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس پر ذرا غور کیجئے“، تو بس میرے پیچھے پڑ گئے۔ اب جتنا عرصہ ساتھ ہوتا تو اتنا عرصہ گالیاں۔ چند دن بعد بھول گئے اور پھر کبھی ذکر بھی نہیں کیا۔

بھول جانے کا معاملہ عجیب تھا۔ آپ کا نام بھول جائیں گے۔ اپنے گھر کا راستہ بھول جائیں گے۔ تانگہ میں کتابیں بھول آئیں گے۔ لیکن برسوں پہلے کے واقعات ذہن میں محفوظ تھے۔ میں حیران رہ جاتا تھا۔ جب وہ تیس سال پہلے کے واقعات مع ساری تفصیلات و جزئیات کے سناتے۔ لیکن اگر کوئی شخص آتا تو فوراً نام پوچھ تو لیتے مگر جب چلا جاتا تو کہتے ”یار اسد اس آدمی کا نام کیا تھا؟“ کہتے تھے ”تمہارا نام صرف اس لئے یاد رہ گیا کہ تم غالب کے ہم نام ہو۔

بھولنے کا ایک واقعہ خود ہی سنایا تھا کہ ایک دفعہ پاکستان آنے کے بعد نئی سائیکل خریدی اور شام کو گھر سے نکلے۔ کہیں جا کر خوب پی اور سائیکل پر گھر کی طرف چلے تو راستہ میں پتہ چلا کہ سائیکل میں ہوا ہے ہی نہیں تو اتر پڑے اور ایک سائیکل کی دوکان پر ہوا بھرنے کو کہا۔ آپ کو سائیکل کی دوکان پر سوجھی کہ ”یار تانگہ میں کیوں نہ چلا جائے“، لہٰذا تانگہ میں سوار ہو گئے اور سائیکل والے سے کل سائیکل آ کر لے جائیں گے کہہ کر چلے آئے صبح خیال آیا کہ بھئی سائیکل؟ کافی دیر بعد خیال آیا کہ کسی سائیکل کی دوکان پر چھوڑی تھی۔ کس دوکان پر اب یہ پتہ نہیں۔ بہت سوچا لیکن دوکان یاد نہیں آئی اور مرنے تک ساڑھے پانچ سال میں دوکان کو یاد نہ کر سکے۔ تانگہ میں سامان بھول آئیں گے۔ کسی جگہ گھڑی رکھ کر بھول جائیں گے۔ اس بھول کی عادت سے بے حد نقصان اُٹھایا ہے۔

صفیہ صاحبہ منٹو صاحب کی یادداشت ہیں۔ ہزاروں افسانے لکھنے کی تحریک صفیہ صاحبہ کے کسی واقعہ کو یاد دلانے سے ہوئی ہے اردو زبان کی خوش قسمتی ہے کہ منٹو کو صفیہ جیسی خاتون ملیں۔ اس خاتون کو منٹو ڈرائنگ روم میں بیٹھے آواز دیتے ”صفیہ وہ آج سے اٹھارہ سال پہلے اس دن اس وقت کیا بات ہوئی تھی۔“ اور صفیہ صاحبہ ساری روداد سنا ڈالتیں۔

صفیہ صاحبہ سناتی ہیں کہ دوست منٹو کی بہت بڑی کمزوری رہے ہیں اور یہ کمزوری ان کی سدا کی

کمزوری ہے۔ واقعہ یہی ہے کہ منٹو بے حد دوست پرست تھے اور ان کے دوست بھی ایک سے ایک دلچسپ رہے ہیں لیکن صفیہ کا کہنا ہے کہ جب سے پاکستان آئے ہیں صرف شرابی دوست ڈھونڈ ڈھونڈ کر دوستی کرتے ہیں۔ بمبئی میں تو پینے والے کام بھی کرتے تھے اور ان میں کوئی نہ کوئی خوبی بھی ہوتی تھی لیکن یہاں تو ان کے دوست نرے نکمے ہوتے ہیں۔ بس پینے کے سوا شاید انہوں نے کچھ سیکھا ہی نہیں ہے۔

بمبئی کے دوستوں کی بات ہی اور تھی۔

بمبئی میں منٹو کا ایک دوست برج موہن [1] تھا۔ شادی سے پہلے منٹو اور برج موہن اکٹھے ہی رہتے تھے۔ وہ عجب آدمی تھا۔ فوٹو گرافر تھا مگر صرف بیکار رہنا جانتا تھا اگر منٹو اسے کہیں کام دلاتے تو وہ صفیہ کے پاس جا کر منٹو کو گالیاں دیتا تھا کہ ''دیکھو منٹو میری آزادی سلب کرنا چاہتا ہے وہ چاہتا ہے کہ میں غلام ہو کر رہ جاؤں۔ وہ اپنے کو بہت بڑا رائٹر وائٹر سمجھتا ہوگا۔ احمق کہیں کا،'' منٹو مجھ سے کہتے تھے کہ ''برج موہن بے حد ذہین، تیز اور بہت کچھ تھا اور وہ جو چاہتا وہ بن سکتا تھا۔ وہ بہترین فوٹو گرافر تھا۔ بہترین ڈائریکٹر تھا اور وہ دنیا میں جو چاہے کر سکتا تھا۔ لیکن اس نے کرنا ہی کچھ نہ چاہا۔''

منٹو نے مجھے بتایا کہ ''میں نے اشوک کمار سے کہہ کر برج موہن کو ایک دفعہ فلم کمپنی میں پانچ سو روپیہ ماہانہ پر نوکر کرادیا۔ برج موہن گیارہ مہینہ تک ہر مینہ کی پہلی تاریخ کو جا کر کمپنی سے پانچ سو روپیہ لیتا رہا اور گیارہ مہینے میں اس نے صرف کمپنی میں دو باتیں کیں۔ ایک دفعہ جب شوٹنگ جاری تھی تو اس نے اشوک کمار سے کہا تھا ''نہیں، بالکل نہیں۔ یہ کپڑے ٹھیک نہیں رہیں گے،'' اور دوسری دفعہ اس نے نسیم سے کہا تھا ''غلط، بالکل غلط، یہ میک اپ بدل دو'' بس، اور گیارہ مہینہ تک پانچ سو روپیہ ماہوار لیتا رہا۔

صفیہ نے مجھے برج موہن کا ایک قصہ سنایا تھا کہ جن دنوں منٹو اور برج موہن ایک ہی کمرہ میں رہتے تھے ایک دفعہ برج موہن کمرہ بند کر کے کہیں باہر چلا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد منٹو کچھ ضروری کاغذات لینے کے لئے کمرہ پر آئے۔ برج موہن غائب تھا اور کمرہ بند تھا۔ منٹو بے چین ٹہلتے رہے، برج موہن کا انتظار کرتے رہے۔ دو گھنٹے گزر گئے، تین گھنٹے، بڑی دیر بعد سامنے سے برج موہن آتا دکھائی دیا۔ منٹو چلایا کہ ''دوڑ کر آ'' برج موہن پھر بھی بڑی خاموشی سے جھومتے جھومتے قدم اٹھاتا آیا اور منٹو کے آگے چابی بڑھا

---

[1]: منٹو کا عزیز ترین دوست برج موہن جو ان دنوں ممبئی ہی میں ہے اور جس کے نام منٹو نے ''بادشاہت کا خاتمہ'' انتساب کیا ہے

دی۔ منٹو سخت غصہ میں تھا۔ منٹو نے غصہ سے چابی لے کر برج موہن کے منہ پر دے ماری۔ برج موہن اس پر نیچے جھکا زمین سے چابی اٹھائی اور جدھر سے آیا تھا اسی طرف آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا جھومتا جانے لگا۔ منٹو اسے جاتے دیکھ کر دوڑے اور لپٹ گئے اس طرح چابی اٹھا کر چلے جانے کی ادا منٹو صاحب کو بھا گئی تھی۔

منٹو نے اپنے دوست برج موہن کا ایک اور واقعہ مجھے سنایا تھا کہ ایک دفعہ میں فلم کمپنی میں گیا ہوا تھا برج موہن گھر صفیہ کے ہاں گیا اور کہا ''بھئی مجھے چشمہ خریدنا ہے روپیہ چاہئے۔ صفیہ نے چک بک پر دستخط کر کے چیک بک آگے بڑھا دی کہ جتنی رقم کی ضرورت ہے درج کر لیجئے۔ اس پر برج موہن نے تیس روپیہ چیک پر لکھے اور چشمہ لینے چک لے کر چلے گئے۔ شام کو برج موہن چشمہ خرید کر لے آئے اور آتے ہی دروازے میں سے کہا ''بھابی منٹو سمجھتا ہوگا کہ میں نے اس کے روپیوں ہی سے چشمہ خریدا ہے۔ مجھے ان تیس روپیوں میں اپنے روپے بھی شامل کرنے پڑے ہیں۔ وہ سمجھتا ہوگا تیس روپیوں ہی میں چشمہ آ گیا۔ اسے بتلا دینا چونتیس روپیوں میں آیا ہے،'' منٹو کا کہنا تھا کہ یہ کہہ کر برج موہن دروازے ہی میں سے واپس لوٹ گیا۔

منٹو کے ایک اور دلچسپ دوست خلش صاحب[1] تھے۔ وہ بھی اپنی نوعیت کے واحد آدمی تھے۔ منٹو کا ارادہ خلش صاحب پر مضمون لکھنے کا تھا لیکن افسوس وہ مضمون لکھنے سے پہلے ہی رخصت ہو گئے۔ منٹو سناتے تھے کہ جب کبھی ہمارے ہاں دعوت ہوتی تھی اور ہم لوگ مہمان خصوصی کے انتظار میں ہوتے تھے تو یکا یک خلش صاحب کی آواز ابھرتی تھی' یار تمہارا مہمان نہیں آیا ہے تو کیا ہوا۔ میں جو آ گیا ہوں،'' صفیہ صاحبہ بتلاتی ہیں کہ خلش صاحب سنترے، کیلے وغیرہ مع چھلکے کے کھاتے تھے اور کہتے تھے ''میری سمجھ میں نہیں آتا لوگ بغیر چھلکے کے کس طرح کھا لیتے ہیں۔ حالانکہ ان چیزوں کو ان کی اپنی حقیقی اور فطری حالت میں کھانا چاہئے۔'' صفیہ کا کہنا ہے کہ خلش صاحب شاعری بھی فرماتے ہیں اور بڑے دلچسپ طریقہ سے شعر بھی پڑھتے ہیں۔ منٹو بتلاتے تھے کہ اگر خلش صاحب ہمارے گھر آئیں اور ہم لوگ کھانا کھاتے ہوں تو خلش صاحب کہتے تھے کہ'' یار کھانا کھا تو چکا ہوں لیکن چلو تمہارا ساتھ دیتے ہیں،'' یہ کہہ کر شریک ہو جاتے اور پندرہ بیس چپاتیاں کھا کر اُٹھتے۔''

آخر دم تک منٹو خلش صاحب کا نام بڑے پیار سے لیتے رہے۔

---

[1] آغا خلش کاشمیری

بمبئی میں محسن عبداللہ، شیام، شاہد لطیف، اشوک کمار، ایس مکرجی، نظیر، رفیق غزنوی، پیر صاحب، خورشید انور سے منٹو کے بڑے تعلقات تھے۔

شیام کو صفیہ ناپسند کرتی تھیں۔ منٹو کہتے تھے پتہ نہیں تم کو کیوں اس سے دشمنی ہے حالانکہ بڑا اچھا یار تھا۔ خورشید انور کے ساتھ خوب پینا ہوتا تھا، اشوک کمار اگر کبھی کوئی خاص بات ہو تو، یا پھر کسی دن بہت خوش ہو تو پیتا تھا لیکن پیر صاحب اور خورشید انور سے تو روز کے پینے کی دوستی تھی۔ پیر صاحب قالینوں کا کاروبار کرتے تھے اور ان کی دوکان گرین ہوٹل[1] کے پاس ایران پیالیس کے نام سے تھی۔

منٹو کام سے چھٹی کر بارہ ایک بجے پیر صاحب کی دوکان پر پہنچ جاتے اور شراب طلب کرتے۔ پیر صاحب کہتے "سعادت یہ دن کا وقت ہے اور دوکانداری کا معاملہ ہے،" تو منٹو جواب دیتے "شراب نہیں تو پھر بیئر ہی پلاؤ۔ بیئر تو شراب نہیں ہے جو کا پانی ہے۔" شاہ صاحب کا کہنا ہے کہ پی کر بعض دفعہ وجد میں آجاتے تھے اور شعر پڑھتے اور ایک خاص رنگ پیدا کر دیتے تھے۔ پھر کوئی ان کا ملنے والا آجاتا تو اس کے ساتھ چل دیتے۔ پیر صاحب معمر آدمی ہیں۔ خود مجھ سے پیر صاحب نے کہا تھا کہ "اسد صاحب! میری اور سعادت کی عمر میں کوئی تناسب نہ تھا۔ وہ میرے بچوں کا ہم جماعت تھا۔ میرے اور اس کے خاندانی مراسم تھے اور منٹو کے بھائیوں[2] سے میری دوستی تھی۔

سعادت تو میرے بھانجے ڈاکٹر پیرزادہ[3] کا کلاس فیلو تھا لیکن ان ساری باتوں کے باوجود میرا بہترین دوست تھا۔ وہ میرے دوستوں میں سے میرا عزیز ترین دوست تھا۔ اس کا مشورہ میرے لیے ہمیشہ مفید ہوتا تھا آہ میرا دوست مجھ سے جُدا ہو گیا۔"

منٹو کی جُدائی کا سب کو دکھ ہے چونکہ منٹو خود دوست پرست تھا اور اپنی محبت کا دوسرے پر گہرا تاثر چھوڑتا تھا۔ وہ دکھی دوستوں پر تو مر مٹ جاتا تھا۔ ہر ملنے والا اس کا دوست تھا۔

اب جبکہ منٹو کے دوستوں ہی کا ذکر چل رہا ہے۔ میں اس کے چند دوستوں کا یہاں ذکر کرتا ہوں۔ اپنے ان دوستوں کو وہ مرتے دم تک یاد کرتا رہا ہے اور زندگی کے ہر موڑ پر یہ دوست اس کے ماضی کا ایک

۱: گرین ہوٹل — قریب تاج محل ہوٹل بمبئی

۲: منٹو کے بھائی سعید حسن اور سلیم حسن، جو برسوں سے نیروبی میں ہیں اور بیرسٹر ہیں

۳: ڈاکٹر پیرزادہ حفظات سول سرجن میو ہسپتال لاہور۔

ناقابل فراموش سرمایہ رہے ہیں۔

کرشن چندر کی تحریر کی کبھی تعریف کی ہو یا نہ کی ہو لیکن کرشن کی معصومیت، بھولا پن اور اس کی خاموش سنجیدگی کا ضرور ذکر کرتے رہتے تھے۔ کہتے تھے کہ ''اسد میں کرشن پر ایک طویل مضمون لکھنا چاہتا ہوں لیکن کیا کروں بعض یادوں کی کڑیاں نہیں مل رہی ہیں اور بعض باتوں کو میں بھول رہا ہوں اگر یاد آجائیں تو پھر ایک ڈھنگ کا کرشن پر مضمون لکھوں گا۔''[1]

سردار جعفری کے علم کے بڑے معتقد تھے۔ کہتے تھے ''وہ کمیونسٹ ہے کمیونسٹ، اس سے پوچھ لو کہ کارل مارکس نے ڈاس کیپٹل کے صفحہ ۱۲ کی تیرھویں سطر میں پہلا لفظ کیا لکھا ہے جعفری تم کو فوراً بتادے گا۔''

کہتے تھے ''سردار سے مجھے اس لئے بھی پیار ہے کہ وہ میرا تنہا دوست ہے جو مجھے سعادت کہہ کر پکارتا تھا، منٹو نہیں کہتا تھا۔ بمبئی میں وہ گھر آتا تھا تو دروازہ پر آواز دیتا تھا کہ میں ''سردار ہوں، سعادت ہے''، جب کبھی ٹیلیفون کرتا تھا تو پوچھتا ''سعادت ہے''۔ اور میری بیوی فوراً پہچان لیتی تھی کہ سوائے سردار کے اور کوئی نہیں ہوسکتا کہ جو بمبئی میں سعادت کے نام سے منٹو کو پوچھے۔''

کہتے تھے ایک دفعہ سنڈھرسٹ روڈ پر مل گیا اور مجھے کمیون لے گیا، وہاں پر یہ لوگ ناریل کے چھلکے ہوتے ہیں نا اس میں چائے پیتے تھے۔ ایک لحاف میں سارے دوست سوتے تھے۔ عجب فراڈ بنے رہتے تھے میں اسے اپنے گھر لے آیا۔ نوکر سے کہا ''جلد دو گلاس خوب صاف کر کے لاؤ'' جب گلاس آئے تو میں نے شراب انڈیلی اور کہا ''اس طرح انسانوں کی طرح انسان بن کر رہا کرو۔''

کہتے تھے کہ مجھے سردار نے بہت گالیاں دی ہیں لیکن میں کیا کروں، میں اب بھی اس سے پیار کرتا ہوں۔''

کہتے تھے کہ مجھے پہلا ۔۔۔

تھا۔سردار سے تعارف ہوا۔سب بیٹھ گئے۔میری نظر اس کے جوتوں پر پڑی۔سردار نے ایک پیر میں کالا ایک پیر میں لال جوتا پہن رکھا تھا اور تسموں کے بجائے دھاگے سے جھوٹ موٹ ڈوریوں کے طور پر باندھ رکھا تھا۔میں نے کہا واقعی یہ دانشور ہے۔بالکل اسکالر لگتا تھا۔کمرے میں ایک طرف کاغذات کا ڈھیر تھا۔میں نے پوچھا ''جعفری صاحب یہ کیا ہے۔'' سردار نے کہا ''میرے افسانے'' میں نے پوچھا ''وہ کاہے کا ڈھیر ہے،'' جعفری نے کہا ''وہ میری نظمیں ہیں،'' میں نے پوچھا ''اس طرف کیا لگا رکھا ہے'' سردار نے کہا ''میرے ڈراموں کے مسودے'' میں نے کہا ''آپ نے لکھ ہی رکھا ہے یا شائع بھی کراتے ہیں۔''

''ابھی تو میں مشق کر رہا ہوں،'' سردار نے جواب دیا۔

کہتے تھے ''میں نے اس ڈھیر میں سے ایک مسودہ اٹھا کر ''ہمایوں'' کو پوسٹ کر دیا۔اس زمانہ میں ''ہمایوں'' ڈھنگ کا پرچہ تھا، پہلے ہی شمارہ میں وہ ڈرامہ شائع ہوا اور اسے سب لوگوں نے پسند کیا۔''

کہتے تھے ''سردار نے بڑی محنت کی ہے۔بڑا پڑھا ہے، لکھا ہے۔ان سب ترقی پسندوں میں سردار جعفری ہی واحد شخص ہیں جو چیزوں کو سمجھتا ہے''، کہتے تھے ''لیکن کیا کیا جائے اپنے عقیدہ میں وہ سالا ایسا سرشار اور کٹر ہے کہ دوسرے کی کچھ سنتا ہی نہیں۔''

ایک دفعہ میں نے پوچھا ''بنّے بھیا[1] سے آپ کی خوب ملاقاتیں رہی ہوں گی۔''

منٹو صاحب نے جواب دیا ''کبھی کبھار وہ ہمارے گھر آتے تھے۔بے حد پیارا اور پر خلوص آدمی ہے۔اتنا مہذب آدمی شاید ہی میں نے کوئی اور دیکھا ہو۔''

میں نے حیران ہو کر پوچھا لیکن اپنے ایک مضمون میں آپ نے تو لکھا ہے کہ ''چاندی کی لٹیا سے دودھ پینے والا سجاد ظہیر مجھے ہمیشہ ایک مسخرا نظر آیا'' یہ کیا؟

منٹو صاحب بگڑ گئے ''لکھی ہوئی چیزوں کو کیوں درمیان میں لاتے ہو جو میں نے لکھا ہے وہ بھی صحیح ہے اور جو میں نے اب کہا ہے وہ بھی صحیح ہے۔''

''اب میں ان دونوں میں سے کسے صحیح سمجھوں''؟ میں نے آہستہ سے پوچھا۔اس سوال پر منٹو سنجیدہ ہو گئے اور میں خاموش ہو گیا۔جب وہ خلاف توقع سنجیدہ ہو جاتے تھے تو خاموش ہو جانا ہی بہتر ثابت ہوتا تھا۔

---

[1] سجاد ظہیر

احمد ندیم قاسمی سے بڑے گہرے تعلقات تھے۔ندیم صاحب کی انسانیت ،شرافت ،اور دیانت کے بڑے قائل تھے۔البتہ شاعری اور افسانہ نگاری کا ذکر آجاتا تو دبی زبان میں کچھ تیز سا فقرہ کہہ جاتے،[1] لیکن بہ حیثیت انسان بڑا مانتے تھے اور قاسمی صاحب کے بڑے واقعات سناتے تھے۔

کہتے تھے''اسد تم قاسمی کو آج سے جانتے ہو۔میں اس وقت سے جانتا ہوں جب قاسمی مجھے سولہ سولہ صفحے کے خط لکھا کرتے تھے۔ہر خط کے ساتھ ایک افسانہ ہوتا تھا۔بیشتر افسانے تو میں نے پورے پورے کاٹ دیئے ہیں۔لیکن وہ اتنا شریف آدمی ہے کہ کبھی اس نے بُرا نہیں مانا۔ایک دفعہ کا واقعہ سنانے لگے کہ راجندر سنگھ بیدی کسی پرچہ کا ایڈیٹر تھا۔مجھے قاسمی نے ایک افسانہ اصلاح دینے کے لئے بھیجا میں نے تین چوتھائی افسانہ کاٹ دیا اور افسانہ سیدھا بیدی کو بھیج دیا۔بیدی نے قاسمی سے دریافت کیا کہ مجھے منٹو نے تمہارا ایک افسانہ بھیجا ہے اور اس کا بیشتر حصہ کاٹ دیا ہے۔وہ افسانہ شائع کیا جائے یا تمہیں لوٹا دوں۔قاسمی نے بیدی کو لکھا کہ''بالکل اسی طرح شائع کیا جائے جیسے کہ منٹو صاحب نے مناسب سمجھا ہے۔''

کہتے تھے،،یار قاسمی بے حد شریف آدمی ہے۔میرے ہاں دہلی آیا تو قاسمی اس دور میں شلوار پہنتے تھے میں نے پہلی بار کوٹ پتلون بنوایا'' کہتے تھے''ایک منظوم ڈرامہ ریڈیو کے لئے میں نے لکھوایا۔۴۵ منٹ کا تھا۔حسب معمول بڑی محنت سے لکھا۔میں نے اس ڈرامہ کے معاوضہ کے لیے ڈائریکٹر سے بڑا جھگڑا کیا۔[2] ڈائریکٹر کے اختیار میں صرف ایک سو روپیہ تک کی منظوری تھی۔آخر کار ندیم کو ننانوے روپے ملے۔''

کہتے تھے''میرے ہاں قاسمی کے کوئی ایک ہزار خط تھے اور ہر خط پندرہ پندرہ ،سولہ سولہ ،صفحہ کا تھا، میں وہ سارے خط بمبئی سے آتے وقت ضائع کر آیا ہوں۔مگر میں نے قاسمی کو جو خط لکھے تھے۔میرا خیال ہے کہ قاسمی نے وہ سارے محفوظ رکھے ہیں۔''

افسانہ نویسی پھر بھی برداشت کر لیتے تھے۔شاعری کے متعلق کہتے تھے۔''سمجھ میں نہیں آتا۔کیوں شاعری کرتے ہیں۔کہتے تھے یار غالب کے بعد تو کسی کو بھی شاعری کرنے کا حق ہی نہیں ہے۔[3]

ایک دور میں جب شدّت سے مخالفت کا دورہ پڑا تھا میں نے کہا''منٹو صاحب احمد ندیم قاسمی

۱: اور اگر کرشن چندر کی تحریر کا ذکر ہوتا رہتا تو پھر یہ جملہ کچھ اور تیز ہو جاتا۔

۲: مجھے یاد نہیں ڈائریکٹر کا نام مجھے انہوں نے احمد شاہ بخاری پطرس بتلایا تھا یا کچھ اور۔

۳: غالب سے عقیدت کے علاوہ اس جملہ سے کس قدر جذباتیت کا پتہ چلتا ہے۔

ہمارے لیے تو بڑے مقدّس ہیں۔ کم از کم میرے سامنے تو کچھ نہ کہیے اور ویسے بھی ان کی خدمات، ان کی قربانیاں، ان کی انسانیت دیکھئے نا۔''

کہنے لگے'' سردار جعفری اور ندیم قاسمی کو تم خدا بنالو۔''

ایک دفعہ ترقی پسند ادیبوں کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ میں نے کہا'' کسی بھی ترقی پسند کا نام لے لیجئے۔ نظریات کو تو چھوڑیے عملی زندگی میں بھی وہ بڑا پیارا ہوگا۔ اس کی شخصیت میں بڑا چارم ہوگا اور بحثیت انسان اس کا درجہ بھی یقینی بلند ہوگا۔''

'' ہٹاؤ یار بکواس کرتے ہو؟ یہ کوئی کلّیہ ہوا۔ اچھا ہونا ترقی پسند ہوئے بغیر ممکن نہیں؟ شرافت کا تم ہی لوگوں نے گویا ٹھیکہ لے رکھا ہے''؟

'' یہ تو میں نے دعویٰ نہیں کیا ہے۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ کسی غیر ترقی پسند کو لے لیجئے۔ بڑے گھناؤنے نظریات رکھے گا۔ گنجلک خیالات ہوں گے۔ طور طریق عجب ہوں گے اور اب رہا ترقی پسند، تو ترقی پسند ہونے کے لئے آدمی کی حیثیت میں بھی بلند ہونا ہوگا۔ بلکہ یہ کہ اچھا ہوئے بغیر ترقی پسند کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔'' میں نے کہا

کہنے لگے'' اپنی بکواس بند بھی کرو۔ کیا مہمل بات لے بیٹھے ہو''؟ میں نے کہا'' اچھا سبطے[1] کو لیجئے۔ اس کے بارے میں کیا رائے ہے''؟

کہنے لگے'' مستثنیات کو چھوڑو وہ تو بے حد پیارا آدمی ہے۔''

میں نے کہا'' میں بھی یہی کہتا ہوں مستثنیات کو چھوڑیئے غیر ترقی پسندوں میں اچھا ڈھنگ کا آدمی بھی ہو سکتا ہے لیکن اچھا آدمی ہونے کے لئے تو ترقی پسند ہی ہونا ہوگا۔ اب آپ نے خود سبطے کی تعریف کی ہے۔ سبطے کے بارے میں کرشن کی رائے بھی سن لیجئے۔''

اتفاقیہ طور پر میرے ساتھ اس دن کرشن چندر کا رپورتاژ'' پودے'' تھا۔ میں نے کہا۔'' سنیے کرشن اپنے سبطے کے بارے میں کیا لکھتے ہیں،''' سبطے کے چہرے پر کرب کی بے شمار لکیریں ہیں جیسے سمندر کا جھاگ ساحل سے ٹکرا ٹکرا کر پختہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ذہنی احساسات کا تموج سالہا سال سے اس کے نازک چہرے پر یخ بستہ ہوتا چلا گیا ہے۔ اس کا چہرہ خفیف سے خفیف انسانی جذبات کا بھی عکاس

1۔ سید سبط حسن۔

ہے اور اکثر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا سبطے نے زندگی سے کرب ہی حاصل کیا ہے۔ زندگی کی بے پناہ صعوبتوں اور گہری سے گہری مسرّتوں سے بھی اس نے کرب ہی حاصل کیا ہے۔ غالباً اس کے انداز فکر میں ایک ایسی نازکی ہے جو اسے ہر غم سے اور ہر مسرّت سے ایک خاص قسم کا درد محسوس کراتی ہے ایک حسین کلی کو دیکھ کر اس کے چہرے پر ایسی ہی کیفیت پیدا ہوتی ہے جیسے ایک نکبت زدہ بھکاری کو دیکھ کر اس کا چہرہ شدّت احساس کا وہ مرکز اتصال ہے جہاں حسن اور غربت دونوں ایک ہی درد کی تفسیر بن جاتے ہیں۔ اپنی جواں سالی کے باوجود یہ چہرہ بوڑھا سا ہو چلا ہے۔ اس میں صدیوں کی تھکی آچلی ہے۔ کرب کی ننھی ننھی لاکھوں لکیریں اس چہرے کے ہر روزن سے شب و روز جھانکتی نظر آتی ہیں۔ جیسے انہوں نے سارے غم کا احاطہ کر لیا ہو۔ [1]" میں نے کہا "دیکھا آپ نے! کس قدر پیار سے کرشن نے سبطے کا ذکر کیا ہے۔ زندگی میں پہلی بار کوئی چیز انہیں اس قدر دلچسپی سے سنتے دیکھا ہے۔ جب میں پڑھ چکا تو کہنے لگے "اچھا بابا ترقی پسند ہی اچھے ہوتے ہیں لیکن یہ اچھے بُرے کی بات چھوڑو۔ سبطے بہت دن سے نہیں آیا۔ حالانکہ کئی بار اس نے آنے کا وعدہ کیا ہے۔ پتہ نہیں کیوں نہیں آیا۔ میں اس سے پوچھتا ہوں کہ اس کے معاشقہ کا کیا ہوا؟ اس کی شادی کس طرح ہوئی لیکن مصیبت یہ ہے کہ اس سے میری زیادہ سے زیادہ تین ملاقاتیں بمبئی میں ہوئی ہیں۔ دو ایک بار یہاں ملا ہوں۔ میں پوچھتا ہوں تو وہ مسکرا کر پائپ سے دُنیا بھر کے گندے تمباکو کا دھواں اڑانے لگتا ہے اور موضوع بدل دیتا ہے لیکن میں ضرور پوچھ کر رہوں گا۔ اس لئے تم ہماری گفتگو کے وقت چلے جانا۔"—— یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ کسی نے بیل دی اور دوسرے ہی لمحہ سبطے صاحب اپنی حسین ترین مسکراہٹ سمیت اور دوسرے کو موہ لینے والی شخصیت لیے آپہنچے۔ میں کچھ دیر بیٹھا رہا اور پھر ان لوگوں سے اجازت لے کر منٹو صاحب کے کہنے کے مطابق انہیں موقع دینے کے لئے نکل آیا۔

کئی دن گزر گئے سبطے صاحب اس عرصہ میں پھر گرفتار کر لیے گئے۔ ایک دن اپنے ایک دوست اظہار الدین احمد صاحب کے ساتھ میں منٹو صاحب کے گھر پہنچا، منٹو صاحب باہر جانے کے لئے تیار ہو رہے تھے ہم بھی ان کے ساتھ ہو لئے۔ ٹانگہ ماہنامہ "ڈائریکٹر" کے دفتر پہنچا۔ منٹو صاحب اُوپر دفتر میں چلے گئے۔ میں اظہار، منٹو صاحب کی لڑکی نزہت نیچے ڈین ہوٹل [2] میں بیٹھے چائے پینے لگے۔ کچھ

---

[1] پودے از کرشن چندر صفحہ نمبر ۴۳-۴۴

ہی دیر بعد منٹو صاحب نیچے آئے۔ اسی دن ''ڈائریکٹر'' کا سالنامہ شائع ہوا تھا۔ ان کے ہاتھ میں سالنامہ کی دو کاپیاں تھیں۔ ایک کاپی مجھے یہ کہہ کر دی کہ ''ڈائریکٹر پڑھو اس سے تمہارا اخلاق سُدھر جائے گا اور چال چلن درست ہو جائے گا۔ یہ دوسری کاپی میں رکھ لیتا ہوں تاکہ میں بھی پڑھوں[2] اور اپنا چال چلن دُرست کروں۔''

ہاسٹل آکر رات کو میں نے ڈائریکٹر پڑھنا شروع کیا۔ منٹو صاحب کا ''پُراسرار نینا'' پر ایک مضمون تھا۔ دوران مضمون میں سیٹھے صاحب کا بھی ذکر تھا اور ان کی شادی کے متعلق تفصیلات بھی — دوسرے دن منٹو صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے پہلا جملہ یہ کہا ''منٹو صاحب سیٹھے کی شادی کی تفصیلات دریافت کرنا شاید آپ کو اسی لیے ضروری تھا کہ اسے آپ ڈائریکٹر کے حوالے جلد سے جلد کر دیں۔'' منٹو صاحب ہنسنے لگے۔

میں نے کہا ''منٹو صاحب اب خدا کے لئے اس قسم کے مضامین لکھنا ختم کیجئے۔''

''تم اپنی یہ بکواس ختم کرو'' منٹو صاحب کا جواب تھا۔[3]

دوستوں ہی کی حکایات جاری ہیں تو منٹو کے ایک اور دوست کی بات سنئے۔

ایک دفعہ بیٹھے گفتگو کر رہے تھے۔ پاس ہی ایک فلمی رسالہ ''چتر لیکھا'' پڑا تھا۔ میں اٹھا کر دیکھنے لگا۔ اس پرچہ میں ظہیر کاشمیری کا ایک انٹرویو تھا اور ظہیر صاحب کی ایک فلسفیانہ تصویر بھی۔ میں نے رسالہ منٹو صاحب کی طرف بڑھایا اور کہا ''دیکھئے اپنا شیکسپیر کن پرچوں میں چھپتا ہے؟''

منٹو صاحب نے پوچھا ''کون ہے؟''

میں نے کہا ''دیکھ لیجئے۔''

پرچہ ہاتھ میں لے کر ہنس پڑے۔ کہنے لگے ''یار ظہیر کاشمیری ہے'' پوچھنے لگے ''ظہیر سے تمہاری دوستی ہے؟'' میں نے کہا ''کیوں نہیں پچھلے دنوں تو ہم کئی کئی گھنٹے تک ساتھ رہے ہیں''

کہنے لگے ''کئی کئی گھنٹے تم ظہیر کے ساتھ کس طرح رہ سکے''

1: ڈین ہوٹل، مال روڈ لاہور کا ایک ہوٹل

2: واقعی آخری عمر میں ''شمع'' اور ''ڈائریکٹر'' ہی پڑھتے تھے۔

3: اب ان کی کتاب ''برقعے'' میں پراسرار نینا'' عنوان سے یہ مضمون شامل ہے۔

میں نے کہا" بھائی انڈیا گئے ہوئے تھے وہ جاتے ہوئے میرے لیے ایک معقول رقم مجھے دیتے گئے میں یوننگ ہال[1] میں اپنے ایک دوست کے ہاں رہتا تھا، صبح ہی صبح مجھے میرا یہ دوست جگا دیتا یا پھر ہمارا ہاسٹل کا نوکر" آبادان" مجھے اٹھا دیتا۔ میں منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلتا۔ میرا دوست ناشتہ کے لئے کہتا لیکن میں سیدھا ظہیر کے گھر[2] پہنچتا تھا۔

ظہیر بعض دفعہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے اخبار پڑھتے ملتے یا پھر کسی دن میں جلد پہنچ جاتا تو میرے آواز دینے پر وہ اپنے دومنزلہ مکان کی کھڑکی سے سر نکالتے اور کہتے I am Coming just in a minute میں دل میں (اردو میں) کہتا آپ ایک منٹ کیا پندرہ منٹ میں بھی آ جائیں تو میں شکریہ ادا کروں۔ بہر حال میں ظہیر کے محلہ کے بچوں کو کھیلتے کودتے دیکھتا رہتا۔ وہ اپنے بال سنوار کر سوٹ پہن کر چھڑی ہاتھ میں لے کر نکل آتے۔ ہم دونوں آرام کیفے[3] میں جاتے اور صبح کا ناشتہ کرتے۔ میں ناشتہ کے ساتھ ساتھ اخبار پڑھتا رہتا۔ ظہیر ناشتہ کے ساتھ ساتھ لیکچر دیتے رہتے۔"

"پھر—" منٹو نے پوچھا۔

"پھر کیا۔ پیسے ختم ہو گئے۔ ناشتہ بند ہو گیا لہٰذا ظہیر سے ملنا بھی کم ہو گیا۔"

"یار تم تو ناشتہ کرا کر ظہیر کا لیکچر سننے والے نکلے۔ بڑے باہمت ہو۔ میں تو اس کے ہاں سے ایک دفعہ آدھ گھنٹہ بعد ہی بھاگ آیا تھا۔"

"کیوں کیا ہوا تھا۔" میں نے پوچھا۔

کہنے لگے" یار میں ایک دفعہ ڈاکٹر پیرزادہ کے ہاں جانے کے لئے نکلا۔ بیڈن روڈ پر ظہیر مل گیا۔ مجھے زبردستی پکڑ کر اپنے گھر لے گیا۔ ایک بڑا تاریخی صوفہ اپنے پاس ڈال رکھا ہے۔ اس پر مجھے بٹھا دیا۔ خود سامنے بیٹھ گیا اور آدھ گھنٹہ تک بغیر فل اسٹاف کے انگریزی میں نہ جانے کیا کیا لیکچر دیتا رہا۔"

"میں دوران لیکچر کئی بار روک روک کر اُسے یاد دلاتا رہا کہ مجھے ڈاکٹر کے ہاں جانا ہے لیکن وہ میری سنے بغیر لیکچر دیتا رہا۔ جب میں نے اس پر زور دے کر یہ کہا کہ مجھے ڈاکٹر کے پاس جانا ہے تو ظہیر نے جانتے ہو کیا جواب دیا۔ اس نے مجھ سے انگریزی میں کہا" آج تیس سالوں سے بیمار ہوں لیکن میں

1: یوننگ ہال۔ ایف سی کالج لاہور کے پوسٹ گریجویٹس کا ہاسٹل۔

2: واقع ۳ بیڈن روڈ لاہور	3:۔ آرام کیفے بیڈن روڈ لاہور کا ایک ہوٹل

ڈاکٹر کے ہاں نہیں جاتا۔ میں کھیتوں کے کنارے سوکر راتیں گزارتا ہوں۔ میں جنگلوں میں تحریک کے لئے پیاسا درختوں پر بیٹھا چہچہارہا ہوں۔ تم میری سنو،'' اور پھر ''سنو'' کہہ کر وہ سنائے چلا گیا۔''

کہنے لگے'' اتنے میں ظہیر کا باپ آ گیا۔ ظہیر، میں اور ظہیر کے باپ میں بڑے دلچسپ مکالمے ہوتے ہیں،'' یہ کہہ کر منٹو آدھ گھنٹے تک پنجابی میں دونوں کے مکالمے سُناتے رہے۔

میں نے کہا'' کچھ بھی ہو۔ بُرا پڑھا لکھا اور اپنے عقیدہ کا پکا آدمی ہے۔''

کہنے لگے'' یار ٹھیک ہے لیکن یہ کیا ہے تم نے اس کی وہ پتلی سی موٹر سائیکل دیکھی ہے کیا؟'' '' میں تو اس پر بیٹھ کر ظہیر کے ساتھ مال کے نسبت روڈ گیا ہوں۔ میں ان دنوں میٹرو ہوٹل میں رہتا تھا اور ظہیر مجھے لینے آیا تھا۔ وہ مجھے اپنی موٹر سائیکل پر میٹرو سے نسبت روڈ لے گیا تھا۔'' میں نے کہا۔

'' یار پھر یہ پڑھے لکھے انسان کیوں نہیں ہوتے؟''

'' اسے کیا ہوا'' میں نے پوچھا۔

کہنے لگے'' یار وہ ہندوستان میں ایک دیوندر ستیارتھی ہے۔ ٹیگور بنا پھرتا ہے۔ اپنے پاس یہاں یہ ظہیر کاشمیری ہے جو شیکسپئر بنا رہتا ہے۔ آخر یہ لوگ انسان بن کر کیوں نہیں رہتے؟''

دیوندر ستیارتھی کے ذکر سے بہت چڑتے تھے۔ ایک دفعہ میں نے کہا'' ستیارتھی نے دیکھئے کتنا کام کیا ہے۔ کتنی زبانوں کے ادب پاروں کو اردو میں منتقل کیا ہے۔ کس قدر ریاضت کی ہے اور مشقت اٹھائی ہے۔ کیا'' ہم گائے جا ہندوستان'' اور'' بانسری بجتی رہتی'' کی عظمت سے انکار کر سکتے ہیں،'' تو کہنے لگے۔'' بابا وہ ٹھیک ہوگا لیکن یہ کیا ہے؟''

یہ کہہ کر ایک واقعہ سنایا'' جن دنوں میں بمبئی میں تھا اور اپنے ایک افسانہ پر مقدمہ کے سلسلہ میں لاہور آیا اور ایک دن مکتبہ اردو[1] میں چودھری برکت علی سے ملنے اپنی بیوی صفیہ اور اپنی سالی ذکیہ کے ساتھ گیا۔ وہاں ستیارتھی بیٹھا تھا۔ وہ میری بیوی اور میری سالی کو اس طرح سے گھورنے لگا جیسے اس نے زندگی میں عورت ہی نہ دیکھی ہو۔ میں بہت سنجیدہ ہو گیا۔ چودھری برکت علی بڑے نبض شناس آدمی تھے۔ مجھے لال پیلا ہوتے دیکھ کر کسی بہانے سے وہ ستیارتھی کو باہر لے گئے۔ جب وہ ستیارتھی کو باہر لے گئے تو میری سالی ذکیہ نے کہا'' بھائی جان میرا جی چاہتا تھا آپ کے اس نامعقول دوست کو اس طرح گھورنے

1: ہندوستان کا پہلا ترقی پسند اشاعت گھر۔

کا مزا چکھاؤں،'' میں نے اسے ٹھنڈا کیا اور کہا'' بیٹے وہ ہے ہی ایسا۔ تمہاری کسی بات کا اس پر اثر نہیں ہوگا۔''

اشوک کمار کی بڑی تعریف کرتے تھے ساتھ ہی یہ بھی کہتے تھے'' لیکن پیسوں کے معاملہ میں وہ بڑا محتاط ہے۔ حالانکہ اس کے پاس جس قدر روپیہ ہے شاید ہی اتنا روپیہ کسی فلمی آدمی کے پاس ہو،'' کہتے تھے پیتا بھی کم ہی تھا۔ کسی دن بہت خوش ہو یا کوئی خاص بات ہو تو پی لی، ورنہ نہیں پیتا تھا کہتے تھے مجھے اس کی یہ بات بہت پسند تھی کہ وہ دوسرے آرٹسٹوں کی تعریف بھی کرتا تھا۔ بتلاتے تھے کہ دلیپ کمار کو اشوک بہترین آرٹسٹ مانتا تھا۔ کہتا تھا کہ دلیپ کمار کا اپنے رول میں جواب نہیں ہے۔ کہتے تھے اشوک مجھے دادامنی کہنے کو کہتا تھا میرا اس سے اس بات پر بڑا جھگڑا رہتا تھا[1] بتلاتے تھے کہ اشوک کمار کے ہندوستان سے میرے ادھر آنے کے بعد دو خط آئے تھے۔ اس میں اشوک نے لکھا تھا کہ'' منٹو آپ اپنی تشریف کا ٹوکرا لے آیئے،'' اشوک سے اپنی دوستی پر نازاں بھی تھے۔ کہتے تھے وہ میری کوئی بات نہیں ٹالتا اگر میں کسی بھی تعلق سے کچھ لکھ دوں تو مجھے یقین ہے۔ وہ میرا ضرور خیال کرے گا۔[2]

دلیپ کمار کا جب کبھی نام آتا تھا۔ کہتے تھے یار دلیپ کمار بے حد شریف لڑکا ہے۔ میں نے اس سے زیادہ پیارا لڑکا نہیں دیکھا۔ کہتے تھے کہ میری اصل میں دوستی اس کے بڑے بھائی سے تھی۔[3] دلیپ کمار ناصر خاں وغیرہ اپنے بڑے بھائی کو مثل باپ کے سمجھتے تھے۔ چونکہ میں ان کے بڑے بھائی کا دوست تھا اس لئے وہ لوگ (دلیپ کمار و ناصر خاں) مجھے بھی اپنا بزرگ سمجھتے تھے۔ میں جانتا تھا کہ دلیپ بیئر پی لیتا ہے چنانچہ میں اس سے کہتا تھا کہ'' آیار پی لے،'' تو وہ مسکرا کر چلا جاتا تھا۔ کہتے تھے دلیپ تو میرے سامنے سگریٹ بھی نہیں پیتا تھا۔ بس چپ چاپ بیٹھا رہتا تھا۔ کہتے تھے'' یار کیسے کیسے پیارے لوگ ہندوستان میں رہ گئے ہیں۔

۱: گنجے فرشتے میں اس سلسلہ میں تفصیل سے لکھا ہے۔

۲: واقعی اشوک منٹو کا بڑا لحاظ کرتے تھے۔ ایک دوست بمبئی جارہا تھا۔ وہ ان کے پاس آیا اور کہنے لگا والدین سے ملنے بمبئی جارہا ہوں اور پیسے کم ہیں۔ انہوں نے اشوک کے نام اُسے دو سو روپے دینے کے لئے لکھا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے میں نے سنا ہے بمبئی میں اشوک نے منٹو کے دوست کو پیسے دیئے تھے۔

۳: منٹو نے دلیپ کے بڑے بھائی کا مجھے نام بتلایا تھا اب میں بھول رہا ہوں۔

نسیم اور نرگس کی بھی بڑی تعریف سنی ہے۔ صفیہ بتلاتی تھی کہ منٹو کو کسی سے ملنے کا اپنے سے شوق نہیں۔ ہمارے گھر نسیم اور نرگس بہت آتی تھیں، نرگس کی ماں جدن بائی سے منٹو کی خوب دوستی تھی۔

چراغ حسن حسرت صحت یاب ہوئے تو وائی ایم سی اے ہال میں ان کی صحت یابی کی خوشی میں ایک جلسہ کا اہتمام کیا گیا۔ منٹو صاحب نے مجھ سے کہا تھا ''میں بھی اس جلسہ میں مضمون پڑھ رہا ہوں۔ شام کو آ جانا اکٹھے چلیں گے۔'' میں ٹھیک وقت پر پہنچ گیا معلوم ہوا کہ مقررہ وقت سے پہلے صفیہ صاحبہ کے ساتھ نکل چکے ہیں میں جلسہ میں جانے کے خیال سے مال روڈ پر آیا تو میرے چند میڈیکل کالج کے دوست مل گئے اور وہ مجھے کھینچ کر لارنس گارڈن لے چلے۔ لارنس سے لوٹتے ہوئے منٹو صاحب کے پاس پہنچا تو کہنے لگے: ''یار آج تم جلسہ میں نہیں آئے وہاں تو ایک ہنگامہ رہا۔''

میں نے پوچھا: ''کیا بات ہوئی؟''

کہنے لگے ''مجھے حسرت صاحب پر مضمون پڑھنا تھا میں نے مضمون لکھا۔ صفیہ کے ساتھ ریڈیو اسٹیشن جانا تھا چلا گیا۔ وہاں سے وائی ایم سی اے ہال پہنچا وہاں پر جلسہ شروع ہو چکا تھا۔ میرا نمبر آیا تو میں ڈائس پر پہنچا اور مضمون پڑھنے لگا۔ جب میں نے حسرت صاحب کی شراب نوشی اور ان کی رفیقۂ حیات کی اس شراب نوشی سے ناواقفیت کا ذکر کیا تو حسرت صاحب بگڑ پڑے اور اُٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے صدر جلسہ [1] سے پروٹسٹ کیا کہ مضمون پڑھنے نہ دیا جائے۔''

میں نے پوچھا: ''صدر جلسہ کیا میں مضمون پڑھنا ختم کر دوں؟'' ہال میں لوگوں نے چلانا شروع کر دیا ''نہیں، نہیں پڑھیئے۔'' صدر جلسہ خاموش تھے۔

میں نے دوبارہ صدر جلسہ سے خطاب کیا ''کیا میں مضمون پڑھ سکتا ہوں؟''

لوگ پھر شور مچانے لگے: ''پڑھنے دیا جائے، پڑھنے دیا جائے۔'' جناب صدر نے یہ دیکھ کر کہا: ''آپ مضمون پڑھ سکتے ہیں۔''

میں مضمون پڑھنے لگا۔ حسرت صاحب اُٹھ کر باہر چلے گئے۔'' [2]

یہ سنا کر منٹو صاحب کہنے لگے ''یار میری سمجھ میں نہیں آتا لوگ کیوں تنقید برداشت نہیں کر سکتے۔

۱: صدر جلسہ ملک عبدالقیوم ایم ایل اے تھے یا ملک عبدالقیوم پرنسپل لاء کالج مجھے یاد نہیں۔

۲: مجھے یاد نہیں کہ منٹو نے کہا تھا کہ حسرت صاحب پھر واپس آ گئے تھے یا نہیں؟

مجھے دیکھو میں تو گالیاں بھی برداشت کرتا ہوں بلکہ میں تو کہتا ہوں گالی ضرور دو لیکن خدا کے واسطے سلیقہ سے دو[1] اور حسرت صاحب نے تو میری بات بھی سُننا گوارا نہیں کی،" یہ کہہ کر سنانے لگے کہ "یار حسرت صاحب مجھے بڑے عزیز ہیں ان کا مجھے احترام بھی بہت ہے پتہ نہیں وہ کیوں ناراض ہو گئے حالانکہ میں تو انہیں اپنا بزرگ تک مانتا ہوں۔"

عصمت چغتائی کی بے حد تعریف کرتے تھے۔ عصمت کو بڑی گھریلو عورت بتلاتے تھے۔ کہتے تھے یار وہ واقعی ایک مکمل عورت ہے۔ کہتے تھے میں اس پر ایک طویل مضمون لکھنا چاہتا ہوں جو میں نے پہلے ایک مضمون[2] لکھا ہے اس میں سردار جعفری صاحب نے اپنی سرداری دکھلائی ہے اور مضمون کاٹ چھانٹ دیا ہے اور وہ سارا مضمون بے کار ہو گیا ہے میں اس پر ایک اور مضمون لکھوں گا لیکن مصیبت یہ ہے کہ وہ مجھے بھائی کہتی ہے میں اس کو بہن کہتا ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ میری بیوی کی عزیز سہیلی ہے۔ تیسرے یہ کہ وہ میرے پرانے دوست شاہد لطیف کی بیوی ہے اب یہ تین تین باتیں ہیں اور پھر مصیبت یہ ہے وہ میری ہم عصر افسانہ نگار بھی ہے۔ اب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ میں نے اس طرف ایک افسانہ لکھا ہے۔[3] لوگ اسے عصمت سے منسوب کر رہے ہیں۔ حالانکہ یہ قطعی غلط ہے۔ وہ صرف افسانہ ہے۔ اس کا عصمت سے یا کسی سے کیا واسطہ بہر حال یار ایک مضمون لکھنا ہی ہوگا۔"

دل کھول کر تعریف کرنا بھی جانتے تھے ایک دفعہ میرے کمرے میں بیٹھے تھے گفتگو شروع ہو گئی کہ آج کے طالب علموں میں وہ پہلی سی بات نہیں۔ کہنے لگے ہاں ٹھیک ہے لیکن طالب علموں ہی کا کیا ذکر اب کسی چیز میں بھی وہ پہلے کی سی بات رہی کہاں ہے۔ کھانے ہی کو لے لو۔ چاہے کتنے ہی اہتمام سے کھانا تیار کرو لیکن کھانے میں اب وہ لذت ہی نہیں رہی۔ کوئی چیز خالص ملتی ہی نہیں ہے۔ لہٰذا ہر چیز میں

1: واقعی منٹو نے بے شمار گالیاں سنی ہیں اور پھر اپنی کتابیں انہی گالیاں دینے والوں کے نام منسوب کی ہیں میرا ایک مضمون "امروز" (لاہور) میں فلسفہ حسن پر شائع ہوا تھا اس میں میں نے ایک جگہ لکھا تھا کہ منٹو کے ہاں حسن سلیقہ اور قرینہ میں ہے۔ منٹو کا کہنا ہے گالی بھی دو تو سلیقہ اور قرینہ سے دو۔ میرا یہ مضمون پڑھ کر منٹو نے مجھ سے کہا تھا ہاں، مجھے ضرور گالی دو لیکن خدا کے لئے سلیقہ سے۔

2: کُتب پبلشرز بمبئی نے اسے "نئے ادب کے معمار" سلسلہ میں شائع کیا ہے۔

3: یہ افسانہ "سڑک کے کنارے" مجموعہ ... [illegible]

سے ذائقہ اُڑ گیا ہے۔ بات طالب علموں سے چلی تھی اِدھر اُدھر گھوم پھر کر طالب علموں پر آئے۔ کہنے لگے چند طالب علموں کو دیکھ کر پھر بھی جی خوش ہو جاتا ہے۔ کہنے لگے تم اپنے متعلق غلط فہمی میں نہ رہو میں انور سجاد[1] جیسے لڑکوں کے متعلق کہہ رہا ہوں، پھر انور سجاد کی تعریف کرنے لگے کہتے تھے: ''میں ایک ڈرامہ دیکھنے کے لئے لڑکوں کی خواہش پر ایف سی کالج گیا۔ وہاں پر لڑکوں نے مجھے زبردستی جج بنا دیا۔ جج بننے پر میں بڑے دھیان سے ڈرامہ دیکھنے لگا جب فیصلہ دینے کا وقت آیا تو میرے پاس صفیہ بھی بیٹھی تھیں، میں نے کہا: ''فلاں کردار کرنے والے کو انعام دوں گا،'' صفیہ نے پوچھا: ''آپ نے پہچانا نہیں وہ کردار کس نے ادا کیا ہے'' منٹو نے کہا ''نہیں'' صفیہ نے بتلایا ''ارے وہ تو انور سجاد ہے'' منٹو کہنے لگے ''میں پہچان ہی نہ سکا تھا۔ اس میں اداکاری کی بہترین صلاحیت ہے بہر حال میں نے اس ڈرامہ میں اس کو پہلا انعام دیا تھا[2]

یہ ان کی ایک عادت تھی کہ سامنے کم ہی لوگوں کی تعریف کرتے تھے۔ کہتے تھے سامنے تعریف کر دینے سے خود کو زندہ رکھنے اور آگے بڑھانے کے آدمی میں جو جراثیم ہوتے ہیں وہ تعریف کر دینے سے خود اپنے آپ آدمی مار لیتا ہے اس لئے تعریف بڑی احتیاط سے کرنی چاہئے۔''

بہر حال جن دوستوں کو پسند کرتے تھے ان کی خصوصیات غائبانہ ضرور گنا دیتے تھے۔ نئے لکھنے والوں میں اے حمید کو سراہتے تھے اور کہتے تھے اسے لکھنا آتا ہے اور اس کا اپنا ایک انداز ہے لیکن شاید ہی اے حمید کے آگے اس کی تعریف کی ہو۔ ایک دوست تھے ڈاکٹر جمیل بے حد دلچسپ انسان ہیں۔ ان سے میری بھی خوب بحثیں رہی ہیں۔ جن دنوں میں بھی یوینگ ہال میں مقیم تھا ڈاکٹر جمیل بھی یہاں تھے۔ ان دنوں ان کے نئے نئے معرکۃ الآرا نظریات سے آشنا ہونے کا موقع ملتا تھا۔ بہر حال ان ڈاکٹر جمیل

۱: انور سجاد منٹو کے ایک مخلص دوست ہیں۔ دونوں میں دلچسپ مکالمے ہوتے تھے۔ آواز بنا بنا کر دونوں یوپی سی پی والوں کی گفتگو کی نقل خوب کرتے تھے، انور سجاد ایف سی کالج لاہور میں سال سوم سائنس کے طالب علم ہیں۔ برسوں سے کالج میں ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ بہ یک وقت مصوری، موسیقی، افسانہ نویسی، شاعری سب سے دلچسپی لیتے ہیں۔ ان کا نیوٹن ہاسٹل (ایف سی کالج) میں کمرہ ایک چھوٹا موٹا میوزیم ہے جس میں سارے فنونِ لطیفہ کے لوازمات موجود ہیں۔

۲: ڈرامہ شاید کرشن چندر کا ''سرائے سے باہر'' تھا اور انور سجاد نے لنگڑے کا کردار ادا کیا تھا۔

کے متعلق کہا کرتے تھے کہ "اسد میں کیا بتلاؤں کہ جمیل مجھے کتنا عزیز ہے۔ سچ مانو میں تم سے جمیل کو اپنا رشتہ دار کہہ کر اسے ذلیل نہیں کرنا چاہتا۔ رشتہ دار بتلانا بھی دراصل اس کی توہین کرنا ہے۔ بس یہ سمجھ لو وہ میرا دوست ہے۔ بس دوست کہنا کافی ہے،" حالانکہ ڈاکٹر جمیل سے مختلف باتوں پر میرے سامنے منٹو کا جھگڑا ہوتا رہا ہے۔ ایک دفعہ میں رات کے وقت پہنچا۔ ڈاکٹر جمیل اور منٹو بیٹھے مچھلی کھا رہے تھے۔ میں ہاسٹل سے کھانا کھا کر چلا تھا۔ ان کے اصرار پر میں بھی شریک ہو گیا۔ اس دن منٹو صاحب سے میرا بھی جھگڑا ہو گیا۔ قصہ یہ تھا کہ "دستور"[1] کے لئے ان کی ایک تصویر لینی تھی۔ میرے ایک دوست احمد فوٹو گرافر ہیں۔ یہ ریڈیو پاکستان ہی میں تصویریں اُتارتے ہیں۔ میں نے احمد صاحب سے کہا تھا کہ بھئی منٹو کی تصویریں لینی ہیں آپ کسی وقت میرے ہاسٹل چلے آیئے۔ اکٹھے منٹو کے ہاں چلیں گے اور تصویر اُتاریں گے۔ احمد صاحب آ گئے اور منٹو کے پاس چلے۔ اس دن ابر تھا۔ منٹو کہہ رہے تھے کہ دھوپ نہیں ہے۔ تصویر اچھی نہیں آئے گی۔[2] احمد کا بھی یہی خیال تھا کہ واقعی تصویر اچھی نہیں آئے گی۔ میں نے سوچا پھر احمد صاحب خدا جانے کب ہاتھ آئیں جیسی بھی ہو آج ہی تصویر لے لی جائے۔ چنانچہ تین تصویریں لی گئیں ایک منٹو کی (یہ تصویر کہیں شائع نہیں ہوئی ہے اور میرے پاس محفوظ ہے) دوسری تصویر میں منٹو اپنی تینوں بچیوں کے ساتھ ہیں۔ تیسری صفیہ صاحبہ کی تصویر تھی۔ یہ تصویریں لینے کے لیے منٹو صاحب نے اہتمام کیا تھا اور بطور خاص اندر جا کر شیروانی پہنی تھی —— بہرحال میں کہہ رہا تھا کہ منٹو کا خیال تھا کہ تصویر اچھی نہیں آئے گی پھر بھی میرے کہنے پر احمد نے تصویر لے لی۔ جس دن میں منٹو صاحب سے اپنی شکر رنجی کا ذکر کر رہا ہوں۔ میں یہ تصویریں لیے منٹو صاحب کے ہاں پہنچا۔ منٹو صاحب تصویریں دیکھ کر بگڑ گئے۔ واقعی تصویریں ڈم تھیں۔ لیکن اس قدر فضول بھی نہیں جیسے کہ منٹو

---

[1]: لاہور کا ایک ماہنامہ۔

[2]: ہرفن مولا آدمی تھے یہاں تک کہ ڈاکٹری بھی فرماتے تھے میں بیمار تھا ایک دن ڈاکٹر نذیر کے ہاں سے منٹو صاحب کے گھر پہنچا۔ انہوں نے پوچھا: "کہاں سے آ رہے ہو،" میں نے کہا: "نذیر کے پاس میو ہاسٹل سے،" کہنے لگے "یار تمہیں کیا ہوا ہے خیر جو بھی آئندہ ہو مجھے بتلا دیا کرو۔ میں سالوں سے بیمار ہوں اس لیے ساری بیماریوں کا مجھے پتہ ہے میں علاج بھی جانتا ہوں۔ تمہیں بھلا ڈاکٹر کے پاس جانے کی کیا ضرورت ہے۔"

صاحب بتلاتے تھے[1] میں اور ڈاکٹر جمیل مصر تھے کہ تصویریں بری نہیں ہیں منٹو کہہ رہے تھے کہ "اچھی تصویر کسے کہتے ہیں۔ تم لوگوں کو پتہ نہیں ہے" منٹو صاحب اس دن خوب بولے۔ میں نے بھی کچھ کہا۔ دوسرے دن ڈاکٹر جمیل نے مجھ سے ہاسٹل میں کہا "اسد صاحب منٹو آپ کے وہاں سے اُٹھ کر چلے آنے کے بعد آپ کی بڑی تعریف کرتے تھے۔" میں نے کہا "میرے سامنے تو وہ مجھ سے اس قدر جھگڑتے رہے پیچھے تعریف کرنے سے حاصل؟" لیکن منٹو سامنے تعریف نہیں کرتے تھے۔ مجھے یہ معلوم تھا۔

اگر سامنے تعریف نہ بھی کریں تو یہ تو کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے لیکن بعض دفعہ اس قدر بدل بھی جاتے تھے کہ جیسے کبھی تعلقات ہی نہ رہے ہوں اور جانتے ہی نہ ہوں۔ ایک دفعہ میں اپنے ایک دوست عباس صاحب اور غیاث صاحب کے ساتھ منٹو صاحب کے گھر گیا۔ تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد میں اٹھا تو وہ اصرار سے بٹھا لیے جب تین گھنٹے جبراً بٹھا چکے اور ہمارے سامنے بیٹھے بیٹھے افسانہ لکھ چکے تو کہنے لگے "یار سگریٹ کے بھی پیسے نہیں ہیں۔ ٹانگہ کے پیسوں کا کیا سوال، بہر حال افسانہ لکھ لیا ہے چلو قسمت آزمائی کرتے ہیں اور دفتر ڈائریکٹر سے کچھ افسانہ کا معاوضہ حاصل کرتے ہیں۔"

ڈائریکٹر کے دفتر پہنچنے میں اپنے دونوں دوستوں غیاث اور عباس کے ہمراہ نیچے کھڑا رہا۔ کافی دیر بعد وہ اُترے۔ کہنے لگے "یار پیسے مل گئے اب تم لوگ جاؤ سلام علیکم، تانگہ والا کہاں مر گیا ہے۔ ٹانگہ کیوں نہیں چلاتا۔ چل ٹانگہ بڑھا۔" اور پھر یہ جا وہ جا۔

مجھے اپنے دوستوں کے سامنے بڑی شرمندگی اٹھانی پڑی یار میں نے سوچا یہ کس طرح کا ظلم ہے یہ کس طرح کا سلوک ہے۔

اس طرح کا سلوک وہ اس وقت بھی کرتے تھے جبکہ ان کے پاس کوئی آدمی آجائے اور اس سے انہیں کچھ پیسے مانگنے ہوں۔

بیٹھے ہوئے ابھی باتیں کر رہے ہیں۔ منٹو صاحب پہلو بدلنا شروع کر دیں گے۔ تیز تیز سگریٹ پئیں گے۔ پھر بڑی ہمت کر کے کہیں گے "جاؤ یار تمہیں پڑھنا ہوگا جا کر پڑھو ورنہ کہو گے کہ امتحان میں منٹو کی دوستی کی وجہ سے فیل ہو گیا۔"

چونکہ میں اکثر ان سے درخواست کرتا رہتا تھا کہ ہر آدمی سے اس طرح نہ مانگا کیجئے اس سے لوگ

---

[1]: انتہا پسندی تو ان کی طبیعت میں تھی ہی۔ ادھر یا اُدھر۔

انہوں نے بھلا سیکھا ہی کب تھا؟

سیکھا تو انہوں نے مانگنا بھی نہ تھا۔

اب میں سوچتا ہوں کہ منٹو کو کس قدر روز مرّہ کے لئے پریشانی اٹھانی پڑتی تھی تو بے حد اذیت ہوتی ہے۔ روز مرّہ کا پینا منٹو کے لئے ایک مصیبت تھا۔ نہ صرف اس کے نتیجہ کے طور پر وہ خود مصائب میں مُبتلا رہے ہیں بلکہ اپنے متعلقین کے لئے بھی باعث تکلیف بنے۔ اس سلسلہ میں مجھے ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔

ایک دن کوئی دو بجے کا وقت ہوگا میں ان کے پاس پہنچا۔ بیٹھے افسانہ لکھ رہے تھے۔ مجھ سے کہنے لگے "اخبار پڑھتے رہو۔ میں تین صفحہ لکھ چکا ہوں۔ چار صفحہ کا فسانہ لکھنا ہے۔ ایک صفحہ باقی ہے۔ ابھی ختم کیے لیتا ہوں۔" جب چوتھے صفحے کی آخری سطروں پر تھے قلم کی روانی ختم ہوگئی۔ ہر افسانہ کا خاتمہ بڑے دھیان سے ایک ایک لفظ پر غور کر کے کرتے تھے۔ آخر خُدا خُدا کر کے آخری سطر بھی لکھ دی۔ کہنے لگے "یہ افسانہ پڑھ لو جہاں کا، کی، کے رہ گیا ہے۔ ٹھیک کر دو۔ میں کپڑے پہنتا ہوں۔" میں یہ جس دور کی بات کر رہا ہوں اس دور میں صفیہ صاحبہ نے طے کیا تھا کہ منٹو صاحب جہاں بھی جائیں گے وہ بھی ساتھ ہوں گی۔ چنانچہ صفیہ صاحبہ بھی ساتھ چلنے کیلئے تیار ہوگئیں۔ منٹو صاحب انہیں آخر تک ٹالنے کی پوری کوشش کرتے رہے لیکن صفیہ ساتھ ہولیں۔ ہم تینوں گھر سے نکلے۔ منٹو صاحب ٹانگہ میں آگے تھے۔ میں اور صفیہ پیچھے بیٹھ گئے۔

راستہ میں منٹو صاحب دنیا جہان سے پیسے وصولی کے تفصیلی واقعات سناتے رہے۔ جب ٹانگہ مکتبہ کارواں روڈ پہنچا تو منٹو صاحب کا کہنا تھا کہ صفیہ تم ٹانگہ میں بیٹھو میں ابھی آتا ہوں لیکن صفیہ صاحبہ بھی ساتھ ہولیں، چنانچہ مکتبہ کارواں میں چلے۔

ان دنوں منٹو صاحب کا مکتبہ کارواں سے یہ حساب تھا کہ افسانہ لکھ کر لے جاتے۔ حمید چودھری صاحب مالک مکتبہ کارواں منٹو صاحب کو دیکھتے ہی تجوری کھولتے۔ منٹو صاحب افسانہ دے دیتے اور ۲۰ روپیہ ان سے لے لیتے اور زور سے سلام علیکم کی صدا لگاتے۔

منٹو صاحب بہت کافی رقم مکتبہ کارواں سے لے چکے تھے۔ صفیہ صاحبہ نے اس دن چودھری صاحب سے دریافت کیا کہ "منٹو صاحب نے آپ سے کتنا روپیہ لیا ہے۔"

چودھری صاحب نے کچھ رقم بتلائی۔

صفیہ صاحبہ نے پوچھا "یہ کس حساب سے۔"

چودھری صاحب نے جواب دیا "یہ افسانہ لکھ کر میرے ہاں لے آتے ہیں میں انہیں پچھلے بقایا حساب کے علاوہ ۲۰ روپیہ ان افسانوں کے علی الحساب دے رہا ہوں۔ فرصت ملتے ہی میں ان افسانوں سے انتخاب کروں گا اور انہیں کتابی شکل دوں گا۔"

صفیہ صاحبہ نے کہا کہ "کیا آپ کو معلوم نہیں کہ منٹو صاحب نے ساری کتابوں کے حقوق میرے نام کر دیئے ہیں اور کتابوں کی اشاعت اور رپیوں کے لین دین کے متعلق ساری چیزیں میں طے کروں گی۔"

چودھری صاحب نے کہا "مجھے اس کی اطلاع نہیں۔"

صفیہ صاحبہ نے کہا " مکتبہ اُردو، مکتبہ جدید، گوشۂ ادب، نیا ادارہ سب کے ہاں منٹو صاحب کے دستخط سے میں نے خطوط بھیجے ہیں۔"

چودھری صاحب نے کہا "مجھے تو ایسا کوئی خط نہیں ملا۔" "اب آپ کو میں اطلاع دے رہی ہوں کہ ایسا ہوا ہے،" صفیہ نے کہا۔

اس گفتگو کے بعد چودھری صاحب نے منٹو کا افسانہ اپنے سامنے سے اٹھا کر منٹو صاحب کے آگے رکھ دیا اور کہا "جب یہ بات ہے تو آپ اپنا افسانہ سنبھالیے اب میں صفیہ صاحبہ سے ہی بات کروں گا۔"

اس پر منٹو صاحب آگ بگولہ ہو گئے اور صفیہ سے مخاطب ہوئے "تم کیا میرے ساتھ اسی لئے آئی تھیں۔"

چودھری صاحب نے کہا "منٹو صاحب یہاں جھگڑنے کی ضرورت نہیں،" منٹو صاحب پھر بھی بگڑتے رہے۔ میں نے کچھ کہنا چاہا تو اس پر اور بھی بگڑ کر کہنے لگے "اب تم بھی صفیہ کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔"

میں نے کہا "آپ جو کچھ کرتے ہیں اس کی تائید کون کرے گا۔" سخت ناراض ہو گئے۔ صفیہ صاحبہ بے حد ملنسار اور پیاری خاتون ہیں۔ بات بگڑتی اور بڑھتی دیکھ کر وہ اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ میں بھی ان

کے ساتھ اٹھ گیا۔

منٹو صاحب نے چودھری صاحب سے بیس روپیہ وصول کیے۔

میں اور صفیہ صاحبہ پیدل چلنے لگے۔ منٹو صاحب نے کہا'' آؤ ٹانگہ میں بیٹھ جاؤ۔'' صفیہ صاحبہ نے کہا'' آپ کی جدھر مرضی ہو آپ جائیں ہم نہیں بیٹھیں گے۔''

منٹو صاحب نے ٹانگہ آگے بڑھایا۔

میں اور صفیہ میو ہسپتال تک پیدل ہی چلے آئے۔ وہاں سے صفیہ صاحبہ کو نسبت روڈ پر کچھ کام تھا۔ مجھے ڈاکٹر نذیر[1] کے پاس میو ہسپتال جانا تھا میں ادھر چلا گیا۔ صفیہ صاحبہ نسبت روڈ کی طرف چلی گئیں۔

شام کو میں نے منٹو صاحب سے کہا'' منٹو صاحب آپ یہ کیا کرتے ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔''

'' یار سمجھ میں تو میرے بھی نہیں آتا، لیکن میں کیا کروں؟'' منٹو صاحب کا جواب تھا۔ واقعی جب منٹو صاحب کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو پھر انہوں نے بلا سوچے سمجھے بہت کچھ کرنا شروع کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں منٹو کے فنانسروں کی تعداد اتنی ہو گئی کہ اگر انہیں جمع کیا جائے تو وہ منٹو کے افسانوں کا کم از کم پچاس گنا ہو گی۔

منٹو صاحب سے بے شمار لوگ ملنے کے لئے آیا کرتے تھے، آخری دور میں البتہ صرف وہی لوگ آنے لگے جو پہلے کبھی نہ آئے تھے وجہ یہ تھی کہ منٹو صاحب زیادتی پر اتر آئے تھے۔ آپ کا ایک پرستار آپ سے ملنے کے لئے آئے تو کیا یہ زیادتی نہیں ہے کہ آپ اس سے دس، پندرہ، بیس روپیہ مانگ بیٹھیں اور لیے بغیر جانے نہ دیں۔

جب کسی اور کو شہادت کا درجہ نصیب نہیں ہوتا تھا۔ تو مجھ سے کہتے تھے'' یار آج تو ہی شہید ہو جا۔'' جب ابتدا میں مشق ستم ہوا کرتی تھی تو ان دنوں یہ کہہ کر ڈھارس باندھا کرتے تھے۔ کہ'' یار بس صرف ایک ہفتہ کی بات ہے ابھی دو فلموں کے مکالمے اور تین فلموں کی کہانیاں لکھ دیں گے پھر پیسہ ہی پیسہ ہے اور دونوں عیش کریں گے۔'' وہ یہ سب کچھ اس طرح کہتے تھے کہ بارہا کے تجربوں کے باوجود مجھے درجۂ شہادت نصیب ہو جاتا تھا۔ ایک دفعہ جب میں امتحان یونیورسٹی کی فیس جمع کرنے جا رہا تھا وہ راستہ میں مل گئے اور مجھے روک لیا اور جیبوں کی تلاشی لی، چالیس روپے نکل آئے، میں نے بار بار عرض

---

[1]: ڈاکٹر نذیر (تب) اسسٹنٹ پروفیسر کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور

انتظام نہیں ہوا تھا۔ میں نے حنیف صاحب کی خواہش پر ہوٹل چھوڑ دیا اور اکٹھے ہاسٹل میں کمرہ لینا طے کیا۔ جب کمرہ لینے کے لئے رقم جمع کرانی تھی منٹو صاحب کی ضرورت آڑے آگئی اور ساٹھ روپیہ انگلش واٹن ہاؤس کی نظر ہو گئے اور مجھے اور میرے دوست حنیف کیانی کو اس کے نتیجہ کے طور پر بڑی تکلیف اٹھانی پڑی۔

اسی تعلق سے شاد امرتسری صاحب نے مجھے ایک واقعہ یاد دلایا جو کہ میں بھول گیا تھا۔ شاد صاحب[1] ہر جمعہ کو دفتر ''ادب لطیف'' ٹھیک ایک بجے تشریف لاتے ہیں اور دوپہر کی چائے دفتر ''ادب لطیف'' میں پیتے ہیں۔ لاہور میں جتنے عرصے سے میں رہ رہا ہوں میرا ابھی معمول ہے کہ دوپہر کے کھانے کے بعد تقریباً ہر روز میں اپنا وقت مرزا ادیب صاحب کے پاس گزارتا ہوں۔ شاد صاحب سے میری مُلاقات دفتر ''ادب لطیف'' میں ہوئی تو انہوں نے یاد دلایا کہ ''آپ وہی اسد تو نہیں جن سے پاک ٹی ہاؤس کے پاس کچھ عرصہ پہلے منٹو نے متعارف کرایا تھا۔''

میں نے کہا ''مجھے یاد نہیں رہا معافی چاہتا ہوں۔''

شاد صاحب نے کہا ''ایک رات میں اور منٹو تانگہ میں سوار کسی اہلِ زر کی تلاش میں تھے۔ منٹو نے آپ کو مال، پر سے آتے دیکھا تو آواز دی اور آپ کے قریب آنے پر آپ سے کہا تھا ''میری جان بیس

1: تب پروگرام ایگزیکٹیو ریڈیو پاکستان لاہور

روپیہ کی ضرورت ہے دے دو" شاد صاحب کا کہنا ہے کہ میں نے جواب دیا تھا "میرے پاس پیسے نہیں ہیں اور میں اس وقت اپنے ایک دوست کے پاس ماڈل ٹاؤن جا رہا ہوں" تو منٹو صاحب نے جواب دیا تھا "یار کچھ بھی کر کسی طرح بھی شہید ہو جا اور کسی بھی دوست سے انتظام کر دے۔" میں یہ سن کر آگے بڑھ گیا اور منٹو صاحب چلانے لگے "میری جان یوں ناراض ہو کر کیوں جاتا ہے۔"

میں منٹو صاحب سے شاید ہی کبھی ناراض ہوا ہوں۔ میں نے تو منٹو صاحب کی ہر بات برداشت کی ہے۔ منٹو سے ملنے والے جانتے ہیں کہ منٹو بعض دفعہ کس قدر زیادتی پر اُتر آتے تھے۔ ایک دفعہ ضرور میں نے ان کی شکایت احمد ندیم قاسمی سے کی ہے اور آج مجھے ان کے مرنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ کاش میں اس بار بھی حرف شکایت زبان پر نہ لایا ہوتا اور وہ زیادتی بھی برداشت کر لیتا۔

قصہ یہ تھا کہ میرا TONSIL کا اپریشن ڈاکٹر ولایت ملک[1] نے کیا تھا۔ میں ایک مہینہ چھ دن ہاسپٹل میں زیرِ علاج رہ کر نکلا۔ جون کا مہینہ، لاہور کی گرمی، بیماری کے بعد کا چڑچڑاپن، اور اسی دن ہاسپٹل میں میری ایک قیمتی گھڑی کھو گئی تھی۔۔۔ لیکن چونکہ ایک مہینہ چھ دن سے منٹو صاحب سے ملاقات نہیں ہوئی تھی اس لئے ہاسپٹل سے میں سیدھا منٹو صاحب کے گھر گیا۔ منٹو صاحب پہلے تو بگڑے کہ اتنے دن خبر کیوں نہیں لی۔ میں نے ہاسپٹل کی روداد سنا کر کہا کہ خبر تو آپ کو لینی تھی۔ یہ سن کر خاموش ہو گئے۔ بیٹھے باتیں کرتے رہے کچھ دیر بعد انہوں نے آہستہ سے کہا "کچھ پیسے چاہئے ہیں؟" میں نے کہا "میرے پاس جملہ بیس روپیہ ہیں اور وہ بڑی مشکل سے ہاسپٹل میں بچائے ہیں اور آج ہی مجھے راولپنڈی بھائی کے پاس جانا ہے۔ کالج کے ہاسٹل کی کچھ چھوٹی چھوٹی ادائیگیاں اور کرایہ وغیرہ مل کر بیس روپیہ ہوتے ہیں۔"

کہنے لگے "یار پھر بھی دے دو۔"

میں نے کہا "میری مجبوری دیکھئے۔"

"یار کیا بک بک کرتے ہو۔ نکالو۔"

میں نے کہا "مجھے پنڈی جانا ہے۔"

"یار پھر بھی دے دو۔" منٹو نے کہا۔

1: (تب) پروفیسر فاطمہ جناح میڈیکل کالج لاہور و سرجن گنگارام اسپتال

میں نے غصہ سے بیس روپیہ جیب سے نکال کران کے سامنے پھینک دیئے۔ شراب نہ ہونے پر ان کی عجیب حالت ہو جاتی تھی اور یہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔

میں نے بیس روپیہ دے دیئے اوراب میرے پاس ایک پیسہ بھی نہ تھا۔ ایک گھنٹہ تک مال روڈ اور ہال روڈ کے چوراہے پر کھڑا میں سوچتا رہا کہ اب بیس روپیہ کہاں سے حاصل کیے جائیں۔ بڑی سوچ کے بعد ندیم صاحب کے پاس پہنچا۔ ظاہر ہے کہ میرے لئے اور کوئی راہ نہ تھی۔ میں نے سارا واقعہ ندیم صاحب کو سنا دیا اور کہا کہ پہلے بھی کئی بار اس طرح ہو چکا ہے۔

ندیم صاحب بے حد مخلص انسان ہیں۔ انہوں نے کچھ نہ کہا۔ کاغذ قلم اٹھا کر ایک خط نذیر چودھری[1] کے نام لکھا کہ ''برادرم اسد اللہ کو بیس روپیوں کی ضرورت ہے۔ آپ میرا افسانہ لے لیجئے اور انہیں اسی وقت بیس روپیہ دے دیجئے۔''

نذیر چودھری مجھے نہیں ملے۔ میں نے مکتبہ اردو سے ندیم صاحب کو ٹیلیفون کیا۔ انہوں نے جواب دیا'' آپ امروز کے دفتر چلے آیئے۔ میں امروز کے دفتر پہنچا۔ وہ میرے نام ایک رقعہ چھوڑ گئے تھے کہ انتظار کیجئے میں ابھی آتا ہوں۔ مجھے ایک اور جگہ کام تھا۔ میں وہاں سے ہو آیا تو ندیم صاحب اپنے ایک دوست سے جن کی چشموں کی دوکان ہے۔ جون کے مہینہ میں لاہور کی گرمی میں دوپہر کے وقت جا کر بیس روپیہ ادھار لے آئے تھے۔ انہوں نے مجھے بیس روپے دیئے کہ یہ لو اور راولپنڈی چلے جاؤ۔

جس وقت پاس پیسے ہوں اس وقت تو نکال کر رکھ دینے میں بھلا ہمیں عذر ہی کیا ہو سکتا ہے جبکہ ہم اپنے ملک کے فنکاروں کی اقتصادی حالت سے آشنا ہیں، لیکن جب یہ مطالبہ ہوتا کہ نہیں کسی طرح مانگ کر لاؤ، ہاسٹل کے کسی دوست سے ادھار لے آؤ تو شاید یہ بات نہ صرف آدمی کو دوسرے کے آگے جھکا دینے کا باعث بنتی ہے بلکہ اکثر و بیشتر اپنے ہم عمر ساتھیوں میں جو کوفت اٹھانی پڑتی ہے وہ نا قابلِ بیان ہے اور اس صورت میں تو خاص طور پر جبکہ یہ احساس بھی ستائے کہ ہم ایک دوست کی وجہ سے دوسرے دوستوں میں بدنام ہو رہے ہیں۔

اس قسم کی بات کا ردِ عمل بعض دفعہ دوسرے کو بھی کھسیانا کر دیتا ہے۔ اس سلسلہ میں دو واقعات ایسے ہیں جو میرے ذہن میں اچھی طرح محفوظ ہیں گو یہ دونوں واقعات آج مجھے بڑا دکھ پہنچاتے ہیں۔

قصہ یہ ہے کہ ایک دفعہ وہ صبح ہی صبح کمرے پر پہنچ گئے کہنے لگے ''میرے پاس تین روپے ہیں ڈھائی روپے دو ''نِپ'' آئے گا۔ میں نے کہا ''میرے پاس پیسے نہیں ہیں،'' کہنے لگے ''کسی طرح دو۔'' میں نے کہا ''اچھا آپ اپنے کمرہ میں چلئے میں ذرا منہ دھو کر تیار ہو آؤں۔'' تیار ہو کر میں ان کے پاس پہنچا، منتظر تھے میں نے کہا ''لایئے میں لائے دیتا ہوں۔ تین روپے دیجئے،'' کہنے لگے ''یار تم لا چکے۔'' میں نے کہا ''ضرور لائیں گے۔''

تین روپے لے کر میں مال پر آیا۔ میرے پاس ایک پیسہ بھی نہ تھا۔ ڈھائی روپے کی تلاش تھی۔ گھنٹہ بھر گزر گیا کوئی اہلِ دل نہیں ملا۔ میں نے سوچا ہٹاؤ یار تین روپیہ ہیں ناشتہ نہیں کیا ہے۔ لہٰذا شیراز میں ناشتہ کیا جائے چنانچہ ڈیڑھ روپیہ کا ناشتہ ہو گیا پھر اتنے میں ایک دوست ہوٹل میں داخل ہوا اس کے ناشتہ پر ڈیڑھ روپیہ صرف ہو گیا۔ بارہ بجے کمرہ پر پہنچا تو معلوم ہوا منٹو صاحب بیس بار چکر لگا گئے ہیں۔ میں اندر سے کمرہ خوب مضبوط بند کر کے بیٹھ گیا کچھ ہی لمحے بعد کمرہ پر دھڑا دھڑ کسی نے گھونسے مارے۔ ظاہر ہے منٹو صاحب کے علاوہ کون ہو سکتا تھا۔ مجبوراً دروازہ کھولنا پڑا۔ منٹو صاحب ہی تھے۔ کہنے لگے۔

''یار تو عجب آدمی ہے۔''

میں نے کہا ''کیوں کیا بات ہے بادشاہو۔''[2]

کہنے لگے ''بکواس کرتے ہو تم NIP لے آئے؛''

''اوہو'' میں نے کہا ''میں تو بھول ہی گیا تھا۔''

''تو اب تم میرا منہ کیا تک رہے ہو اب لے آؤ۔''

''پیسے خرچ ہو گئے ہیں۔''

''یار تو عجب بندہ[3] ہے۔''

یہ کہہ کر منٹو صاحب کرسی پر بیٹھ گئے۔ میں نے کہا ''منٹو صاحب اب ذرا بھائی کے پاس سے اس مہینہ منی آرڈر تو آنے دیجئے۔ دیکھئے دو NIP لا حاضر کروں گا۔''

"خدا چھپّر پھاڑ کر دیتا ہے۔" میں نے کہا۔

"یار دولت چھپّر پھاڑ کر دیتا ہے۔ شراب تو ہمیں کسی کی جیب پھاڑ کر خود حاصل کرنی ہے نا۔ بتلاؤ کیا کیا جائے۔"

میں نے کہا "جو آپ مناسب سمجھیں، ہم پر تو آپ کا ایک NIP DUE سمجھئے ہے۔

"یار یہ مستقبل کی بات کیوں چھیڑتے ہو اب کی کیوں نہیں سوچتے اب کے لئے سوچو۔

میں نے کہا" دور کے لئے کیوں نہ سوچیں۔ دور کی سوچئے۔

"یار دور کی اندھے کو سوجھتی ہے۔ میں اندھا نہیں شرابی ہوں۔"

یہ جملہ سن کر میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اُردو کا یہ جلیل القدر ادیب جو اپنی ضد میں اپنا جواب نہیں رکھتا اور جو ساری عمر نئے نئے شعبدے دکھاتا رہا ہے جو بڑے سکون سے شیشے کی کرچیاں پھانکتا رہا ہے اور جو بڑی بے تکلفی سے پیٹ میں خنجر اور تلواریں بھونکتا رہا ہے۔ آج کس قدر بے بسی سے صرف اپنے شرابی ہونے کا اظہار کر رہا ہے۔

یہ ایک واقعہ ہوا۔

میں آپ کو دوسرا واقعہ بھی سنا دوں کہ میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو اور اپنے گناہ کا احساس کم ہو۔

ایک دفعہ صفیہ صاحبہ کسی شادی میں گئی ہوئی تھیں۔ منٹو صاحب گھر پر تھے۔ میں اپنے ایک دوست اظہار الدین احمد کے ساتھ منٹو صاحب کے پاس پہنچا۔ کہنے لگے "یار میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ چلو ذرا ڈائریکٹر تک چلیں۔" میں تیار ہو گیا۔ ہم، منٹو صاحب کی لڑکی نکہت اور میرے دوست اظہار ڈائریکٹر کے دفتر کی طرف چلے۔ ہم لوگ ڈائریکٹر کے دفتر کے نیچے ڈین ریسٹورانٹ میں بیٹھے رہے۔ اوپر منٹو صاحب دفتر میں چلے گئے۔ کچھ دیر بعد اُتر آئے اور کہنے لگے "یار یہاں کام نہیں بنا۔ گوشۂ ادب چلو۔ گوشۂ ادب کے مالک باہر گئے ہوئے تھے۔ کافی دیر تک ہم لوگ وہاں ٹھہرے رہے۔ نکہت گھر چلنے کے لئے ضد کرنے لگی تو منٹو صاحب نے مجھ سے کہا "یار تم نکہت کو لے کر چلو۔ میں یہاں بیٹھتا ہوں۔ تم ٹانگہ کے پیسہ دے دو۔" اس دن میرے پاس تھوڑے ہی پیسے تھے اور ٹانگہ تین گھنٹہ سے ہمارے لئے کھڑا تھا اور ٹانگہ کے کوئی چار پانچ روپیہ بنتے تھے۔ میں دوسرا ٹانگہ لیے نکہت اور اظہار کے ساتھ لکشمی مینشن، چلا آیا۔ نکہت کو منٹو صاحب کے نوکر جمیل کے حوالے کر دیا اور میں اور اظہار ہمیں اے بی جانا تھا۔

وہاں چلے گئے۔

دوسرے دن جب میں لکشمی مینشن سے نکل رہا تھا ٹانگہ اسٹینڈ سے میں نے ایک ٹانگہ والے کو اشارہ کیا تو ایک اور ٹانگہ والا بھی دوڑا چلا آیا اور اس نے کہا ''صاحب کل آپ کے ساتھ جو وہ سفید کرتا پاجامہ پہنا، عینک والا صاحب تھا۔ وہ ہمارا انارکلی میں ٹانگہ چھوڑا تھا۔ دس بجے رات تک ہم نے اس کا انتظار کیا۔ وہ کہاں رہتا ہے۔ ہمارا اس سے ساڑھے چھ روپیہ کرایہ بنتا ہے۔''

یہ سن کر سارا معاملہ میرے ذہن پر روشن ہوگیا۔ یہی کہ منٹو صاحب نے سوچا ہوگا۔ ٹھہرائے ہوئے ٹانگہ پر اسد لوٹ گیا ہوگا۔ ٹانگہ والے کو پیسے ادا کر دیئے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ اسی لیے وہ دوسرے ٹانگہ میں سوار ہو کر گوشۂ ادب سے چلے آئے تھے لیکن یہاں میں نہ تو اس ٹانگہ پر آیا تھا اور نہ کرایہ ادا کیا تھا۔ ظاہر ہے ٹانگہ والا انتظار کرتا رہا ہوگا۔

یہ بات ٹانگہ والے سے ہو رہی تھی کہ سامنے سے پروفیسر[1] اثر آتے دکھائی دیئے۔ ان سے میرے تعلقات تھے اور اکثر و بیشتر منٹو صاحب کے ساتھ ان سے گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ جب یہ سامنے سے آتے نظر آئے اور دوسری طرف ہال روڈ سے کچھ میڈیکل کالج کی لڑکیاں جن میں سے اکثر میری دوست تھیں آتی دکھائی دیں تو میں نے ٹانگہ والے سے اپنا پیچھا چھڑانے کے لئے کہا کہ ''دیکھو'' وہ سامنے اس صاحب کا فلیٹ ہے اس جگہ جا کر اپنے پیسے لے لو۔''

منٹو صاحب کے ہاں زہر کھانے کے لئے بھی اس دن ایک پیسہ نہ تھا۔

اسی دن صبح منٹو نے مجھ سے ادھے NIP کے لئے ساڑھے پانچ روپے مانگے تھے۔ جب میں اپنے کام سے لوٹ کر شام کو منٹو کے پاس پہنچا تو منٹو نے بتلایا کہ تم جس ٹانگہ والے کو گوشۂ ادب ہی پر چھوڑ کر آئے تھے اور مجھے پھر بتلایا بھی نہیں تھا وہ آیا تھا اور اپنے ساڑھے چھ روپیوں کے لئے میری بے عزّتی کر رہا تھا۔

بے عزّتی مول لینے کے سلسلہ میں خود انہوں نے بھی کچھ ایسے کلاسیکل کارنامے انجام دیئے ہیں کہ ان کے فن کا قائل ہو جانا پڑتا ہے[2] اور یہ ذہانت دیکھ کر سوچنا پڑتا ہے کہ یہ ذہانت کسی روپ میں بھی کام آئے اپنی راہ سب سے علیحدہ ہی بنائے گی۔ دوسرے کی ڈگر پر چلنا اس ذہانت کو کبھی بھی گوارا

---

[1] (تب) گورنمنٹ کالج لاہور کے اُردو کے پروفیسر۔ [2] فنکار جو تھے۔

نہیں۔اس سلسلہ میں میں صرف دو واقعات سناؤں گا۔

ایک دفعہ اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھے مجھے ایک کتاب ''سڑک کے کنارے'' دی اور کہا ''یار اسد آج لکھنے کا موڈ نہیں بن رہا ہے اور پیسے بھی نہیں ہیں۔اس کتاب سے یہ افسانہ ''خدا کی قسم''نقل کردو اور اس کا عنوان ''تیقن'' کردو۔میرے ایک دوست عباس ساتھ تھے۔وہ کتاب سے افسانہ پڑھنے لگے۔میں نقل کرتا گیا۔غلطی سے میں نے عنوان ''تیقن'' کی بجائے افسانے ہی کا عنوان ''خدا کی قسم'' لکھ دیا اور وہ افسانہ منٹو صاحب کو دے دیا۔عنوان دیکھ کر بگڑ گئے اپنے قلم سے ''تیقن'' لکھا اور پوری احتیاط برتی کہ کہیں ''خدا کی قسم'' نظر نہ آجائے۔پھر کپڑے بدلے،تانگہ لیا،سامنے وہ بیٹھ گئے،میں اور میرا دوست پیچھے تھے۔''ڈائریکٹر'' کے دفتر کے نیچے تانگہ روکا۔منٹو صاحب اوپر چڑھے۔میں بھی ساتھ گیا۔شباب کیرانوی ایڈیٹر ڈائریکٹر سے منٹو نے کہا۔''یہ افسانہ ابھی ابھی اسد سے ڈکٹیٹ کروا کر لایا ہوں۔بیس روپیہ دے دیجئے۔''شباب صاحب نے کچھ کہنا چاہا،منٹو صاحب نے روک دیا''اچھا آپ صبیحہ پر مضمون[1] لکھنے کا شاید کہہ رہے ہوں۔میں لکھ کر لادوں گا۔آپ بے فکر رہئے۔بیس روپیہ پہلے دلا دیجئے۔''اور بیس روپیہ لے کر واپس چلے آئے۔

اس سے بھی زیادہ قابل ذکر ایک اور کلاسیکل واقعہ ہے اور یہ واقعہ شاید فرانس کے بوہیمن اور لا ابالی فنکاروں کو بھی مات کر دے اور دنیا کے غیر ذمہ دار ترین آدمیوں ہی سے شاید اس کی توقع کی جائے تو کی جائے۔

مرنے سے کچھ سال پہلے تو جب لوگ منٹو صاحب کے پاس اپنے افسانے اٹھائے اصلاح کے لئے چلے آتے تو منٹو صاحب انہیں ضرور دیکھتے۔کوئی بڑی کام کی بات بتلا دیتے اور کوشش کرتے کہ وہ کچھ سیکھ لے۔[2] جب مصروفیت اپنے لکھنے پڑھنے کی وجہ سے وقت نہ دے سکے تو پھر اور لوگوں کو دکھلانے کے لئے کہتے اور اس طرح خود بچ جاتے چنانچہ خود میرے سامنے ایک دفعہ ایک محترمہ تشریف لے آئیں اور سامنے افسانہ رکھ دیا کہ منٹو صاحب افسانہ درست کر دیجئے گا۔

۱: صبیحہ پر انہوں نے مضمون لکھنا شروع کیا تھا وہ آگے لکھوں گا۔

۲: مثلاً ابو سعید قریشی (ڈرپوک) اور اشفاق احمد (ایک محبت سو افسانے) پر منٹو نے بڑی محنت کی ہے۔خود ہی بتلاتے تھے کہ میری آرزو تھی کہ یہ دونوں لکھنا سیکھ لیں۔

منٹو صاحب نے افسانہ پڑھنا شروع کیا، افسانہ درست کرنا نہیں بلکہ صحیح معنوں میں گویا شروع سے لکھنا تھا۔

نتیجتاً اپنا پیچھا چھڑانے کے لئے منٹو صاحب نے ان محترمہ کو عزیز احمد کا پتہ دیا اور کہا کہ آپ انہیں خط لکھئے اور ان سے مشورہ لیجئے چونکہ وہ جو آپ نے محبت کا موضوع اٹھایا ہے نا اس کے ماہر بلکہ اپنے فن میں وحدہٗ لاشریک ہیں۔[1]

بہرحال منٹو نے اس محترمہ سے اپنا دامن چھڑا لیا۔ لیکن بعض دفعہ ایسے باہمت لوگ بھی آجاتے تھے کہ اپنی مستقل مزاجی سے منٹو کو رام کر لیتے اور منٹو قلم پکڑے ان کے افسانوں میں کھو جاتے۔

لیکن آخری دنوں میں منٹو صاحب کچھ اور ہی کرنے لگے تھے۔ مسلسل تیس سال سے لکھتے رہنے کے باعث اب ان کے پاس کہنے کو کچھ کم ہی رہ گیا تھا۔ یہاں تک کہ اپنے سارے دوستوں کی شخصی باتیں تک لکھ ڈالی تھیں۔[2] اس سلسلہ میں منٹو صاحب سے میرا جھگڑا بھی رہا تھا ایک تو اس وقت جبکہ انہوں نے سبطے[3] پر لکھا تھا اور دوسرے اس وقت جبکہ انہوں نے ڈائریکٹر ہی میں رفیق غزنوی پر لکھا، اور میں نے ان کے کمرے ہی میں بیٹھے رفیق غزنوی پر وہ مضمون پڑھا تو مجھے بڑا دکھ ہوا— حالانکہ

---

[1] چنانچہ منٹو صاحب بتلاتے تھے کہ ان محترمہ نے عزیز احمد کے نام خط لکھا اور افسانہ روانہ کر دیا۔ کچھ ہی روز بعد وہ محترمہ آئیں اور منٹو صاحب سے بڑی شکایت کی کہ آپ نے کس شخص کا مجھے پتہ دیا۔ منٹو صاحب کہتے تھے میں نے اسے بڑا ٹھنڈا کیا اور عہد کیا کہ کسی لڑکی کا اگر افسانہ ہو تو خود دیکھوں گا کسی اور کا پتہ دے کر خود پر کوئی ذمہ داری مول نہیں لوں گا۔

[2] منٹو کے شخصی مضامین لکھنے پر ان کے اکثر دوستوں نے انہیں ٹوکا تھا۔ ابراہیم جلیس نے اس سلسلہ میں ایک بہت ہی خوبصورت جملہ منٹو صاحب سے کراچی میں کہا تھا کہ ''منٹو تم شاہراہ ادب کی طرف پلٹ کر دیکھو۔ تم نے اس پر کیسے کیسے مجسمے نصب کئے ہیں۔ بابو گوپی ناتھ، ٹوبہ ٹیک سنگھ، اور موذیل اور آج تم اپنے دوستوں کی زندگی سر بازار نیلام کر کے اس سے اپنی روٹی کما رہے ہو۔'' چنانچہ سنا ہے کہ اس جملہ نے منٹو پر بڑا اثر کیا اور منٹو نے جلیس سے اپنی نوٹ بک میں یہ جملہ ''ناخن کا قرض'' کے لئے درج کروا لیا تھا (ناخن کا قرض کا ذکر آئندہ آئے گا) مجھے یہ بات خود جلیس نے کراچی میں بتلائی ہے۔

[3] ایک دفعہ اس وقت بھی میرا منٹو سے سخت جھگڑا ہوا تھا جب انہوں نے ڈاکٹر رشید جہاں اور فیض احمد فیض کے بارے میں لکھا تھا۔

سطے سے تو خیر ہمیں عقیدت ہے ہی اور ان سے ملاقات بھی ہے لیکن رفیق غزنوی سے میرا آج تک زندگی میں تعارف تک نہیں ہوا ہے۔ میں نے کہا تھا۔ ''منٹو صاحب رفیق غزنوی میرا دوست نہیں ہے لیکن آپ چاہے کسی بھی آدمی پر یہ مضمون لکھتے مجھے پسند نہ آتا۔ رفیق غزنوی تو اپنا آرٹسٹ ہے۔ اپنے ہاں کا واحد فنکار ہے۔'' تو منٹو صاحب نے کہا'' بکواس بند کرو۔'' اور رفیق غزنوی پر اپنا مضمون میرے آگے بڑھا کر کہا تھا کہ'' دیکھو اس میں کا، کی، کے رہ تو نہیں گئے ہیں۔

بہر حال میں کہہ رہا تھا کہ مطالعہ تو خیر کبھی کا ختم ہو گیا تھا۔ مشاہدہ بھی باقی نہ رہا۔ چنانچہ جب کسی دن کچھ نہ لکھا ہوتا اور روز کے پینے کے لئے پیسے نہ ہوتے تو پھر کلاسیکل حرکات کرتے۔ مثلاً یہ کہ میں نے انہیں اپنا ایک افسانوں کا مجموعہ ''نگر نگر کے افسانے'' دیکھنے کے لئے دیا۔ اس مجموعہ کا دیباچہ احمد ندیم قاسمی صاحب نے باوجود اپنی شدید مصروفیات کے میری خواہش پر تحریر فرمایا تھا۔ میں ان دنوں لاہور ہی کے ایک پبلشر سے اس مجموعہ کو شائع کرنے کے متعلق گفتگو کر رہا تھا اور چاہتا تھا کہ اشاعت سے پہلے اُسے منٹو دیکھ لیں چنانچہ یہ افسانوں کا مجموعہ میں نے ان کے پاس چھوڑ رکھا تھا۔

ایک دن جب میں ان کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ اس مجموعہ میں سے انہوں نے علیحدہ ایک افسانہ نقل کیا تھا اور اس کے خاتمہ پر سعادت حسن منٹو لکھ کر تاریخ درج کر دی تھی اور کہیں باہر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔

میں نے یہ دیکھا تو حیران رہ گیا۔ میں نے پوچھا'' منٹو صاحب یہ کیا؟''

منٹو صاحب کی اس عظمت کو میں دنیا کے ہر اسٹیج سے نشر کرنے کو تیار ہوں کہ منٹو صاحب جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ کہنے لگے'' یار کیا کیا جائے کچھ لکھا نہیں ہے، پینے کے لئے پیسے نہیں ہیں۔ سوچا کہ تمہارا ہی افسانہ ٹھکانے لگا آئیں۔ منٹو کا نام چلتا ہے چاہے کسی کی بھی چیز ہو منٹو کا نام ہو تو منٹو کے نام پر بک جائے گا۔''

بالکل اسی قسم کی باتیں مرزا ادیب صاحب سے سنی ہیں جن لوگوں نے مرزا ادیب صاحب کو دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ مرزا ادیب صاحب ہمارے ملک کے ان چند آدمیوں میں سے ہیں جو نہ تو پارٹی بندی میں حصہ لیتے ہیں اور نہ کسی پر کیچڑ اچھالتے ہیں۔ مرزا صاحب تو اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ مرزا صاحب بتلاتے ہیں کہ گورنمنٹ کالج لاہور کے اور ایف سی کالج کے کچھ لڑکے منٹو صاحب کے ہاں افسانے

چھوڑ آئے تھے۔ وہ افسانے منٹو صاحب کے ہاں سے انہی کے نام سے رسالوں کے دفتر تک پہنچ گئے۔

اس قسم کی دھاندلی اور زیادتی سے اپنے پرائے سب نالاں اور نالاں سے زیادہ حیران تھے۔ ایف سی کالج لاہور میں ایک دفعہ بزم کے سیکریٹری اظہار صاحب کی خواہش پر میں نے احمد ندیم قاسمی اور ہاجرہ مسرور صاحبہ سے درخواست کی تھی کہ وہ وہاں اپنی نگارشات پیش کریں۔ اس اجلاس کے خاتمہ پر ندیم صاحب سے منٹو صاحب کا ذکر آیا تو انہوں نے کہا ''اسد صاحب منٹو صاحب نے تو ہم ادیبوں میں سے سب سے زیادہ کمایا ہے اور مجھ سے تو ان کے گہرے دوستانہ تعلقات ہیں۔ ان باتوں کی وجہ سے آپ کو کیا بتلائیں کہ کتنا دُکھ ہوتا ہے۔''

ایک دفعہ ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب سے میں نے کہا ''عبادت صاحب حلقے کے اجلاس کے خاتمہ کے بعد منٹو صاحب نے آپ کو بُلایا ہے۔'' عبادت صاحب نے فرمایا ''بھئی شام ہوگئی ہے اور شام کے وقت منٹو کے ہاں جانا خطرہ کے قریب جانا ہے۔''

خود ان کے دوستوں اور بہت سے قریبی ملنے والوں کو منٹو نے پریشان کر رکھا تھا۔ گو وہ خود بھی کچھ کم پریشان نہیں ہوتا تھا۔ مجھے اس کا احساس ہے۔

ایک دفعہ مجھ سے انہوں نے پوچھا ''تمہارے پاس کتنے پیسے ہیں''؟ میں نے خالی جیب الٹ دی۔ جیب نہ صرف خالی تھی بلکہ پھٹی ہوئی بھی تھی۔

منٹو نے کہا ''یار کچھ تو کیا ہی جائے۔''

چنانچہ کچھ تو کرنے ہی کے لئے ہم دونوں رِسک لے کر کہ پیسے مل جائیں گے۔ ٹانگہ میں نیو گورنمنٹ کالج ہاسٹل کے ایک طالب علم کے پاس پہنچے۔ کمرہ بند تھا اور ایک بڑا سا تالہ ہمیں آنکھیں دکھلا رہا تھا۔ اس وقت کا منٹو کا پریشان چہرہ میری نظروں میں سدا کے لئے محفوظ ہوگیا ہے۔ منٹو کا چہرہ اس وقت اس آدمی کا سا نظر آتا تھا جس نے اپنے سارے رشتہ داروں کو گویا ایک ساتھ قتل ہوتے دیکھا ہے اور وہ بچوں سے بھی زیادہ معصوم انداز میں کہتا ہے ''یار اسد اب تو ٹانگہ کے کرائے کا بھی سوال پیچیدہ ہوگیا ہے۔'' اور پھر منٹو کو ایک لمحہ بعد خیال آتا ہے کہ سامنے گورنمنٹ کالج ہے چنانچہ ٹانگہ کو سیدھے گورنمنٹ کالج قسمت آزمائی کرنے کے لئے چلنے کو کہتا ہے اور وہاں مجھ کو پروفیسر اثر کو بلانے کے لئے بھیجتا ہے۔ اور پروفیسر اثر بھی مے خوار ہیں اور ان کی جیب بھی خالی ہے اور مہینہ کے آخری دن ہیں اور پھر بھی پروفیسر اثر

ہماری مجبوری دیکھ کر اندر جاتے ہیں۔ اور اپنے کسی شاگرد سے ڈیڑھ روپیہ قرض مانگ کر اسے کاغذ میں لپیٹ کر چپراسی سے کہتے ہیں "جاؤ اس تانگہ میں جو صاحب بیٹھے ہیں انہیں یہ دے آؤ۔"

اور یہ ڈیڑھ روپیہ ہاتھ میں لے کر منٹو اطمینان کا سانس لیتے ہیں "چلو یہ مصیبت دور ہوئی" کہہ کر ایسا محسوس کرتے ہیں جیسے منوں بوجھ سے نجات ملی۔

نجات اور راحت تو انہیں آخر عمر میں ملی ہی نہیں۔ ایک طرف تو وہ تیس کتابوں کے مصنف تھے لیکن دوسری طرف انہیں کیپٹن سگریٹ خریدنے کے لئے دو دو گھنٹے اپنے کسی دوست کا منتظر رہنا پڑتا تھا۔ ایک طرف ملک کے رسالے یہ اشتہار دیتے تھے کہ منٹو ملک کا سب سے بڑا ادیب ہے اور اس کا قلم ہنگامی حالات میں بھی رواں رہا ہے اور دوسری طرف ان کی بیوی صفیہ کو شلواریں بنانے کے لئے چھ چھ مہینے سوچنا ہوتا تھا۔ ایک طرف تو انہیں اس بات کی آگاہی تھی کہ انہوں نے اردو کو لازوال افسانے دیئے ہیں اور دوسری طرف ان کو اس بات کا احساس تھا کہ ان کی بیوی شارٹ اور ٹائپ سیکھنے گھر سے نو بجے جاتی ہے اور بارہ بجے لوٹتی ہے۔

ان باتوں نے ان میں عجیب وغریب احساسات پیدا کر دیتے تھے۔ اپنی ذات پر سے انہیں اعتماد اٹھ رہا تھا۔ جوں جوں خود اعتمادی کے عظیم ہتھیار سے محروم ہوتے جا رہے تھے زندگی میں عجب کھردرا پن، عجب احساس محرومی اور عجب تشنگی پیدا ہو رہی تھی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اس احساس نے اپنی مختلف شکل میں احساس برتری کو ابھارا اس احساس برتری نے انہیں تھوڑا بہت سہارا بھی دیا اور اسی سہارے کے باعث وہ لکھنا لکھانا بھی جاری رکھ سکے اور اس احساس نے ان سے سب سے پہلے یہ کہلوایا کہ میں واحد عظیم مصنف ہوں میں ہی سب سے بلند افسانہ نگار ہوں۔ چنانچہ مجھ سے تو انہوں نے ایک دفعہ یہاں تک بھی کہا تھا کہ "اسد دنیا کے کسی بھی بڑے سے بڑے مصنف کو لے لو اگر اس کی بارہ کہانیاں زندہ رہیں گی تو تمہارے اس منٹو کی تیرہ کہانیاں باقی رہیں گی۔"

اپنی تحریر سے آگے چل کر یہ زعم دوسری چیزوں میں بھی داخل ہو گیا۔ ایک دفعہ کمرے پر آئے۔ کہنے لگے "کس طرح جانوروں کی طرح رہتے ہو۔ کمرہ میں پنکھا نہیں، ریفریجریٹر نہیں، صوفہ نہیں،" گھر پر پانی پلاتے تو کہتے "ریفریجریٹر سے لایا ہوں،" ریڈیو سنتے تو کہتے "آٹھ والو کا ہے بارہ سو روپیہ کا ہے،" بہر حال انہیں شاید اس سہارے کی ضرورت بھی تھی۔

اسی احساس کے باعث اپنی زندگی میں لاہور کے ایک ماہنامہ "دستور" کا "منٹو نمبر" نکالنے کے خواہش مند تھے۔

ایک رات جب میں اپنے ہاسٹل یوننگ ہال سے شام کا کھانا کھا کر چہل قدمی کے ارادہ سے باہر نکل رہا تھا تو گیٹ پر مل گئے۔ کہنے لگے "یار جمیل کے پاس گیا تھا۔ اس کے کمرے پر تالہ پڑا تھا۔ تمہارے کمرہ پر گیا وہاں بھی تالہ تھا۔ نیچے اُتر رہا تھا کہ تم ڈائننگ ہال میں بیٹھے پروفیسر صفدر کے ساتھ کھانا کھاتے نظر آئے۔ میں نے سوچا گیٹ ہی پر کھڑا ہو کر تمہارا انتظار کیا جائے۔ کہو تمہارا کیا پروگرام ہے۔"

میں نے کہا "چاندنی رات ہے، تنہا ہوں سارے دوست امتحان کی تیاری میں مصروف ہیں۔ ایک مقالہ لکھنا ہے۔ میں دن بھر اس کی تیاری کے سلسلہ میں فلسفہ کی ایک موٹی کتاب کا مطالعہ کرتا تھک گیا ہوں اور اب ارادہ رات بھر آوارہ گھومنے کا ہے۔"

کہنے لگے "آؤ میرے ساتھ چلو" میں ساتھ ہولیا۔ ٹانگہ والے کو انہوں نے آواز دی اور ہم ٹانگہ میں لکشمی مینشن پہنچے۔ یہاں پر اصغر گوبند پوری صاحب[1] تشریف فرما تھے۔ تمام راستہ میں منٹو صاحب نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ کسی فکر میں ڈوبے کھوئے کھوئے سے بیٹھے رہے تھے۔ لکشمی مینشن پہنچ کر جلدی سے شیروانی اُتاری اور اپنے مخصوص صوفہ پر آ کر بیٹھ گئے اور اصغر صاحب کے ساتھ بڑی سنجیدگی سے مصروف گفتگو ہو گئے۔ میں بھی گفتگو میں شامل ہو گیا۔ منٹو نے مجھ سے بڑے رازدارانہ انداز میں صفیہ منٹو اور اصغر گوبند پوری کی موجودگی میں کہا۔

"اسد میں ایک بات کہہ رہا ہوں اگر وقت سے پہلے تم نے کسی سے ذکر کر دیا تو سمجھ لو قتل کر ڈالوں گا۔ زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

میں نے کہا "آپ کچھ سنایئے بھی تو۔"

منٹو کہنے لگے اور یہ کہتے ہوئے ان کا لہجہ بڑا نرم ہو گیا۔ یار میرے یوم پیدائش پر ہم لوگ دستور کا منٹو نمبر نکالنا چاہتے ہیں۔ اس کے لئے انتظامات کرنے ہیں۔ طے یہ ہوا کہ پرچہ پانچ ہزار چھاپا جائے گا۔ اس کے لئے میں چار تازہ افسانے، چار شخصیتوں پر مضمون، چار بالکل نئے فیچر لکھوں گا اور اس کے علاوہ آج تک جو مجھ پر لکھا گیا ہے چاہے وہ گالیاں ہوں یا تعریف، وہ بھی شریک کیا جائے گا۔ اس طرح

---

[1] ایڈیٹر ماہنامہ "دستور" (لاہور) کے بھائی

ایک شاندار ''منٹو نمبر'' نکالا جائے گا۔ کہو تمہاری کیا رائے ہے۔''

میں نے کہا ''مجھے کیا اختلاف ہو سکتا ہے۔ بہترین آئیڈیا ہے۔''

اس پر منٹو نے کہا کہ ''تمہارے ذمے دو کام ہیں۔ ایک یہ کہ آج تک جو کچھ مجھ پر لکھا گیا ہے اس کا انتخاب کرنا اور اس پر طویل نوٹ لکھنا۔[1] دوسرے یہ کہ کاپیاں دیکھنا، پروف پڑھنا اور فوٹوز کے انتخاب وغیرہ کی ساری ذمہ داری، تا کہ گیٹ اپ بڑا ہی شاندار ہو یعنی منٹو کے شایانِ شان ہو۔''

اس وقت صرف ایک بات پر اختلاف ہوا۔ اور وہ پرچہ کی قیمت کے بارے میں چار سو صفحے کی قیمت منٹو صاحب پانچ روپیہ رکھنا چاہتے تھے۔ میرا خیال تھا قیمت زیادہ ہے اور قیمت صرف ساڑھے تین یا چار روپے ہو۔ منٹو بگڑ گئے۔ کہنے لگے ''منٹو کا نام کیا اس قابل بھی نہیں کہ منٹو پر لوگ پانچ روپیہ صرف کریں۔''

---

[1]: میں نے انتخاب بھی کیا تھا اور منٹو کے فن کے بارے میں ایک ۶۰ صفحے کا طویل مضمون بھی لکھا تھا۔ اس کے علاوہ اس موقع پر میں نے صفیہ منٹو کا ایک انٹرویو بھی لیا تھا۔ اس انٹرویو کا اس وقت سلسلہ یوں بندھا کہ جب منٹو نے مجھ سے کہا کہ تم مجھ پر ایک طویل نوٹ لکھنا تو صفیہ پاس بیٹھی تھیں۔ صفیہ صاحبہ نے کہا ''اگر میں انتخاب کر کے نوٹ لکھوں تو گالیاں ہی لکھوں گی۔'' منٹو نے کہا ''تو پھر لکھتی کیوں نہیں ہو۔ ضرور لکھو میں تھوڑا ہی ڈرتا ہوں۔'' اس بات پر میرے ذہن میں ایک بجلی سی کوند گئی اور انگریزی ادیبوں کی وہ ساری تحریریں ابھرنے لگیں جو کلاسیکل ادیبوں پر ان کے قریبی جاننے والوں نے لکھی ہیں۔ میں نے سوچا کہ اگر واقعی صفیہ منٹو پر کچھ لکھے تو وہ کس قدر اہم کس قدر قیمتی ہوگا۔ اور یہ سوچ کر میں نے صفیہ کو انٹرویو کے لئے راضی کیا۔ بڑی دیر بعد طے ہوا کہ میں جو جی میں آئے سوال کرتا جاؤں گا اور صفیہ صاحبہ جواب دیتی جائیں گی۔ انٹرویو کے لئے ہم نے دوسرا دن تجویز کیا اور جب رات کے بارہ بجے منٹو کے گھر سے نکل کر میں مال روڈ پر آیا ہر طرف چاندنی چھائی ہوئی تھی میں تنہا رات کے ساڑھے تین بجے تک شملہ پہاڑی، لارنس اور مال روڈ پر گھومتا رہا اور اپنے ذہن میں صبح کے لئے سوالات تیار کرتا رہا۔ دوسرے دن جب میں منٹو کے گھر گیا تو صفیہ بھی آ گئیں اور میں نے انٹرویو شروع کر دیا۔ یہ انٹرویو تین دن تک جاری رہا۔ اس انٹرویو کی اس لئے بھی میرے نزدیک بڑی اہمیت ہے کہ اس وقت پاس منٹو بھی بیٹھے تھے اور سارے انٹرویو کے دوران میں انہوں نے صرف ایک بار زبان کھولی تھی اور وہ بھی اس وقت جبکہ صفیہ بار بار منٹو کی شراب نوشی کا ذکر کر رہی تھیں تو منٹو نے کہا ''تمہیں میں شراب کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا ہوں۔'' یہ انٹرویو صفیہ کے پاس موجود ہے۔ اس انٹرویو کے سوالات کے سلسلہ میں شمشیر علی صاحب طاہر ایم ایس سی سابق پروفیسر گورنمنٹ کالج حیدرآباد دکن نے میری بڑی مدد کی تھی جس کے لئے میں طاہر صاحب کا ممنون ہوا۔

میں نے کہا "بات منٹو کے نام کی نہیں لوگوں کی جیب کی ہے لہٰذا قیمت چار روپیہ رکھئے اور نہیں رکھ سکتے تو ضخامت کم کر دیجئے۔"

صفیہ صاحبہ بھی موجود تھی وہ میری تائید کر رہی تھیں۔ اصغر صاحب بھی مجھ سے متفق تھے۔ چنانچہ منٹو صاحب بھی راضی ہو گئے۔

ان باتوں میں بارہ بج گئے۔ اصغر صاحب بھی اٹھے میں نے بھی اجازت لی۔ دوسرے دن منٹو نے ساڑھے نو بجے بلایا تھا۔ میں دیر سے اٹھنے کے باعث دس بجے پہنچا۔ منٹو بے حد سنجیدگی سے دیر سے آنے پر بگڑے۔ پھر کہنے لگے "یار سب ٹھیک ہے کوئی بات نہیں آؤ بیٹھ جاؤ"

میں بیٹھ گیا کہنے لگے "پانچ بجے رات اٹھا تھا اور فوراً ہی پوسٹر کا مضمون تیار کیا حامد جلال[1] کو سائیکلو اسٹائل کرنے کے لئے دیا ہے۔ تم بیٹھو ابھی ابھی وہ پوسٹر آتے ہوں گے ان پوسٹروں میں منٹو نے شاید اپنی زندگی میں پہلی بار اپنے قلم سے لکھا تھا "اردو کے عظیم فنکار کے یومِ پیدائش پر ماہنامہ دستور کی پیشکش۔"

دوسرے دن جمعہ تھا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے اجلاس میں چلنے کے لئے منٹو صاحب نے کہہ رکھا تھا۔ میں ساڑھے چار بجے ان کے گھر پہنچ گیا اور ہم انجمن کے اجلاس میں پہنچے۔ منٹو صاحب نے سب سے پہلے احمد ندیم قاسمی کو پکڑا اور ساری باتیں سنا کر کہنے لگے "یہ منٹو نمبر کی بات ابھی اپنے تک رکھئے۔ جب نمبر نکل آئے گا لوگ چونک پڑیں گے۔ اس وقت تک پتہ نہ چلے تو بہتر ہے۔" ندیم صاحب نے اس نمبر کے لئے منگل کے دن شام کو مضمون بھیج دینے کا وعدہ کیا۔ (اور واقعی منگل کی شام مضمون بھیج دیا تھا) ندیم صاحب کے بعد انہوں نے عابد حسن منٹو کو آواز دی اور ان سے بھی مضمون کے لئے کہا۔ منٹو کے کہنے پر کافی لوگ لکھنے کے لئے راضی ہو گئے۔

دوسرے دن شام کو سبطے منٹو کے گھر آئے تو ساری باتیں سنانے کے بعد منٹو نے کہا "لیکن آپ کی جماعت[2] نے تو مجھے مردود قرار دے رکھا ہے۔ آپ شاید مجھ پر مضمون لکھنا پسند نہ کریں۔" سبطے نے کہا "ہر آدمی کی ایک ذاتی رائے بھی ہوتی ہے۔"

منٹو نے جواب دیا "تو پھر میں کب تک امید کروں۔"

---

[1]: حامد جلال منٹو کے بھانجے۔ [2]: انجمن ترقی پسند مصنفین

منٹو بڑی سنجیدگی اور انہماک سے کام کر رہے تھے۔

منٹو شراب سے دور آ رہے تھے۔[۲]

منٹو پھر ایک بار بمبئی کے منٹو ہو گئے تھے۔ محنتی، بااصول لیکن......

ایک دن جو صبح پہنچا معلوم ہوا منٹو صاحب صبح سے پی رہے تھے اب سو رہے ہیں۔ منٹو نے مجھے اجازت دے رکھی تھی کہ اگر دروازہ بند ہو تو اُوپر دروازہ کا شیشہ میں نے توڑ رکھا ہے اندر ہاتھ ڈال کر چٹخنی کھول لینا اور بے دھڑک جب جی چاہو چلے آنا۔ چنانچہ میں اسی طرح پہنچا۔ منٹو صاحب سو رہے تھے۔ میں نے جگایا تو انہوں نے جواب دیا۔ ''یار شام میں ملو۔ اب جاؤ'' اس قسم کی بات کا پہلی بار اتفاق ہوا تھا۔ میں چلا آیا اور کئی دن تک ان کے پاس نہیں گیا۔

ایک دن ہاسٹل ہی میں میرے نوکر'' آبادان'' نے مجھے بتلایا کہ منٹو صاحب کئی بار میرے کمرے پر ہو گئے ہیں آپ نہیں ملے۔ آپ کو بُلایا ہے ضرور مل لیجئے۔

میں لکشمی مینشن پہنچا کہنے لگے'' تم اس دن شاید بُرا مان گئے۔ تمہیں یہ معلوم نہیں کہ میرا'' دستور، والوں سے اختلاف ہو گیا ہے۔ اب وہ مجھے دو ہزار [۳] دینے پر راضی نہیں ہیں۔ اب میں کس طرح نمبر

نکال سکتا ہوں۔"

وہ اداس تھے۔

میں نے کہا "منٹو نمبر" تو نکالنا کسی بھی پرچہ کے لئے باعثِ فخر ہو سکتا ہے کہیں اور بات کی جائے۔"

منٹو صاحب نے شیروانی پہن لی۔

اور ہم تانگہ میں چل پڑے۔

اور یہ تانگہ تین دن تک لاہور کے پرچوں کے دفتروں کے مسلسل چکر کاٹتا رہا۔ اس تانگہ میں بیٹھا برِ عظیم ہندو پاک کا مشہور افسانہ نگار ایک ایک پرچہ کے ایڈیٹر سے کہہ رہا ہے۔

"منٹو کے پیدائش کے دن کی تاریخ صرف اٹھارہ دن رہ گئی ہے۔ کسی صورت یہ نمبر نکالو۔" وہ ایک ایک ایڈیٹر سے کہہ رہا ہے "منٹو کے نام پر پرچہ بک جائے گا تم فکر نہ کرو اور اعلان کر دو اور منٹو نمبر نکالو۔"

اُردو زبان کا مشہور ترین افسانہ نگار "نقوش" کے دفتر میں داخل ہوتا ہے اور خاموش واپس چلا آتا ہے۔

اُردو زبان کا عظیم[1] افسانہ نگار دفتر "سویرا" کی سیڑھیاں چڑھتا ہے اور اپنے سفید کرتے سے اپنے سنہری چشمہ کے گلاس صاف کرتا ہوا خاموش لوٹ آتا ہے۔

شاید ایڈیٹر کاروبار کی بابت سوچ رہے تھے۔ نفع نقصان کے متعلق غور کر رہے تھے۔ پیسوں کے تعلق سے فکر مند تھے۔

اور منٹو اپنی حسرت لیے واپس لکشمی مینشن لوٹ لوٹ کر آتا رہا۔ اور یہ حسرت دل ہی دل میں لیے

---

[1]: اس لفظ "عظیم" کا استعمال ہمارے پاس جس دریا دلی سے ہوا ہے اس کا جواب نہیں عظیم شاعر، عظیم نقاد، عظیم افسانہ نگار، عظیم انسان، عظیم صحافی اور نہ جانے کیا کیا عظیم۔ میں نے یہاں منٹو کے لئے لفظ عظیم اس وقت استعمال کرنے کی جرأت کی ہے جبکہ تازہ ماہ نو (جلد نمبر ۷ شمارہ نمبر ۱۲) میں منٹو کے ساتھ لفظ عظیم وقار عظیم کے قلم سے دیکھا ہے۔

ہم سے رُخصت ہو گیا۔[1]

رخصت ہوتے وقت ان کے دل میں خُدا جانے کیا کیا حسرتیں تھیں۔ دل میں جانے کیا کیا ارمان تھے۔ زندگی میں تو البتہ انہیں جس چیز کی حسرت تھی اور جو وہ ارمان رکھتے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ یہ تھا کہ وہ ہر آدمی کے کام آئیں اور ہر ضرورت مند کی ضرورت پوری کریں۔

میں اوروں کی بات کیا عرض کروں اپنی سناتا ہوں۔

ایک دفعہ جب لکشمی مینشن میں میرا شاہ صاحب[2] کے ہاں قیام تھا میرے کمرے کی چابی گم ہوگئی۔ میں منٹو صاحب کے ہاں پہنچا۔ وہ بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔

میں نے کہا ''منٹو صاحب کمرے کو تالہ لگا ہوا ہے اور چابی گم ہوگئی ہے۔''

''آپ پہلے تو نل کھلا چھوڑ کر باہر چلے گئے تھے جس کے نتیجہ کے طور پر سارا بلاک پانی سے محروم ہو گیا تھا۔ آج چابی بھی گنوا آئے۔'' منٹو نے کہا۔

''بہر حال جو بھی ہونا تھا ہو چکا اب تالہ کھولنے کا مسئلہ ہے۔''

یہ سن کر منٹو صاحب اُٹھے۔ تالہ کا معائنہ کیا۔ کہنے لگے ''یار یہ تالہ نہیں تالوں کا تالہ ہے۔ تُم نے کوئی خزانہ دفن کر رکھا ہے جو اتنا بڑا تالہ لگاتے ہو۔''؟

میں نے کہا ''تالہ جو شاہ صاحب نے دیا ہے وہ میں نے ڈال دیا ہے اب کھولنے کی سوچئے۔''

منٹو صاحب کو اس دن سخت نزلہ تھا۔ مفلر لپیٹ رکھا تھا اور بار بار ناک صاف کر رہے تھے۔ اتنے میں شاہ صاحب بھی آ گئے۔ منٹو صاحب اور شاہ صاحب تالہ کھولنے کی فکر کرنے لگے۔ شاہ صاحب جو چیز مانگتے منٹو صاحب اپنے فلیٹ کو دوڑے جاتے اور گھر سے ایک کے بعد دوسری چیز (ہتھوڑا، کیل وغیرہ) تالہ

1: اور اس کے رخصت ہونے کے ساتھ ہی اس مردہ پرست قوم نے ''منٹو نمبر'' کی تیاریاں شروع کردیں۔ میں منٹو کی وفات کے چوتھے روز رفیق خاور (ایڈیٹر ماہ نو) کے ساتھ ابن انشاء کے پاس گیا تو ابن انشاء نے کہا کہ افکار منٹو نمبر نکال رہا ہے۔ نقوش کے شخصیات نمبر میں اعلان ہے کہ نقوش کا آئندہ نمبر منٹو نمبر ہوگا۔ اختر انصاری اکبر آبادی (ایڈیٹر مشرب) نے مجھے بتلایا کہ مشرب بھی منٹو نمبر پیش کرے گا۔ نقش (کراچی) کا بھی منٹو نمبر کے لئے اعلان آ چکا ہے۔ سیارہ (کراچی) کا منٹو نمبر سُنا ہے پریس میں ہے۔

2: مظہر محمود شاہ۔ بے حد خلیق و ہمدرد انسان۔

توڑنے کے لئے لے آتے۔

اس دن ان کی اس دوست پرستی نے مجھے بڑا ششدر کیا۔ میں بے حد مغرور تھا کہ پاک و ہند کا عظیم فنکار میرے لئے کتنا پریشان ہے۔ یقین کیجئے جب شاہ صاحب نے تالہ کھولا تو منٹو صاحب کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ تھی جیسے انہوں نے کوئی بڑا معرکہ سر کر لیا ہو۔

مارشل لا کے دن تھے لاہور کے مومنین نے اسلام کی خدمت اور باطل کی قوت کو شکست دینے کیلئے قادیانیوں کے خلاف ایک مہم چلائی تھی۔[1] جان نثاران و فدایانِ اسلام نے اس بار مسجد شہید گنج کے انداز پر مسجد وزیر خان سے اسلام کا پرچم بلند کیا تھا۔ نتیجتاً مارشل لا لگ گیا۔ صرف صبح سے دوپہر تک گھروں سے باہر نکلا جا سکتا تھا۔ ایک دن ہم صبح اٹھے، اتوار کا دن تھا۔ ناشتہ کی بہت کوشش کی کہ ناشتہ ہاسٹل ہی میں ہو جائے لیکن اکاؤنٹ اتنا بڑھ گیا تھا کہ کریڈٹ نہیں چل سکتا تھا۔ مجبوراً اپنے دوست خلیق کو جو ان دنوں میرے مہمان تھے ساتھ لے کر دوسرے دوستوں کی تلاش میں چلے۔ کوئی اور نہیں ملا تو لکشمی مینشن پہنچے۔ منٹو صاحب نے کہا ''یار بڑے دنوں بعد آئے ہو۔''

''ناشتہ کرنے کے لئے آئے ہیں۔'' میں نے کہا۔

منٹو صاحب یہ سن کر اٹھے جمیل کو آواز دی اور صفیہ منٹو کو کہلوایا کہ ناشتہ کا انتظام کر دیں۔ اس کے بعد منٹو صاحب بار بار اندر جاتے اور باہر آتے۔ گفتگو بھی نہیں کر رہے تھے۔ میں کوئی بات شروع کرتا اور منٹو ''ابھی آیا'' کہہ کر اندر چلے جاتے، مجھے یہ بات بڑی ناگوار گزر رہی تھی۔

میں نے پوچھا ''منٹو صاحب اندر کیا چیز آج رکھ چھوڑی ہے جسے دیکھنے بار بار جاتے ہیں۔''

منٹو نے کوئی جواب نہ دیا۔

کچھ دیر بعد بسکٹ چائے آئی، چائے بغیر دودھ کی تھی۔

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ منٹو کے گھر میں اس دن ایک پیسہ بھی نہ تھا۔ بغیر دودھ کی چائے دیکھ کر مجھے پتہ چلا کہ منٹو بار بار اندر کیوں جاتے ہیں۔ اسی لئے تاکہ دودھ کا کوئی بندوبست ہو جائے۔

کس قدر وہ دوست پرست انسان تھا۔

منٹو واقعی بڑے دوست پرست اور دوست نواز انسان تھے۔

البتہ میں حیران ہوں کہ اپنی ذاتی زندگی میں تو وہ بڑے انسان دوست اور بے حد دوست پرست تھے لیکن عقائد میں نہ جانے کیوں انسان کو ازلی طور پر گناہگار تصور کر بیٹھے تھے اور سرشت انسانی کو شر سے ہٹا کر کیوں نہیں دیکھتے تھے۔ یہ عقدہ مجھ پر نہیں کھل سکا ہے۔

جب کبھی انسان کے مستقبل کے بارے میں گفتگو ہوئی انہوں نے یہی کچھ کہا کہ ایک انسان دوسرے انسان کو یوں ہی سدا ایذا پہنچاتا رہے گا۔ مصائب میں مبتلا کرتا رہے گا۔ اگر ایک شخص کتابیں لکھے گا تو دوسرا لائبریریوں کو جلائے گا۔ ایک شخص نقش ونگار بنائے گا تو دوسرا میوزیم کو مٹائے گا اور بم گرانے کی سوچے گا۔ میں حیران ہوں منٹو کیوں اس انسان کا تصور نہیں کرتے تھے جو آنے والے معاشرہ میں باغات کے لگانے، کتب خانوں کے بسانے اور تسخیر فطرت میں مصروف رہے گا۔

بہرحال مستقبل کے انسان کے متعلق ان کا جو بھی تصور ہو وہ اپنی ذات سے تو بے حد بافیض آدمی تھے۔ بارہا میں نے دیکھا ہے کہ بے شمار لوگ منٹو کے ہاں آتے اور اپنی غرض پوری کر کے جاتے رہے ہیں۔ منٹو کسی کی ضرورت روپے پیسے سے پوری نہیں کر سکتے تھے چونکہ خود ان کے پاس اپنے لیے ہی پیسہ نہ تھا۔ یہ ضرورت کچھ اس طرح پوری ہوتی تھی کہ اپنے جاننے والوں سے دوسروں کے کام نکلوا دیا کرتے تھے۔

ان کے دوست احباب تو خیر ان کی ذات سے فائدہ اٹھاتے ہی رہے ہوں گے لیکن بے شمار وہ لوگ جو منٹو کے ہاں پہلی بار آتے تھے۔ منٹو ان کے لئے بھی کچھ نہ کچھ کرتے ہی تھے۔ منٹو کے ہاں طالب علموں کا جمگھٹا خوب لگا رہتا تھا[1] اس لیے امتحانات کے بعد ایک تانتا بندھا ہوتا تھا۔ پنجاب یونیورسٹی کو بطور خاص یہ اعزاز حاصل ہے کہ پنجاب یونیورسٹی کے اکثر و بیشتر طالب علم پڑھنے پر یا امتحان پر اتنا زور نہیں دیتے اور اتنی محنت نہیں کرتے جتنی کہ امتحان دے دینے کے بعد ممتحن حضرات کے گھروں کا پتہ دریافت کرنے اور FICTITIOUS نمبر معلوم کرنے پر صرف کرتے ہیں۔ منٹو کبھی انکار نہیں کر سکتے تھے اس لئے جو اٹھتا منٹو کے گھر کا رخ کرتا اور ''۳۱ لکشمی مینشن ہال روڈ لاہور'' کا دروازہ[2] ہر شخص کے لئے کھلا ہی رہتا تھا۔ طالب علم نہ صرف منٹو سے سفارش کی درخواست لے کر آتے بلکہ بضد منٹو

---

[1]: میں نے بھی کم از کم ایک ہزار طالب علموں کو منٹو کا درشن کرایا ہوگا اور ان میں سے نہ جانے کتنوں نے منٹو کو استعمال کیا۔

[2]: منٹو کا گھر

کو پابند اور مجبور کر دیتے تھے اور منٹو صاحب ٹانگہ پر سوار دوسروں کی فکر میں گھوما کرتے تھے۔

گھر میں بچوں کا جھگڑا ہو۔ لکشمی مینشن کے مہتر، مہترانی کے تعلقات بگڑ گئے ہوں۔ پروفیسر اثر کے لئے ایمبولینس کار منگوانی ہو۔ ٹکٹ کے لئے دوستوں کے پاس پیسے نہ ہوں اور ان کو سفر کرنا ضرور ہو۔ ہر موقع پر ہر ضرورت کے لئے منٹو صاحب کو یاد کیا جاتا اور منٹو صاحب ''دونوں'' طرف کا خیال رکھتے ہوئے بڑی خوبی کے ساتھ معاملات نمٹا دیتے تھے۔ آخری دور میں کہنے لگے تھے۔ ''یار اب تو میں لکھنا لکھانا ختم کر دیتا ہوں۔ لڑائی جھگڑے چکانے ہی سے فرصت نہیں ملتی۔'' واقعی انہیں فرصت نہیں ملتی تھی۔ لوگ شادی کر رہے ہیں تو اس موقع پر بھی منٹو صاحب معاملات طے فرماتے۔ کوئی دوکان کھول رہا ہو منٹو صاحب ہی کام آتے۔ اَب یہ جو الاٹمنٹ کا سلسلہ ہمارے ملک میں جاری ہے وہ بھی منٹو صاحب کے لئے دردسر تھا۔ بیشتر حضرات کو منٹو صاحب یاد آتے اور وہ سفارش کرنے کی درخواست لیے چلے آتے۔ منٹو صاحب کے تعلقات اتنے وسیع تھے اور ان کا نام اس قدر مشہور تھا کہ وہ جن کے ہاں سفارش کرنا ہوا سے جانتے بھی ہوں یا نہ ہوں چونکہ وہ انہیں جانتا تھا اس لیے بھی منٹو صاحب اپنی شخصی واقفیت کے بغیر سفارش لیے پہنچ جاتے۔ لوگوں کو نوکری نہیں مل رہی ہے۔ ریڈیو پروگرام نہیں مل رہا ہے۔ اخبارات میں مضامین شائع نہیں ہو رہے ہیں۔ منٹو صاحب کے پاس چلے جایئے کوئی نہ کوئی صورت کامیابی کی نکل ہی آئے گی۔ بہر حال بڑے بافیض آدمی تھے۔

مجھے بھی انہوں نے ہر موقع پر مدد پہنچائی۔

کراچی سے لاہور نیا نیا پہنچا تھا اور میرے رہنے کا کوئی معقول (بلکہ نامعقول بھی) بندوبست نہیں تھا۔ تین چار روز گزر گئے اور رہنے کا انتظام نہیں ہو سکا تو میں منٹو صاحب کے ہاں پہنچا اور کہا کہ ''جناب میں نے پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج میں داخلہ تو لے لیا ہے۔ لیکن ہاسٹل میں کمرہ نہیں مل سکا ہے۔ کیا کوئی صورت ممکن ہے۔

''کون کون پروفیسر ہیں۔''

جب میں نے دو تین نام لینے کے بعد ڈاکٹر محمد باقر کا نام لیا تو کہنے لگے'' باقر صاحب سے تو کام نکل سکتا ہے۔''

''پھر تو بہتر ہے۔'' میں نے کہا۔

منٹو فوراً اٹھے۔ شیروانی پہن لی اور یونیورسٹی چلنے کا پروگرام بتلایا تو میں نے کہا'' آج تو اتوار ہے اور یونیورسٹی بند ہے۔''

''تو پھر باقر صاحب کے گھر چلو'' انہوں نے جواب دیا۔

گھر کا پتہ مجھے معلوم نہ تھا۔ لکشمی مینشن میں اثر صاحب بھی تھے۔ مگر انہوں نے بھی عدم واقفیت بتلائی۔'' ''امروز'' کے دفتر ٹیلیفون کیا گیا وہاں سے بھی پتہ نہ ملا۔'' ''ہمایوں'' کے دفتر میاں بشیر احمد کو ٹیلیفون کیا گیا معلوم ہوا وہ باہر گئے ہوئے ہیں دو ایک جگہ اور کوشش کی۔ کہیں سے بھی صحیح جواب نہ مل سکا۔ مایوس ہو کر آج کا کام کل پر چھوڑ کر بیٹھ گئے لیکن شام کو مجھے ایک دوست سے باقر صاحب کے گھر کا پتہ چلا تو میں منٹو صاحب کے پاس لکشمی مینشن پہنچا۔ منٹو صاحب بیمار تھے ہلکا ہلکا بُخار اور نزلہ شدید تھا۔ کہنے لگے'' کیا کیا جائے۔'' میں نے کہا۔'' اس حالت میں چلنا تو مناسب نہیں بعد میں دیکھیں گے۔''

''اچھا تو پھر تم ڈاکٹر باقر کے نام میرا رقعہ لے لو۔''

میں نے کہا'' جلدی نہ کیجئے، کل سہی آپ اچھے ہو جایئے۔''

کہنے لگے'' بھئی تمہیں ہوٹل میں رہنا پڑ رہا ہے۔ پیسہ خرچ ہو رہا ہے۔ تکلیف علیحدہ کاغذ قلم اٹھاؤ۔ میرا خط لے لو۔''

میں نے کاغذ قلم دیا تو منٹو نے حسب ذیل خط ڈاکٹر محمد باقر کے نام لکھا:۔

''برادرم مکرم جناب ڈاکٹر صاحب

السلام علیکم۔ میں نے بہت کوشش کی کہ آپ کے دولت خانہ کا پتہ مل جائے مگر نہ مل سکا۔ آج اتوار ہے اس لئے آپ سے کالج میں بھی ملاقات نہیں ہو سکتی۔ حامل رقعہ اسد اللہ میرے عزیز ترین دوست ہیں۔ ان کو بورڈنگ میں داخلہ چاہیے اور اس کے لئے آپ کی سفارش کی ضرورت ہے۔

اُمید ہے کہ آپ میری خاطر یہ کام کر دیں گے۔ کبھی حلقہ میں ملاقات ہوئی تو میں شکریہ ادا

کروں گا۔ آپ کے خلوص کے پیشِ نظر یہ چند سطور لکھی ہیں۔ خُدا کرے آپ میرا یہ کام بغیر کسی تکلیف کے کرسکیں۔

اُمید ہے کہ آپ بخیریت ہونگے۔ اب حلقہ[1] میں اگر مجھے افسانہ پڑھنا ہوتو آپ صدارت فرمایئے گا۔ ذرا لطف آجاتا ہے۔ خاکسار

سعادت حسن منٹو

۵/اکتوبر ۱۹۵۲ء

یہ خط پنسل سے لکھا ہوا ہے۔ جملہ بارہ سطریں ہیں۔ یہ خط میرے پاس محفوظ ہے۔

یہ خط لے کر میں اپنے دوست کے بتلائے ہوئے پتہ پر ڈاکٹر باقر کے گھر کی طرف چلا۔ پتہ غلط دیا گیا تھا اس لئے میں یہ خط ڈاکٹر باقر کو نہ پہنچا سکا اور رات ہی کو میں نے منٹو صاحب کو بتلایا کہ پتہ غلط تھا اس لئے ڈاکٹر باقر کا گھر نہ مل سکا۔[2] منٹو نے کہا ''اچھا صبح آنا اگر میں ذرا ٹھیک ہوگیا تو اکھٹے چلیں گے۔''

دوسرے دن میں پہنچا۔ منٹو صاحب لیٹے لپٹائے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر تیار ہوگئے۔ اس وقت ان کے ہاں منیر نیازی بیٹھے تھے۔ وہ بھی ہمارے ساتھ ہوگئے اور ہم تینوں ٹانگہ میں سوار ڈاکٹر باقر کے پاس پہنچے۔

یاد نہیں رہا کہ ڈاکٹر باقر سے اس وقت کیا کیا کہا۔ میری تعریف میں کیا کیا الفاظ استعمال کیے۔ بہر حال ڈاکٹر باقر نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ کمرہ دلا دیں گے۔

منٹو صاحب وہاں سے اُٹھے اور اسٹاف روم میں آئے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، پروفیسر سیّد وقار عظیم، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور مشرف انصاری صاحب تشریف رکھتے تھے کچھ دیر باتیں کیں۔ وقار صاحب سے کہا: ''آپ لوگ مجھ پر لکھیئے گا اور مجھے میری غلطیاں بتلایئے گا۔'' پھر عبادت صاحب کی طرف پلٹے اور ان سے بھی یہی کہا کہ ''میری آپ سے بھی یہی درخواست ہے۔''

پھر اُٹھ کھڑے ہوئے زور سے سلام علیکم کہا اور ٹانگہ میں سوار لکشمی مینشن چلے آئے دوسرے دن

---

[1]: حلقۂ ارباب ذوق۔

[2]: مجھے میرے دوست نے گارڈن ٹاؤن کہا تھا۔ باقر صاحب کا گھر ماڈل ٹاؤن میں ہے

میں ڈاکٹر باقر سے ملا اور اسی دن مجھے کمرہ مل گیا۔

میرے پاس منٹو صاحب کا ایک اور خط محفوظ ہے۔ وہ پروفیسر عزیز احمد کے نام ہے۔ یہ خط "اردو ادب" کے لیٹر ہیڈ پر ہے۔ یہ خط منٹو صاحب نے مجھے اس وقت دیا تھا جبکہ میں پنجاب یونیورسٹی کے امتحان کے بعد لاہور کی سخت گرمی سے عاجز آ چکا تھا اور لاہور کے شدید موسموں (سردی اور گرمی) سے مستقلاً نجات پانے کراچی میں ہی ٹھہر جانا چاہتا تھا۔ منٹو صاحب نے اس وقت مجھے بہت سمجھایا کہ "لاہور میری جان بہرحال لاہور ہے۔" لیکن میں کراچی آنے کا قطعی ارادہ کر چکا تھا۔ اس لئے میں اپنی رائے پر قائم رہا۔

صفیہ منٹو کوہ مری گئی ہوئی تھیں۔ منٹو صاحب کا نوکر جمیل سو رہا تھا اور منٹو صاحب تولیہ بھگو بھگو کر سر پر رکھ رہے تھے میں نے کہا کہ "سنیئے آج شام میں اپنے دوست ارشد کے ساتھ کراچی جا رہا ہوں۔ وہاں رہنے اور کالج میں داخلہ لینے کے لئے آپ کے خط کی ضرورت ہے۔" تو اُٹھے اور کاغذ ڈھونڈنا شروع کیا جب کافی تلاش کے بعد بھی "اُردو ادب" کے کاغذ نہیں مل رہے تھے تو میں نے کہا "سادہ کاغذ پر ہی لکھ دیجئے۔" تو کہنے لگے "مر کیوں رہے ہو، صبر کرو۔" آخر مکتبہ جدید لاہور کے "اُردو ادب" کے کاغذ بڑی تلاش کے بعد نکال کر پروفیسر عزیز احمد کے نام حسبِ ذیل خط لکھا:۔

پیارے عزیز! السلام علیکم۔ میں بہت عرصہ سے بیمار ہوں اس لئے "ماہِ نو" کے لئے کچھ نہ لکھ سکا اور بھی کچھ وجوہ تھیں جو آپ کو معلوم ہو گئی ہوں گی۔

بہرحال اب آپ سے ایک کام لینا ہے۔ حامل رقعہ میرے عزیز ترین دوست محمد اسد اللہ ہیں۔ وہ کراچی کے کسی ہاسٹل میں جگہ چاہتے ہیں۔ مجھے پوری امید ہے کہ آپ ان کی مدد کریں گے۔ دیکھئے مجھے مایوسی نہ ہو۔

اُمید ہے کہ آپ بخیرت ہوں گے۔ میں "ماہِ نو" کے لئے دو افسانے بہت جلد آپ کی خدمت میں روانہ کر دوں گا۔ خاکسار

سعادت حسن منٹو

یکم اگست ۱۹۵۳ء

یہ خط آٹھ سطروں میں ہے اور میرے پاس محفوظ ہے۔ کراچی آنے کے بعد لاہور کی یاد نے بہت

جلد کراچی میں مستقل رہنے کا میرا ارادہ بدل دیا اور میں پروگرام بدل کر کوئٹہ چلا گیا اور کوئٹہ سے لاہور۔ اس طرح یہ خط بھی میرے پاس ہی رہ گیا۔

تیسرا خط منٹو صاحب کا اے بی اے حلیم کے نام ہے۔ اس خط کی تفصیلات یہ ہیں کہ میں جس وقت لاہور سے چلا تھا اس وقت منٹو صاحب سے کہا تھا کہ میں کراچی ہی میں پڑھوں گا تو انہوں نے خود اپنی مہربانی سے حلیم صاحب کے نام مجھے یہ خط دیا تھا۔

مکرمی و محترمی جناب حلیم صاحب!

تسلیمات، آپ کو شاید یاد نہ ہو، میں کسی زمانہ میں جبکہ آپ علیگڑھ یونیورسٹی میں تھے۔ وہاں کا ایک بدقسمت طالب علم تھا، کیونکہ مجھے علالت کے باعث تین مہینے کے بعد یونیورسٹی چھوڑنا پڑی تھی۔

میں اس چھوٹے سے رشتہ کی بنا پر آپ سے اپنے ایک عزیز دوست محمد اسداللہ کی سفارش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ ایس ایم کالج میں داخلہ چاہتے ہیں۔ تفصیلات وہ خود زبانی عرض کر دیں گے۔ اگر ہو سکے تو ان کے لئے ہاسٹل کا بندوبست بھی فرما دیجئے گا۔ میں ممنون و مشکور ہوں گا۔

اگر زندگی ہوئی تو آپ سے نیاز حاصل کروں گا۔[1] آپ کو یقیناً اپنی یونیورسٹی کا سب سے شریر طالب علم سردار خان (بلوچ) یاد ہوگا۔ خدا جانے وہ کہاں ہے۔؟

خُدا آپ کو خوش رکھے

نیاز کیش

سعادت حسن منٹو

یکم اگست ۱۹۵۳ء

یہ خط دس سطروں میں ہے اور مکتبہ جدید کے رسالہ اُردو ادب ہی کے لیٹر ہیڈ پر ہے اس خط میں منٹو نے اپنے گھر کا پتہ لکھا ہے اور پتہ انگریزی میں تحریر ہے۔ منٹو صاحب کو انگریزی لکھتے پہلی بار میں نے اسی دن دیکھا تھا۔ اس خط میں منٹو صاحب نے اپنے لیے "بدقسمت" کا لفظ ابتدائی سطروں میں استعمال کیا ہے۔ اس کے بارے میں مجھے یہ کہنا ہے کہ منٹو صاحب کو اپنے نہ پڑھ سکنے کا بڑا ملال تھا۔ وہ اکثر کہا

۱: زندگی نہیں تھی اور وہ پروفیسر اے بی حلیم سے نہیں مل سکے۔

کرتے تھے،" میں کیا ہوں، میں تو ایف اے فیل ہوں،" پھر کہا کرتے تھے،" میرے دوسرے دو بھائی بیرسٹر ہیں۔"[1]

میں نے ایک دن کہا تھا" آپ کے بھائیوں نے بیرسٹر بن کر جو روپیہ کمایا ہے اس سے لاکھوں گنا زیادہ قیمتی نام آپ نے ادیب بن کر کمایا ہے۔" تو منٹو صاحب نے ہنس کر کہا تھا۔

"نہیں یار"، اور پھر خاموش ہو گئے تھے۔

تین مہینے بعد یونیورسٹی چھوڑنے کا جو ذکر کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یونیورسٹی کے ڈاکٹروں نے منٹو صاحب کے بارے میں کہا تھا کہ وہ ٹی بی کا شکار ہیں اس لئے انہیں بورڈنگ اور کالج میں نہیں رکھا جا سکتا۔ منٹو صاحب نے جب دہلی میں اور ڈاکٹروں سے مشورہ لیا تو یونیورسٹی کے ڈاکٹروں کی تشخیص غلط نکلی لیکن پھر بھی منٹو یونیورسٹی میں داخلہ نہیں لے سکے۔ جس سردار خان بلوچ کا منٹو نے ذکر کیا ہے وہ منٹو صاحب کے قدیم دوست رہے ہیں اور منٹو صاحب کو ان کی بڑی تلاش تھی لیکن وہ انہیں نہیں مل سکتے۔

دوست ہوں یا سکون، ایک دفعہ کھو جانے کے بعد کہتے تھے پھر نہیں مل سکتا۔ اس کا انہیں بڑا ملال بھی تھا۔ ماضی ہی ان کا سرمایہ تھا۔ یہ ماضی اچھا رہا ہو یا سوہان روح۔ یونہی تو ان کی ماضی ہی تھا۔ اکثر کہتے تھے" اب مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک چیز تھی۔ تم اُسے خوشی کہہ لو یا کچھ اور نام دے لو۔ بہرحال جو بھی ہو، ایک چیز تھی۔ اب میں اس سے محروم ہو گیا ہوں،" میں کہتا تھا ایسا نہیں ہے۔ اب بھی لوگ آپ سے محبت کرتے ہیں آپ کے دنیا میں بے شمار پرستار ہیں۔ آپ کا اپنا گھر ہے۔ بیوی بچے ہیں۔ لیکن کہتے تھے" سب کچھ سچ، لیکن بس ایک چیز یوں معلوم ہوتا ہے کہ تھی اب نہیں رہی۔" وہ کیا چیز تھی۔ باوجود کوشش کے مجھے اندازہ نہیں ہو سکا۔ کہیں" مقبولیت" تو نہیں جسے منٹو کم ہوتی محسوس کرتے تھے؟

مقبولیت تو اب بھی بے پناہ تھی۔

ایک دفعہ دو بجے کا وقت ہوگا میں اپنے ایک دوست ارشد کے ساتھ منٹو صاحب کے پاس گیا۔ ارشد کو بھی گپ مارنے کا بڑا شوق ہے۔ منٹو اور ارشد دونوں بیٹھے باتیں کرنے لگے۔ میں نے اخبار اٹھا لیا۔ ارشد کو پہلی بار میں نے ان سے ملایا تھا اس لئے منٹو نے پوچھا" کیا کرتے ہو دوست،"

1: سلیم حسن، منٹو، سعد حسن منٹو جو برسوں سے نیروبی میں ہیں۔

ارشد نے جواب دیا ''ایف سی کالج سے ایف ایس سی پاس کیا ہے۔ اب سیکنڈ ایئر ایم بی بی ایس میں پڑھتا ہوں،'' ارشد سے منٹو نے کہا ''تم نے ایف ایس سی پاس کرلیا ہے۔ اب تین چار سال میں تم ایم بی بی ایس کی تکمیل کرلو گے۔ مجھے دیکھو میں کیا ہوں، کچھ بھی نہیں ہوں۔ ایف اے فیل ہوں بڑی مشکل سے دوسری بار میٹرک پاس کیا ہے۔''

ارشد کہہ رہا تھا ''اس سے کیا ہوتا ہے اگر میرے جیسے دس ہزار بھی روزامتحانات پاس کرلیں تو اس کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔ آپ فنکار ہیں۔ فنکار بی، اے، ایم، اے نہیں ہوتا۔ فنکار فنکار ہوتا ہے۔

منٹو کہہ رہے تھے ''نہیں یار فنکار ونکار کیا ہوں، کچھ بھی نہیں اگر میں ایم اے ہی ہوتا تو کسی کالج میں لیکچرار لگ جاتا۔ پروفیسر ہو جاتا۔''

گفتگو کا سلسلہ چل پڑا اب منٹو صاحب اپنا حسب نسب، دنیا بھر کی تفصیلات بتلانے پر اُتر آئے۔ میرے بھائی بیرسٹر ہیں۔ میرا بھانجا سعد اللہ بی اے، ایم اے پی ایچ ڈی، ایل ایل ڈی ہے۔ سیف الدین کچلو میرے قریبی رشتہ دار ہیں،'' اور دُنیا جہاں کے رشتے ناطے دہرا ڈالے۔

میں نے کہا ''منٹو صاحب جانتے ہیں آج کیا دن ہے؟''

منٹو نے پوچھا ''کیوں کیا بات ہے؟''

میں نے کہا ''آج جمعہ ہے اور آپ کو مجلس اقبال[1] میں مضمون پڑھنا ہے۔''

''ہاں یار'' منٹو نے کہا ''تمہارے آنے سے پہلے میں مضمون لکھ رہا تھا دو تین صفحے لکھے ہیں اب تم آگئے تو کیا خاک لکھوں گا۔[2] بس اتنا ہی سنا دوں گا۔ لیکن یار یہ کیا بکواس ہے اس پر میں کیا خاک مضمون لکھوں۔ یہ بھی کوئی عنوان ہوا کہ ''میں افسانہ کیوں کر لکھتا ہوں۔''

کہنے لگے ''یار کیوں کر کی بکواس میری سمجھ میں نہیں آئی۔ کیوں لکھتا ہوں کا جواب تو ہو سکتا ہے۔ یہی کہ جھک مارنے کو لکھتا ہوں۔ پیسہ کمانے کو لکھتا ہوں۔ مقدر چلانے کو لکھتا ہوں۔ قوم کا اخلاق سدھارنے یا بگاڑنے کو لکھتا ہوں۔ بہر حال کیوں لکھتا ہوں۔ میں کوئی لاجک ہوئی نا؟ لیکن یہ کیوں کر کیا

---

[1]: گورنمنٹ کالج لاہور کے طلباء کی ادبی بزم

[2]: واقعی اس دن اس سے آگے کچھ بھی نہیں لکھا تھا۔ جس قدر لکھ چکے تھے وہی اُٹھا کر مجلس میں چلے آئے تھے۔

بکواس ہے ذرا تم ڈکشنری[1] اٹھا کر دیکھو تو سہی کیوں کر کے کیا معنی ہیں،،

میں نے کہا'' اب ڈکشنری کون دیکھے۔ آپ نے جو دو تین صفحہ لکھا ہے بچّوں کے لئے وہی کافی ہے۔ وہی پڑھ دینا۔''

'' نہیں یار تم ڈکشنری میں کیوں کر کے معنیٰ دیکھوں آخر یہ کیا بات ہوئی'' کیوں کر،، میں اٹھا ان کی اکلوتی ڈکشنری اُٹھائی اور کیونکر کے معنی تلاش کرنے بیٹھ گیا۔

تلاش معاش ہو یا تلاش معنی۔ بڑا مشکل کام ہے اور یہ دونوں کام اپنے بس کے نہیں۔ بہت جلد میں بے بس ہو گیا اور صبر کا دامن میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور میں نے کہا'' جناب آپ ہی تلاش کیجئے۔ مجھے تو یہ کیوں کر نہیں ملتا۔؟''

کہنے لگے'' یار تو عجب بندہ ہے۔ لفظ نہیں ملتا''؟

میں نے کہا'' ڈکشنری میں کسی لفظ کے معنیٰ ڈھونڈنا ہو یا ڈائریکٹری میں کسی ٹیلیفون کا نمبر یہ اپنے سے کب ہوا ہے جواب ہوگا؟''

'' یار عجب بکواس کرتے ہو۔ لاؤ ادھر ڈکشنری،،

میں نے ڈکشنری ان کے حوالے کر دی اور خود دیوان سنگھ مفتون کا خط پڑھنے لگا جو اسی دن منٹو کے نام آیا تھا۔ دیوان سنگھ مفتون نے بے حد پیار سے منٹو کی خیرت دریافت کی تھی۔

منٹو نے ڈکشنری لے کر تلاش معنیٰ شروع کی اور ایک لمحہ بعد لفظ ڈھونڈ لیا۔ کہنے لگے'' یار کیوں

---

[1]: ڈکشنریاں ان کی کائنات تھی۔ ڈرائنگ روم میں دو ڈکشنریاں ایک اردو، ایک انگریزی رکھی تھیں۔ یہی اس مشہور ادیب کا ''کُتب خانہ'' تھا۔ ''اوپر نیچے درمیان'' کے سلسلہ میں ایک دفعہ پولس خانہ تلاشی کے لئے آئی اور ان سے ان کے کتب خانہ کا راستہ پوچھا۔ انہوں نے کھڑکی کی طرف جس میں یہ دونوں ڈکشنریاں تھیں اشارہ کر کے کہہ دیا'' میری یہی لائبریری ہے۔ اور اگر میری پہلے کی لائبریری آپ پوچھ رہے ہیں تو وہ بمبئی میں ہے۔ پتہ بتلا دیتا ہوں وہاں جا کر خانہ تلاشی کر لیجئے۔'' بمبئی میں انہوں نے اپنی کتابیں راجہ مہدی علی خان کے پاس چھوڑ دی تھیں۔ کہتے تھے راجہ مہدی علی خاں کا خط آیا ہے اور اس نے لکھا ہے کہ'' اپنی کتابوں کے ٹرنگ منگوا لو۔ مجھے بمبئی میں اکثر مکان بدلتے رہنا پڑتا ہے اور تمہاری کتابوں کے ٹرنک اٹھانے کے لئے بمبئی میں صحت مند مزدور ڈھونڈنے پڑتے ہیں اور بمبئی میں صحت مند مزدور تو کُجا صحت مند صاحب لوگ بھی شاید ہی ہوتے ہوں،،

کر کے تو مجھے معنیٰ معلوم تھے۔ میں نے جو معنیٰ سمجھ کر مضمون لکھا ہے وہ ٹھیک ہی ہے۔''

تین بجے تک میں اور میرا دوست ارشد منٹو کے ہاں سے اٹھ آئے۔ میں نے کہا'' ہاسٹل جار ہوں گورنمنٹ کالج میں ملاقات ہوگی۔''

گورنمنٹ کالج منٹو آئے۔ حسبِ معمول مخمور، صُوفی تبسّم ان کے استاد، دوست، ہم پیالہ، ہم مشرب اور بہت کچھ ہوتے تھے ان کے ساتھ بیٹھ گئے۔

مضمون پڑھا گیا۔ مضمون میں ذہانت ہی ذہانت تھی۔ ویسے عنوان بھی تو لغو ہی تھا۔ اجلاس کے خاتمہ کے بعد چائے تھی۔

چائے کی میز پر منٹو اور میں ایک ساتھ بیٹھے تھے۔ ایک طرف قدر الطاف[1] بیٹھی تھیں۔ اور باوجود اپنے بے حد مختصر اور نظروں کی گرفت میں نہ آنے والے حلیہ کے بیٹھے بولی جا رہی تھیں۔

منٹو نے آہستہ سے میری طرف جھک کر کان میں کہا'' تیزی ہے لیکن مختصر۔''

میں نے کہا'' اگر تیزی مختصر نہ ہوتی تو کیا پروگرام تھا؟''

منٹو صاحب یہ سن کر چپ ہو گئے۔ وہ چُپ ہی ہو سکتے تھے اس لیے کہ میں مسلسل دیکھتا رہا ہوں کہ لڑکیوں سے وہ بڑی دور بھاگتے تھے۔

منٹو صاحب کے ساتھ مال روڈ کی خُوب سیر ہوتی تھی چونکہ ان کا فلیٹ بھی مال روڈ ہی پر تھا۔ اور ان کی دوڑ'' ملا کی دوڑ مسجد تک'' کی طرح مال سے منٹو کی دوڑ انار کلی تک ہی تھی۔ زیادہ سے زیادہ انہیں گھر سے جانا ہوتا تھا تو دفتر ڈائریکٹر، گوشۂ ادب، مکتبہ جدید، مکتبہ اردو، مکتبہ کارواں، نیا ادارہ، فروغِ اُردو ہی تک، ان سب کے لئے مال پر سے گزر کر ہی انارکلی جاتے تھے اس لئے دن بھر مال کو روندتے رہتے تھے۔ مال روڈ کا ذکر تو تذکرتا آ گیا۔ مجھے سنانا یہ تھا کہ ایک دفعہ مال پر مل گئے اور کہنے لگے آؤ آج تمہیں ڈاکٹر پیرزادہ سے میوہاسپٹل میں ملالائیں۔[2] منٹو صاحب کی بیشتر ڈاکٹر حضرات جن میں ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش، کرنل ضیاء اللہ، ڈاکٹر ریاض علی شاہ، ڈاکٹر رمضان علی شاہ، ڈاکٹر واسطی، ڈاکٹر ریاض قدیر شامل ہیں، سب ہی سے ملاقات تھی اور واقعی عجیب بات ہے کہ منٹو کے ذاتی مراسم بے شمار

---

[1]: پنجاب یونیورسٹی کی ایک طالبہ۔

[2]: منٹو کا یہ بھی احسان ہے کہ بے شمار بڑے اور اہم لوگوں سے ملاقات کرا دی تھی۔

حضرات سے تھے اور ان کا دائرہ احباب اس قدر وسیع تھا کہ مجھے تو حیرت ہوتی تھی۔ بہر حال منٹو صاحب نے پیرزادہ کے ہاں چلنے کو کہا۔ میں ان کی بات کم ہی ٹالتا تھا۔ ساتھ ہولیا۔ میو ہاسپٹل پہنچے۔ معلوم ہوا کہ پیرزادہ صاحب فاطمہ جناح میڈیکل کالج لیکچر دینے گئے ہیں۔ منٹو صاحب نے کہا ''چلو وہاں چلیں۔'' منٹو صاحب کے ہمراہ وہاں پہنچے۔ وہاں لڑکیوں نے منٹو صاحب کو جو دیکھا تو گھیر لیا۔ لڑکیوں کے مجمع میں منٹو صاحب کے ساتھ میں بھی پھنس گیا اور لڑکیوں نے ان سے باتیں کرنا اور سوالات کرنا شروع کر دیا۔ اب منٹو صاحب میری طرف اور میں منٹو صاحب کی طرف دیکھتے۔ اتنے میں منٹو صاحب کو جانے کیا سوجھی کہ انہوں نے کہا ''دیکھئے آپ لوگ میرے دوست اسد سے باتیں کیجئے۔ میں پیرزادہ سے ابھی مل آتا ہوں۔ مجھے ایک ضروری کام ہے۔'' وہ یہ وعدہ کر کے چلے گئے اور میں لڑکیوں کے ہاتھ لگ گیا کیا کیا سوالات کیے گئے اب آپ اسے رہنے دیجئے۔ لڑکیاں اور وہ بھی لاہور کی اور اس پر ستم یہ کہ میڈیکل کالج کی وہ روز میرے لئے روزِ محشر سے کم نہ تھا۔ جو سوالات کیے گئے اس میں سے کوئی بھی سوال سنایا نہیں جا سکتا۔

پھر بھی میں باتیں کرتا رہا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ بڑی دیر ہوگئی تو میں نے سوچا کہ منٹو صاحب چکر دے گئے اور دوسرے دروازہ سے شاید نکل گئے۔ یہ سوچ کر بدلہ لینے کے لئے ایک ایکٹوٹی کی غرض سے میں نے بڑی سنجیدگی سے ان لڑکیوں سے کہا ''آپ لوگ کسی دن منٹو صاحب کے گھر کیوں نہیں چلی آتیں؟ فرصت سے بیٹھ کر منٹو صاحب سے باتیں کیجئے گا۔''

لڑکیاں مان گئیں۔ طے ہوا میں اتوار کے دن پانچ بجے ان کے ہاسٹل[1] پہنچ جاؤں۔ اس وعدے کے ساتھ میں سیدھا لکشمی مینشن پہنچا۔ حسب توقع وہ وہاں پہنچ چکے تھے۔ مجھے دیکھ کر ہنس پڑے۔ کہنے لگے ''میدان مار آئے۔'' میں نے کہا ''آپ مجھے کس جہنم میں چھوڑ آئے تھے؟'' پھر بھی میں نے ساری روداد سنائی۔ لڑکیوں کے کیسے سوالات بھی بتلا دیئے لیکن اس بات سے انہیں لاعلم ہی رکھا کہ اتوار کو ان کے گھر پر لڑکیاں بغیر ان کی اطلاع کے دھاوا بولیں گی۔

اتوار کے دن میں ہاسٹل پہنچا۔ وہاں ایک جم غفیر میرا منتظر تھا۔ سب کو لے کر میں منٹو صاحب کے گھر پہنچا لیکن افسوس اس دن واقعی منٹو صاحب بیمار تھے اور لڑکیاں صرف ان کی مزاج پرسی کر کے لوٹنے

---

[1] واقع ہال روڈ قریب براڈوے ہوٹل لاہور

پر مجبور ہو گئیں۔ بیماری کے عالم میں لڑکیاں ان سے کیا سوالات کر سکتی تھیں؟ کیا ان کے فن اور نظریات پر ان سے بحث کر سکتی تھیں؟

ویسے بھی یہ ایک واقعہ ہے کہ وہ ایک مشہور ادبی شخصیت تھے جس کے نتیجہ کے طور پر ان سے بے شمار لڑکیاں ملنے آیا کرتی تھیں جب کوئی لڑکی آجاتی تو وہ فوراً صفیہ کو آواز دیتے۔ صفیہ آتی تو کچھ دیر وہ بیٹھتے اور پھر کوئی بہانہ بنا کر ایک چور دروازہ سے نکل جاتے جو ان کے ڈرائنگ روم والے کمرے کے بازو کے کمرے میں تھا۔[1]

راستہ سے گزرنا تو واقعی مصیبت تھی۔ موٹر میں جاتے ہوئے لڑکیاں آپس میں ایک دوسرے کو اشارہ کر کے بتلاتیں کہ ''دیکھو منٹو جا رہا ہے۔ سعادت حسن منٹو۔''

ایک دفعہ بڑا دلچسپ لطیفہ رہا۔ ٹانگہ ہی میں میں اور منٹو جا رہے تھے۔ کچھ لڑکیاں ریگل بس اسٹینڈ پر کھڑی تھیں۔ کالج کا وقت ختم ہو گیا تھا اور لڑکیاں بس اسٹینڈ پر آکر بس کے انتظار میں تھیں۔ منٹو کو دیکھتے ہی انہوں نے چہروں پر سے نقابیں اُلٹ دیں اور دوسرے سے کہنے لگیں۔ ''منٹو کو دیکھو۔ منٹو کو دیکھو۔''

منٹو صاحب اس دن خلاف معمول ٹانگہ میں پیچھے بیٹھے تھے۔ میں سامنے تھا اور وہ میری طرف منہ کیے باتیں کر رہے تھے۔ ٹانگہ والے نے ان کی توجہ میری طرف دیکھ کر انہیں پنجابی میں مطلع کیا کہ ''تینوں اور کڑیاں تکدیاں پیاں نے تھے'' (تجھے وہ لڑکیاں دیکھ رہی ہیں) منٹو صاحب مجھ سے کسی سنجیدہ واقعہ کا ذکر کر رہے تھے یہ سن کر بھڑک اٹھے اور ٹانگہ والے سے زور سے کہا ''آکھ چھڈ میں بڈھا ہو گیاں'' (کہہ دے میں اب بوڑھا ہو گیا ہوں)

منٹو یوں ہمیشہ ہی سنجیدگی سے بات کرتے اور سنجیدہ بات کرتے لیکن اس روز ٹانگہ میں جو سنجیدہ واقعہ سنا رہے تھے وہ یہ تھا کہ ایک دفعہ وہ انارکلی سے آرہے تھے جون یا اگست کا مہینہ تھا۔ شدت کی لاہور کی گرمی تھی۔ ویسے بھی منٹو کے لئے گرمی ناقابلِ برداشت ہوتی تھی۔ پیسے وصول کرنے کے لئے وہ کسی ناشر کے پاس گئے تھے جب وہ بائبل سوسائٹی ہاؤس کے پاس پہنچے تو گر پڑے اور بیہوش ہو گئے اور اس دن لوگ انہیں جوتے سونگھا کر پانی کے چھینٹے مار مار کر ہوش میں لائے تھے۔ اس دن کچھ لوگ جن سے

---

[1] یہ دروازہ ان کے اس وقت بھی کام آتا جبکہ گھر والے ان کے پینے سے عاجز آکر انہیں گھر ہی میں روکے رکھتے تو یہ آہستہ سے اسی چور دروازہ سے نکل کھڑے ہوتے۔

منٹو کی واقفیت تک نہ تھی منٹو کو ان کے فلیٹ تک چھوڑ کر آنا چاہتے تھے۔ منٹو سارا واقعہ سنانے کے بعد کہ کس طرح وہ آرہے تھے۔ کس طرح بمشکل یونائیٹڈ پبلشرز تک پہنچ سکے تھے اور پھر کس طرح یکا یک گر پڑے۔ کہنے لگے "یار میرے گرتے ہی مجھے اب پتہ نہیں کہ مجھے کیا ہوا جب میں ہوش میں آیا تو دیکھا کہ میرے گرد ایک مجمع لگا ہے۔ کوئی میرے کپڑے جھاڑ رہا ہے۔ کوئی میرے کاغذات سمیٹ رہا ہے۔ کوئی مجھے پنکھا جھل رہا ہے۔ اور کوئی میرے سر پر برف رکھ رہا ہے یہ سب کچھ دیکھ کر میری تو سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ بہر حال میں نے ان میں سے ایک سے ٹانگہ لانے کو کہا۔ اب جب ٹانگہ آگیا تو میں ٹانگہ میں سوار ہوگیا۔ اب وہاں جتنے لوگ تھے وہ سب چاہتے تھے کہ منٹو کو ہم اس کے گھر تک چھوڑ آئیں۔ ایک مصیبت تھی ہر شخص کہتا تھا کہ منٹو کو میں چھوڑ آؤں گا۔ آخر میں عاجز آگیا اور عاجز آکر میں نے کہا "جو شخص میرا گھر جانتا ہے وہ میرے ساتھ چلے" یار ان میں سے تو ہر شخص میرا گھر جانتا تھا۔ سبھوں نے چلایا کہ "آپ لکشمی مینشن میں رہتے ہیں نا۔ ہم آپ کا گھر جانتے ہیں،" اب تو اور بھی مصیبت ہوگئی۔ اتنے میں سامنے سے میرا ایک دوست آتا نظر آیا۔ میں نے کہا وہ میرے ساتھ جائے گا۔ اور یار میں وہاں سے چلا آیا۔"

کچھ ہی دن بعد ایک اور واقعہ ان سے میں نے اتنی ہی سنجیدگی کے ساتھ سنا۔ یہ واقعہ تو انہوں نے لکھا بھی ہے[1] مجھے پتہ نہیں کہ پہلا واقعہ انہوں نے لکھا ہے کہ نہیں؟

ایک دن مال ہی پر سے آرہے تھے جب ٹانگہ صدر پوسٹ آفس پر پہنچا تو کہتے تھے کہ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ سامنے راستہ بند ہے۔ اور ایک بڑا گڑھا ہے حالانکہ مجھے اندھیرے میں نظر نہیں آتا ہے اور رتوندھے کا مجھے مرض ہے لیکن اس دن نہ جانے کیا غیبی طاقت تھی جس کی آواز میرے دل تک پہنچی کہ "منٹو خبردار" اور میں خبردار ہوگیا اور زور سے چلایا "او ٹانگہ والا ٹانگہ روک" ٹانگہ والے نے حیران پریشان ٹانگہ روک لیا۔ میں نے کہا "تینوں آگے کچھ نظر نیں آندا؟" ٹانگہ والا میری بات سن کر اتر پڑا اور آگے دو قدم چل کر دیکھا کہ ایک گڑھا ہے اگر دو قدم اور ٹانگہ بڑھا ہوتا تو بس معاملہ ختم تھا۔ گڑھا دیکھ کر ٹانگہ والا مجھے دعائیں دینے لگا کہ "تسی ساڈا ہزار روپے واگھوڑا گڈی بچالیا۔ نیں تے ہور ے ساڈا کی حال ہوندا؟"

یہ سنا کر منٹو نے کہا "گھوڑے گاڑی کا جو بھی حشر ہوتا لیکن ہندو پاک کے سب سے بڑے افسانہ

---

[1] جس کا عنوان "دو گڑھے" ہے اور جوان کی کتاب "اوپر نیچے درمیان" میں صفحہ نمبر ۲۵۳ پر درج ہے۔

نگار کا یہ حشر ہوتا کہ اپنی بیوی اور بچیوں کو اس دنیا میں وہ مفلس چھوڑ جاتا۔"

مفلس چھوڑ جانے کا انہیں احساس تھا اور اس احساس سے وہ کبھی کبھی تو بے حد پریشان بھی ہو جاتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ۲۸ر اکتوبر ۱۹۵۱ء کو "جیب کفن" کے عنوان سے اپنے مجموعے کے لئے ایک دیباچہ بھی لکھا تھا۔ اس دیباچہ میں صفحہ نمبر ۲۰۹ کی دوسری سطر میں وہ لکھتے ہیں کہ "میری موجودہ زندگی مصائب سے پُر ہے۔ دن رات مشقت کرنے کے بعد بمشکل اتنا کما تا ہوں جو میری روزمرّہ کی ضروریات کے لئے پورا ہو سکے۔ یہ تکلیف دہ احساس ہر وقت مجھے دیمک کی طرح چاٹتا رہتا ہے کہ اگر آج میں نے آنکھیں میچ لیں تو میری بیوی اور تین کم سن بچیوں کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ میں فحش نویس، دہشت پسند، سنکی، لطیفہ باز اور رجعت پسند سہی لیکن ایک بیوی کا خاوند اور تین لڑکیوں کا باپ ہوں۔ ان میں سے اگر کوئی بیمار ہو جائے اور موزوں و مناسب علاج کے لئے مجھے در در کی بھیک مانگنی پڑے تو مجھے کوفت ہوتی ہے۔"

یقیناً منٹو کو بڑی کوفت ہوتی تھی۔ ایک دفعہ میں منٹو کے ہاں بیٹھا باتیں کر رہا تھا کہ اتنے میں نصیر انور آ گئے۔ نصیر انور سے منٹو کے کافی اچھے مراسم تھے۔ منٹو صاحب انہیں پیار سے "خواجہ" کہا کرتے تھے۔ ان دنوں نصیر انور صاحب پنڈی سے علیل ہو کر علاج کے سلسلے میں لاہور آئے ہوئے تھے اور وہ ہر روز باوجود بیماری کے عالم کے گھر سے یہ کہہ کر ڈاکٹر کے ہاں جا رہا ہوں، حجامت کروانے جا رہا ہوں، منٹو صاحب کے ہاں آ نکلتے تھے اور دن دن بھر اپنا وقت منٹو صاحب کے ہاں گزارتے تھے۔

ایک دن نصیر انور اپنی نجی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے کہنے لگے "یار منٹو! میں بڑا بدنصیب ہوں۔ میں نے بڑے ظلم سہے ہیں۔"

منٹو صاحب نے کہا "یار خواجہ تم کو پتہ نہیں کہ میں کتنا دُکھی رہا ہوں۔ میں نے جو پاپڑ بیلے ہیں اور جو ظلم برداشت کئے ہیں تم ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

نصیر انور خاموش ہو گئے۔

واقعی درمیان کے بمبئی کے دور کو چھوڑ کر زندگی میں منٹو نے جو ظلم برداشت کیے ہیں اس کا تصور بھی تکلیف دہ ہے چنانچہ شاید اسی کے نتیجہ کے طور پر ان کی طبیعت میں چڑچڑا پن، اپنی بات پر اصرار اور غیر متعلقہ اور غیر ضروری چیزوں میں بھی دخل دینے کی عادت پیدا ہو گئی تھی۔

اندر چلے آئے منٹو صاحب اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد کہنے لگے۔

یار دانش صاحب! یہ آپ نے اپنا نام احسان بن دانش کیا رکھا ہے۔'' یہ ''بن'' کیا چیز ہوتی ہے۔ دانش صاحب نے کہا'' یہ نام مجھے اسی طرح پسند ہے اور یہ میرا نام ہے۔''

منٹو صاحب نے پھر کہا'' یہ تو ٹھیک ہے کہ یہ آپ کا نام ہے لیکن آپ کا نام احسان دانش بھی ہو سکتا ہے یہ بن کی بیخ کیا چیز ہوئی؟''

اس پر دانش صاحب نے پھر کچھ کہا لیکن منٹو صاحب بہ ضدر ہے کہ بھلا'' بن'' بھی کوئی بات ہوئی۔

تھوڑی دیر بعد دانش صاحب اُٹھ کر چلے گئے۔ میں نے کہا'' منٹو صاحب یہ آج آپ کو کیا سوجھی تھی۔ بیچارے دانش صاحب کا کیوں پیچھا لیا؟''

کہنے لگے'' یار بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی احسان بن دانش۔ بکواس ہے۔ احسان دانش کافی ہے۔ یہ بن کیا مصیبت ہے۔'' اس روز تمام دن یہی وظیفہ پڑھتے رہے بار بار کہتے رہے کہ'' بھلا اس بن میں کوئی تک ہے کوئی معنی ہے؟''

ایک دفعہ اور احسان دانش صاحب سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ میں بھی ساتھ تھا۔ گرمی کے دن تھے۔ منٹو صاحب اپنا پسندیدہ لباس[2] کھدر کا کرتا، کھدر کا پائجامہ پہنے بگلا بھگت بنے ہوئے تھے۔ احسان دانش

---

[1]: ان کا یہ معمول تھا کہ اپنی جیب میں جس قدر رقم ہوئی جو دوست ساتھ ہوتا اس کے حوالے کر دیتے تھے اور وہ پیسے دینے دلانے سے نمٹتا تھا۔

[2]: ان کا پسندیدہ لباس سفید کھدر کا کرتا پاجامہ تھا۔ سردیوں میں بہ مجبوری شیروانی پہن لیتے تھے۔ پسندیدہ لباس کی طرح پسندیدہ کھانوں میں بھی عجب پسند تھی۔ پکوڑے۔ مولی، کباب، بیسن کی روٹی ان کا من بھاتا کھاجا تھی۔

صاحب سامنے سے چلے آئے۔ ادارۂ فروغ اُردو اور مکتبہ دانش کے درمیان ملاقات ہوگئی۔ دانش صاحب گیروے رنگ کا پائجامہ کرتا پہنے ہوئے تھے۔

''یار دانش صاحب یہ آپ نے کیا پہن رکھا ہے۔'' منٹو نے پوچھا۔

''قمیض پائجامہ'' دانش صاحب کا جواب تھا۔

''وہ تو ہے ہی لیکن یہ رنگ کیا بکواس ہے۔'' منٹو نے کہا۔

''یہ رنگ میلا دیر سے ہوتا ہے۔ میں غریب آدمی ہوں۔'' دانش صاحب نے جواب دیا۔

''غریب آدمی تو میں بھی ہوں لیکن میں یہ نہیں پہنتا۔'' منٹو نے کہا۔

''ایک آپ وہ غریب ہیں جو یہ نہیں پہنتے۔ ایک میں غریب ہوں جسے یہ پہننا پڑتا ہے۔'' دانش صاحب نے کہا۔

منٹو صاحب کہنے لگے'' چھڈ یار[1] کیا بکواس کرتا ہے غریب امیر کی کیا بات ہے۔ یہ تو بکواس ہوئی۔ غریب آدمی ہے تو اپنے ہاتھ سے دھوکر پہنا کرے لیکن سفید پہنے۔''

دانش صاحب یہ سن کر آگے بڑھ گئے۔

میں نے کہا'' منٹو صاحب دوسروں کی ذاتی چیزوں میں دخل دینے کا ہمیں کیا حق؟''

''دنیا میں کوئی چیز ذاتی اور بدذاتی[2] نہیں ہوتی۔''

یہ منٹو صاحب کا جواب تھا۔

اور جب خود کی ذات پر کوئی حملہ کرتا تو پھر ان کی کیا کیفیت ہوتی تھی وہ بھی میں نے دیکھا ہے۔

حلقۂ ارباب ذوق کے ممبر بن گئے تھے۔ کہتے تھے'' یار اگر میری وجہ سے کسی کے اعزاز میں اضافہ ہوتا ہے تو پھر مجھے کیوں اعتراض ہو؟ ظاہر ہے کہ حلقہ کا ممبر بننا میرے لئے تو باعث افتخار نہیں اگر میں حلقہ کا ممبر بن جاتا ہوں اور میرے ممبر بننے سے حلقہ کا رتبہ بڑھ جاتا ہے تو پھر مجھے اعتراض نہیں ہونا

1: ''بکواس ہے''''چھڈ یار'' اور'' سب ٹھیک ہے'' ان کے تکیہ کلام تھے۔ اس کے بغیر ان کا کوئی جملہ نہ شروع ہوتا نہ مکمل ہوتا تھا۔ ان کی ایک دلچسپ عادت یہ تھی کہ آدھی رات پلنگ پر سوتے تھے ایک اور آدھی رات فرش پر کہتے تھے کہ سادہ فرش پر سونے سے مجھے بڑا سکون ملتا ہے۔

2: انہوں نے بدذاتی ہی کہا تھا۔ نہ جانے کس مفہوم میں؟

چاہیے نا۔ بن آئی لئے مجھ سے قیوم نظر، یوسف ظفر وغیرہ نے جب کہا تو میں نے کہا۔

''فارم لاؤ میں دستخط کیے دیتا ہوں چنانچہ میں ممبر بن گیا ہوں۔''

حلقہ میں جس دن افسانہ پڑھنا ہوتا لاکھ مجبوریوں کے باوجود پہنچ جاتے تھے۔[1]

ایک دن انہیں حلقہ میں افسانہ پڑھنا تھا اور کوئی تازہ افسانہ لکھا نہیں تھا۔ اتوار کا دن تھا اور اتوار کے دن میرا یہ معمول تھا کہ پانچ بجے میں نہا دھو کر تیار رہتا تھا اور ادب لطیف کے ایڈیٹر مرزا ادیب صاحب میرے ہاسٹل پر آ جاتے تھے چونکہ میں مرزا ادیب صاحب کا بڑا احترام کرتا ہوں اس لئے ان کی جو بھی تجویز ہوتی اس دن اس پر عمل کیا جاتا۔ کبھی ہمارا حلقۂ ارباب ذوق میں اور کبھی حلقۂ ارباب علم میں شرکت کرنے کا پروگرام بنتا۔ کبھی لانس گارڈن کی سیر اور پھر واپسی پر عشرت رحمانی صاحب کے گھر جانے کا طے پاتا۔ اس دن لارنس چلنے کا پروگرام بن گیا۔ میں اور مرزا ادیب صاحب مال روڈ پر سے پیدل جا رہے تھے کہ سامنے سے موٹر میں منٹو صاحب آتے دکھائی دیئے۔ منٹو صاحب نے ہمیں پکارا جب ہم قریب پہنچے تو انہوں نے مرزا صاحب سے کہا'' بھئی مرزا مجھے حلقہ میں افسانہ پڑھنا ہے۔ تمہارے ہاں میرے غیر مطبوعہ افسانے ہیں نا۔ اس میں سے کوئی افسانہ دے دو۔ پڑھ کر تمہیں لوٹا دوں گا۔''

مرزا صاحب نے کہا'' میں وہ افسانے ساتھ تو نہیں لیے پھرتا ہوں۔ وہ افسانے تو گھر پر ہیں۔''

کہنے لگے'' آؤ موٹر میں بیٹھ جاؤ گھر چل کر لے لیتے ہیں۔''

---

[1] ویسے چکر بھی خوب دیتے تھے اور ان کی اس بات کی وجہ سے میں ذرا بھی کرتا تھا۔ منٹو وعدہ تو کر لیتے اور جب وقت آتا تو کہہ دیتے تھے'' چھڈ یار کون جائے''۔ مجلس اقبال والے جب بھی ان سے کوئی چیز پڑھاتے گھنٹوں پہلے سے موٹر لیے ان کے فلیٹ پر پہنچ جاتے۔ بزم ادب ایف سی کالج کے سیکریٹری اظہار صاحب کی خواہش پر میں نے ان کے ہاں وقار عظیم، عبادت بریلوی، ظہیر کاشمیری، اے حمید، ہاجرہ مسرور، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی سے اپنی چیزیں پڑھنے کی خواہش کی اور ان لوگوں نے بزم میں اپنی نگارشات پیش بھی کیں جب اظہار صاحب نے مجھ سے منٹو صاحب کو بزم ادب میں لانے کے لئے کہا تو میں نے انہیں جواب دیا تھا ''یہ اپنے بس کی بات نہیں۔'' واقعہ یہ تھا کہ منٹو وعدہ تو کر لیتے لیکن آخر وقت میں کہہ دیتے تھے'' چھڈ یار اب کون جائے۔'' لیکن عجب اتفاق ہے اسی بزم میں انہوں نے اپنا آخری افسانہ '' کبوتر اور کبوتری'' پڑھا تھا۔

چنانچہ میں، منٹو صاحب، مرزا ادیب صاحب موٹر ہی میں مرزا صاحب کے گھر واقع موہنی روڈ پہنچے۔ وہاں سے افسانہ لیا۔ واپس ماہنامہ ''ڈائریکٹر'' آئے۔ وہاں پر صفیہ صاحبہ اور انور سجاد منتظر بیٹھے تھے۔ ان کو لیا اور اب ہم سب حلقہ میں پہنچے۔ اس وقت تک ہمارا بھی لارنس کے پروگرام کا ارادہ بدل کر حلقہ ہی کے حق میں ہو گیا تھا۔

اس دن حلقہ میں انہوں نے اپنا یہ افسانہ ''دولے شاہ کا چوہا'' سنایا۔ افسانہ ختم کیا تو مجھے یاد نہیں صدر جلسہ شیر محمد اختر تھے یا انجم رومانی۔ بہرحال انہوں نے حاضرین سے کہا کہ ''آپ لوگوں نے افسانہ سن لیا ہے۔ کچھ افسانہ کے متعلق کہنا ہو تو کہیے۔

ہال میں سکون تھا۔ ایک طرف دور سے ابوالخطیب[1] نامی کسی صاحب کی آواز سنائی دی'' جناب صدر یہ افسانہ ہی نہیں ہے۔''

لوگ چپ تھے۔

افسانہ نہ ہونے کے ثبوت میں ابوالخطیب نے ایک بے ربط سی تقریر جھاڑی۔ تقریر طویل تھی۔ کیا کہا جا رہا ہے۔ کہنے والے کو خود پتہ نہ تھا۔ واقعی کوئی بات کسی کے پلے نہیں پڑ رہی تھی۔

قیوم نظر بھی تشریف فرما تھے۔ قیوم نظر نے اس قسم کے بولنے والے بیسیوں حضرات کو دیکھا ہے اور ان کی نفسیات قیوم نظر خوب سمجھتے ہیں چنانچہ قیوم نظر نے اس موقع پر بڑی دلچسپ بات کہی۔

''جناب صدر! ان صاحب نے جو کچھ کہا ہے ہم بھی شاید اسے تسلیم کر لیں اگر یہ صاف اور مختصر سے الفاظ میں ہمیں پھر ایک بار یہ بتلا دیں کہ انہوں نے کیا کہا ہے۔ یہ اور بھی مناسب ہے کہ اگر ۱، ۲، ۳ گنا دیں کہ انہیں افسانہ پر یہ یہ اعتراض ہیں۔

خطیب صاحب نے مکرر تقریر کی لیکن اپنی اس ''کوشش'' میں اُنہوں نے وہ باتیں کیں جو پہلے نہیں کی تھیں۔

منٹو صاحب کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔

کہنے لگے ''میں آج سے افسانہ لکھنا چھوڑ دوں اگر یہ صاحب یہ ثابت کر دیں کہ میرا یہ افسانہ افسانہ نہیں ہے۔'' ہال میں سکون تھا۔

---

[1]: جماعت اسلامی کے ایک گمنام کارکن جن کا بیان ہے کہ وہ لکھتے لکھاتے ہیں۔

سب چُپ تھے یہاں تک کہ معترض بھی۔

منٹو صاحب اب اور آگے بڑھے۔

''اعتراض کرنے والے کو پتہ ہی کیا کہ افسانہ کیا ہوتا ہے۔ میرا پیشہ افسانہ نویسی ہے۔ وہ کہتے ہیں یہ افسانہ ہی نہیں ہے۔ بھلا یہ کیا جانیں کہ افسانہ کیا ہوتا ہے۔ شارٹ سٹوری کسے کہتے ہیں؟'' جناب معترض سمیت سب خاموش ہو گئے۔ صدر نے بات کا رُخ پھیر دیا۔

اس بات سے قطع نظر کہ وہ افسانہ تھا یا نہیں یہ واقعہ ہے کہ منٹو صاحب اعتراض برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ یہ بات خاص طور پر آخری دنوں میں بڑھتی ہی چلی گئی۔ شاید اس لئے کہ خود اعتمادی ختم ہو گئی تھی۔ عجب حالت کا شکار تھے اس خود اعتمادی کے نقصان کی وجہ سے اور باتوں کے علاوہ چڑچڑا پن بھی پیدا ہو گیا تھا۔

حالانکہ میں جانتا ہوں کہ منٹو بہت زیادہ فراخ دل تھا جیسے کہ آگے کہیں میں نے لکھا ہے۔ منٹو نے سب سے زیادہ گالیاں سُنی ہیں اور اس نے تو گالیاں دینے والوں کے نام اپنی کتابیں تک انتساب کی ہیں اور میں نے تو ایک دفعہ ان سے یہاں تک سُنا تھا کہ 'گالیاں دی جائیں تو میں سمجھتا ہوں کہ صحیح راہ پر ہوں اس لئے کہ ہمیشہ سچ بولنے ہی پر گالی دی جاتی ہے اور سچ بولنا صحیح راہ پر ہوتا ہے۔''

یہ بات انہوں نے میری ایک بات کے تعلق سے کہی تھی۔

قصہ یہ تھا کہ ایک دفعہ مکتبہ کارواں کو کہانی دے کر تانگہ میں آ رہے تھے اور انگلش واٹن ہاؤس منزل تھی۔ جب لائیڈز بنک کے قریب پہنچے تو اور کوئی موضوع رہا نہیں تھا اس لئے گفتگو جاری رکھنے کے لئے میں نے کہا ''منٹو صاحب آج کل ہندوستان میں سردار جعفری گالیوں کی شدید زد میں ہیں۔''

''کیوں کیا بات ہے،'' منٹو نے پوچھا۔

میں نے کہا ''سردار نے ''شاہراہ'' میں فراق پر ایک مضمون لکھا تھا۔ بس اس سے ہندوستان میں قیامت آ گئی ہے اور سردار پر بے حد زیادتی ہو رہی ہے حالانکہ سردار کا مضمون بڑا ہی جاندار ہے۔ میں تو سردار کی تائید میں سو صفحے کا مضمون لکھوں گا۔ بھلا سردار کو گالیاں دینا بھی کوئی معنی رکھتا ہے۔ سردار جعفری تو وہ دانشور ہے جس کے متعلق ہمیشہ کہا جا سکتا ہے۔

Ali Sardar Jafri is the only person who is always right.

یہ سن کر ہنس پڑے اور کہنے لگے۔ ''اگر گالیاں دی جا رہی ہیں تو پھر یقیناً وہ مضمون بڑا اچھا ہوگا۔۔

جب میں نے ''کالی شلوار'' اور ''دھواں'' وغیرہ لکھے۔ مجھ کو بھی بے شمار صلوٰاتیں سنائی گئیں۔ وہ سب مجھے سُننی پڑیں۔ میں جانتا تھا کہ میں راستی پر ہوں اور اس وقت سے مجھے یقین ہوگیا ہے کہ جو شخص جتنی صحیح اور سچی بات کرے گا اتنا ہی وہ گالیاں سنے گا اور بدنام ہوگا۔''

یہ منٹو صاحب کی طبیعت کا تضاد تھا۔ حلقہ والے دن کے اور اس دن کے رویتے میں زمین و آسمان کا فرق تھا...... منٹو نے خود بھی اپنے لیے سنکی کا لفظ استعمال کیا ہے۔

میں نے ایک دن ان سے پوچھا ''اب پاکستان آنے کے بعد آپ کو کب سے گالیاں ملنی شروع ہوئیں۔'' کہنے لگے ''یار میرے یہاں حسن عسکری آیا کرتا تھا ان دنوں وہ لاہور ہی میں تھا وہ میرے یہاں آتا اور خاموش بیٹھا بیٹھا مجھے بور کرتا۔ میں نے ایک دن گفتگو شروع کرنے کے لئے اس سے کہہ دیا میری کتاب ''سیاہ حاشیے'' شائع ہو رہی ہے تم اس پر دیباچہ لکھ ڈالو۔ مجھے اس دیباچہ بازی سے اور ہر دیباچہ کی قسم کی چیز سے نفرت[1] ہے۔ لیکن پتہ نہیں میں نے کس موڈ میں کہہ دیا چنانچہ حسن عسکری نے دیباچہ لکھا۔ اب تک مجھے علماء اور حکومت گالیاں دیتی تھی۔ اس دیباچہ کے بعد ادیب حضرات بھی مجھے گالیاں دینے لگے حالانکہ یہ سارے ادیب میرے دوست تھے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ یہ دیباچہ لکھا کر میں نے غلطی کی کیونکہ وہ دیباچہ ہے بھی بے معنی۔''

میں نے پوچھا ''حسن عسکری سے ویسے آپ کا ذہنی رشتہ ہے یا ذاتی؟''

کہنے لگے'' بکواس کرتے ہو یہ ذہنی رشتہ کیا ہوتا ہے۔ میرا کسی سے کوئی ذہنی رشتہ نہیں ہے جسے دیکھیے نقاد بنتا ہے اور نئے نئے رشتے ڈھونڈتا ہے۔ کوئی رشتے ڈھونڈتا ہے اور کوئی اثرات۔ کوئی یہ دریافت کرتا ہے کہ منٹو پر گورکی کا اثر ہے۔ موپساں کا اثر ہے۔ ہارڈی کا اثر ہے۔ یہ سب بکواس

---

[1] چنانچہ انہوں نے اپنی کتاب ''افسانے اور ڈرامے'' میں لکھا ہے۔

''پیش نظر۔

مگر اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔''

سعادت حسن منٹو

بمبئی ۲۸ نومبر ۴۳ء

ہے" کہنے لگے" یہ تم ذہنی رشتہ، ذاتی رشتہ کیا لے بیٹھے۔ میرا عسکری سے نہ ذہنی رشتہ ہے نہ ذاتی۔ میرے ہاں آتا تھا۔ میں اوروں کی طرح جیسے اور آتے ہیں یہ بھی آتا ہے سمجھ کر مل لیتا تھا۔ بس بات ختم۔ اور کسی کا مجھ پر اثر والی بات جو ہے تو یہ سمجھ لو مجھ پر کسی کا اثر نہیں۔ ہاں اوروں پر میرا اثر ہو سکتا ہے۔"

ان پر جہاں تک کسی کے اثر ہونے کا تعلق ہے میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ منٹو پر ہاں یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ دُنیا جہاں کے لوگوں کا اثر ہوا دیبوں کا اثر تو ہرگز ہرگز نہیں ہوتا تھا۔ یہ بات قطعیت کے ساتھ میں ان کے آخری دور کے بارے میں تو ضرور کہہ سکتا ہوں وہ پڑھتے نہیں تھے "زمیندار" اور "نوائے وقت" کے علاوہ "ڈائریکٹر" اور "شمع" کے سوا ان کا آگے کا مطالعہ نہیں تھا۔ ادیبوں کے ساتھ مل بیٹھنا، کافی ہاؤس میں گپیں مارنا انہوں نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ میں نے تو ہمیشہ دیکھا ہے کہ جب بھی میں ان کے گھر گیا ہوں ان کے ہاں دنیا بھر کے لوگ تو ضرور دکھائی دیئے ہیں۔ ادیب شاعر شاذ و نادر ہی نظر آئے۔ ادیبوں سے ملنے ملانے کا منٹو کو شوق ہی نہیں تھا۔

البتہ عام لوگوں سے بڑی دلچسپی تھی اگر کبھی کوئی امرتسری یا کشمیری آدمی ان کی طرف آنکلتا تو اس سے بڑے بے تکلف ہو جاتے۔ بار بار اس کو بتلاتے تھے (گویا یقین دلاتے تھے) کہ "میں بھی کشمیری ہوں۔ ویسے امرتسری ہوں۔" اکثر میں نے دیکھا ہے اس قسم کے لوگوں سے رات دیر گئے تک وہ بیٹھے بڑے اطمینان سے باتیں کرتے تھے۔ عالم یہ ہوتا تھا کہ بار بار ناک صاف کر رہے ہیں۔ سگریٹ پر سگریٹ جلا رہے ہیں۔۔ اُٹھ اُٹھ کر اندر جا کر ایک پیگ چڑھا آ رہے ہیں اور امرتسر اور کشمیر کی باتیں کر رہے ہیں۔

ایک دن میں نے کہا" منٹو صاحب اب بھی آپ کشمیر کو یاد کرتے ہیں، امرتسر کی یادوں میں کھو جاتے ہیں۔"

منٹو صاحب نے فوراً کہا" تم حیدرآباد کے ہو نا تمہیں حیدرآباد یاد نہیں آتا؟"

میں نے کہا" خیر حیدرآباد تو مجھے یاد نہیں آتا البتہ حیدرآباد کے لوگ بے پناہ یاد آتے ہیں، مثلاً قاضی عبدالغفار[1] ہی کو لے لیجئے۔ وہ کتنی پیاری، کتنی مہربان اور کتنی ہنس مکھ شخصیت تھے۔ میں بہت ہی چھوٹا تھا اور ان کے اخبار" پیام"[2] کے دفتر جایا کرتا تھا۔ وہ مجھ سے کس قدر پیار کرتے تھے۔ مجھے

۱: قاضی عبدالغفار مصنف لیلیٰ کے خطوط
۲: جن دنوں قاضی صاحب حیدرآباد میں ہوتے تھے۔ اب وہ دہلی میں مقیم ہیں اور انجمن ترقی اُردو ہند کے سیکریٹری ہیں

ڈاکٹر حسن ظہیر[1] اور عالم خوندمیری[2] یاد آتے ہیں۔ عالم صاحب سے میں فلسفہ پڑھا کرتا تھا۔ ان کی ذاتی لائبریری سے ضد کر کر کے کتابیں لایا کرتا تھا۔ ان سے میرے کتنے اچھے ذاتی مراسم تھے۔ ڈاکٹر حسن ظہیر سے ملنے میں بنجارہ ہل[3] جایا کرتا تھا۔ اپنی اس سیکل پر جس کی گھنٹی کے علاوہ اس کی ہر چیز بجتی تھی۔ وہاں پر ان کا لڑکا وزیر نظر آتا تھا۔ اب وہ بڑا ہو گیا ہوگا۔ اختر حسن[4] اور ان کی بہنیں رضیہ بیگم، رابعیہ بیگم[5] اور ان کی بیوی ریاست اور ریاست کی بہنیں شوکت[6] اور حکومت۔[7] یہ لوگ کیسے پڑھے لکھے کتنے ذہین تھے۔ اختر حسن کا خاندان کس قدر علم دوست خاندان تھا اور میں کتنی چھوٹی عمر میں ان لوگوں سے اپنے رسالے ''اپنا دیس'' کے سلسلہ میں جس کا میں ایڈیٹر تھا ملا کرتا تھا۔ اور افسانہ نگار جیلانی بانو جن کا نام حیدرآباد میں رہتے ہم نے سُنا بھی نہیں تھا اور پھر ہم اِدھر آئے۔ اِدھر اس عرصہ میں اس چھوٹی سی لڑکی نے کس قدر نام پیدا کر لیا۔ اس زمانہ میں افسانہ نگار زینت ساجدہ کے سوا ہمارے سامنے کوئی کسی کا نام بھی نہیں لیتا تھا۔ نرسنگ راؤ اب اسٹوڈنٹ لیڈر ہو گیا ہے۔ نرسنگ راؤ کس قدر معصوم اور کس قدر سادہ تھا۔ سُنا ہے اس نے ایم اے کر لیا ہے اور لاء کا طالب علم ہے اور ان دنوں دنیا بھر کا حیدرآباد کے اسٹوڈنٹ لیڈر کی حیثیت سے دورہ کر آیا ہے اور پتہ نہیں میرا ہائی اسکول کا ساتھی بھاسکر راج سکسینہ کدھر ہے؟ غوث محی الدین جس کے ساتھ زندگی کا کس قدر طویل عرصہ گزرا ہے اور پھر — اپنے بابا مخدوم جن کے نام پر کتنے مرنے کے لئے تیار ہو جاتے تھے اور پھر مجرد گاہ کا میرے بھائی قدرت کا وہ کمرہ جس میں[8] حسینی شاہد، وہاب حیدر، سری نواس لاہوتی، احمد مکی، حامد علی قادری، سردار

---

[1]: ڈاکٹر حسن ظہیر پرنسپل سٹی کالج حیدرآباد دکن ہوتے تھے اب وہ عثمانیہ یونیورسٹی میں ڈائریکٹر سائنٹفک ریسرچ ہیں

[2]: عالم خوندیری میری نظام کالج حیدرآباد میں فلسفہ کے پروفیسر ہیں۔

[3]: بنجارہ ہل حیدرآباد کے رئیسوں کی رہائش گاہ)

[4]: اختر حسن جو ''عوام'' کے ایڈیٹر ہیں اور انڈیا پارلیمنٹ میں حیدرآباد ریاست کی طرف سے ایم ایل اے ہیں

[5]: رضیہ اور رابعیہ بیگم انگریزی اور فارسی کی گرلس کالج حیدرآباد میں پروفیسر ہیں۔

[6]: شوکت مشہور شاعر کیفی اعظمی کی بیوی

[7]: حکومت خانم مشہور شاعر وشوامتر عادل کی بیوی

[8]: حیدرآباد کے ادیب جعفرات

سلیم، چندر سین جائیسوال، لطیف ساجد اور سلیمان اریب کا جھمگٹا رہتا تھا اور ہمیشہ علم وادب کی بحثیں ہوا کرتی تھیں۔اب وہ سب خواب کی باتیں ہوگئی ہیں۔اب تو ایک دوسری دنیا ہے اور اب اس دنیا میں اپنی راہ آپ بنانی ہے۔اب یہاں کوئی غلط راہ چلنے پر روکتا نہیں۔غلط کام کرنے پر ٹوکتا نہیں۔اور اگر میں وہاں جھوٹ بولتا تو پدم جا[1] مجھے ٹوکتیں اور اگر میں کوئی غلط بات کرتا تو مجھے لیلیٰ منی[2] خبردار کرتیں اور وہاں پر بابا ڈاکٹر جے سوریا نائڈو[3] ہوتے۔

نائڈو مجھ سے کتنا پیار کرتے تھے۔مجھے پڑھنے لکھنے اور جلد سے جلد عالم بن جانے کے کتنے اچھے مشورے دیتے تھے۔اب یہاں اس قسم کے مشورے کون دیتا ہے۔اب یہاں ہماری فکر کون کرتا ہے۔ ہماری کیفیت تو وہی ہے جو میرے ایک حیدرآبادی دوست نظر حیدرآبادی نے بتلائی ہے۔

وطن سے دور ہوئے اور تھکن سے چور ہوئے
مگر یہ حکم ہے عزم سفر کی بات کرو

جانے یہ سفر کب ختم ہوگا؟ جانے کس دن کوئی دل کی دھڑکن سننے والا اور آنکھوں کی بیقراری محسوس کرنے والا دور دیس سے نکل کر قریب آئے گا اور کہے گا ''میرے اداس دوست پردیس میں اُداس رہنا چھوڑ دو اب آؤ ہم تم جنم بھر کے لئے اکٹھے رہیں گے۔اس تاروں بھرے نیلے گگن اور اس سندر دھرتی پر ہمیشہ ہم ایک دوسرے کے ہوکر زندگی گزاریں گے۔''

منٹو نے یہ ساری گفتگو بڑے غمگین انداز میں سنی۔اس دن میں واقعی بڑا اُداس تھا اور اپنی اس تنہا دیس دیس بھٹکنے والی زندگی سے نالاں تھا۔منٹو نے بے حد پیار، بے حد خلوص کے ساتھ انگریزی میں کہا تھا۔

اور جب میں اٹھ کر جانے لگا منٹو کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی: ''یادیں جہاں سے بھی وابستہ ہوں مرتے دم تک پیچھا نہیں چھوڑتیں۔''

اس دن کے بعد سے میں نے محسوس کیا کہ اب منٹو امرتسر اور کشمیر کا ذکر میری موجودگی میں کم کرتے تھے۔شاید وہ سوچتے تھے کہ اس ذکر سے مبادا مجھے صدمہ پہنچے۔اس واقعہ کے بعد میں نے دیکھا کہ منٹو کی مجھ پر مہربانیاں بھی بہت زیادہ بڑھ گئیں ہیں۔اب ان مہربانیوں میں ایک سرپرستانہ انداز

1: پدمجا، سروجنی نائڈو کی لڑکی۔ 2: لیلیٰ منی، سروجنی نائڈو کی لڑکی۔

3: ڈاکٹر جے سوریا نائڈو، سروجنی نائڈو کے لڑکے۔

شامل ہوتا جا رہا تھا۔ اب منٹو میری باتوں سے بھی اختلاف کم کرتے تھے۔ کوئی ایسا ذکر یا ایسا موضوع نہیں چھیڑتے تھے جس میں کوئی ذاتی یا نظریاتی اختلاف ہو۔[1]

ان کی بڑھتی ہوئی مہربانیوں نے ایک حد تک بے باک کر دیا تھا۔ بعض دفعہ تو ان کو میری وجہ سے پریشانی بھی اُٹھانی پڑی ہے۔

میں لکشمی مینشن ہی میں مظہر محمود شاہ صاحب کے فلیٹ میں رہتا تھا۔ شاہ صاحب سے میرے تعلقات نہیں تھے اور منٹو صاحب نے شاہ صاحب سے مجھے متعارف کروایا تھا، جب مجھے یوینگ ہال سے دیس نکالا مل گیا تو میں نے پہلے تو بڑی کوشش کی کہ ہاسٹل ہی میں میرا بندوبست ہو جائے۔ نہ ہونے کی صورت میں میں منٹو صاحب کے پاس پہنچا اور منٹو صاحب نے ہی میرے لیے شاہ صاحب کے ہاں انتظام کیا چونکہ میرا یہ کمرہ اور منٹو صاحب کا فلیٹ ساتھ ساتھ تھے اس لئے میں زیادہ تر ان ہی کے ہاں ہوتا تھا۔ جس دن میرا لکھنے پڑھنے کا پروگرام ہوتا اس دن بے حد پریشانی ہوتی منٹو صاحب دن میں کوئی کم از کم سو بار آتے اور پوچھ جاتے ''ابھی پڑھنا لکھنا ختم نہیں ہوا،'' اسی دوران میں میں نے ایک ناول لکھنا شروع کیا تھا اور کوئی دو سو صفحے لکھ چکا تھا۔[2] شام میں مجھے بڑی پریشانی اٹھانی پڑتی کیونکہ منٹو کو اندھیرے میں قطعی نظر نہیں آتا تھا اس لئے بھی میں باوجود اپنے پڑھنے لکھنے کی مصروفیات کے ان ہی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا رہتا۔ جس دن کا میں آپ کو یہ واقعہ سنا رہا ہوں اس دن ایف سی کالج لاہور میں بزمِ ادب کا اجلاس تھا۔ بزم کے سکریٹری اظہار الدین احمد صاحب سے ان کے بھائیوں کی وجہ سے میرے بڑے گہرے اور پرخلوص تعلقات تھے۔[3] اس لئے اظہار صاحب کی خواہش پر ان کی بزم کے اجلاس

۱: ویسے بھی وہ سب کے جذبات کا احترام کرتے تھے۔ مجھے احمد راہی (سابق ایڈیٹر سویرا) نے بتلایا تھا کہ منٹو سے راہی۔ نے ایک دفعہ کہا کہ ''منٹو صاحب ہمارے سامنے تو ترقی پسندوں کو گالیاں نہ دو،'' تو راہی صاحب کا بیان ہے پھر کبھی راہی کی موجودگی میں منٹو نے ترقی پسندوں کو بُرا بھلا نہ کہا۔

۲: یہ ناول میں نے مکمل بھی کر لیا تھا۔ منٹو نے اس پر بڑا ہی خوبصورت دیباچہ لکھا تھا۔ ایک دن میں یہ ناول لیے ایک پبلشر سے بات کرنے جا رہا تھا۔ جاتے ہوئے کافی ہاؤس میں کافی پینے گیا تو کسی نے سائیکل کے کیریئر سے مسودہ اُڑا لیا تھا۔ مجھے اپنے چار سو صفحے کے ناول گم ہو جانے سے زیادہ منٹو کے دیباچہ کے کھو جانے کا افسوس ہے۔

۳: تعلقات کے بارے میں احمد ندیم قاسمی نے ایک جگہ کتنی اچھی بات کہی ہے کہ وہ مثل نقدی کے ہوتے ہیں۔

سی کالج چلیں گے۔ میں نے برسوں سے سورج نہیں دیکھا ہے اور اب تو صبح سورج نکلنے کے منظر تک کو بھول بھال گیا ہوں لیکن اس دن مجھے سویرے اٹھنا تھا۔

کوئی رات کے ساڑھے تین بجے ہوں گے میری آنکھ کھل گئی اور میں نے سوچا اس وقت کم از کم چھ کا عمل ہوگا۔ اظہار صاحب سات بجے آنے والے تھے۔ میں نے سوچا چلو تیار ہوتے ہیں۔ میرے کمرے میں نل میں پانی نہیں آ رہا تھا۔ میں منٹو صاحب کے فلیٹ پر پہنچا۔ اندھیرا کافی تھا۔ اندھیرے کے باوجود میں اپنی دانست میں چھ ہی کا وقت فرض کیے رہا (گھڑی کا کھو جانا میرے لئے کس قدر تکلیف دہ رہا اُس کا اُس دن مجھے احساس ہوا)

منٹو صاحب کے فلیٹ پر پہنچ کر بڑی دیر تک دوازہ پر گھنٹی بجاتے کھڑا رہنا پڑا۔ کافی دیر بعد منٹو صاحب نے خود دروازہ کھولا کہنے لگے "یار کیا بات ہے؟"

میں نے کہا "کیا بات ہے کیا؟ چھ بج چکے اور ابھی آپ سو رہے ہیں۔ روز کہتے ہیں کہ میں سویرے بڑا جلد اٹھتا ہوں۔"

"لیکن یار ابھی تو میرے خیال میں چھ نہیں بجے۔"

"آپ کا خیال غلط ہے گھڑی دیکھئے گا۔"

گھڑی دیکھی تو صرف پونے چار بجے تھے۔

ہماری باتوں کے شور سے منٹو کی بچیاں بھی جاگ اٹھیں۔

میں نے کہا "منٹو صاحب آپ کی گھڑی غلط ہے۔"

"نہیں یار ریڈیو سے ملایا ہے۔"

"لیکن بہرحال اب چھ بج چکے ہیں۔"

منٹو صاحب نے کہا "تو پھر تو یار آج میں بڑی دیر تک سوتا رہا۔ اچھا کیا تم نے مجھے جگا دیا۔"

"میں ہمیشہ اچھا کام کرتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

منٹو صاحب اندر چل کر پلنگ پر لیٹ گئے اور میں ان کے پیروں کے پاس کمبل لپیٹا لحاف میں گھسا

بیٹھا گپ مارتا رہا۔

لکشمی مینشن کے گھنٹہ کی آواز سنائی دینے لگی۔

منٹو صاحب کہنے لگے "ایک، دو، تین، چار۔"

"یار ابھی صرف چار بجے ہیں۔" منٹو نے کہا۔

"نہیں گھنٹہ نے چھ بجائے ہیں۔" میں نے گپ ماری۔

"یار تو مجھے گنتی بھی نہیں آتی۔"

"بہر حال اب چھ بجا ہے۔"

"خیر جو بھی ہو وقت کٹ جائے گا۔"

اور ہم باتیں کرتے رہے اور جب تین گھنٹہ بعد میں منٹو صاحب کے فلیٹ سے باہر نکل رہا تھا۔ اور کوٹ پہنے سردی میں ٹھٹھرتے اظہار صاحب مجھے آتے دکھائی دیئے۔ میں نے سوچا ذاتی تعلقات کس قدر شاید ہوتے ہیں۔ ان اظہار صاحب سے صرف ذاتی مراسم کے باعث میں اپنے معمول سے ساڑھے پانچ گھنٹہ پہلے جاگ پڑا تھا۔ نہ صرف خود جاگا بلکہ میں نے منٹو صاحب کو بھی اس قدر سویرے تکلیف دی اور منٹو صاحب "جو بھی بجا ہے یار ٹھیک ہے" کہہ کر گپ مارتے جاگتے رہے۔

اس واقعہ سے ایک طرف منٹو صاحب کی دوست پرستی کا پتہ چلتا ہے تو دوسری طرف ان کی سادگی کا احساس ہوتا ہے۔

سادگی اور صاف گوئی تو ان کے خاص جوہر تھے۔ ایک دفعہ میرے کمرے میں بیٹھے تھے کہیں چلنے کا پروگرام بنا تو میں بکس سے ایک باوا آدم کے زمانے کا اپنا کوٹ نکال کر پہننے لگا۔ منٹو صاحب نے جو اس کوٹ کو دیکھا تو کہنے لگے "کیا بکواس کوٹ پہنتے ہو یار۔ دیکھو، صفیہ سے کہو میرے ہاں بمبئی کا ایک گیبرڈین کا بڑھیا سوٹ پڑا ہے وہ تمہیں دے دے۔ میں تو پہنتا نہیں ہوں اور اگر پہنتا بھی تو میں اب بوڑھا ہو گیا ہوں۔ بوڑھا آدمی چاہے کچھ ہی پہن لے۔ تم لوگوں کو اچھا پہننا اوڑھنا چاہیے وہ سوٹ تم لے لو۔"

اس وقت میرے چند ایسے دوست بیٹھے تھے جن سے میری قطعی بے تکلفی نہیں تھی اور ان سے بڑے رکھ رکھاؤ کے مراسم تھے۔[1] اس لیے میں نے کہا "قبلہ مجھے آپ کا کوٹ نہیں چاہیے۔"

کہنے لگے'' بکواس کرتے ہو۔ تمہیں لینا ہوگا۔''

یہ کہہ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ کہنے لگے۔ ''ناپ کر دیکھو تم مجھ سے زیادہ لمبے تو نہیں ہو۔'' کندھے سے ناپ کر کہنے لگے'' یار چلے گا ابھی چل کر لے لو۔ چھوٹا ہو تو ٹھیک کروالینا۔''

میں نے پھر اپنی وہی بات دوہرائی۔

وہ بگڑ گئے۔

جب میں نے اپنے دوستوں کے چلے جانے کے بعد'' وجہ تکلف'' بتلائی تو کہنے لگے'' یار دوستوں کے سامنے کیا فرق پڑتا ہے۔ دوستوں کے ساتھ تو سب چلتا ہے۔'' پھر کہنے لگے'' دوستوں کی چیز میری جان اپنی چیز ہوتی ہے اور اپنی چیز دوستوں کی چیز ہوتی ہے۔''

میرا خیال ہے کہ واقعی یہی منٹو صاحب کا عقیدہ تھا جس کی وجہ سے ان کے دوست بھی ان کی خواہشات کا احترام کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایک مجلس میں عبدالرحمان چغتائی صاحب سے خواہش کی کہ میری سالی ذکیہ کے لئے اور میرے ڈرائنگ روم کے لئے کچھ تصویریں چاہئیں۔ وہ کسی وقت بھیج دو۔

چند دن بعد میں منٹو صاحب کے پاس بیٹھا کچھ لکھ پڑھ رہا تھا کہ عبدالرحمٰن چغتائی کا آدمی چار تصویریں اور چغتائی صاحب کا ایک رقعہ لیے چلا آیا۔ منٹو صاحب سو رہے تھے۔ چغتائی صاحب کا آدمی تصویریں اور رقعہ چھوڑ کر چلا گیا۔

کافی دیر بعد منٹو صاحب جاگے۔ صفیہ بھی موجود تھیں۔ منٹو صاحب نے تصویریں دیکھیں اور وہ تصویریں ان کو پسند نہیں آئیں۔ صفیہ صاحبہ کے بھی ناپسند تھیں۔ منٹو صاحب نے تصویریں دوسری بار بڑے غور سے دیکھیں اور پھر بڑے زور سے چلّائے'' یار اسد چغتائی نے میرے ساتھ چالاکی کی ہے۔''

''وہ کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''یار میں نے چغتائی سے اوریجنل تصویریں مانگی تھیں اور انہوں نے مجھے کاپی بھیج دی ہے۔ یار کیا ظلم ہے۔'' کہتے تھے'' میں ابھی واپس کردوں گا۔''

صفیہ نے کہا'' ایسی بھی کیا جلدی ہے۔''

بہرحال اس وقت تک تصویروں کی تقسیم بھی ہو چکی تھی۔ حامد جلال صاحب کے ڈرائنگ روم کے لئے ذکیہ صاحبہ نے ایک تصویر منتخب کر لی تھی اور اسی طرح اوروں میں تصویروں کی تقسیم طے پا چکی تھی۔

منٹو صاحب کہنے لگے "اچھا چلو پھر اور چار تصویروں کے لئے چغتائی سے خواہش کریں گے۔ چغتائی اپنا آدمی ہے وہ ضرور دے گا۔"

چنانچہ ہر آدمی منٹو صاحب کا اپنا آدمی تھا۔ عالم یہ تھا کہ ان کے متعلق بھی جس سے ایک آدھ بار ملاقات ہوئی ہے وہ پرامید رہتے تھے اور کہتے تھے "یار وہ بھی اپنا آدمی ہے"۔

مجھے پتہ نہیں چغتائی صاحب سے اور چار تصویریں منٹو صاحب نے حاصل کی تھیں یا نہیں البتہ جس تصویر کو اپنے ڈرائنگ روم میں لگا رکھا تھا اس کے متعلق ہر ایک کو ضرور بتلا دیتے تھے کہ میں نے چغتائی سے اوریجنل تصویر مانگی تھی۔ چغتائی نے مجھ سے چالاکی کی اور یہ تصویر بھیج دی۔

چالاکی تو ان سے صرف ایک ہی شخص نے کی تھی اور وہ اس کی چالاکی کی داد بھی دیتے تھے۔

منٹو نے ایک مضمون میں جو انہوں نے راولپنڈی ریڈیو اسٹیشن سے نشر کیا تھا اور جو بعد میں ان کی کتاب "سرکنڈوں کے پیچھے" میں بھی شائع ہوا ہے لکھتے ہیں کہ "منٹو ایک فراڈ ہے۔" لیکن آپ یہ سن کر شاید حیران ہوں کہ اگر منٹو فراڈ تھے تو ان سے بھی ایک شخص فراڈ کھیلتا ہے اور وہ شخص ایک مصنف ہے۔

قصہ یہ ہے کہ ایک شام میں منٹو صاحب کے پاس گیا۔ صفیہ منٹو اور منٹو بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ میں اس دن منٹو صاحب کو ایک بات بتلانے گیا تھا۔

وہ بات یہ تھی کہ اس دن صبح کو میں میاں ممتاز محمد خان دولتانہ کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا دولتانہ صاحب کا انتظار کر رہا تھا۔ اس دن طلباء کے کچھ مطالبات کے سلسلے میں اسٹوڈنٹ لیڈرز کے ساتھ میں دولتانہ صاحب کے پاس ان کی دعوت پر گفتگو کرنے گیا تھا۔ ممتاز دولتانہ کو لکھنے پڑھنے کا کافی شوق ہے اور ان کے پاس بے حد کتابیں ہیں بلکہ میرا تو خیال ہے کہ ہمارے ملک میں تو کسی یونیورسٹی کے پیشہ ور اسکالر کے ہاں بھی ایسی نایاب اور قیمتی کتابوں کا ذخیرہ نہ ہوگا جتنا کہ دولتانہ کے پاس ہے۔ میں نے ان کے ڈرائنگ روم میں وقت گزارنے کے لئے کتابوں کا جائزہ لینا شروع کیا تو مجھے پتہ چلا کہ ان کی الماری میں صرف دو ہی موضوعات پر کتابیں ہیں۔ ایک تو اُردو تنقید کی کتابیں دوسرے افسانوں کے مجموعے اور ان مجموعوں میں مجھے صرف منٹو کے مجموعے نظر آئے۔

بہر حال میں منٹو سے ذکر کر رہا تھا کہ دولتانہ کے ہاں صرف اُردو کے ادیبوں میں آپ کی کتابیں ہیں۔ منٹو کے پاس صفیہ بھی اس وقت موجود تھیں۔

... شخص کا بڑا سستا اور گھٹیا ناول تھا۔ اب ...

کسی جنسی موضوع پر کسی غیر معروف شخص کا بڑا سستا اور گھٹیا ناول تھا۔ اب ... کتاب کا نام کیا تھا اور مصنف کا نام کیا تھا۔ بہر حال اس کتاب میں ایک دیباچہ تھا اور اس دیباچہ میں کہا گیا تھا کہ ''یہ مصنف منٹو سے بڑا افسانہ نگار ہے اور اس بات کا خود منٹو نے اس کتاب کے دیباچہ میں اظہار کیا ہے۔''

منٹو نے مجھ سے کہا کہ ''صبح سے صفیہ مجھ سے لڑ رہی ہیں کہ میں نے اس گندی کتاب کا یہ کیا دیباچہ لکھا ہے، حالانکہ میں نے سرے سے یہ دیباچہ لکھا ہی نہیں ہے۔''

منٹو نے یہ کتاب مجھے دی اور مجھ سے کہا کہ ''تم اس طرز عمل کے خلاف ایک مضمون ''امروز'' میں لکھو اور اس فراڈ کے بارے میں مفصل لکھو اور خود جا کر احمد ندیم قاسمی کو یہ مضمون دو۔''

اس کتاب پر اسی رات میں نے کچھ لکھنے کا وعدہ کیا اور جب میں نے اپنے ہاسٹل جا کر اطمینان سے اس دیباچہ کو پڑھا تو دیباچہ کے بعد کے صفحے پر بہت ہی باریک تحریر میں ایک جملہ بڑا ہی فراڈ کا نظر آیا۔ آخر میں خود مصنف نے لکھا تھا:

''مصنف کا خیال ہے کہ اگر منٹو نے اس کتاب کا دیباچہ لکھا ہوتا تو یہی کچھ لکھتا۔''

دوسرے دن منٹو کو میں نے یہ معرکۃ الآراء جملہ سنایا۔ منٹو بہت محظوظ ہوئے۔ پھر کہنے لگے کہ اب اسی چیز کے بارے میں لکھو۔''

میں نے خط کی شکل میں اس پر ایک صفحہ لکھا۔ ہاسٹل سے نکلا تو مجھے کافی ہاؤس میں حمید اختر مل گئے۔ میں نے امروز کے لئے یہ خط حمید اختر کے حوالے کر دیا۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ وہ خط شائع نہیں ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں حمید اختر کو خط دے کر مطمئن ہو گیا کہ وہ شائع ہو جائے گا۔ کچھ دن بعد حمید اختر سے سر راہ مُلاقات ہوئی تو میں نے دریافت کیا اس پر انہوں نے پوچھا۔

''وہ کس کا خط تھا۔''

"آپ نے نام نہیں پڑھا؟" میں نے پوچھا۔[1]

"نہیں۔"

"وہ میرا خط تھا۔"

"اچھا تو پھر شائع ہو جائے گا" اور اب جبکہ حمید اختر صاحب دوسری بار جیل سے ہو آئے ہیں وہ خط اس قدر طویل عرصہ میں بھی شائع نہیں ہوا ہے۔ اب شاید وہ خط گم بھی ہو چکا ہوگا۔

ان ہی دنوں جبکہ منٹو صاحب نے مجھ سے اس گھٹیا ناول کی دیباچہ کے متعلق کچھ لکھنے کے لئے کہا تھا منٹو کو ایک دورہ اپنے بارے میں دُوسروں کے تاثرات جمع کرنے کا پڑا تھا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں بھی انہوں نے جو جو معرکے سر کئے ہیں وہ بے حد دلچسپ ہیں۔

ان دلچسپ واقعات کی ترتیب وار کڑیاں مجھے مل نہیں رہی ہیں اور میں بیچ کے چند واقعات اس وقت بھول رہا ہوں۔ بہر حال یہ ایک واقعہ ہے کہ ان کا پروگرام تھا کہ اپنے متعلق ایک کتاب "ناخن کا قرض" کے نام سے شائع کرائی جائے۔

چنانچہ انہوں نے اپنے تمام دوستوں، پڑھنے والوں، ملنے والوں سب سے اپنے بارے میں کچھ نہ کچھ تحریر کروایا تھا اور تو اور جن دنوں یہ پاگل خانے میں تھے اس وقت بھی یہ خیال انہیں تھا چنانچہ اپنے پاگل خانے کے ساتھیوں تک سے انہوں نے اپنے بارے میں تحریریں جمع کی تھیں۔

اپنی لڑکی نزہت تک سے انہوں نے اپنے متعلق پوچھا تھا اور کہا تھا "تم میری ایک تصویر بناؤ" نزہت کی عمر ۷،۸ سال ہے لیکن اس ذہین لڑکی نے اپنے باپ کی ایک عجیب سی تصویر بنائی تھی۔ منٹو اس تصویر کا بلاک "ناخن کا قرض" میں شامل کرنا چاہتے تھے۔

ایک رات منٹو اسی کتاب "ناخن کا قرض" کے سلسلہ میں الہ بخش[2] کے پاس پہنچے تھے ان سے منٹو کی یہ پہلی ملاقات تھی منٹو کا نام سن کر الہ بخش چونک پڑے تھے اور منٹو کے یہ پوچھنے پر کہ "مینوں

---

[1]: حمید اختر کی نیت پر حملہ کرنا مجھے مقصود نہیں تھا میں نے صرف صفائی کی خاطر پوچھ لیا تھا ویسے حمید اختر خود یہ بات جانتے ہیں کہ ان کا میرے دل میں کتنا احترام ہے۔

[2]: الہ بخش مشہور آرٹسٹ جنہوں نے رام اور سیتا کی بے پناہ حسین تصویریں بنائی ہیں اور ہندوؤں میں بڑا نام کمایا ہے۔

الٰہ بخش کے ہاں نہ کاغذ تھا نہ برش نہ رنگ۔ منٹو نے اسی رات یہ سب کچھ فراہم کیا تھا اور الٰہ بخش سے اپنی تصویر بنوائی تھی۔

عبدالرحمٰن چغتائی کے بھی گھر پر انہوں نے ہلّہ بولا تھا اور مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے چغتائی صاحب نے منٹو کو ایک تصویر بنا کر دی تھی جس میں ایک عورت دکھلائی گئی ہے اور اس کے پیروں سے کئی مرد چمٹے ہوئے ہیں۔

اپنے ایک دوست کو منٹو نے راولپنڈی بھیجا تھا کہ جاؤ وہاں سے مختار صدیقی، یوسف ظفر، ممتاز مفتی اور عدم سے میرے متعلق اشعار لکھوا کر لاؤ۔ اس وقت یوسف ظفر نے فی البدیہہ منٹو پر جو شعر کہا تھا منٹو اس شعر کی بڑی تعریف کرتے تھے۔ کہتے تھے ''یوسف ظفر کا یہ شعر مجھے سب سے زیادہ پسند ہے۔''

ایک دفعہ مجلس اقبال میں مضمون پڑھنے تشریف لے آئے ساتھ ہی راجہ مہدی علی خان کی خود پر ایک نظم لیتے آئے یہ نظم سویرا میں ''ٹیڑھی لکیر'' کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ اس وقت ''سویرا'' کے اڈیٹر احمد راہی تھے۔ احمد راہی سے منٹو کے کافی گہرے تعلقات تھے اور دونوں گھنٹوں اکٹھے رہا کرتے تھے۔ مجھے جہاں تک یاد ہے اس دن مجلس اقبال میں احمد راہی بھی موجود تھے بلکہ انہوں نے لڑکوں کو اس دن منٹو کی ذاتی زندگی کے متعلق بڑے خوبصورت انداز میں بہت سی کارآمد باتیں بھی بتلائی تھیں۔ بہرحال اس اجلاس میں پروفیسر اثر نے راجہ مہدی علی خان کی یہ نظم پڑھی تھی۔ اب مجھے پتہ نہیں کہ سویرا میں اس کا عنوان ''منٹو'' سے ''ٹیڑھی لکیر'' کیوں کر دیا گیا اور یہ کہ آیا یہ منٹو کی مرضی سے کیا گیا؟ نظم دلچسپ ہے آپ بھی سنئے گا۔

دنیا ہرگز گول نہیں ہے	ڈھول کے اندر پول نہیں ہے
مجنوں کی دشمن تھی لیلیٰ	مسلمان تھا بھائی چھیلا
اُلّو رات کو سو جاتے ہیں	طوطے گلابی ہو جاتے ہیں
افلاطون کی چھ مائیں تھیں	کچھ بھینسیں تھی کچھ گائیں تھیں
جگنو سے سگریٹ سلگاؤ	دھوپ میں اپنے اشک سکھاؤ

چور کو چوری سے مت روکو شعر کہے شاعر تو ٹوکو

سب سے بڑی ہستی ہے شیطان دبلا ہے راجہ مہدی علی خان

"ناخن کا قرض" کتاب کے لئے انہوں نے ایک دن احمد ندیم قاسمی صاحب سے بھی کہا تھا کہ "میرے متعلق اسی وقت کچھ لکھو" ندیم نے کہا تھا "میں اسی وقت تو نہیں لکھ سکتا۔"

منٹو نے کہا "نہیں ابھی لکھ دو جو چاہے لکھو۔"

ندیم نے کہا "میں کوئی چیز بغیر سوچے اور غور کیے نہیں لکھتا۔"

منٹو نے کہا "جو دل میں آئے لکھ دو سوچنے کا کیا سوال ہے۔"

ندیم نے کہا "میں بعد میں بائی پوسٹ بھیج دوں گا۔"

منٹو راضی ہو گئے تھے۔ اور اٹھ کر چلے آئے تھے کہ کچھ دن بعد ندیم صاحب نے اپنی رائے بھیج دی تھی۔ اب مجھے یاد نہیں رہا کہ ندیم نے کیا لکھا تھا۔[1]

جب میں کراچی آرہا تھا کہنے لگے "کراچی میں میرا ایک کام کرتے آنا۔"

میں نے کہا "کی حکم اے جناب؟" (کہیئے جناب کیا حکم ہے)

کہنے لگے۔ ممتاز شیریں۔ حسن عسکری، عزیز احمد، اختر حسین رائے پوری اور مہدی علی صدیقی سے میرے متعلق لکھا لانا۔"

ساتھ ہی ہدایت کر دی تھی کہ وہ لوگ جو بات بھی مرے متعلق کہیں وہ نوٹ کر لینا اور ان سے دستخط لے لینا۔ سوچ کر اور غور وفکر کر کے لکھنے کی ضرورت نہیں ہے ان پر یہ واضح کر دینا۔"

میں کراچی آنے کے بعد چند روز تو بہت ہی مصروف رہا اس لیے منٹو کا فوری کام نہیں کر سکا تھا ان کے مرنے سے چند ہی روز پہلے ہی ممتاز شیریں صاحبہ سے ملا اور منٹو کی خواہش ان تک پہنچا دی۔ اس طرف میں نے یہ بات کم ہی دیکھی ہے کہ ایک ادیب کو دوسرے ادیب سے اور ایک فنکار کو دوسرے فنکار سے دلچسپی ہو لیکن مجھے اس بات کی بے حد خوشی ہے کہ جب میں نے ممتاز شیریں سے منٹو کی خواہش

---

[1] اس وقت سنا ہے منٹو میں اور ندیم میں بڑی دلچسپ گفتگو بھی ہوئی تھی کسی بات پر ندیم سے منٹو نے کہا "جب سے تم جیل سے ہو آئے ہو اپنے میں کوئی بڑائی محسوس کرتے ہو؟" ندیم نے کہا "میں بڑائی تو محسوس نہیں کرتا شاید آپ کوئی کمی محسوس کرتے ہیں۔"

کا اظہار کیا تو انہوں نے فوری منٹو کے متعلق مجھے ایک جملہ لکھ دیا تھا۔

''منٹو ہمارا موپساں ہے۔''[1]

اس کے آگے بھی ممتاز شیریں نے چند سطریں لکھی تھیں اور جس خلوص کے پیش نظر لکھی تھیں۔ اس نے مجھ پر انمٹ نقوش چھوڑا ہے۔

میں نے منٹو کو ان کے تاثرات لاہور بھیج دیئے تھے اور ساتھ ہی منٹو کو مطلع کیا تھا کہ ممتاز شیریں منٹو کی شخصی زندگی سے کتنی دلچسپی رکھتی ہیں اور کتنے خیال سے انہوں نے میرے سامنے منٹو کا ذکر کیا تھا۔

اسی سلسلہ میں محمد حسن عسکری سے بھی ملاقات ہوئی تھی محمد حسن عسکری کوئی بات صاف نہیں کرتے کہنے لگے تھے ''چھوڑیئے صاحب، ہٹایئے'' — چنانچہ اس موضوع کو ''چھوڑ کر'' اور ''ہٹا کر'' ہم نے کوئی اور موضوع ڈھونڈ لیا تھا۔ کون سا موضوع۔ یہ اب مجھے یاد نہیں رہا۔

منٹو کی اس کتاب ''ناخن کا قرض'' کے لئے میں نے بھی ایک مختصر سا مضمون لکھا تھا۔ قصہ یہ تھا کہ پنجاب یونیورسٹی کے امتحانات کے بعد میں گرمیاں گزارنے مری چلا گیا مری ہی میں مجھے ''سویرا'' کا خاص نمبر ملا تھا جو احمد راہی کی ادارت میں ڈیڑھ سال کے طویل وقفہ کے بعد کافی ضخیم شائع ہوا تھا اس میں منٹو کی کتاب ''ناخن کا قرض'' کا اشتہار پڑھ کر میں نے منٹو پر ایک مضمون بڑے مختصر سے وقت میں لکھا اور جب میں مری سے راولپنڈی آیا تو یہ مضمون، راولپنڈی جی۔ پی۔ او سے رجسٹری کر کر منٹو کو پوسٹ کر دیا۔

جب میں نے رجسٹری کے لئے متعلقہ کلرک کو لفافہ دیا تھا تو وہ منٹو کا نام پڑھ کر چونک گیا تھا اور مجھ سے کہا ''کیا جناب آپ افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کو یہ خط بھیج رہے ہیں۔''

میں نے جواب دیا ''جی ہاں افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کے پاس۔ اگر کوئی سعادت حسن منٹو نام کا کوئی اور شخص ہے تو میں اس سے واقف نہیں۔''

اس شخص نے پھر بڑی دلچسپی سے پوچھا ''کیا آپ منٹو کے دوست ہیں۔''

''نہیں جناب مجھے ان کا دوست ہونے کا فخر حاصل نہیں۔'' بڑی خاکساری سے میں نے جواب دیا۔

---

[1] اس کا ذکر انہوں نے اپنے تازہ مضمون ''منٹو ہمارا موپساں'' شائع شدہ ''مشرب'' ...... ۵۵ء میں کیا ہے

اور پھر رجسٹری کی رسید لیے یہ سوچتا پوسٹ آفس سے باہر چلا آیا کہ خُدا جانے منٹو تک یہ خط پہنچے گا بھی کہ نہیں؟

لیکن وہ خط منٹو تک پہنچ گیا تھا۔

اپنے اس مضمون میں میں نے دو باتیں لکھی تھیں۔ ایک یہ کہ منٹو کو تاریخی شعور نہیں ہے۔ تاریخی بصیرت کی کمی نے منٹو کو اور بلند ہونے سے روک دیا ہے اگر منٹو کو تاریخی شعور ہوتا تو مجھے یقین ہے وہ بہت ہی عظیم ہوتا اور وہ ہرگز ایسی چیزیں نہ لکھا ہوتا جو اس کی عظمت کی نفی کا باعث ہیں۔

دوسری بات میں نے اپنے اس مضمون میں یہ تحریر کی تھی کہ منٹو بلا کا ضدی ہے۔ حکومت نے اس پر "بو" اور "دھواں" لکھنے پر مقدمہ چلایا تو اس نے چڑ کر اس سے بھی زیادہ صاف صاف افسانے لکھے اگر حکومت "نیا قانون" اور "نعرہ" پر مقدمہ چلاتی تو منٹو اسی قسم کے افسانے لکھا ہوتا۔

یہ مضمون منٹو کو بھیج دینے کے ایک ہفتہ بعد میں لاہور چلا گیا۔ لاہور میں چند دن تو میں ڈرتا رہا کہ منٹو پر میں نے جو مضمون لکھا ہے اس میں منٹو کے خلاف کچھ باتیں ہیں مبادا کہیں منٹو مجھ سے خفا ہو اس لیے میں ان سے ملنے بھی نہیں گیا لیکن ایک دن انارکلی میں ملک عنایت اللہ کی دوکان میں مڈبھیڑ ہوگئی۔ منٹو نے ملتے ہی جو پہلی بات کہی وہ یہ تھی "یار تیرا مضمون مل گیا میں اسے "ناخن کا قرض" میں ضرور شائع کروں گا۔"

میں چپ رہا۔

منٹو نے پھر کہا "لیکن یار دیباچہ میں تیری خبر لوں گا۔"

میں نے کہا "جیسے آپ کی مرضی" ــــ اور بات ختم ہوگئی اور منٹو مجھے اپنے ساتھ اپنے گھر لکشمی مینشن لے چلے۔ راستے میں میں نے کہا "منٹو صاحب ایک دفعہ میں کراچی میں مشہور مارکسی نقاد ممتاز حسین کے گھر واقع پیر الٰہی بخش کالونی میں ممتاز حسین سے بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ کسی بات کے تعلق سے انھوں نے آپ کے بارے میں کہا تھا "منٹو خود کو ترقی پسند کہتا ہے اور ان لوگوں سے بہت چڑتا ہے جو اسے رجعت پسند کہتے ہیں اور یہ کہ منٹو اپنی غلطی ماننے میں بڑا بہادر ہے۔ اب آپ کہہ رہے ہیں کہ دیباچہ میں میری خبر لیں گے۔"

کہنے لگے "خبر تو ضرور لوں گا اور اگر ممتاز حسین نے تم سے کوئی بات کی ہے تو خیر وہ بات تو

تمہارے لیے سند ہوگئی لیکن ممتاز حسین کیا لکھتا ہے کیا کہنا چاہتا ہے۔ مجھے تو کبھی سمجھ میں نہیں آیا۔ اس کا کوئی مضمون میں نے مکمل نہیں پڑھا ہے۔ اِدھر اُدھر سے جو بھی سطر پڑھی ہے۔ مجھے تو جیومٹری کا سوال نظر آیا — اور جانتے ہو میں جب میٹرک میں پڑھتا تھا جیومیٹری اور اُردو میں فیل ہوتا تھا چنانچہ تین سال تک میں میٹرک میں فیل ہوتا رہا۔ بچپن میں دِل محمد کا حساب نہیں چل سکا تو اب ممتاز حسین کی جیومیٹری کس کی سمجھ میں آئے گی۔"

یہ گفتگو کرتے ہوئے ہم اِن کے گھر پہنچے۔ ڈرائنگ روم میں منٹو صاحب نے زوبی کی ایک تصویر فریم کروا رکھی تھی۔ میں نے اس تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے منٹو صاحب سے کہا "ممتاز حسین کی تحریر اگر جیومیٹری کا سوال ہے تو زوبی کی یہ تصویر کیا ہے۔؟"

کہنے لگے "یہ بھی جیومیٹری کی ایک بدلی ہوئی شکل ہے۔"

میں نے کہا "ممتاز حسین کی تحریر آپ نہیں پڑھتے ہیں تو زوبی کی یہ تصویر اپنے ڈرائنگ روم میں نظروں کے سامنے کیوں رکھتے ہیں۔"

کہنے لگے "اپنے لیے نہیں، آنے والوں کی تفریح کے لئے تا کہ ان کے ذوق کا امتحان لیا جا سکے۔"

میں نے کہا "ذوق کا امتحان یا صبر کا۔"

ہنس کر کہنے لگے "دونوں کا۔"

میں نے کہا "پھر تو ہم دونوں امتحانوں میں پاس ہو چکے۔"

کہنے لگے "پھر تو تمہاری علمیّت مشتبہ ہے۔"

میں نے کہا "ہاں ہمیں تو فیض کے کلام اور چغتائی کی تصویروں ہی تک رسائی ہے۔ میرا جی کی نظمیں ہوں یا زوبی اور حنیف رامے کی تصویریں اس میں تو ہماری علمیّت مشتبہ نہیں سرے سے علمیت عنقا ہے۔

یہ گفتگو کرتے ہوئے منٹو میرے مضمون کو بھول گئے البتہ جب کبھی ان کا کوئی دوست ان سے ملنے کے لئے ان کے ہاں آنکلتا اور منٹو اسے دکھلانے کے لئے "ناخن کا قرض" کا سارا پلندہ نکال لاتے تو میرے مضمون پہ نظر پڑتے ہی ضرور کہتے تھے "تم نے اپنے مضمون میں مجھ پر ہاتھ چلایا ہے اب میں اپنے دیباچہ میں جو تم پہ وار کروں گا وہ بھی دیکھ لینا۔" لیکن مجھے افسوس ہے وہ دیباچہ تحریر نہیں کر سکے اگر وہ دیباچہ لکھے ہوتے تو نہ جانے میرے متعلق کیا کچھ لکھے ہوتے؟

منٹو کی یہ کتاب ''ناخن کا قرض'' شائع نہیں ہوئی ہے اس کے سارے مسودے منٹو نے بڑی احتیاط سے اپنے پاس رکھ چھوڑے تھے۔ کاش کہ کوئی آگے بڑھے اور یہ کتاب شائع کرنے کی کوئی صورت نکل آئے۔ میرا خیال ہے کہ یقیناً یہ کتاب اپنی نوعیت کی پہلی ہوگی اور ہر اعتبار سے بڑی دلچسپ اور کارآمد بھی۔

لیکن ہمارے ملک میں کم ہی لوگ کارآمد بات کرنے کے لئے آگے بڑھتے ہیں کارآمد کام ریاضت کے علاوہ قربانی کا بھی مطالبہ کرتا ہے اور اس بازار میں جہاں ہر بات نفع نقصان کی ترازو میں تولی جاتی ہے قربانی کا تصور بھی (مطالبہ تو ایک دوسری ہی بات ہوئی) مضحکہ خیز بات ہے۔

کچھ ہی دن ہوئے مجھے ڈاکٹر محمود حسین[1] سے تفصیلی ملاقات کا موقعہ ملا۔ ڈاکٹر محمود حسین کا تبحر علمی اور پروقار شخصیت پڑھنے لکھنے والوں کے لئے ہمارے ملک میں اپنی نوعیت کی واحد مثال ہے ڈاکٹر علم تاریخ اور علم سیاسیات کے اُستاد ہیں لیکن انہوں نے ادب پر جو گفتگو فرمائی اور اپنی گفتگو میں حوالوں کے طور پر جن نئے لکھنے والوں کا تذکرہ کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا کہنا تھا کہ کارآمد بات کے لئے ہماری زمین شائد ابھی برسوں بعد بھی تیار نہ ہو۔ یہ امر کس قدر محتاج توجہ ہے کاش ہمارے نظامِ تعلیم اور نظامِ زندگی سے متعلقہ ارباب اقتدار کچھ وقت نکال کر اس بات پر بھی دھیان دے سکیں۔

منٹو پر آخری مقدمہ ''اوپر نیچے درمیان'' پر چلا تھا۔ یہ دلچسپ بات قابلِ ذکر ہے کہ ''اُوپر نیچے درمیان'' پہلے لاہور میں ''احسان'' اخبار میں شائع ہوا تھا۔ اسے ''پیامِ مشرق'' کراچی نے نقل کیا تھا اور مقدمہ کراچی ہی کی کچہری میں چلا۔

کچہری سے منٹو کو بڑی نفرت تھی۔ ہزار بار کہتے رہتے تھے کہ کچہری سے زیادہ گھٹیا اور مہمل جگہ کوئی اور نہیں۔ لیکن اس نفرت کے باوجود کچہری سے انہیں اکثر سابقہ پڑتا رہتا تھا۔

کراچی سے ان کے نام وارنٹ آیا، انہوں نے ضمانت کروادی محمد طفیل صاحب کے اصرار پر کراچی جانے کے لئے راضی ہوگئے۔ نصیر انور کو ساتھ لے لیا اور کراچی روانہ ہوگئے۔

ان کی کراچی کو روانگی کے دوسرے دن میں لکشمی مینشن گیا۔ صفیہ منٹو ملیں اور انہوں نے بتلایا وارنٹ آیا تھا۔ منٹو کراچی جا چکے ہیں۔ دوسرے ہی دن ان کی پیشی تھی اور مجھے فیصلہ کے متعلق تشویش تھی میں نے دوسرے دن کوئی تین بجے صفیہ منٹو کو ٹیلیفون کیا پتہ نہیں اس وقت ان کے ہاں کس نے فون

---

[1] سابق وزیر تعلیم حکومتِ پاکستان۔

اٹھایا۔ دریافت کرنے پر جواب ملا کہ منٹو کو ۲۵ روپیہ جرمانہ ہوا ہے۔ میں نے نمازِ شکرانہ ادا کی کہ چلو جلد اور سستے چھوٹے۔

چند دن بعد گنگا رام بلڈنگ واقع مال روڈ پر سے گزر رہا تھا کہ سامنے سے ایک ٹانگہ آتا دکھائی دیا اس ٹانگہ میں منٹو صاحب سوار تھے۔ انہوں نے مجھے آواز دی اور میرے پوچھنے سے پہلے ہی کہنا شروع کیا۔ ''یار ابھی اسٹیشن سے چلا آ رہا ہوں سوچا کہ گھر چلنے سے پہلے کچھ لیتا چلوں۔ انگلش وائن ہاؤس سے ذرا ہوتے ہوئے گھر چلتے ہیں۔''

شراب لی گئی تو کہنے لگے ''بتلاؤ تمہیں کچھ کام تو نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو یار وہ چھوڑ و اور میرے ساتھ چلو میں تمہیں کراچی کی روداد سناتا ہوں۔''

میں نے کہا ''ویسے بھی اگر مجھے کوئی کام ہو تو تھوڑے ہی آپ مجھے چھوڑ دیں گے'' یہ سن کر منٹو ہنس پڑے اور ہم لوگ لکشمی مینشن کی طرف چلے۔

لکشمی مینشن پہنچے۔ کپڑے بھی نہیں بدلے اور کراچی کی روداد سنانی شروع کر دی۔ کہنے لگے ''یار کچہری میں جب ہم پیش ہوئے میں کافی پیے ہوئے تھا میں نے مجسٹریٹ سے درخواست کی کہ میرے مقدمہ کا جلد فیصلہ کر دیا جائے کیونکہ میں لاہور سے آیا ہوں اور بیمار ہوں۔''

جب مجھے مجسٹریٹ نے اس قدر بیتاب دیکھا تو کہا ''آپ سعادت حسن منٹو ہیں؟ آپ بیٹھیے۔''

کہنے لگے ''یار مجھے کچہریوں سے اکثر سابقہ پڑتا رہا ہے لیکن اس مجسٹریٹ کے حُسنِ سلوک نے مجھے بڑا حیران کر دیا۔ میں مجرم تھا اور عدالت میں اپنے جرم کے باعث پہنچا تھا مگر مجسٹریٹ مجھے نہایت نرمی سے بیٹھنے کے لئے کہہ رہا تھا۔

بہرحال میں بیٹھ گیا اور میں نے کہا جناب ''اُوپر نیچے درمیان'' فیچر کا مصنف ہوں مجھے یہاں فحش نگاری کے جرم میں حاضر ہونا پڑا ہے۔ میں اقبال جرم کرتا ہوں۔ ابھی میرا فیصلہ کر دیا جائے۔''

مجسٹریٹ نے کہا ''میں ابھی تو فیصلہ نہیں کر سکتا چونکہ میں آج اس فیچر کا مطالعہ کروں گا اور کل فیصلہ سناؤں گا۔''

خیر میں مان گیا۔

دوسرے دن مجسٹریٹ نے پوچھا ''آپ کی مالی حالت کیسی ہے۔''

میں نے کہا ''بہت خراب۔

مجسٹریٹ نے پوچھا '' آج تاریخ کیا ہے؟''

کسی نے کہا '' پچیس۔''

مجسٹریٹ نے فیصلہ سنایا '' پچیس روپیہ جرمانہ۔''

منٹو نے سنایا کہ میں نے دوسرے دن زیلن کافی ہاؤس کا اس مجسٹریٹ کو پتہ دیا اور کہا کہ '' میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں آپ وہاں مجھے ضرور ملیئے گا۔''

مجسٹریٹ نے وعدہ کر لیا۔

میں نے پوچھا '' یہ مجسٹریٹ ہے کون؟ نام تو بتلایئے؟''

منٹو نے کہا '' بس سُنتے چلے جاؤ نام آخر میں بتلاؤں گا۔ شاید تم جانتے ہو۔'' کہنے لگے '' دوسرے دن میں زیلن کافی ہاؤس وقت مقررہ سے دو منٹ دیر سے پہنچا مجسٹریٹ میرا انتظار کر رہے تھے میں نے معذرت چاہی اور ہم لوگوں نے گپ مارنی شروع کر دی۔ کہنے لگے '' وہ بڑا پڑھا لکھا آدمی ہے۔ کہتا تھا منٹو صاحب میں نے روسی، فرانسیسی اور انگریزی ادب کا بڑا مطالعہ کیا ہے لیکن فن افسانہ کے امام تم ہو۔ تم دُوسری زبانوں کے عظیم ادیبوں سے بھی زیادہ عظیم ہو۔''

کہنے لگے '' یار وہ بہت شریف آدمی ہے۔ میں نے ان سے کہا آپ نے مجھے سزا کیوں دی ہے؟''

مجسٹریٹ نے کہا '' چونکہ وہ تحریر میری نظر میں فحش ہے۔''

میں نے کہا '' فحش کسے کہتے ہیں؟ فحش کی تعریف کیا ہے۔''

کہنے لگے '' اس نے کہا میں آپ کو یہ سب کچھ دو سال بعد بتلاؤں گا ابھی نہیں۔''

کہنے لگے '' میں نے اس سے وعدہ لے لیا ہے اور وہ شاید دو سال بعد ریٹائر ہو تو وجوہات بتلائے۔''

میں نے کہا '' اب تو نام بتلا دیجئے مجسٹرٹ صاحب کا۔''

کہنے لگے '' وہ تمہارے حیدرآباد ہی کے ہیں۔ نام مہدی علی صدیقی ہے۔ تم جانتے ہو یا نہیں؟''

میں نے کہا '' یہ نام تو میں نے زندگی میں پہلی بار سنا ہے۔''

کہنے لگے '' یار بے حد شریف آدمی ہے۔ اب تک حیدرآباد کے میرے دو دوست تھے ایک ابراہیم

جلیس دوسرے تم، اب تیسرا مہدی علی صدیقی ہے۔ میں اس کی شرافت کی پوری تفصیل لکھوں گا۔‘‘

میں نے کہا ’’تفصیل لکھئے گا تو اسے اپنے ’’اوپر نیچے درمیان‘‘ مجموعے میں شائع بھی کروایئے گا اوراس مجموعہ کو مہدی علی صدیقی کے نام انتساب کیجئے گا۔

منٹو میری اس رائے سے متفق تھے لیکن انہوں نے مہدی علی صدیقی کے نام اپنی کتاب ’’اوپر نیچے درمیان‘‘ صرف انتساب کی ہے۔ مقدمہ کی ساری روداد نہیں لکھی ہے صرف اپنے لاہور سے کراچی تک سفر کی داستان ’’پانچواں مقدمہ‘‘ عنوان سے نقوش میں شائع کروائی تھی۔

شاید زندہ رہتے تو ساری تفصیل لکھتے اور مہدی علی صدیقی کا بھی ضرور ذکر کرتے۔ حال ہی میں جب مہدی علی صدیقی سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے منٹو سے سنی ہوئی ساری روداد انہیں سنائی اور ان سے دریافت کیا ’’کیا یہ سچ ہے‘‘؟ مہدی علی صدیقی نے بتلایا ’’ہاں یہ سب کچھ درست ہے۔‘‘ اور مہدی علی صدیقی صاحب نے اپنے منٹو سے کیے ہوئے وعدہ کے مطابق ساری روداد کہ وہ منٹو کے فیچر ’’اوپر نیچے درمیان‘‘ کو کیوں فحش تصور کرتے ہیں اور ان کی نظر میں کونسی تحریر فحش ہے تفصیلی طور پر ’’افکار‘‘ (کراچی) کے منٹو نمبر میں شائع کردی ہے۔

مہدی علی صدیقی صاحب نے مجھے بتلایا کہ منٹو نے بھی ان سے ایک وعدہ کیا تھا اور وہ وعدہ یہ تھا کہ اپنی ساری تصانیف مہدی علی صدیقی صاحب کے پاس روانہ کریں گے۔ مسلسل بیماری اور پریشانی کے باعث منٹو اپنا وعدہ پورا نہیں کر سکے۔ میں نے مہدی علی صدیقی صاحب سے عرض کیا کہ منٹو کے ایک ناچیز دوست کی حیثیت سے میں منٹو کا وعدہ پورا کرنا اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا۔

کراچی کا طویل سفر منٹو کی مختصر زندگی کا یہ آخری طویل سفر تھا اس کے بعد وہ اپنے دوست نصیر انور کے ہاں پنڈی گئے تھے اور پنڈی میں انہوں نے اپنا دلچسپ مضمون ’’منٹو ہمزاد کی نظر میں‘‘ ریڈیو راولپنڈی سے نشر بھی کیا تھا۔ راولپنڈی سے لوٹ کر پھر لاہور سے باہر نہیں گئے۔

البتہ انہوں نے بمبئی جانے کا پروگرام ضرور بنایا تھا پاسپورٹ کے لیے درخواست بھی دی تھی لیکن درخواست میں کوئی TECHNICAL غلطی رہ جانے کے باعث پاسپورٹ نہیں بن سکا تھا منٹو ہر شخص سے کہتے تھے کہ ’’پاسپورٹ کے لئے درخواست دی تھی اس میں کوئی غلطی رہ گئی ہے کیا کریں پاسپورٹ نہیں بنتا۔‘‘ میں نے ایک دن عرض کیا ’’قبلہ کسی دن دفتر چلئے غلطی دُور کردیجئے پاسپورٹ بن جائے گا۔‘‘

کہتے تھے ''یہ تو ٹھیک ہے لیکن اب پاسپورٹ آفس کون جائے۔''

میں نے بارہا پھر یاددہانی کی کہ ''چلئے پاسپورٹ بنوا لیجئے'' منٹو ٹال جاتے تھے آخر میں کہنے لگے تھے ''یار اب سفر کی بھی ہمت نہیں رہی البتہ میں اشوک کمار، نقوی، سردار دیوان سنگھ مفتون اور دوسرے دوستوں کو تمہارے لئے تعارفی خط دیئے دیتا ہوں تم وہاں سے میری کتابوں کے پیسے اور فلموں کی کہانیوں کے معاوضے لے آؤ۔''

غرضیکہ انہوں نے پاسپورٹ نہیں بنوایا۔

ایک دن یورپ سے کراچی کی ایک ممتاز ادیبہ کا خط آیا کہ وہ پاکستان سے باہر ہی شاید رہ جائیں۔

یہ خط پڑھ کر کہنے لگے ''ہاں یار باہر چلا جانا چاہیے۔''

میں نے کہا ''کیوں منٹو صاحب کیا بات ہے؟''

کہنے لگے ''یار میں نے کہا باہر ہی چلا جانا چاہئے کیونکہ یہاں کی بات کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتی ہے جب تک ہندوستان میں تھے اس وقت گاندھی جی سنیما نہیں دیکھتے تھے اور میں اخبار نہیں پڑھتا تھا۔ مجھے اخبار سے نفرت تھی گاندھی جی کو سنیما سے۔ لیکن میں جب کبھی اخبار اٹھا کر دیکھ لیتا تھا تو کوئی نہ کوئی بات کوئی نہ کوئی مسئلہ سمجھ میں آ جاتا تھا، اب یہاں کتنا ہی سمجھنے کی کوشش کیجئے کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ پھر یہاں رہنے کے کیا معنیٰ؟ اس لیے میں نے کہا باہر ہی چلا جانا چاہئے۔

لیکن پھر بھی وہ پاکستان سے باہر نہیں گئے۔ شاید اس لئے کہ انہیں تو دنیا ہی سے جانا تھا۔ آخر وہ دن قریب آ ہی گئے۔

اور — یہ آخری دن کی آخری ایک ساتھ نشست کا ذکر ہے (پھر اس کے بعد نہ منٹو کے ساتھ بیٹھنا نصیب ہوا اور منٹو کو دیکھنا) منٹو حسب معمول دو بجے مضمون لکھنے کے لئے بیٹھے۔ سردی تھی۔ باہر انہوں نے خود کرسیاں ڈالیں اور دھوپ میں ایک کرسی پر وہ اور دوسری پر میں بیٹھ گیا انہوں نے مضمون لکھنے کے لئے کاغذ پر ۷۸٦ لکھا اور میں ان کے کتے DANNY سے کھیلنے لگا چند سطریں لکھنے کے بعد منٹو نے کہا ''یار آج میرا موڈ ٹھیک نہیں ہے۔ میں کہتا جاتا ہوں تم لکھو۔'' میں نے اپنی گود سے DANNY کو اُتار دیا اور منٹو کے ہاتھ سے کاغذ قلم لے لیا اور کہا لکھائیے منٹو صاحب۔

منٹو نے کہا عنوان لکھو ''صبیحہ ایم اے۔''

میں نے حیران ہوکر پوچھا ''منٹو صاحب فلم اسٹار صبیحہ ایم اے ہے؟''

منٹو نے جواب دیا ''یار یہ تو ایک فراڈ ہے۔اس کے باپ کا نام محمد علی ہے ایم سے محمد اے سے علی، محمد علی یعنی ایم اے۔''

میں نے کہا ''کمال ہے خیر لکھایئے۔''

چند سطریں لکھائیں۔ پھر کہنے لگے ''یار مصیبت یہ ہے کہ میں صبیحہ کی ماں، بہن، اور باپ کو زیادہ جانتا ہوں اور مضمون صبیحہ پر لکھنا ہے۔''

میں نے کہا ''بہر حال جیب سے کچھ نکالیے۔''

ہنس کر کہنے لگے ''یہ افسانہ نہیں مضمون ہے۔''

اور پھر لکھانے لگے، لکھاتے چلے گئے۔

کافی صفحات لکھنے کے بعد میرے ایک عزیز دوست بشیر احمد بھٹی آ گئے اور میں مضمون ادھورا چھوڑ کر ان کی اجازت لے کر اپنے دوست کے ساتھ باہر چلا گیا۔ شام کو جب لوٹا تو مضمون لکھا جا چکا تھا۔ میرے پہنچتے ہی منٹو نے کہا ''یار کدھر مر گیا تھا میں تیرا کب سے انتظار کر رہا ہوں۔'' میں نے کہا ''اب آ گیا ہوں۔ کیا حکم ہے؟'' کہنے لگے کیا حکم ہے کیا۔ صبیحہ پر مضمون ختم کر دیا ہے۔ باہر چلنا ہے پیسے حاصل کرنے ہیں۔'' میں نے کہا ''تو پھر چلیے باہر چلیں۔'' باہر چلے۔ مضمون منٹو نے بیس روپیہ میں ٹھکانے لگا دیا۔ اس دن واپسی پر وہ مجھے ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش کے ہاں لے گئے تھے یہ اس دور کی بات ہے جبکہ میں ایک ساتھ کئی بیماریوں سے رسم دوستی نباہ رہا تھا اور مختلف اسپیشلسٹ ڈاکٹروں سے کان، ناک، حلق اور آنکھوں کا علاج کروا رہا تھا۔ یہ وہ دن تھے جبکہ میں جس ڈاکٹر کے پاس بھی جاتا وہ کوئی نہ کوئی مرض میں مبتلا بتلاتا تھا۔ میں کافی پریشان تھا۔ آنکھیں تھیں تو کافی کمزور، حلق کی تکلیف تھی تو شدید، آخر تنگ آ کر اس دن میں نے منٹو سے کہا ''مر رہا ہوں خدا کے لئے کچھ تو کروا دیجئے۔ ورنہ بس چند دنوں کا اور مہمان ہوں۔'' تو منٹو نے کہا تھا۔ ''کس کے ہاں چلنا چاہتے ہو۔'' میں نے کہا ''پاکستان کا جو سب سے بڑا ڈاکٹر ہے اسی کے پاس چلئے۔'' کہنے لگے ''پھر بھی بتلاؤ کس کے پاس۔'' میں نے کہا ''ڈاکٹر الٰہی بخش کے سوا کون ہوسکتا ہے۔'' بہر حال ڈاکٹر الٰہی بخش کے پاس چلے۔

ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش سے منٹو نے کہا ''اے میرا پرا اے، بہتیاں بیماریاں وسدا اے، اینو ویکھو۔

اینوں کش ہویاوے کہ ایویں بہانے پیہ کرداوے(یہ میرا بھائی ہے کئی بیماریاں بتلاتا ہے۔اسے کچھ ہوا ہے بھی یا بہانے بناتا ہے)

ڈاکٹر الٰہی بخش نے مجھ سے پوچھا''کہ تکلیف اے تہانوں''(آپ کو کیا تکلیف ہے)

میں نے فنافٹ (فرفر) کئی تکلیفیں گنادیں، ظاہر ہے کہ اس کی کیا کمی تھی!

الٰہی بخش نے تفصیلی معائنہ کیا اور پھر کچھ دوائیں تجویز کیں۔پھر منٹو سے گپ شروع کردی۔

منٹو سے کچھ دیر بعد کرنل صاحب نے پوچھا''ایہے تواڈا سگا پراوے''(تمہارا یہ سگا بھائی ہے)

منٹو نے کہا''بس میرا پراای سمجھلو''(بس میرا بھائی ہی سمجھ لو)

کرنل الٰہی بخش نے مجھ سے پوچھا''تو پراایں منٹو دا،''(تو منٹو کا بھائی ہے)

میں نے پنجابی میں جواب دیا''تہانوں شبہ کیوں ہو رہیا اے!''(آپ کو شبہ کیوں ہو رہا ہے)

میری پنجابی ظاہر ہے مبتدی کی پنجابی تھی اور ٹوٹی پھوٹی پنجابی سے میرے بھائی ہونے کا بھانڈا پھوٹ گیا۔

کرنل صاحب ہنس پڑے کہنے لگے''تو ہاڈے پرانوں تے پنجابی وی نئیں آندی،''(تمہارے بھائی کو پنجابی بھی تو نہیں آتی)

منٹو نے کہا''اینو پنجابی تے نیں آندی فیروی کوشش کردوااے ایس گلے میرا پرااے''

(اسے پنجابی بولنی تو نہیں آتی لیکن کوشش کرتا ہے بس اسی لئے میرا بھائی ہے)

پھر اُردو میں کہنے لگے''میرے جتنے غیر پنجابی دوست رہے ہیں اس قدر کبھی بھی پنجابی دوست نہیں رہے اور وہ میرے غیر پنجابی دوستوں میں اسد ہی ہے جو کبھی مذاق کے موڈ میں ہو یا سنجیدہ کبھی بھی پنجابیوں کے متعلق کچھ نہیں کہا اور جب بھی کچھ کہا ہے تعریف میں کہا ہے۔''

الٰہی بخش نے کہا''یہاں ہی کے آدمیوں کے ساتھ رہتے ہوں گے۔''

منٹو نے جواب دیا''میں نے آج تک اسے کبھی کسی حیدرآبادی یا ہندوستانی کے ساتھ نہیں دیکھا۔ہمیشہ پنجابیوں کے ساتھ رہتا ہے اور پنجاب کی تعریف کرتا ہے۔

میں نے کہا''پنجاب فیض، چغتائی، کرشن چندر اور ندیم قاسمی کی جنم بھومی ہے۔پنجاب کے کیا کہنے۔''

منٹو بہت بگڑ گئے اور کہنے لگے''میرا نام تم نے نہیں لیا، کیا میں بڑا آدمی نہیں ہوں۔پنجاب میری جنم

بھومی نہیں ہے۔"

میں نے کہا' آپ تو کشمیری ہیں نا۔"

سارا غصہ یک لخت اُتر گیا اور لبوں پر مُسکراہٹ دوڑ گئی کہنے لگے"ہاں میں تو کشمیری ہوں۔" اس گفتگو کے بعد اُٹھ پڑے۔ کرنل صاحب کو زور سے سلام علیکم کہا اور اپنے فلیٹ کو انگلش وائن ہاؤس سے ہوتے ہوئے لوٹ آئے اور اسی رات میں لاہور سے کراچی کے لیے روانہ ہو گیا۔

کراچی کے لئے روانہ ہوتے وقت راستے میں پڑھنے کے لئے انہوں نے مجھے اپنی نئی کتاب "سرکنڈوں کے پیچھے" دی تھی اور اس پر لکھا تھا۔

"پیارے اسد۔

سرکنڈوں کے پیچھے کیا کچھ ہوتا ہے وہ تمہیں اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہو جائے گا۔"

یہ کتاب پڑھتا ہوا میں کراچی چلا آیا۔

اور کراچی ہی میں —

ایک دوپہر مجھے میرے ایک دوست نے بتلایا"میں ابھی ریڈیو پر منٹو کی وفات کی خبر سن کر آ رہا ہوں منٹو مر گیا ہے۔"

"آہ" میری زبان سے نکلا اور میں نے کہا"منٹو بھی ہم سے جُدا ہو گئے۔"

ایک بڑا افسانہ نگار تو خیر جدا ہوا۔ ایک بہت بڑا انسان بھی سدا کے لئے بچھڑ گیا ہے ایک ایسا دوست جس کا ثانی نہیں مل سکے گا۔

یادیں طویل ہیں، زخم گہرا ہے، گھاؤ زیادہ ہے، منٹو بہت دور چلا گیا اب اس سے کبھی مُلاقات نہیں ہوگی۔ اس تصور سے آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ یہ اندھیرا اب سدا رہے گا اور اس ریگستان میں اپنی زندگی تنہا ہی گزرے گی۔

آہ! منٹو کے بغیر تنہا زندگی کس قدر تکلیف دہ ہوگی؟

☆☆☆

ابوالحسن نغمی

سعادت حسن منٹو

جب منٹو صاحب کو پہلی بار دیکھا

یہ انیس سو باون کے بیتے دنوں کی باتیں ہیں ان دنوں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور کا طالب علم تھا۔ ان دنوں مال روڈ پر وائی ایم سی اے ہال کے بورڈ روم میں اتوار کی سہ پہر حلقۂ ارباب ذوق کے تنقیدی اجلاس ہوا کرتے تھے۔ میں نے منٹو صاحب کو پہلی مرتبہ وہیں دیکھا۔ منٹو صاحب اپنا افسانہ سنا رہے تھے۔ کمرے میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ ہجوم اتنا تھا کہ تاخیر سے آنے والوں کو دروازے سے داخل ہونے میں دقت پیش آ رہی تھی۔ کرسیاں ناکافی ہو چکی تھیں۔ لوگ کھڑے افسانہ سن رہے تھے۔ اس روز لاہور کے اخباروں میں سنگل کالم کی ایک چار سطری خبر میں اعلان کیا گیا تھا کہ آج حلقۂ ارباب ذوق کے اجلاس میں سعادت حسن منٹو اپنا افسانہ سنائیں گے۔ یہ پُر ہجوم اجلاس اسی چھوٹی سی خبر کا نتیجہ تھا۔

میں اجلاس میں جلدی پہنچ گیا تھا، اس لئے مجھے کرسی میسر تھی۔ میرے برابر میں میرا کلاس فیلو کرامت حیات بیٹھا تھا۔ وہ مجھے بے حد عزیز تھا۔ ہمارے غیر نصابی مشاغل میں سرفہرست شغل یہ تھا کہ ہم دونوں لاہور کی علمی ادبی محفلوں میں نہایت جوش و خروش سے جایا کرتے تھے۔

جب منٹو صاحب افسانہ پڑھ چکے تو حاضرین کو تنقید کی دعوت دی گئی۔ اجلاس میں مظہر انصاری صاحب موجود تھے۔ وہ ان دنوں میاں بشیر احمد کے ادبی رسالے ''ہمایوں'' کے ایڈیٹر تھے۔ وہ اپنے نام کے ساتھ مظہر انصاری دہلوی بی اے آنرز بالالتزام لکھا کرتے تھے۔ انھوں نے منٹو صاحب کے افسانے پر تنقید کرتے ہوئے کہا: ''صاحب صدر اس افسانے کو پڑھ کر لوگوں میں خودکشی کا رجحان پیدا ہو سکتا ہے۔'' اجلاس کے پُر ہجوم ہونے کی وجہ سے منٹو صاحب کو مظہر انصاری کی آواز تو سنائی دی مگر چہرہ نظر نہ

آیا۔ انھوں نے کہا: ''آپ کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہو جائیں۔'' مجھے یوں محسوس ہوا جیسے منٹو صاحب کسی اسکول کے مدرس ہیں اور وہ اپنے کسی برخوردار شاگرد کو کھڑے ہو جانے کا حکم دے رہے ہیں۔ حاضرین مسکرانے لگے۔ مظہر انصاری فرماں بردار شاگرد کی طرح اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

''ہاں، اب آپ اپنا اعتراض دہرایئے۔''

''میں یہ عرض کر رہا تھا کہ آپ کے اس افسانے کو پڑھ کر لوگوں میں خودکشی کا رجحان پیدا ہو سکتا ہے۔''

''تو آپ کے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اگر اس افسانے کو کوئی مظہر انصاری پڑھے گا تو اُس کا خودکشی کرنے کو جی چاہے گا اور اگر وہ مظہر انصاری نہیں ہوگا تو وہ خودکشی نہیں کرے گا۔ اب آپ بیٹھ جایئے۔''

حاضرین میں سے بہت سے لوگ ہنسنے لگے۔ مظہر انصاری نے مزید کچھ نہ کہا۔ ان کے چہرے پر کھسیاہٹ نمایاں تھی۔ جب اجلاس ختم ہوا تو منٹو صاحب ہجوم سے گزرتے ہوئے دروازے سے باہر نکل گئے۔

''ارے جلدی کرو، جلدی کرو، ہمیں منٹو صاحب سے ملنا ہے۔''

کرامت حیات نے مجھ سے کہا۔

اور ہم دونوں وائی ایم سی اے ہال کی سیڑھیوں سے اترنے لگے۔ ہم بہت جلد منٹو صاحب تک پہنچ گئے اور کرامت حیات نے مال روڈ کے فٹ پاتھ پر منٹو صاحب کو سلام کیا اور ہاتھ ملایا۔ منٹو صاحب چلتے چلتے ٹھہر گئے۔

''منٹو صاحب میرا نام کرامت حیات ہے اور یہ ہیں میرے دوست ابوالحسن نغمی ہم دونوں اسلامیہ کالج میں پڑھتے ہیں۔ میں اپنے کالج کی ایک ادبی کمیٹی کا سیکریٹری ہوں۔''

منٹو صاحب کے منہ سے شراب کی بُو آ رہی تھی۔ یہ بُو مجھے ناگوار گزر رہی تھی۔ لیکن مجھے اب تک یاد ہے کہ مجھے اس بات کی مسرت بھی تھی کہ میں ان سے اس قدر نزدیک ہوں۔

کرامت حیات نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:

''منٹو صاحب میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ ہمارے کالج کی ادبی انجمن کے اجلاس

میں تشریف لائیں اور طلبہ کو اپنا کوئی تازہ افسانہ سنائیں۔‘‘

منٹو صاحب نے کرامت حیات کی پُر تکلف اردو کا پنجابی میں جواب دیتے ہوئے کہا:

’’پہلے اپنے کالج دے پرنسپل کولوں پچھ لو کہ مینوں اوتھے بن پیتے آونا ں ہووے گا یا میں تواڈی انجمن دے اجلاس اچ پی کے آ سکناں (پہلے اپنے کالج کے پرنسپل سے پوچھ لو کہ کیا مجھے وہاں بغیر پیئے ہوئے آنا ہوگا یا میں آپ کی انجمن کے اجلاس میں پی کے آ سکتا ہوں‘‘۔)

’’جی اچھا— میں معلومات حاصل کر کے آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔‘‘

’’چنگا‘‘ منٹو صاحب نے ہم دونوں سے ہاتھ ملایا اور وہ ریگل چوک کے رخ پر چل دیئے۔

کرامت حیات اسلامیہ کالج کی جس ادبی انجمن کے سیکریٹری تھے، اس کے نگرانِ مطلق لائق صد احترام فارسی کے استاد مولانا علم الدین سالک مرحوم و مغفور تھے۔ وہ اپنی داڑھی کو خضاب آلودہ رکھنے کی کوشش تو کرتے تھے مگر پابندی نہ کرنے سے ان کی ریشِ مبارک کھتئی رنگ کی ہو جاتی تھی اور سفید بال نمایاں ہو جاتے تھے۔ وہ پگڑی باندھتے تھے، شلوار اور اچکن پہنتے تھے اور اپنی گفتگو میں تکیہ کلام کے طور پر کہا کرتے تھے: ’’اور یہ ہے کہ —‘‘

کیا اب بھی یہ بتانے کی ضرورت باقی ہے کہ اگر کرامت حیات نے اسلامیہ کالج کی ادبی انجمن کے اجلاس میں سعادت حسن منٹو کو افسانہ پڑھنے کی دعوت دینا چاہی بھی ہوگی تو مولانا نے کیا فرمایا ہوگا: ’’اور یہ ہے کہ ایسے فحش نویس شرابی کا یہاں کیا کام؟‘‘

کرامت حیات ایک دن اپنی ادبی انجمن کے اجلاس میں شوکت تھانوی کو لانے میں تو کامیاب ہو گئے لیکن منٹو صاحب کو وہ کبھی مدعو نہ کر سکے۔

منٹو صاحب سے پہلی ملاقات

اسلامیہ کالج میں میری طالب علمی کا دور ختم ہوا۔ اب میں ادب اور صحافت کے بحرِ مواج میں جاں بر ہونے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ ان دنوں میں اپنی بیوی اور ایک ننھی بچی کے ساتھ ’’بیت القیام‘‘ نامی ہوٹل کے ماہانہ کرائے داروں والے سکونتی یونٹ میں رہا کرتا تھا۔ میکلوڈ روڈ پر رتن سنیما کے سامنے یہ ہوٹل، ان دنوں ان ترقی پسند ادیبوں کا گڑھ بنا ہوا تھا جنھوں نے احمد ندیم قاسمی والے ترقی پسند دھڑے سے

الگ ہوکر اپنی علیحدہ انجمن بنالی تھی۔نام انگریزی میں تھا یعنی پروگریسیو مارکسسٹ لٹریری فرنٹ Progressive Marxist Literary Front تھا،اس کے بانی ظہیر کاشمیری تھے۔وہ احمد ندیم قاسمی، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور اور فیض احمد فیض کی مخالفت میں دن رات مصروف رہا کرتے تھے۔وہ ان ادیبوں کو رجعت پسند قرار دے رہے تھے۔

ترقی پسند مصنفین کی مرکزی انجمن نے سعادت حسن منٹو کو فحش نویس قرار دے کر اپنی انجمن سے خارج کردیا تھا۔ حالاں کہ اصل سبب یہ نہیں تھا بلکہ منٹو صاحب کے وہ نظریات تھے جن کا تعلق قیام پاکستان اور کشمیر میں ہندوستان کی فوج کی موجودگی سے تھا۔منٹو صاحب سے غالباً ظہیر کاشمیری نے اپنی نئی انجمن کا ذکر کیا ہوگا۔ممکن ہے کہ انھوں نے اپنی انجمن میں منٹو صاحب کو مدعو بھی کیا ہو۔

ایک شام میں نے منٹو صاحب کو شیروانی میں ملبوس بیت القیام میں اس اجلاس کو تلاش کرتے ہوئے دیکھا جس کے بانی ظہیر کاشمیری تھے۔جب انھیں اجلاس کا سراغ نہ ملا تو وہ ہوٹل کی بالائی منزل پر پہنچ گئے۔تب انھیں کسی نے بتایا کہ اجلاس تو اتوار کو ہوتا ہے،اس روز اتوار نہ تھا۔ میں نے منٹو صاحب کو نگاہِ اشتیاق سے دیکھا تو ضرور مگر آگے بڑھ کر نہ ہاتھ ملایا نہ بات کی۔وہ پرچھائیں کی طرح آئے اور چلے گئے۔ مجھے بہت دنوں تک پچھتاوا رہا کہ کاش میں ان سے مل لیتا۔ میں نے تہیہ کرلیا کہ اب اگر وہ نظر آئے تو میں ان سے ہاتھ بھی ملاؤں گا اور بات بھی کروں گا۔

چند روز اور گزر گئے۔پھر ایک روز شام کے دھند لکے میں مال روڈ کے فٹ پاتھ پر میں نے منٹو صاحب کو دیکھا۔ہم دونوں ایک ہی رخ پر،ایک ہی فٹ پاتھ پر جا رہے تھے۔وہ آگے آگے اور میں پیچھے پیچھے۔اگر آپ لاہور کے ریگل چوک سے ٹولنٹن مارکیٹ کے رخ پر جا رہے ہوں تو آپ اس منظر کا تصور کرسکتے ہیں۔ہم دونوں مال روڈ کے بائیں جانب،فٹ پاتھ پر چل رہے تھے۔میرے بائیں جانب جب شراب کی دکان آئی تو منٹو صاحب اس دکان کے اندر چلے گئے۔ مجھے ان سے ملنے کا بے حد اشتیاق تھا،میں بھی شراب کی دکان کے اندر چلا گیا۔میں نے منٹو صاحب کو سلام کیا،انھوں نے سلام کا جواب دیا اور کسی تعارف کے بغیر ہی مجھ سے نہایت دوستانہ انداز میں بے تکان بولنے لگے۔وہ اس انداز سے بول رہے تھے، جیسے وہ مجھے روزِ ازل سے جانتے ہیں۔

منٹو صاحب نے شراب کی بوتل خریدی، چھوٹی سی گہرے عنابی رنگ کی بوتل تھی۔ بعد میں معلوم

ہوا کہ پاکستان کی بنی ہوئی اس شراب کا نام ''جم خانہ'' تھا۔ جب منٹو صاحب سے میرا ربط بڑھا تو وہ اسے ہمیشہ ''یتیم خانہ'' ہی کہا کیے۔ دکان دار نے بوتل کو ردی اخبار میں اچھی طرح لپیٹا۔ منٹو صاحب نے دکان دار کو کرنسی نوٹ دیا، اس نے کچھ ریزگاری واپس کی۔ پھر اس نے ردی اخبار میں لپٹی ہوئی بوتل منٹو صاحب کے حوالے کی۔

اس تمام عرصے میں منٹو صاحب مجھ سے مسلسل بولتے رہے۔ جب وہ بوتل لے کر دکان سے باہر نکلے تو میں بھی ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ میں لکشمی مینشنز تک ان کے ساتھ گیا۔ وہیں ان کا گھر تھا۔ جب وہ اپنے گھر میں جانے لگے تو میں نے ان سے کہا: ''منٹو صاحب کیا میں پھر کسی وقت آپ سے ملنے آؤں؟''

''ہاں ٹھیک ہے''۔

ان کا یہ کہنا کہ ''ہاں ٹھیک ہے'' یہ میرے لئے خاصا حوصلہ افزا تھا۔ اس پہلی ملاقات کے بعد میں گاہے بگاہے ان کے ہاں جانے لگا۔

پہلی ملاقات میں انھوں نے ایک بار بھی نہ تو میرا نام پوچھا اور نہ یہ معلوم کیا کہ میں کون ہوں۔ کہاں رہتا ہوں، کیا کرتا ہوں۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ پہلی ہی مرتبہ کسی اجنبی شخص کو یا تو ہمیشہ کے لئے مسترد کر دیا کرتے تھے یا قبول کر لیا کرتے تھے۔ وہ جسے ایک بار مسترد کر دیا کرتے تھے اسے کبھی اپنے قریب بھٹکنے ہی نہ دیتے تھے، خواہ وہ کتنی ہی کوشش کرے اور جسے وہ قبول کر لیا کرتے تھے۔ اس کا نام پتا پوچھے بغیر اس طرح گھل مل کر باتیں کرتے تھے کہ گویا وہ اس شخص کو ہمیشہ سے جانتے ہیں۔ جب میں انھیں اچھی طرح سے جان گیا تو مجھے اس بات پر پختہ یقین ہو گیا کہ منٹو صاحب کو اپنے باطن کے نہاں خانوں سے کچھ اشارے ملا کرتے ہیں، انھی کی بنا پر وہ لوگوں کو پسند یا ناپسند کرتے ہیں۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ ان دنوں میں بیت القیام میں رہا کرتا تھا۔ یہ جگہ منٹو صاحب کے گھر سے زیادہ دور نہیں۔ پیدل بھی جایا جا سکتا ہے۔ ان دونوں میرے پاس بائیسکل تھی۔ چلئے اس وقت میں آپ کو بیت القیام سے منٹو صاحب کے گھر لے چلوں۔ مسرت کی بات یہ ہے کہ لاہور میں بیت القیام اور منٹو صاحب کا گھر — دونوں ہی اپنی جگہ موجود ہیں۔ اللہ کرے ہمیشہ موجود رہیں۔ ہم بیت القیام سے نکل کر بائیں جانب میکلوڈ روڈ پر آ گئے ہیں۔ کچھ ہی فاصلے پر لکشمی چوک ہے۔ وہاں سے گزرتے ہوئے ہم بائیں جانب مڑ کر بیڈن روڈ پر چل رہے ہیں۔ اب بیڈن روڈ ختم ہونے کے قریب ہے۔

آگے مال روڈ ہے۔ مال روڈ تک جانے کی ضرورت نہیں، کیونکہ مال روڈ سے اک ذرا پہلے، دائیں ہاتھ کی گلی منٹو صاحب کے محلے میں جاتی ہے۔ اس محلے کا نام لکشمی مینشنز ہے۔ قیامِ پاکستان سے پہلے یقیناً یہاں ہندوؤں کے خوشحال گھرانے آباد ہوں گے۔ خوش قطع اور خوش وضع دو منزلہ مکانوں کا یہ نظر افروز چھوٹا سا محلّہ اپنے محل وقوع کے لحاظ سے لاکھوں میں ایک ہے۔ تین انتہائی اہم سڑکیں اس محلے کو اپنے بازوؤں میں لئے ہوئے ہیں۔ منٹو صاحب کے دروازے پر کھڑے ہوں تو سامنے مال روڈ، دائیں جانب ہال روڈ اور بائیں جانب بیڈن روڈ، لطف کی بات یہ ہے کہ اس محلے کو اس طرح مرتب کیا گیا ہے کہ کسی بھی سڑک کا منظر منٹو صاحب کے دروازے سے نظر نہیں آتا۔ وقت تحلیل ہو چکا ہے، ہم بیسویں صدی کے نصف دوم میں بخیریت پہنچ کر ایک دوسرے سے ہم کلام ہیں۔ یہ دیکھ کر کہ آپ بھی میرے ساتھ ساتھ ہیں میری خوشی کی کوئی حد وانتہا نہیں۔ یہ سن انیس سو باون کا لکشمی مینشنز ہے۔ نہایت صاف ستھرا، شور غل سے محفوظ و مامون محلّہ، یہاں اکادکا مکان، دھیمے مزاج والے اینگلو پاکستانیوں اور پارسیوں کے بھی ہیں۔ کوڑے کرکٹ کا نام ونشان نہیں۔ منٹو صاحب کے گھر کی بالائی منزل پر ذکیہ جلال او رحامد جلال رہتے ہیں۔ حامد جلال، منٹو صاحب کے بھانجے بھی ہیں اور ہم زلف بھی ہیں۔ پروفیسر جی ایم اثر بھی منٹو صاحب کے پڑوسی ہیں پروفیسر صاحب رات کے وقت بھی کالا چشمہ لگاتے ہیں۔ کاش وہ منٹو کے پڑوسی نہ ہوتے۔ کیا وہ جی ایم اثر کو دیکھ کر کہتے ہوں گے کہ:

''میرے قاتل مرے دلدار میرے پاس رہو۔''

لکشمی مینشنز میں صبیح صورت اینگلو پاکستانیوں اور پارسی ہمسایوں کی موجودگی سے منٹو صاحب کو بمبئی بہت یاد آتا ہوگا۔ اس محلے سے ملی ہوئی بیڈن روڈ پر ایک پارسی کی بیکری ہے۔ یہ پارسی نہایت روانی سے فارسی بولتا ہے۔ ایران بھی ہو آیا ہے۔ مال روڈ پر شراب کی دکان کا مالک بھی پارسی ہے۔ اس کا نام ایڈل جی ہے۔ منٹو صاحب کو کتنی سہولت ہے کہ ایڈل جی کی دکان گھر سے زیادہ دور نہیں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ''پاکستان'' میں شراب صرف مریضوں اور ''کافروں'' کو سرکاری اجازت نامہ دکھا کر ہی ملتی ہے۔ مگر ایڈل جی منٹو صاحب کا یار ہے، وہ بھلا ان سے پرمٹ کیوں مانگے گا اور پھر ایک بات یہ بھی تو ہے کہ منٹو صاحب نے کچھ ایسی طبیعت پائی تھی کہ ایک ذرا سی دیر میں جس سے خوش ہوتے تھے اسے اپنا یار بنا لیا کرتے تھے۔

قصہ سوتے جاگتے کا

ابتدائی ملاقاتوں میں منٹو صاحب میرے نام کے حصہ اول سے خاصا لطف لیتے رہے۔ کہا کرتے تھے: ''یار آپ وہی ابوالحسن تو نہیں ہیں جس کا ذکر الف لیلہ میں ہے۔۔۔ ''قصہ سوتے جاگتے کا۔''

آپ کو یقیناً الف لیلہ کا وہ قصہ تو یاد ہوگا جس میں خلیفہ ہارون الرشید بھیس بدل کر موصل کے سوداگر ابوالحسن سے ملا تھا۔

منٹو صاحب سے میرے تعلقات کی نوعیت

میں عرض کر چکا ہوں کہ منٹو صاحب عمر میں مجھ سے اٹھارہ سال اور پانچ مہینے بڑے تھے۔ میرا نہایت دیانت دارانہ دائمی تاثر یہ ہے کہ وہ مجھے شفقت بھری نظر سے یوں دیکھتے تھے۔ جیسے کوئی بڑا اپنے سعادت مند چھوٹے بھائی کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔

اُن کے انتقال کے چند روز بعد صفیہ بھابھی نے مجھے بتایا:۔

''انتقال سے تین دن پہلے سعادت نے مجھ سے کہا تھا کہ صفیہ نعّمی بہت دنوں سے نہیں آیا۔''

منٹو صاحب کی وفات کے بعد ایک مرتبہ جب میں نے صفیہ بھابھی سے کہا کہ ''بھابھی میں نے آلیور گولڈ سمتھ Oliver Goldsmith کے کامیڈی ڈرامے ''شی سٹوپس ٹو کانکر'' She Stoops to Conquer پر مبنی ایک فلمی کہانی لکھی ہے۔ میں اس کہانی کے سلسلے میں بمبئی جانا چاہتا ہوں، آپ عصمت چغتائی کے نام تعارفی رقعہ لکھ دیجئے تو اُنہوں نے رقعے میں لکھا تھا۔

''اس لڑکے کو میں تمہارے پاس بھیج رہی ہوں، سعادت اِسے اچھا سمجھتے تھے اس نے فلم کیلئے ایک انگریزی کہانی کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔''

''اسی رقعے میں بھابھی نے یہ بھی لکھا تھا کہ ''جب میں سوچتی ہوں تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ سعادت کے بعد اب یہ زندگی کیسے گزرے گی، تینوں بچیاں ابھی بہت چھوٹی ہیں۔''

جب میں بھابھی کے اس رقعے کو یاد کرتا ہوں تو صفیہ بھابھی کی ایک بہت ہی معصومانہ بات یاد آیا کرتی ہے، انہوں نے ترجمہ کو ''ترجعہ'' لکھا تھا۔ اب سوچتا ہوں تو اپنے دل میں کہتا ہوں کہ میرے بڑی بہن جیسی پیاری بھابھی نے نہ تو کبھی ادیب ہونے کا دعویٰ کیا نہ وہ انشاء پرداز ہونے کی مدعیہ تھیں لیکن

آج کل جب میں اردو کے نہایت معروف ادیبوں کے مسودے پڑھتا ہوں تو ہر صفحے پر مجھے املا کی غلطیوں کے کیڑے مکوڑے بکثرت نظر آتے ہیں۔

منٹو صاحب نے مجھے پبلشر سے معاوضہ وصول کرنے کا گر سکھایا

ایک دن میں نے منٹو صاحب کو بتایا کہ شہر کے ایک پبلشر نے مجھ سے فرمائش کر کے اپنے بتائے ہوئے کسی موضوع پر کتاب لکھوائی ہے اور اب وہ مجھے معاوضہ دینے میں ٹال مٹول کر رہا ہے۔ نہ جانے کتنی مرتبہ اُس کے دفتر جا چکا ہوں مگر جب بھی جاؤ، انتہائی شائستگی سے دوبارہ آنے کو کہتا ہے۔

منٹو صاحب نے نہایت توجہ سے میری دکھ بھری کہانی سُنی اور کہنے لگے ''کیا آپ تنہائی میں معاوضہ طلب کرتے ہیں؟''

میں نے کہا: ''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔''

کہنے لگے: ''پبلشر سے معاوضہ ہمیشہ اس وقت مانگا کرو جب اس کے دفتر میں دو چار لوگ بیٹھے ہوں — وہ اپنی رسوائی سے ڈرے گا اور فوراً اپنے اکاؤنٹینٹ کو آواز دے کر رقم کی ادائیگی کی ہدایت کرے گا۔''

نغمی کو بتاؤ کہ بارایٹ لا کہنا غلط ہے

گرمیوں کی ایک شام، جب میں لکشمی مینشنز گیا تو منٹو صاحب اپنے گھر کے آگے چند کرسیاں بچھا کر بیٹھے تھے۔ ان کے بالمقابل کوئی نوجوان ان سے ہمکلام تھا۔ میں سلام کر کے ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ انہوں نے نوجوان کا تعارف کراتے ہوئے مجھ سے کہا: نغمی یہ میرا بھتیجا ہے، خالد حسن، یہ انگلینڈ سے بیرسٹر ہو کر آیا ہے۔'' منٹو صاحب کی آواز میں مسرت اور فخر کی چمک دمک تھی۔ پھر انھوں نے اپنے خوبرو جواں سال بھتیجے سے کہا: ''تم نغمی کو بتاؤ کہ بارایٹ لا کہنا غلط ہے، بیرسٹرایٹ لا کہنا درست ہے۔''

اور خالد حسن صاحب فوراً فرماں بردار کم سن بچے کی طرح مجھ سے مخاطب ہو کر وہی سب کچھ بتانے لگے جو میرے آنے سے پہلے اپنے چچا کو بتا چکے تھے۔

انسٹھ برس بعد منگل ۲۷ر مارچ ۲۰۱۲ء کو میں نے منٹو صاحب کی منجھلی بیٹی نزہت کو فون کر کے پوچھا: ''کیا تم جانتی ہو کہ خالد حسن صاحب بیرسٹر اب کہاں ہیں؟'' انھوں نے جواب دیا کہ وہ لندن میں آباد ہیں۔ یہ سن کر مجھے بے حد مسرت ہوئی۔ میں نے ان سے خالد حسن صاحب کا فون نمبر حاصل کر کے اسی لمحے انھیں فون کر کے اس واقعے پر مبنی اپنی اس تصنیف کا اقتباس پڑھ کر سنایا تو انھوں نے پُر جوش آواز میں جواب دیتے ہوئے کہا: ''یہ بالکل درست ہے۔ میں بیرسٹرایٹ لا ہونے کے بعد ۱۹۵۳ء میں لاہور واپس پہنچا تھا اور چچا کو سلام کرنے حاضر ہوا تھا اور میں نے ان سے کہا تھا کہ بارایٹ لا کہنا غلط ہے، بیرسٹرایٹ لا کہنا درست ہے۔

میں نے ان سے کہا کہ: ''جناب اس شام سے لے کر آج تک میں انسٹھ سال سے یہی سوچ رہا ہوں کہ اگر بارایٹ لا کہنا غلط ہے تو آخر کیوں غلط ہے اور میں سوچا کرتا تھا کبھی آپ مل جائیں تو آپ سے پوچھوں۔''

خالد حسن صاحب نے میرے سوال کا انگریزی جواب دیتے ہوئے کہا:

The Word is Barrister and it cannot be Abbreviated

منٹو صاحب مجھے کچھ نہ کچھ سمجھانے اور سکھانے کے سلسلے میں پر شوق رہا کرتے تھے۔

نالے اے وی دسو کہ پتر کس دے او

ایک روز شام کو میں منٹو صاحب سے ملنے گیا۔ جب میں ان کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو میں نے ایک نہایت وجیہ و صبیح شخص کو دیکھا۔ رنگ انگریزوں جیسا گورا تھا۔ ان صاحب نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا: ''ناچیز کو قطب الدین فصیح کہتے ہیں۔''

منٹو صاحب نے اس تعارف کو کافی نہ سمجھا اور کہا: ''نالے اے وی دسو کہ پتر کس دے او۔''

تب انھوں نے کہا:۔ میں سائل دہلوی کا بیٹا ہوں۔''

اب واقعی مجھے زیادہ مسرت ہوئی کیوں کہ میں جانتا تھا کہ میں نہ صرف یہ کہ حضرت سائل دہلوی کے بیٹے سے ملاقات کر رہا ہوں بلکہ مجھے اس بات کی بھی مسرت تھی کہ میں داغ دہلوی کے نواسے سے ہم کلام ہوں۔

ارے تم ٹرمینس کے معنی نہیں جانتے

ایک شام کو منٹو صاحب نے اپنی گفتگو کے دوران میں جب انگریزی کا لفظ ''ٹرمینس'' استعمال کیا تو وہ میری صورت کو دیکھ کر سمجھ گئے کہ مجھے اس لفظ کے معنیٰ نہیں آتے۔ انھوں نے فوراً پوچھا: ''تم ٹرمینس کا مطلب سمجھتے ہو؟''

''مجھے اس لفظ کے معنیٰ نہیں معلوم''

''ارے تم ٹرمینس کے معنیٰ نہیں جانتے۔'' ان کی آواز میں کچھ ایسی کیفیت تھی کہ جیسے وہ کہہ رہے ہوں کہ یہ کیسا لڑکا ہے کہ اسے ٹرمینس کے معنیٰ نہیں آتے۔ پھر انھوں نے بمبئی کے آخری ریلوے اسٹیشن ''وکٹوریہ ٹرمینس'' کی مثال دے کر سمجھایا اور کہا چوں کہ آگے صرف سمندر ہے اور ریل گاڑی آگے جا ہی نہیں سکتی، اس لئے اس آخری اسٹیشن کو ٹرمینس کہا گیا ہے۔ ٹرمینس اختتام کو کہا جاتا ہے۔

میں اس شام کو جب بھی یاد کرتا ہوں، میرا دل یہ سوچ کر دکھ سے بھر جاتا ہے کہ اس لفظ کے معنیٰ پر گفتگو کرنے والے میرے شفیق بزرگ کا ٹرمینس آچکا تھا۔

میں ان شاءاللہ مناسب موقع پر یہ بھی بتاؤں گا کہ لفظ ''ٹرمینس'' ہماری گفتگو کے دوران میں کیوں آیا تھا۔

بچوں جیسی شوخیاں

ایک دن جب میں منٹو صاحب کے کے گھر گیا تو وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے: ''تم بھی میرے ساتھ چلو۔''

''کہاں''

''آج ترقی پسند مصنفین کے اجلاس میں مجھے افسانہ پڑھنے کے لئے بلایا گیا ہے۔ میں وہاں صرف دو صفحے کا ایک افسانہ سناؤں گا، لیکن میں نے دو ورق اوپر رکھ کر سادہ کاغذوں کا خوب موٹا سا تھدّا رکھ لیا ہے۔''

انھوں نے مجھے دکھایا تو واقعی ضخامت اتنی تھی کہ جیسے انھوں نے کوئی ناول لکھ ڈالا ہو۔

میں نے دل میں سوچا کہ اجلاس کے تمام حاضرین کس قدر پریشان ہوں گے کیوں کہ وہ اس قدر

طویل افسانہ سننے کے لئے کم از کم دو گھنٹے درکار تھے اور اجلاس میں کسی شاعر کو اپنی غزل اور کسی مقالہ نویس کو اپنا مقالہ تنقید کے لئے پیش کرنا تھا۔

ہم دونوں مال روڈ پر نقی بلڈنگ میں پہنچے تو حاضرین موجود تھے۔ منٹو صاحب نے جاتے ہی کہا:

''مجھے سب سے پہلے پڑھوایا جائے کیوں کہ یہ دیکھئے میرا افسانہ تو بہت طویل ہے۔''

افسانے کی ضخامت کا اندازہ کر کے حاضرین کے چہروں پر پریشانی کے آثار نمایاں ہوئے مگر کسی نے زبان سے کچھ نہ کہا اور صاحب صدر نے کہا: ''جی منٹو صاحب، ارشاد۔''

منٹو صاحب نے پانچ منٹ میں افسانہ پڑھ کر کہا: ''افسانہ ختم ہوا، تنقید فرمایئے۔''

حاضرین حیرت زدہ نظر آ رہے تھے۔ خاصی دیر تک سکوت رہا۔ میں نے نہایت ادب اور احتیاط سے رک رک کر کہا: ''آپ نے اس افسانے کا عنوان جو ''گھس کھدا'' رکھا ہے۔ اس کے املا اور تلفظ کے بارے میں عرض ہے کہ اس لفظ میں ''د'' کے حرف پر تشدید ہے۔ اس کا تلفظ ''گھس کھدّا'' ہے۔ اب منٹو صاحب نے مجھے حیرت زدہ کر دیا۔ انھوں نے مطلق کوئی بحث نہ کی، جیب سے قلم نکالا اور ''د'' پر تشدید کی علامت بنا کر بولے: ''املا درست کر دیا ہے۔ اب افسانے پر تنقید ہونا چاہئے۔''

افسانے پر کسی نے کوئی تنقید نہ کی، البتہ چند لوگوں نے محاسن ضرور بیان کیے۔ اس افسانے میں ایک مقام پر منٹو صاحب نے ایک شکست خوردہ عورت کو ایک ایسی بھیگی ہوئی پتنگ سے تشبیہ دی تھی جو اڑائی نہ جا سکتی تھی۔ اس تشبیہ کی بہت تعریف کی گئی۔

اس افسانے کا مسودہ کہاں ہے؟

میں نے ''گھس کھدا'' کے عنوان سے منٹو صاحب کے اس افسانے کو مطبوعہ صورت میں نہ تو کسی رسالے میں دیکھا اور نہ ان کے افسانوں میں کسی مجموعے میں نظر سے گزرا۔ یقیناً ان کی بعض تخلیقات کے مسودے ضائع ہوئے ہوں گے۔ کیا ان کے گم شدہ مسودوں کی بازیابی ممکن ہے؟ اس پر تحقیقی کام کی ضرورت ہے۔

موذیل کوئی نہ تھی

ایک دن انھوں نے مجھے بتایا: ''میرے افسانوں میں ایسے واقعات اور کردار نہیں ہوتے جنھیں میرے Imagination کا نتیجہ کہا جا سکے۔ البتہ میرا افسانہ موذیل سارے کا سارا Imagination ہے۔

میں بن پیئے نہیں لکھ سکتا

ایک دن منٹو صاحب کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ان سے باتیں کر رہا تھا۔ صفیہ بھابھی بھی موجود تھیں۔ منٹو صاحب نے اپنی معذوری اور مجبوری بیان کرتے ہوئے کہا: 'میرے ساتھ دقت یہ ہے کہ میں بن پیئے افسانہ ہی نہیں لکھ سکتا۔ میرے وہ تمام افسانے جو مقبول ہوئے وہ میں نے پی کر لکھے ہیں۔'' صفیہ بھابھی نے انھیں فوراً ٹوکا اور کہا: ''غلط بالکل غلط'' اور پھر انھوں نے ان کے کئی بہترین افسانوں کا ذکر کیا جو انھوں نے بن پیئے لکھے تھے۔ ان میں ان کا شاہکار افسانہ ''نیا قانون'' بھی تھا۔

منٹو صاحب صفیہ بھابھی کے ان حوالوں کو سن کر لاجواب ہو گئے اور انھوں نے فقط یہ کہا: ''ہاں، مگر اب میں بن پیئے لکھنے کے قابل نہیں رہا۔''

منٹو صاحب کے وہ احباب جو انھیں مے نوشی کی ترغیب دیا کرتے تھے، ان میں ایک پروفیسر جی ایم اثر تھے۔ جو ان کے ہمسائے تھے۔

منٹو صاحب نے مجھ سے کبھی نہیں کہا کہ تم بھی پیا کرو

ایک شام میں منٹو صاحب سے ان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ان سے باتیں کر رہا تھا۔ شاد امرت سری بھی موجود تھے۔ شاد نے گفتگو کے دوران میں کہا: ''جو لوگ شراب نہیں پیتے وہ بھی کیا لوگ ہوتے ہیں۔'' اس وقت منٹو صاحب نشے میں تھے۔ انھوں نے شاد سے پوچھا ''یہ کس کا شعر ہے؟'' میرا گمان یہ ہے کہ اگر وہ نشے میں نہ ہوتے تو انھیں اتنا تو ضرور معلوم ہوتا کہ شاد نے کوئی شعر نہیں سنایا ہے۔

منٹو صاحب کے استفسار پر شاد نے ہنس کر کہا: ''یہ شعر نہیں ہے، میں نے تو بس یوں ہی ایک بات کہی ہے۔''

''اسے فوراً شعر بنا دو۔'' منٹو صاحب نے شاد سے کہا۔

شاد خاموش ہو گئے۔ بات آئی گئی ہو گئی۔

نشے کی کیفیت میں ہونے کی وجہ سے شاد کے جملے پر انھیں شعر ہونے کا گمان گزرا۔ وہ اس جملے سے لطف اندوز بھی ہوئے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا واقعی منٹو صاحب کا یہ خیال تھا کہ جو لوگ شراب نہیں پیتے وہ زاہدِ خشک، بے کیف اور روکھے پھیکے لوگ ہوتے ہیں؟ مجھے نہیں معلوم کہ منٹو صاحب کا کیا خیال تھا لیکن

جو بات مجھے بھرپور احساسِ تشکر اور ممنونیت کے ساتھ یاد ہے، وہ یہ ہے کہ منٹو صاحب نے ایک مرتبہ بھی مجھ سے یہ نہیں کہا کہ: "تم بھی پیا کرو۔" انھوں نے کبھی مجھ سے یہ تک نہ پوچھا کہ: نغمی کیا تم نے کبھی شراب پی ہے؟" انھوں نے کبھی از راہِ ترغیب یہ بھی نہ کہا کہ: "یار گاہے گاہے پی لینے میں آخر حرج ہی کیا ہے۔"

میرے زمانے میں اور میرے لاہور میں ایسے سن رسیدہ، سال خوردہ، بوڑھے ادیبوں اور شاعروں کی کوئی کمی نہ تھی جو نوجوان ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کو مے نوشی کی ترغیب دیا کرتے تھے۔ ہم سے پہلے کے خاصانِ شعر و ادب میں آغا حشر اور سید امتیاز علی تاج سے منسوب یہ لطیفہ بزرگانِ ادب سے ہوتا ہوا ہم تک پہنچا ہے کہ آغا صاحب کا بڑھاپا تھا اور تاج صاحب جوان رعنا تھے۔ بزرگ ڈراما نویس نے اپنے ہاتھ سے "جام مے" "انارکلی" کے مصنف کو پیش کیا اور جب تاج صاحب کا انکار شدت اختیار کر گیا تو آغا صاحب غضب ناک ہو کر دہاڑے:

"ہم تو تمھیں شریفوں کی اولاد سمجھتے تھے، مگر تم تو انتہائی کمینے نکلے۔"

بوڑھے ادیب نوجوان ادیبوں کو اس لئے بھی شراب پینے کی ترغیب دیا کرتے تھے کہ اگر یہ شراب کے عادی ہو جائیں گے تو از راہِ فرماں برداری اپنے پلے سے ہمیں شراب پلایا کریں گے۔ منٹو صاحب ان دنوں نہایت درجہ تنگ دست تھے۔ ان کے لئے یہ نادر موقع تھا کہ وہ لاہور کے خود غرض، مفاد پرست اور موقع شناس مے نوش ادیبوں کی طرح مجھے شراب کا عادی بنا دیتے جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں منٹو صاحب مجھ سے عمر میں اٹھارہ (۱۸) سال پانچ مہینے بڑے تھے۔ میرے ساتھ ان کا رویہ ایک ایسے بڑے بھائی کے مانند تھا جس میں باپ کی شفقت کی بھی جھلک آیا کرتی تھی۔ مجھے کامل یقین ہے کہ وہ قطعاً نہ چاہتے تھے کہ ان کا یہ برخوردار ان کی ترغیب پر شراب کا عادی ہو جائے۔ میں منٹو صاحب سے اس قدر متاثر تھا کہ اگر وہ مجھے شراب پینے کی ترغیب دیتے تو میں یقیناً ان کے ساتھ مے نوشی کا شغل اختیار کرتا اور چند ہی دنوں میں میری عادت پختہ ہو جاتی۔

یہ آپ ایڈل جی کو دے آئیں

جی ہاں، ایک مرتبہ، فقط ایک ہی مرتبہ، شام کے وقت، جب وہ پروفیسر جی ایم اثر کے ساتھ اپنے گھر کی دہلیز پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے تو انھوں نے کاغذ کے پرزے پر کچھ لکھا اور وہ پرزہ اور ایک کرنسی نوٹ مجھے دے کر لجاجت سے کہا: "نغمی آپ یہ ایڈل جی کو دے آئیں اور جو کچھ آپ کو دیں وہ لے آئیں۔"

جی ایم اثر اور منٹو صاحب کی باہمی مے نوشی کا یہ منظر مجھے یاد آیا کرتا ہے کہ وہ دونوں دروازے کے دہلیز پر بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ جب دونوں کے گلاس خالی ہو گئے تو منٹو صاحب خود گلاس لے کر گھر میں گئے اور تھوڑی دیر میں جام بدست واپس آئے اور ان دونوں نے پھر شغل مے نوشی شروع کر دیا۔

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ جب شراب شرابی کے اوسان پر قبضہ کر لیا کرتی ہے تو اکثر دیکھا گیا ہے کہ مدہوشی کے عالم میں شرابی بس ایک ہی جملے کو بار بار دہراتا رہتا ہے۔ اس شام منٹو صاحب کو یہ وہم ہو گیا تھا کہ انھوں نے بھولے سے جی ایم اثر کے گلاس میں پانی کی زیادہ مقدار انڈیل دی ہے۔ اس بھول چوک کا انھیں بے حد ملال تھا۔ وہ جی ایم اثر سے اعلیٰ سطح کے علمی ادبی گفتگو کرتے کرتے اچانک کہتے تھے: ''وہ تو سب ٹھیک ہے مگر یار میں نے بھولے سے تمہارے گلاس میں زیادہ پانی انڈیل دیا ہے۔''

جی ایم اثر منٹو صاحب کی بار بار دل جوئی کرتے تھے اور انھیں یہ باور کرانے کی کوشش کرتے تھے کہ ان کے گلاس میں انھوں نے پانی کی زیادہ مقدار نہیں انڈیلی۔ منٹو صاحب چند لمحوں کے لئے جی ایم اثر کی دل جوئی سے بہل جاتے تھے مگر اک ذرا سی دیر میں وہ پھر یہی کہتے تھے کہ ''وہ تو سب ٹھیک ہے مگر یار میں نے بھولے سے تمہارے گلاس میں زیادہ پانی انڈیل دیا ہے۔''

اُن دنوں منٹو صاحب افلاس اور تنگ دستی کی انتہا کو پہنچے ہوئے تھے اور میں دو سو بیس روپے ماہوار پر

بابائے صحافت مولانا ظفر علی خاں کے اخبار زمیندار میں ملازم تھا۔ مگر منٹو صاحب نے جس شام مجھے ایڈل جی کی دکان پر بھیجا اس شام انھوں نے مجھ سے یہ بالکل نہ کہا کہ نغمی کیا تم ہم دونوں دوستوں کو آج اپنی جیب سے شراب پلا سکتے ہو؟ اچھا تو اس وقت تم ایڈل جی کی دکان سے جم خانے کا ایک پوا تو لے آؤ۔"

میں موقع کا چشم دید گواہ تو نہیں تھا لیکن جن دنوں میں منٹو صاحب کے ہاں جایا کرتا تھا عین انھی دنوں یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ ان کے چند "دوست" جو درحقیقت ان کے بدترین دشمن تھے انھیں گھر سے بہلا پھسلا کر ریگل چوک پر لے جایا کرتے تھے اور لاہور کے کالجوں کے طلبہ انھیں پہچان کر ان کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔ ان میں سے بعض آٹو گراف کی فرمائش کرتے تھے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر یہی دوست نما دشمن ان لڑکوں سے سرگوشی کرتے ہوئے کہتے تھے: "آپ کے عظیم افسانہ نگار کی جیب خالی ہے، یہ اپنی زبان سے کچھ نہیں کہتے لیکن آپ پر تو لازم ہے کہ آپ ان کی مالی مدد کریں۔" اور وہ لڑکے منٹو صاحب سے اظہار عقیدت کے طور پر کچھ نہ کچھ دے دیا کرتے تھے۔ جسے منٹو صاحب کے یہ خود ساختہ دلال وصول کرتے تھے اس طرح منٹو صاحب کے یہ نام نہاد دوست عملاً ان سے بھیک منگوایا کرتے تھے اور پھر اس رقم سے خود بھی پیتے تھے اور انھیں بھی پلاتے تھے لیکن عین انھی دنوں منٹو صاحب نے فقط ایک دفعہ کے سوا مجھ سے کبھی کچھ نہیں مانگا۔ یقیناً وہ اس بات کو بے حد معیوب سمجھتے ہوں گے کہ وہ "مجھ سے بھی" شراب پینے کے لئے پانچ روپے مانگ لیں۔ وہ تو میرے لئے ایک شفیق بھائی کے مانند تھے اور جس شفقت بھری نظر سے وہ مجھے دیکھتے تھے، اس میں اس بات کی گنجائش تھی ہی نہیں کہ وہ شراب پینے کے لیے مجھ سے قرض مانگیں۔ لیکن ایک مرتبہ — جی ہاں صرف ایک مرتبہ رات کے وقت میں اپنے دوست مرزا حامد بیگ کے ساتھ ان سے ملنے گیا تھا۔ حامد بیگ کرشن نگر سے متصل محلے سنت نگر میں رہا کرتے تھے، وہ پیشے کے اعتبار سے کاتب تھے۔ ہم دونوں منٹو صاحب سے مل کر رخصت ہوئے اور گھر سے باہر نکل کر چند ہی قدم چلے ہوں گے کہ وہ دروازہ کھول کر باہر آئے اور انھوں نے بلند آواز سے کہا: "نغمی ٹھہرئے، سنئے، کیا اس وقت آپ کے پاس پانچ روپے ہیں؟"

میرے پاس پانچ روپے نہیں تھے۔ میں نے ان سے کہا "میرے پاس پانچ روپے نہیں ہیں۔"

"اچھا" کہہ کر وہ گھر میں واپس چلے گئے۔ حامد بیگ نے چند قدم چل کر مجھ سے کہا: "نغمی بھائی، میرے پاس پانچ روپے ہیں۔ کیا میں منٹو صاحب کو دے دوں؟"

"ہاں دے دو" میں نے کہا۔

اور پھر ہم دونوں منٹو صاحب کے پاس دوبارہ گئے۔ میں نے منٹو صاحب سے کہا: "منٹو صاحب ان کے پاس پانچ روپے ہیں۔ اور حامد بیگ نے منٹو صاحب کو پانچ روپے کا نوٹ دے دیا۔

میں جب بھی اس واقعے کو یاد کرتا ہوں میرا دل دکھ سے بھر جاتا ہے کہ منٹو صاحب نے مجھ سے بھی پانچ روپے مانگ لئے۔ ۔ اللہ اللہ کوئی مجبوری سی مجبوری ہوگی۔ اس رات کو شراب کی طلب کی شدت نے انھیں کتنی قوت سے بچھاڑا ہوگا۔

اس ایک واقعے کے سوا انھوں نے کم از کم مجھ سے تو کبھی شراب کی طلب سے مجبور ہو کر کوئی بھی رقم نہیں مانگی۔

منٹو صاحب کو اچھی طرح معلوم تھا کہ میں شادی شدہ ہوں اور ایک ننھی منی بچی کا باپ ہوں۔ انھوں نے کبھی تفصیل سے تو نہ پوچھا لیکن انھیں اندازہ ضرور تھا کہ میں صحافت کے سمندر میں طوفانی موجوں سے لڑ کر جاں بر ہونے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہوں۔ ایسے پر آشوب دور میں وہ بلا شبہ میرے نہایت شفیق بڑے بھائی کے مانند تھے۔ وہ خلوصِ دل سے میرے مختصر ترین کنبے کے بہی خواہ تھے۔

منٹو صاحب کا ٹرمینس

۱۹۵۳ء میں اگست کے مہینے میں مجھے خبر ملی کہ منٹو صاحب کو میو ہسپتال میں داخل کر دیا گیا ہے اور وہ بے حد بیمار ہیں۔ اس خبر کو سن کر میری حالت دگرگوں ہوگئی۔ میں فوراً ہسپتال پہنچا۔ میں نے منٹو صاحب کو دیکھا۔ انہوں نے مجھے دیکھا۔ شدید ترین بیماری کے باوجود وہ مجھے پہچان گئے۔ میں نے پوچھا: "کیا حال ہے؟" کہنے لگے: "بس اب تو اللہ ہی اللہ ہے۔" ان کی بے کسی کو دیکھ کر میرا دل دکھ سے بھر گیا۔ میں نے انھیں غور سے دیکھا۔ مجھے یوں نظر آیا کہ جیسے ان کی ناک ٹیڑھی ہو کر مڑ گئی ہے۔ مجھے اپنی اماں کی بات یاد آئی۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ جب نزع کا وقت ہوتا ہے تو ناک مڑ جاتی ہے۔ یہ سوچ کر دل دھڑکنے لگا۔ میں چند منٹ تک ان کے پاس رہا پھر "خدا حافظ" کہہ کر چلا آیا۔ یہ بات مجھے کبھی کبھی یاد آیا کرتی ہے کہ ہسپتال سے واپس آکر میں منٹو صاحب کی علالت سے اس قدر سٹپٹایا ہوا تھا کہ میں نے بیت القیام میں تھوڑے تھوڑے وقفوں سے مجیب خیر آبادی سے دو مرتبہ دریافت کیا: "کیا آپ کو معلوم ہے کہ منٹو صاحب کی حالت بہت نازک ہے اور وہ میو ہسپتال میں ہیں۔ جب میں نے دوسری

مرتبہ مجیب سے وہی سوال کیا تو انھوں نے مجھے عجیب وغریب نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا: ''یہ سوال تو آپ ابھی تھوڑی دیر پہلے کر چکے ہیں۔

پھر میں نے سُنا کہ منٹو صاحب صحت یاب ہو کر گھر واپس آ گئے ہیں۔ ایک دن شام کو میں ان سے ملنے ان کے گھر گیا۔ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اس شام ان کی طبیعت بہت شگفتہ تھی۔ مجھ سے کہنے لگے: ''کیا حال ہے؟''

''اللہ کا شکر ہے۔'' میری آواز میں غم زدگی اور مایوسی کی کیفیت تھی۔ کہنے لگے: ''یار یہ نہ کہا کرو۔ آپ نے اللہ کا شکر کچھ اس طرح سے ادا کیا ہے کہ جیسے کوئی کسی ٹرمینس کا ذکر کرتا ہے۔ آپ ٹرمینس کا مطلب سمجھتے ہیں؟''

''جی نہیں۔'' میں نے کہا۔

''ارے آپ ٹرمینس کا مطلب نہیں جانتے آپ نے وکٹوریا ٹرمینس سنا ہے؟''

''جی ہاں، میں نے سنا ہے کہ وکٹوریا ٹرمینس بمبئی کا مشہور ریلوے اسٹیشن ہے'' میں نے کہا۔

''اچھا تو کبھی یہ نہیں سوچا کہ آخر اُسے وکٹوریا ٹرمینس کیوں کہا جاتا ہے؟''

''جی نہیں، اس بات پر میں نے غور نہیں کیا۔''

''وکٹوریا ٹرمینس کو وکٹوریا ٹرمینس اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ ہندوستان کا آخری ریلوے اسٹیشن ہے۔ آگے تو پھر سمندر ہے، جب آپ ناامید ہو کر کہتے ہیں کہ اللہ کا شکر ہے تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے بس اب ٹرمینس آنے والا ہے۔''

میں نے فوراً انھیں یاد دلاتے ہوئے کہا: ''منٹو صاحب جب آپ ہسپتال میں تھے اور میں نے آپ سے پوچھا تھا کہ آپ کا کیا حال ہے تو آپ نے کہا تھا کہ بس اب تو اللہ ہی اللہ ہے۔''

''اس وقت میرے اعصاب بے حد کمزور تھے۔ جب اعصاب کمزور ہوں تو اللہ بہت یاد آتا ہے۔''

یہ واقعہ جو میں نے آپ کو سنایا، اسے سن کر اگر آپ یہ نتیجہ اخذ کرنا چاہیں کہ منٹو صاحب معاذ اللہ خدا کے منکر تھے تو یہ درست نہ ہوگا۔ ''منٹو صاحب'' منٹو صاحب تھے، وہ ظہیر کاشمیری نہ تھے۔ منٹو صاحب شراب ضرور پیتے تھے لیکن جہاں تک عقائد کا تعلق ہے تو وہ پکے مسلمان تھے۔ وہ افسانہ یا مضمون لکھنے سے پہلے ہمیشہ ۷۸۶ لکھا کرتے تھے۔ ان کی تحریروں میں بھی ایسی بے شمار جھلکیاں نہایت واضح طور پر موجود

اندازہ ہوتا ہے۔

انہوں نے اپنے قیام بمبئی کے دنوں کا ایک واقعہ تحریر کیا ہے۔ بے تکلف دوستوں کی ایک محفلِ مے نوشی تھی۔ سب لوگ پی رہے تھے۔ ایک مغنیہ بھی محفل میں موجود تھی۔ محفل میں کسی نے اس گانے والی سے فرمائش کی کہ وہ نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سنائے تو منٹو صاحب نے مداخلت کرتے ہوئے جو کہا اس سے ان کی محبتِ رسول کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے جو کچھ کہا اس کا مفہوم یہ تھا کہ مے نوشی کی اس ناپاک محفل میں اس ذاتِ پاک کا نام نامی اسم گرامی نہیں لیا جا سکتا۔

سبحان اللہ، کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

با خدا دیوانہ باشم با محمدؐ ہوشیار

ٹرمینس والی بات سے منٹو صاحب مجھے جو نکتہ سمجھانا چاہتے تھے۔ وہ فقط اتنا ہی تھا کہ ہم مسلمان لوگ ہمہ وقت جو افسردگی اور مایوسی میں مبتلا رہا کرتے ہیں اور سرد آئیں بھر کر جو اللہ کا شکر ادا کرتے رہتے ہیں، اس کا اجتماعی نتیجہ یہ ہے کہ پوری قوم پر قنوطیت طاری ہے۔

بے چارے منٹو صاحب خود بھی اسی قنوطیت اور افسردگی کا شکار تھے مگر وہ میرے بزرگ بھائی کی طرح مجھے حالات کا مقابلہ کرنے کی تربیت دے رہے تھے۔ وہ میرے نامساعد حالات سے اچھی طرح سے باخبر تھے۔

منٹو صاحب جاں بر ہو کر میو ہسپتال سے گھر آ گئے۔ انھوں نے شراب پینا چھوڑ دی، وہ اپنے کھانے میں دہی کو باقاعدگی سے شامل کرنے لگے۔ وہ روزانہ غسل کرتے، باقاعدگی سے حجامت کراتے اور کنگھا کر کے اپنے بالوں کو درست کرتے تھے۔ ان کی زندگی کا یہ نیا روپ دیکھ کر میری مسرتوں کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ میں ان کے صحت مندانہ طور طریقوں سے بے حد خوش تھا۔ آہ مجھے اندازہ نہ تھا کہ ان کی زندگی کا ٹرمینس اس قدر قریب ہے۔ بس اگست ۱۹۵۳ء سے جنوری ۱۹۵۵ء تک کل سترہ مہینے باقی رہ گئے تھے۔

غالبؔ سے شدید تعلق خاطر تھا

منٹو صاحب کو غالب سے شدید جذباتی وابستگی تھی۔ انھیں غالب پر کبھی کبھی اس قدر پیار آتا تھا کہ وہ فرطِ محبت سے اسے گالیاں دیا کرتے تھے۔ یوں سمجھئے کہ بس یہ شدید ترین تعلق خاطر کی انتہا تھی۔ وہ گالیاں فحش نہیں ہوتی تھیں۔ وہ غالب کو فرطِ محبت سے کمینہ کہا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ انھوں نے غالب کے ایک خط کا ذکر انتہائی لطف کے ساتھ کیا۔ یہ خط میری نظر سے تو نہیں گزرا۔ آپ نے اگر غالبؔ کے خطوط کے کسی مجموعے میں دیکھا ہو تو مجھے مطلع فرمایئے۔ منٹو صاحب کے بیان کے مطابق مذکورہ خط میں غالب نے کسی خاص قسم کی شراب کا ذکر کیا ہے جسے وہ کسی برتن میں بھر کر نہایت باریک ململ ڈھانپ کر چھت پر رکھ دیا کرتے تھے۔ رات بھر شبنم گرتی رہتی تھی۔ صبح دم غالب اس شبنمی شراب سے شوق فرماتے تھے۔ منٹو اور غالب میں یہ بات بھی تو مشترک تھی کہ غالب بھی ”قرض کی پیتے تھے مے“ اور انھیں بھی اندازہ تھا کہ کسی نہ کسی دن ان کی فاقہ مستی ضرور رنگ لائے گی اور منٹو صاحب بھی لاہور کے مشہور شراب فروش ایڈل جی کے مقروض ہوتے ہی چلے گئے۔ کسی لکھنے والے نے منٹو صاحب اور ایڈل جی کے درمیان جو بک بک جھک جھک ہوئی اسے قلم بند کیا ہے جواب مطبوعہ صورت میں کسی کتاب کا حصہ بن چکی ہے۔ میں چوں کہ موقع کا چشم دید گواہ نہیں ہوں، لہٰذا کچھ عرض نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ منٹو صاحب کے جن نام نہاد دوستوں یعنی بدترین دشمنوں نے انھیں شراب سے تائب نہ ہونے دیا، ان میں تین نام مجھے معلوم ہیں۔ ایک تو پروفیسر جی ایم اثر، دوسرے شاد امرت سری اور تیسرے سراج۔

میں نے سراج کو کبھی نہیں دیکھا۔ صفیہ بھابھی سے نام ضرور سنا ہے۔ وہ ریلوے میں ملازم تھا۔ پروفیسر جی ایم اثر کے بارے میں میں عرض کر چکا ہوں کہ وہ منٹو صاحب کے پڑوسی تھے۔ میں نے انھیں کبھی منٹو صاحب کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے نہیں دیکھا۔ جب بھی دیکھا، شام کے وقت منٹو صاحب کے گھر کی دہلیز پر بیٹھے ہوئے دیکھا۔ میرا قیاس کہتا ہے کہ صفیہ بھابھی کے خوف سے وہ گھر کے اندر آ نہ سکتے تھے۔ ہاں مگر ایک رات، جی ایم اثر اضطراب کے عالم میں منٹو صاحب کے ڈرائنگ روم کے اندر تک چلے آئے تھے لیکن وہ صوفے پر نہ بیٹھے بس کھڑے کھڑے انھوں نے منٹو صاحب کو دہائی دی تھی۔ جی ایم اثر کا سارا واویلا منیر نیازی کے سلسلے میں تھا۔

منٹو صاحب کے دوست نما دشمن

اس واقعے کی تفصیل ان شاء اللہ بعد میں عرض کروں گا۔ فی الحال منٹو صاحب کے اُن تین دوستوں کا ذکر مکمل کر لینے کی اجازت دیجیے۔ دو دوستوں کا ذکر کر چکا ہوں، تیسرے دوست کا نام تھا شاد امرت سری۔ مجھے اس گورے چٹے، خوبرو، خوش لباس، خوش خوراک اور خوش گو کشمیری جوان سال شاعر کا

یہ بات لاہور کے ساغروں اور ادیبوں میں ... [illegible]

کے ریگل چوک لے گئے اور وہاں جب ان کے مداحوں اور آٹو گراف کے طلب گاروں کا ہجوم ہوا تو شاد نے دردمندانہ اپلیں کیں اور جو رقم وصول ہوئی، اس سے خود بھی پی اور منٹو صاحب کو بھی پلائی۔

میں نے بچشم خود یہ منظر کبھی نہیں دیکھا۔ لیکن ۱۹۵۴ء میں ایک شام جب میں منٹو صاحب کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ صفیہ بھابھی بھی موجود تھیں اور جب منٹو صاحب نے اپنی سالگرہ خود منانے کے سلسلے میں گفتگو چھیڑی اور انھوں نے جب یہ کہا کہ میں اپنی سالگرہ کے موقع پر اپنے تمام دوستوں کو بلاؤں گا تو صفیہ بھابھی نے کہا: ''سعادت میں آپ کو ابھی سے بتائے دیتی ہوں کہ اگر شاد امرت سری آپ کی سالگرہ پر آیا تو میں اپنی جوتی اُتار کے اس کا سر گنجا کر دوں گی۔''

میں نے دیکھا کہ اس وقت صفیہ بھابھی کے تیور ہی کچھ اور تھے، وہ بے حد غصے میں تھیں اور میں نے یہ بھی دیکھا کہ منٹو صاحب نے جواباً ایک لفظ بھی نہ کہا اور بالکل ساکت وصامت ہو گئے۔

منٹو صاحب ''جن'' کے زیرِ اثر

۱۹۵۴ء میں منٹو صاحب میو ہسپتال سے شفایاب ہو کر گھر آ گئے تھے اور انھوں نے مے نوشی ترک کر دی تھی، اور غذا میں دہی کا استعمال باقاعدگی سے کرنے لگے تھے۔ لیکن پھر وہ وقت بھی آ ہی گیا جب وہ اول اول تو صفیہ بھابھی سے چھپ کر شراب پینے لگے لیکن آخر تابہ کے۔ یہ حجاب بھی اٹھ گیا۔ بے چاری صفیہ بھابی منٹو صاحب کی توبہ شکنی کو خوب جانتی تھیں۔ یعنی

''جو آج ہو رہا ہے، وہی بار ہا ہوا''

ایک روز انھوں نے مجھے بتایا کہ برسوں پہلے ایک مرتبہ سعادت نے پکا ارادہ کر لیا کہ وہ کبھی شراب

نہیں پئیں گے لیکن چند ہی دنوں بعد وہ مجھ سے چھپ چھپ کر پینے لگے۔ اس مرتبہ انھیں یہ تدبیر سوجھی کہ عام شرابوں کے بجائے ''جن'' پی لینا چاہیے کیوں کہ ''جن'' کا نہ تو کوئی رنگ ہوتا ہے اور نہ بُو۔ صفیہ کو پتہ ہی نہ چلے گا کہ میں نے پی ہے کہ نہیں۔ چناں چہ یہ ''جن'' پی کر میرے نزدیک آئے۔ واقعی ان کے منہ سے بُو تو نہیں آ رہی تھی لیکن پھر میں نے دیکھا کہ ان کے دیدوں کی پتلیاں اوپر کو چڑھ گئیں اور وہ تمام تبدیلیاں ظاہر ہو گئیں جنھیں میں خوب پہچانتی تھی۔ میں نے کہا: ''سعادت آپ پی کر آئے ہیں۔'' انھوں نے انکار کیا مگر میں نہ مانی۔ جب میں نے کہا: ''سعادت آپ ''جن'' پی کر آئے ہیں'' جب میں نے شراب کا نام تک بتا دیا تو یہ جھینپ گئے۔

منٹو صاحب برہنہ گفتار نہ تھے

وہ یقیناً برہنہ گفتاری پر پوری قدرت رکھتے تھے لیکن ان اور میری عمر میں جو فرق تھا اور جس انداز سے وہ مجھے اپنا برخوردار اور برادر خورد سمجھتے تھے اس کے پیشِ نظر وہ اپنی گفتگو کے دوران میں فحش کلامی اور برہنہ گفتاری سے مکمل طور پر پرہیز کرتے تھے۔ اپنی ان گنت ملاقاتوں میں، میں نے ایک مرتبہ بھی گفتگو کے دوران میں ان کی زبان سے کوئی فحش لفظ نہیں سنا۔ جی ہاں میں آپ سے اس شخص کا ذکر کر رہا ہوں جس پر حکومتوں نے فحش نویسی کے مقدمات چلائے اور جو آج تک اپنی فحاشی کے لئے معروف ہے۔

بدن کے وہ اعضا جن کا ہندوی الفاظ میں ذکر مناسب نہیں خیال کیا جاتا اور دستور یہ ہے کہ ہم ان اعضاء کے نام عربی الفاظ میں لیا کرتے بلکہ بعض موقعوں پر محض لطیف اشاروں میں ذکر کر دیا کرتے ہیں، منٹو صاحب کی تحریروں میں ایک آدھ موقعوں کے سوا اس کی کوئی اور مثال نہیں ملتی۔

میں لاہور کے ایسے بزرگ ادیبوں اور شاعروں کو جانتا ہوں جو تکیہ کلام کے طور پر فحش الفاظ کا فراوانی سے استعمال کرتے تھے۔ منٹو صاحب کا قطعاً ایسا کوئی تکیہ کلام نہ تھا۔

خداوند عالم نے ان کی تخلیق میں شرافت اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کے جملہ اجزا شامل کئے تھے۔ غلط نظام اور غلط معاشرے نے ان کی روح میں اور ان کے قلم میں زہر بھر دیا۔

صرف ایک مرتبہ، جی ہاں فقط ایک ہی مرتبہ میں نے منٹو صاحب کو اپنی موجودگی میں برہنہ گفتاری کرتے دیکھا۔

جب منٹو صاحب نے پولس والے کو چابک سے مارا

ہم دونوں گھر سے نکلے۔ منٹو صاحب نے تانگے والے کو اشارہ کیا۔ دونوں گوال منڈی کو روانہ ہوئے۔ جب تانگہ میو ہسپتال کے چوک پر پہنچا تو تانگے والے نے کہا: ''آگے تانگا نہیں جا سکتا۔'' معلوم ہوا کہ ریلوے روڈ کو اب ''یک طرفہ ٹریفک روڈ'' قرار دے دیا گیا ہے۔ اگر ہم لوگ نسبت روڈ کی طرف سے ریلوے روڈ پر آتے تو تانگہ منشور اخبار کے دفتر کے عین سامنے ٹھہر جاتا۔ خیر منٹو صاحب نے تانگے والے سے کہا: ''تم یہیں ٹھہر جاؤ۔ ہم ابھی چند منٹ میں واپس آئیں گے۔ تانگے والا مان گیا۔

میو ہسپتال سے چند ہی قدم پر بائیں جانب ریلوے روڈ پر ''منشور'' کا دفتر تھا۔ لکڑی کی سیڑھیوں والا دفتر تھا۔ بالائی منزل پر جانا تھا۔ منٹو صاحب وہیں ایک زینے پر بیٹھ گئے اور کہنے لگے: ''اب اوپر جانے کی طاقت نہیں ہے۔ تم دس روپے جا کر لے آؤ۔''

میں بالائی منزل پر پہنچا۔ میں نے بابو مولا داد سے کہا: ''منٹو صاحب نیچے سیڑھیوں میں بیٹھے ہیں اور اپنے دس روپے مانگ رہے ہیں۔''

بابو مولا داد نے خوشامدانہ انداز میں کہا: ''نغمی صاحب، ان سے کہیے کل بیس روپے اکٹھا لے لیں۔ اس وقت میرے پاس دس روپے نہیں ہیں۔''

میں واپس گیا۔ میں نے جیسے ہی ان سے کہا کہ بابو مولا داد آج کے لئے معذرت خواہ ہیں۔ کہتے ہیں کہ کل دس کے بجائے بیس لے لیں۔''

کہاں تو یہ حال تھا کہ منٹو صاحب میں سیڑھیاں چڑھنے کی طاقت ہی نہ تھی اور کہاں یہ حال ہوا کہ ایک دم غصے سے بھر کر پوری قوت سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ یوں محسوس ہوا کہ جیسے ہزاروں بیڑیاں بدن میں لگا دی گئی ہیں۔ ایک دم تمام زینے طے کرتے ہوئے بالائی منزل پر پہنچے اور حسبِ معمول پنجابی میں برہمی کا اظہار کرتے ہوئے دہاڑے: ''کتھے اے میرا کالم، میں ہنڑے پھاڑ سٹاں گا۔'' (کہاں ہے میرا کالم، میں ابھی ابھی پھاڑ ڈالوں گا)

تمام دفتر میں سنسنی پھیل گئی۔ بابو مولا داد نے گھبرا کر فوراً دس روپے کا نوٹ منٹو صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ ہم دونوں دفتر سے باہر نکلے۔ میو ہسپتال کے چوک پر پہنچے تو ہم نے دیکھا کہ ایک پولس کانسٹیبل ہمارے تانگے والے کو مار رہا ہے۔ اور برابر کہے جا رہا ہے کہ: ''تو اتھے تانگا نئیں کھلا رسکدا

اے" (تو یہاں تانگا نہیں کھڑا کر سکتا ہے۔) منٹو صاحب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً تانگے والے کے ہاتھ سے اس کا چابک چھین کر پولس والے پر ٹوٹ پڑے اور لگاتار اس پر چابک سے ضربیں لگانے لگے۔ آن واحد میں لاہور والوں کے مزاج کے عین مطابق بیسیوں لوگ جمع ہو گئے۔ پولس والا اپنے اوسان مجتمع کرنے میں ناکام ہو گیا۔ وہ تصور ہی نہ کر سکا کہ کوئی شخص بہادری پولس والے کی بھی مرمت کر سکتا ہے۔

اس دن میں نے پہلی اور آخری بار منٹو صاحب کو برہنہ گفتاری کرتے دیکھا۔ وہ پولس والے کی والدہ کے بدن کے ناگفتنی ٹھکانے کا ذکر کر کے پوچھ رہے تھے کہ اگر یہاں تانگا نہ کھڑا کریں تو کیا پھر وہاں تانگا کھڑا کریں۔"

ہجوم کے لوگ پولس والے سے کہہ رہے تھے۔:" اے منٹو صاحب نے انہاں نوں کج وی نہ کہیں، نئیں تے توں مصیبت اچ پئے جاوے گا۔" (یہ منٹو صاحب ہیں انھیں کچھ بھی نہ کہنا، ورنہ تو مصیبت میں پڑ جائے گا)

پولس والا خوف زدہ ہو کر منٹو صاحب سے معافی مانگنے لگا۔ ہم دونوں تانگے میں سوار ہوئے۔ منٹو صاحب تانگا لے کر سیدھے ایڈل جی کی دکان پر پہنچے اور میں نے انتہائی رنج و غم سے سوچا کہ "افسوس صد افسوس" یہ ساری تگ و دو اسی مے فروش کے لئے تھی۔ میرا دل دکھ سے بھر گیا۔ لیکن میری بے بسی یہ تھی کہ میں کچھ بھی نہ کر سکتا تھا۔

منٹو صاحب ایڈل جی کے لئے روزانہ دس روپئے کی " دہاڑی" پر کالم نویسی کی مشقت بھری چکی پیستے رہے اور میں دل ہی دل میں کہتا رہا کہ " چہ ارزاں فروختند"

منٹو صاحب چند ہی روز تک منشور کے لئے کالم لکھ سکے۔ بابو مولا داد کے لئے یہ امر مشکل ہوتا ہی چلا گیا کہ وہ بلا ناغہ روزانہ منٹو صاحب کو دس روپے نقد دیا کریں۔ منشور اخبار کے احوال کچھ اچھے نہ تھے۔ کچھ ہی عرصے تک یہ اخبار چھپتا رہا اور پھر کچھ عرصے تک ڈمی (Dummy) کی صورت میں چھپتا رہا یعنی " ڈیکلریشن قائم رکھنے کے لئے حکومت کی پریس برانچ کو جاتا رہا اور بالآخر مکمل طور پر بند ہو گیا۔ سنا ہے ہے کہ اب پاکستان میں کوئی ایسا سرکاری ادارہ بھی ہے۔ جہاں پرانے اخبارات کو محفوظ کیا گیا ہے۔ کیا اب منٹو صاحب پر تحقیقی کام کرنے والا کوئی ایسا طالب علم ہے جو " روزنامہ منشور" اور سعادت حسن منٹو کے یومیہ کالم کا سراغ لگا سکے؟

باتیں عصمت چغتائی کی

منٹو صاحب بمبئی کی فلمی دنیا کی ایک اور شخصیت کا بھی ذکر کرتے تھے۔ یہ تھے شاہد لطیف، منٹو صاحب کے دوست تھے۔ شاہد لطیف کی بیگم یعنی مشہور و معروف افسانہ نگار عصمت چغتائی بھی ان سے بھی بڑھ کر منٹو صاحب کی مخلص دوست تھیں بعض اختلافی مسائل کے سلسلے میں ان دونوں کی پُر خلوص نوک جھونک بھی رہا کرتی تھی۔

منٹو صاحب عصمت چغتائی کے فن کے معترف بھی تھے اور نقاد بھی تھے۔ نقوش میں شائع شدہ ان کا افسانہ ''ننھی کی نانی'' پڑھتے پڑھتے جب وہ اختتام پر پہنچے تو انھوں نے کہا'' بکواس' نری بکوس'' انھوں نے اس افسانے کا ذکر کرتے ہوئے مجھ سے کہا:'' یہ ہیں ترقی پسند۔ ایسے ہوتے ہیں ترقی پسند۔'' عصمت نے آخری لائنیں لکھ کر اچھے بھلے افسانے کا ستیاناس کر دیا۔ وہ لائنیں یہ تھیں:

''حشر کے دن صور پھونکا گیا۔ نانی بڑبڑا کر کھنکارتی ہوئی اٹھیں جیسے لنگر کی بھنک کان میں پہنچ گئی ہو۔ فرشتوں کو صلواتیں سناتی لشتم پشتم پل صراط پر سے اکڑوں گھسٹتی خدائے ذوالجلال والاکرام کے حضور میں لپکیں، انسانیت کی اتنی بڑی توہین دیکھ کر خدا کا سر شرم سے جھک گیا اور وہ خون کے آنسو رونے لگا۔

اور خدا کے وہ خون میں ڈوبے آنسو نانی کے کچے ڈھیر پر ٹپکے جہاں سرخ سرخ لالے کے پھول لہلہانے لگے۔''

ان دنوں کی بہت سی باتیں مطبوعہ صورت میں محفوظ ہیں لہٰذا میں ان کا ذکر نہیں کروں گا۔ میری کوشش تو یہ ہے کہ میں صرف وہ باتیں بتاؤں جو میں نے منٹو صاحب سے سنیں۔ کوشش کے باوجود یہ ہوسکتا ہے کہ بعض باتیں جو میں آپ کو بتاؤں، وہ آپ کہیں مطبوعہ صورت میں پڑھ چکے ہوں۔

منٹو صاحب کہا کرتے تھے کہ جب عصمت چھوٹے بلاوز پر ساری پہنتی تھی اور اس کی ''ڈھنی'' نظر آتی تھی تو اسے دیکھ کر کراہت آتی تھی۔ یاد رہے کہ منٹو صاحب نے ''ناف'' کبھی نہیں کہا، ناف کے بجائے ''ڈھنی'' ہی کہا۔

منٹو صاحب یہ بھی کہا کرتے تھے کہ عصمت کی تحریر املا کی فاش غلطیوں سے بھرپور ہوا کرتی ہے، اسے یہ بات معلوم بھی ہے، وہ اس کا اعتراف بھی کرتی ہے۔

منٹو صاحب نے ان دنوں کا ذکر کیا جن دنوں شاہد لطیف عصمت سے بار بار ملاقاتیں کرنے کے

باوجود اظہارِ عشق کی جرأت نہ رکھتے تھے۔

منٹو صاحب نے انھیں مشورہ دیا کہ تم عصمت کو کسی بے ضرر مشروب کا نام لے کر اُسے شراب پلادو۔ تھوڑی سے شراب بھی اسے مخمور کرنے کے لئے کافی ہوگی، جب اطمینان ہوجائے کہ وہ اب نشے میں ہے تو اس سے اظہارِ عشق کردو۔"

غالباً عصمت اس صورتِ حال سے تنگ آچکی ہوں گی کہ یہ شخص خواہ مخواہ ملاقاتوں پر ملاقاتیں کیے چلا جارہا ہے اور اظہارِ عشق کرتا ہی نہیں چنانچہ جب مشروب کا بہانہ کرکے شاہد لطیف نے انھیں تھوڑی سی پلا کر اظہارِ عشق کیا تو انھوں نے ظاہر ہی نہ کیا کہ وہ ہوش میں ہیں۔ بہت دنوں بعد جب بے تکلفی ہوگئی تو شاہد نے اپنی دانست میں گویا بہت بڑے راز سے پردہ اٹھایا اور عصمت پر منکشف کیا کہ اس مشروب کی حقیقت کیا تھی۔ عصمت نے پُرسکون ہوکر سب کچھ سنا اور نہایت متانت سے جواباً کہا: "میں تو پہلے ہی سے جانتی تھی کہ تم مجھے شراب پلارہے ہو مگر میں نے ظاہر نہ ہونے دیا۔"

عصمت چغتائی اور منٹو صاحب دونوں ہی بمبئی کی فلمی دنیا سے وابستہ رہے۔ عصمت چغتائی کے ناول "ضدی" پر مبنی فلم بنائی گئی۔ انھوں نے فلم "جنون" میں ایکٹریس کی حیثیت سے بھی اہم رول ادا کیا۔ منٹو صاحب نے فلم "آٹھ دن" میں اداکاری کے جوہر دکھائے۔ منٹو کے مقابلے میں عصمت چغتائی کی فلمی دنیا سے وابستگی نسبتاً کم تھی اور جتنی وابستگی تھی وہ ان کے شوہر شاہد لطیف کی وجہ سے تھی، لیکن منٹو صاحب کی فلم انڈسٹری سے وابستگی طویل بھی تھی اور گہری بھی تھی۔ وہ صحیح معنوں میں "کاری گر" تھے اور وہ حقیقی معنوں میں فلموں کے نہایت ہنر مند سکرپٹ رائٹر تھے اور فلم والوں کی ضرورتوں کو خوب سمجھتے تھے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ اپنے اس ہنر سے خوب کمارہے تھے۔ ان کی خوش حالی کا یہ حال تھا کہ جب ان کا گھریلو ملازم بیمار ہوا تو اس کے علاج کے لئے انھوں نے ایک ایسے ڈاکٹر کا انتخاب کیا جس کی فیس چونسٹھ روپے تھی۔ ظاہر ہے کہ آج سے ساٹھ ستر سال پہلے یہ بہت بڑی فیس تھی، لیکن جب انھوں نے پاکستان جانے کی ٹھان لی اور عصمت چغتائی نے ان سے پوچھا کہ "آپ پاکستان جاکے کیا کیجئے گا، وہاں آپ کی حیثیت کیا ہوگی؟" تو انھوں نے کہا کہ "وہاں ہم ہی ہوں گے۔"

منٹو صاحب پاکستان چلے آئے۔ پھر کیا ہوا؟ جو کچھ ہوا وہ مطبوعہ صورت میں محفوظ ہے۔ منٹو صاحب کس مپرسی کے عالم میں چل بسے۔ میں نے ان کی وفات کے بعد ان کی یادوں پر مبنی مضامین لکھنے

شروع کئے۔ میرا ایک مضمون ''منٹو کی زندگی کے آخری تین سال'' روز نامہ مشرق لاہور میں قسط وار شائع ہوا۔اس مضمون میں عصمت چغتائی کا بار بار ذکر آیا تھا۔ایک روز شام کو بے اختیار جی چاہا کہ میں عصمت چغتائی سے کچھ دیر باتیں کروں۔اتوار ۱۲ر فروری ۱۹۸۴ء کی ڈائری میں، میں نے اُس گفتگو کو محفوظ کرلیا ہے، جو عصمت چغتائی سے ہوئی۔جب میں نے انھیں یہ بتایا کہ میں نے منٹو صاحب کی زندگی کے آخری تین برسوں کے احوال سے وابستہ یادوں کو قلم بند کیا ہے تو انھوں نے بڑے قلق کے ساتھ کہا: ''اللہ! وہی تین برس تو ان کی زندگی کے انتہائی دکھ بھرے دن تھے۔''

خودکشی کی کوشش

میں ایک روز شام کو منٹو صاحب سے ملنے ان کے گھر گیا تو انھوں نے مجھے اپنی خودکشی کی کوشش کی روداد اس طرح سنائی جیسے کوئی قبض کا مریض جلاب کی دوا کھانے کا حال بیان کرتا ہے۔

کہنے لگے کہ اگر کوئی شخص کڑوے تیل میں افیون کا گولا ڈال کر نگل جائے تو موت واقع ہوجایا کرتی ہے، چنانچہ میں افیون کا گولا خریدنے صفاں والے چوک گیا، وہیں نکڑ پر افیون کے ٹھیکے کی ایک دکان ہے۔وہاں سے میں نے مطلوبہ مقدار میں افیون خریدی، دکان دار نے کوئی پوچھ گچھ نہ کی۔افیون خرید کر میں گھر آیا۔میں کڑوے تیل میں افیون کے گولے کو ڈبو کر نگل تو گیا مگر وہ ڈائجسٹ نہ ہوا۔بہت دیر تک مرنے کا انتظار کرتا رہا۔مرا نہیں کس قدر سخت جان ہوں۔''

منٹو صاحب نے یہ روداد اس طرح سنائی جیسے کوئی تبسم خیز لطیفہ سنا رہا ہو۔مجھے خوب یاد ہے کہ اس روداد کو سن کر نہ میں نے ''ہوں'' کہا اور نہ ''ہاں'' کہا، ساکت وصامت بیٹھا رہا۔وہ سمجھ گئے کہ مجھ پر کیا بیت رہی ہے، وہ بھی خاموش رہے وہ بھی مغموم اور اداس نظر آنے لگے۔

اُس روز میں رہ رہ یہی سوچتا رہا کہ آخر تا بہ کے؟ یہ بار بار یوں ہی خودکشی کی کوششیں کرتے رہیں گے تو کبھی نہ کبھی تو کڑوے تیل میں ڈوبا ہوا افیون کا گولا ان کی جان لے کر ہی ٹلے گا۔میں تو اس قدر سراسیمہ تھا کہ میں نے تو ان سے یہ تک نہ پوچھا کہ منٹو صاحب کڑوے تیل میں ڈوبے ہوئے افیون کے گولے کو نگل کر خودکشی کرنے کا یہ گُر آپ کو کہاں سے معلوم ہوا۔؟ نہ تو میں نے اُس دن اُن سے پوچھا، نہ کبھی بعد میں پوچھا، اور میں نے آج تک کسی سے نہیں پوچھا کہ یہ فارمولا کہاں تک درست ہے؟ ارے جب وہی نہ رہے تو اب پوچھ کے بھی کیا کروں گا؟

ڈپریشن کا جو مریض ہمہ وقت خودکشی پر تلا رہے گا، وہ ہر مرتبہ افیون کا گولا کڑوے تیل میں ڈوب کر تو جان نہ لے گا، وہ تو نہ جانے کون کون سے طریقے آزمائے گا۔

وہ بار بار دماغی طور پر بیمار ہو جاتے تھے اور بار بار کچھ اس انداز سے صحت یاب اور صحت مند نظر آتے تھے کہ جیسے ان سے زیادہ دانا و بینا شخص اور کوئی ہے ہی نہیں۔

منٹو صاحب کا جذبہ تخلیق اس قدر قوی تھا کہ کسی کے آنے یا جانے سے وہ مخل ہوتے ہی نہ تھے بلکہ وہ آنے والے کو اپنے تخلیقی عمل میں شریک کر لیا کرتے تھے۔

اوپندر ناتھ اشک کا ذکر

شدید ترین پریشانیوں کے باوجود آخر آخر تک ان کی زندہ دلی، خوش مزاجی، حسِ مزاح، بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی اس طرح سے دمک اٹھتی تھی جیسے خس و خاشاک کے ڈھیر میں نہایت انمول موتی اچانک دمک اٹھتے ہوں۔

ایک دن انھوں نے مجھے اوپندر ناتھ اشک کی کنجوسی کا ذکر کرتے ہوئے ایک وضعی لطیفہ سنایا۔ ممکن ہے کہ انھوں نے یہ لطیفہ کہیں لکھ بھی دیا ہو۔ میری نظر سے نہیں گزرا ہے۔ اس لئے بیان کر رہا ہوں تاکہ محفوظ ہو جائے۔

کہنے لگے کہ اوپندر ناتھ اشک اس قدر کنجوس تھا کہ اس نے ایک بلی پال رکھی تھی۔ صبح سویرے وہ اپنی سدھائی ہوئی بلی کو اپنے گھر کا دروازہ کھول کر پڑوسیوں کے گھروں کی طرف روانہ کر دیا کرتا تھا۔ وہ سدھائی ہوئی بلی ہمسایوں کے گھروں کے باورچی خانوں میں گھس کر ان کے دودھ کے برتنوں میں منہ ڈال کر دودھ پی کے واپس آجاتی تھی۔ اشک ایک برتن کے دہانے پر بلی کو الٹا کر کے اس کا پیٹ دبا کر پیا ہوا دودھ انڈیلتا تھا اور اس دودھ کو وہ صبح کی چائے میں ڈال کر پیا کرتا تھا۔

اشک اپنا لکھا ہوا افسانہ ہر کس و ناکس کو سنایا کرتے تھے۔ انھیں افسانہ سنانے کا اس قدر شوق تھا۔ وہ اس بات کی بھی پروا نہ کرتے تھے، سننے والے کی قابلیت کیا ہے۔

منٹو صاحب نے اس سلسلے میں بھی ایک لطفیہ وضع کر رکھا تھا۔ انھوں نے مجھے وہ وضعی لطیفہ سناتے ہوئے کہا: ''اشک جن دنوں میری ہی طرح آل انڈیا ریڈیو دہلی میں سکرپٹ رائٹر تھا، تو یہ روزانہ کرائے کے تانگے میں ریڈیو اسٹیشن آیا کرتا تھا۔ دلی کے تمام تانگے والے اسے خوب پہچانتے تھے۔ جب یہ کسی

تانگے والے سے کرایہ دریافت کرتا تو وہ جواب دیتا: ''صاحب! اگر آپ راستے میں مجھے اپنا کوئی افسانہ سنائیں گے تو کرایہ ایک روپیہ اور اگر افسانہ نہیں سنائیں گے تو آٹھ آنے۔''

احمد ندیم قاسمی وضو کے قطروں سے پیدا ہوا ہے

ایک دن احمد ندیم قاسمی کی افسانہ نگاری کا ذکر آیا تو کہنے لگے: ''یہ انتہائی شریف شخص ایک روز اتفاقاً میرے ہمراہ طوائفوں کے بازار سے گزر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر جو شرم و حیا اور گھبراہٹ کی کیفیت تھی، اسے دیکھ کر میرے دل میں خیال آیا یہ شریف آدمی بھلا افسانہ کیا لکھے گا، یہ تو وضو کے قطروں سے پیدا ہوا ہے۔''

حمید اختر کا رومانوی افسانہ سن کر

ایک مرتبہ لاہور میں حلقۂ اربابِ ذوق کے ایک تنقیدی اجلاس میں حمید اختر اپنا افسانہ پڑھ رہے تھے۔ میں بھی اس اجلاس میں موجود تھا۔ میں نے منٹو صاحب کو پچھلی نشستوں میں بیٹھے دیکھا۔ بیزاری ان کے چہرے سے نمایاں تھی۔ غالباً یہ بیزاری اس لئے اور زیادہ تھی کہ حمید اختر ''راسخ العقیدہ'' ترقی پسند مصنف تھے اور رومانوی افسانہ لکھ کر تشریف لائے تھے۔ اس افسانہ کا آخری رومانوی جملہ میری یادداشت کے مطابق کچھ یوں تھا:

''میں نہ کہتا تھا کہ ہزار خار کے پھول کو نہ چھونا، انگلیاں لہولہان ہو جائیں گی۔''

جب اجلاس کے صدر نے منٹو صاحب کو تنقید کی دعوت دی تو انھوں نے کہا: ''انگلیاں لہولہان ہوں گی تو ہو جائیں میں تو ہزار خار کے پھول کو ضرور چھوؤں گا۔ اس کے پھول کو نوچ نوچ کر جمع کروں گا۔ پھر شکر ڈال کر گل قند تیار کروں گا اور مزے لے لے کر کھاؤں گا۔''

منٹو صاحب کے اس تبصرے کو سن کر تمام حاضرین بے تحاشہ ہنسنے لگے۔ (ریسرچ اسکالرز کو حمید اختر کے اس افسانے کا سراغ لگانا چاہئے، غالباً اس کا عنوان تھا ''ہزار خار کا پھول'')

سگریٹ وہ جس میں سے دھواں نکلے

زندگی کی شدید ترین کڑوی کسیلی حقیقتوں نے منٹو صاحب سے تمام رومانوی کیفیتیں چھین لی تھیں۔ بمبئی میں قیام کے دوران میں، اچھے فلیٹ میں رہتے تھے۔ کام کاج کے لئے گھریلو ملازم موجود تھا۔

نہایت نفیس کھانے کھاتے تھے۔نہایت قیمتی شراب پیتے تھے۔اعلیٰ قسم کے سگریٹ پیتے تھے اور نہایت نفیس سگریٹ کیس میں سگریٹ رکھ کر دوسروں کو بھی پیش کرتے تھے اور خود بھی نوش کرتے تھے۔لیکن اب ہجرت کے بعد جب کبھی کسی نے ان سے پوچھا کہ ''آپ کون سا سگریٹ پینا پسند فرمائیں گے؟۔''
میں موقع کا گواہ ہوں۔انھوں نے ہمیشہ ایک ہی مقرر جواب دیا ''وہ جس میں سے دھواں نکلے۔''

جم خانہ یتیم خانہ

اب رہا شراب کا معاملہ تو میں آپ سے پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ وہ پاکستان کی بنی ہوئی نہایت گھٹیا اور مہلک شراب پیتے تھے۔جس کا نام تو تھا ''جم خانہ'' لیکن منٹو صاحب بجا طور پر اسے ''یتیم خانہ'' کہا کرتے تھے۔لاوارثوں اور یتیموں کے ساتھ جو غیر انسانی سلوک ہمارے معاشرے میں روا سمجھے جاتے ہیں، وہی مظالم یہ ناقص شراب ان پر ڈھا رہی تھی۔

ان کا تن بھی اُجلا تھا اور من بھی اُجلا تھا

ایک مرتبہ میں صبح کے وقت ان کے ہاں گیا۔وہ ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ تو گئے لیکن کچھ جھینپے جھینپے سے تھے وہ کسی قدر بے آرام اور بے چین نظر آئے۔گفتگو میں ان کا دل نہیں لگ رہا تھا۔آخر ان سے نہ رہا گیا۔کہنے لگے: ''میرے کپڑے میلے ہیں مجھے نہانا ہے۔شیو کرنا ہے۔ان شاء اللہ پھر ملیں گے۔'' میں نے انھیں غور سے دیکھا۔''واقعی ان کے کپڑے میلے تھے۔''
کوئی بات نہیں۔میں پھر کسی وقت حاضر ہوں گا۔'' میں نے کہا اور اٹھ کر گھڑا ہو گیا۔

ان سے اَن گنت ملاقاتوں میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اپنے میلے ملگجے کرتے اور پاجامے سمیت ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گئے اور یہ بھی پہلا اور آخری موقع تھا۔جب انھوں نے اس کیفیت میں بدستور بیٹھے رہنے سے معذرت طلب کر لی۔ورنہ اس سے قبل ایک مرتبہ بھی ایسا نہ ہوا اور مذکورہ واقعہ کے بعد میں ان سے بار ہا ملتا رہا اور وہ مجھ سے مل کر ہمیشہ خوش ہوئے۔یہ بات تو میں صفیہ بھابھی کے حوالے سے بھی عرض کر چکا ہوں کہ منٹو صاحب نے اپنے انتقال سے صرف تین دن پہلے خاصے تعلق خاطر کے ساتھ کہا تھا کہ ''صفیہ نعمی بہت دنوں سے نہیں آیا۔''

صفیہ بھابھی سے یہ جملہ سن کر میرے دل پہ کیا گزری ہوگی، اس کا اندازہ کرنا اب تو آپ کے لئے

بھی مشکل نہ ہوگا اور آج ستاون برس بعد بھی، جب کبھی یہ بات مجھے یاد آتی ہے تو میں اشکبار ہو جاتا ہوں۔

ہاں تو خیر بات ہو رہی تھی اس صبح کی جب میں نے منٹو صاحب کو میلے اور ملگجے لباس میں دیکھا تھا۔ میں سوچتا ہوں اس روز شب گزشتہ نہ جانے کیا حالات و واقعات ہوئے ہوں گے کہ وہ میلے اور ملگجے لباس میں سو گئے ہوں گے۔ منٹو صاحب بہت اُجلے اجلے تھے۔ ان کی سفید پوشی تو بہت مشہور تھی۔ وہ سراپا صباحت تھے۔ ان کا تن بھی اجلا تھا۔ ان کا من بھی اجلا تھا۔ ان کی سفید پوشی ان کے باطن کی ترجمان تھی۔ وہ طبعاً اور اصلاً بہت ہی بھلے آدمی تھے۔ ام الخبائث، خمر خانہ خراب نے ان کی کردار کشی کی بھرپور کوشش کی اور وہ اس کوشش میں کامیاب بھی ہوئی لیکن ان کے باطن کا اجالا جھلکتا ہی رہتا تھا۔

صفیہ بھابھی نے بتایا

ایک مرتبہ میں نے صفیہ بھابھی سے پوچھا تھا کہ بھابی جب منٹو صاحب سے آپ کے رشتے کی بات چیت شروع ہوئی تھی تو کیا آپ کے بھائیوں نے یہ معلوم کیا تھا کہ یہ شراب پیتے ہیں یا نہیں؟ صفیہ بھابی نے کہا: ''سعادت نے میرے خاندان کے لوگوں سے اس بات کو چھپانے کی ذرہ بھر کوشش نہ کی اور صاف صاف بتا دیا تھا کہ وہ شراب پیتے ہیں۔ سعادت ان دنوں الکوہالک نہیں تھے۔ ہمارے خاندان کے لوگ چوں کہ افریقہ میں آباد ہو گئے تھے اور وہاں کا ماحول کچھ ایسا تھا کہ سوشل ڈرنکنگ (Social Drinking) کو کچھ زیادہ بُرا نہ سمجھا جاتا تھا اس لئے سعادت کا رشتہ منظور کر لیا گیا۔

گفتگو کے دوران میں صفیہ بھابھی نے یہ بھی کہا: ''جن دنوں ہمارے ہاں سعادت کا رشتہ آیا تو ان دنوں تو ان کی آمدنی بھی معمولی تھی۔ پھر بھی رشتہ منظور کر لیا گیا۔ بعد میں جب میری بہنوں کے رشتے آئے تو خوب خوب چھان بین کی گئی۔ لڑکے کے پاس ڈگریاں کون کون سی ہیں، عہدہ کیا ہے؟ تنخواہ کتنی ہے؟۔ میں نے اپنے گھر والوں کو طعنے بھی دیئے کہ میری دفعہ میں تو آپ لوگوں نے کچھ بھی نہ دیکھا اور اب جو میری بہنوں کے رشتے آ رہے ہیں تو آپ لوگ خوب چھان بین کر رہے ہیں۔''

منٹو صاحب کی رفاقت میں صفیہ بھابی نے خوش حالی کے دن بھی دیکھے اور انتہائی تنگ دستی کے دنوں کے دکھ بھی جھیلے۔ لیکن اس میں ذرہ برابر شک نہیں کہ انھوں نے صفیہ بھابی کو جی جان سے چاہا۔ بے حد محبت کی، خوش حالی کے دنوں میں انھوں نے ان کے عیش و آرام کا ہر طرح سے خیال رکھا۔ وہ بلا

شبہ اپنی بیوی کے باوفا شوہر تھے۔

وہ شعرا و ادباء جو بیوی کے ہوتے ہوئے عائلی زندگی کے حصار کو توڑ کر غیر عورتوں سے معاشقے کرتے ہیں، وہ یقیناً اس سلسلے میں مشہور و معروف بھی ہو جاتے ہیں۔ ان کے قصے زبان زدِ خاص و عام ہو جاتے ہیں۔ منٹو صاحب کے بارے میں خاصا تحقیقی کام ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے۔ ان کے کسی معاشقے کی کبھی کوئی سُن گُن نہ ملی۔

وہ اپنی تینوں بیٹیوں کے نہایت شفیق باپ تھے۔ تنگ دستی، افلاس اور مریضانہ مے نوشی کی وجہ سے وہ اپنی بچیوں کی معیاری پرورش کرنے سے معذور تھے اور پھر وہ دور بھی آیا جب وہ حصولِ رزق کی خاطر بسیار نویسی پر مجبور ہو گئے۔ ان کے دورِ آخر کے بعض افسانے بے سروپا اور بے کیف ہیں۔ اس دور میں اگر کوئی انھیں انگریزی کے کسی افسانے کا خلاصہ سنانے کی کوشش کرتا تھا تو وہ سننے سے انکار کر دیتے تھے اور کہا کرتے تھے: ''یار! مجھے نہ سناؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں سن کر بھول نہ جاؤں کہ یہ انگریزی کے کسی مشہور افسانے کا مرکزی خیال ہے اور میں اسے اپنا ہی سوچا ہوا افسانہ سمجھ کر لکھ ڈالوں۔''

کاش

وقت ہمیشہ کی طرح آگے کی طرف کھسکتا ہی چلا گیا۔ آفتاب ہمیشہ کی طرح طلوع و غروب ہوتا رہا۔ میں جب کبھی ان دنوں کا تصور کرتا ہوں جب منٹو صاحب مکمل طور پر خمر خانہ خراب کے قبضے میں تھے تو مجھے ان ہولناک فلموں کے ایسے مناظر تشبیہ کے طور پر یاد آتے ہیں، جن میں دکھایا جاتا ہے کہ ایک بے گناہ، مظلوم و مجبور شخص ایک انتہائی بے رحم اور سفاک بدمعاش کے قبضے میں ہے، جس نے اس مجبور شخص کو اچھی طرح سے جکڑ رکھا ہے اور گولیوں سے بھرا ہوا پستول اس بدمعاش کے ہاتھ میں ہے۔ جس کی نالی مجبور شخص کی کنپٹی پر رکھی ہوئی ہے۔ وہ بدمعاش اسے جو بھی حکم دیتا ہے، وہ مجبور شخص اس کی تعمیل کرتا ہے۔

منٹو صاحب آپ ہاتھ دھو کر اپنی جان کے پیچھے پڑے رہے۔ آپ تو بس جی جان سے مرنا ہی چاہتے تھے۔ آپ کو یاد تو ہوگا میں نے تھوڑی دیر پہلے آپ کو بتایا تو تھا کہ آپ نے ایک روز شام کے وقت مجھے خودکشی کرنے کی روداد اس طرح سے سنائی تھی۔ جیسے کوئی کسی کو کوئی لطیفہ سنایا کرتا ہے۔

''میں کڑوے تیل میں افیون کا گولا ڈبو کر نگل تو گیا مگر وہ ڈائجسٹ نہ ہوا۔''

ستاون (۵۷) برس بیت چکے ہیں۔ مگر یہ تین حروف پر مشتمل لفظ ''کاش''۔ کاش یوں نہ ہوتا، یوں ہوتا۔ کاش..... نہیں نہیں، یوں ہوتا۔ اگر ایسا ہوتا تو کیسا ہوتا۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو اشکبار آنکھیں اچھی نہیں لگتیں۔ آپ نے تو مرنے سے چند منٹ پہلے گھر کی گریہ کناں عورتوں کو ڈانٹا تھا۔ آپ نے نزع کے عالم میں بھی کہا تھا: ''خبردار جو کوئی رویا۔''

منٹو صاحب رونے پر تو کسی کا کوئی اجارہ نہیں۔ دنیا میں سبھی طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ میں ستاون (۵۷) برس کے بعد بھی آپ کو یاد کر کے رو رہا ہوں۔

منٹو صاحب میں تقریباً چالیس برس سے امریکہ میں مقیم ہوں۔ یہاں بھی یہ لفظ ''کاش'' میرا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ میں جب امریکہ کے گلی کوچوں اور بازار سے گزرتا ہوں تو آپ مجھے یاد آتے ہیں۔ جب میں امریکہ کی سڑکوں پر ڈرائیونگ کرتا ہوں تو کبھی کبھی سوچتا ہوں کاش آپ اس وقت میرے برابر والی سیٹ پر بیٹھے ہوتے۔ میری مسرتوں کی کوئی انتہا نہ ہوتی۔ کاش میں سوجتن کر کے آپ کو اپنے ساتھ امریکہ لے آتا۔ یہاں آپ کا علاج ہوتا۔ آپ اچھے ہو جاتے پھر آپ یہاں کی مشہور زمانہ تنظیم الکوہالک اینانی مس (Alchoholic Annonymous) میں شامل ہو جاتے۔

منٹو صاحب! سال میں کئی مرتبہ اخباروں میں ایسے لوگوں کے احوال اور تصویریں شائع ہوتی ہیں جو سو سال کی عمر میں معمول کی زندگی گزار رہے ہیں۔ جب میں ایسی خبریں پڑھتا ہوں تو آپ مجھے بہت یاد آتے ہیں۔ کیا ایسا ممکن نہ تھا کہ آپ ۲۰۱۲ء میں زندہ ہوتے۔ ۱۹۵۴ء میں آپ کی شدید آرزو کہ آپ اپنی سالگرہ ضرور منائیں گے۔ کاش آپ دیکھتے کہ ساری دنیا میں آپ کی سالگرہ منائی جا رہی ہے۔

منٹو صاحب! یہاں امریکہ میں تو ہزاروں کہانیوں کے ہزاروں کردار اپنے مصنف کی تلاش میں سرگرداں ہیں، میں سوچا کرتا ہوں کہ ان کہانیوں کے کرداروں کو اگر آپ اپنی نظر سے دیکھتے تو عالمی ادب میں کتنا گراں قدر اضافہ ہوتا۔ یہ سب باتیں جو میں سوچا کرتا ہوں۔ یہ تو سب ''کاش'' کے زمرے میں آتی ہیں۔ ان پر کسی کا نہ کوئی اجارہ ہے، نہ اختیار ہے، یہ خیالات بے اختیار میرے باطن کے نہاں خانے میں بلا روک ٹوک آتے رہتے ہیں۔ میں جانتا ہو کہ یہ سب خیالات بے سود اور لا حاصل ہیں لیکن میرا یہ

ایقان لا حاصل نہیں ہے کہ انشاءاللہ وہ صبح ضرور آئے گی جس کے طلوع ہونے کے بعد کوئی ''منٹو'' بے
کسی کی موت نہ مرے گا۔

ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

(غالب

☆☆☆

نریش کمار شاد

منٹو سے آخری ملاقات

جون ۱۹۵۴ء کی دوپہر تھی۔

اپنے شاعر نما دوست نثار نجیب آبادی کے ساتھ جب لکشمی منشن میں پہنچ گیا تو یک لخت مجھے احساس ہوا کہ منٹو کے مکان کا نمبر تو مجھے یاد ہی نہیں ہے۔ اتفاق سے نثار بھی اس سے لاعلم تھا لیکن زیادہ جستجو کی نوبت نہیں آئی۔ پہلا آدمی جس سے ہم نے منٹو کے مکان کے بارے میں دریافت کیا وہی ہمیں دروازے تک چھوڑ گیا۔ دروازے پر ایک خاتون کھڑی تھیں۔ جنہیں پہلی ہی نظر میں دیکھ کر میں پہچان گیا کہ وہ منٹو کی بیوی صفیہ ہیں۔

''کیا منٹو صاحب گھر میں ہیں۔؟''

میرے اس سوال کے جواب میں جب صفیہ نے اثبات میں سر ہلایا تو میں نے کہا۔ ''اُن سے کہیئے دہلی سے ان کے ایک دوست ملنے کے لئے آئے ہیں۔''

صفیہ اندر چلی گئیں اور چند لمحوں کے بعد نحیف و نزار و دراز قامت مگر ہمہ تن اضطراب سعادت حسن منٹو زری کی جوتی پہنے اور سفید شلوار کے مختصر سے لباس میں ملبوس اپنے چشمے کو سنبھالتے ہوئے باہر آئے اور ہمیں اندر لے گئے۔

ایک چھوٹے سے کوچ میں اکڑوں بیٹھ کر منٹو صاحب سامنے میز پر بکھرے ہوئے کاغذوں کو اکٹھا کرنے لگے۔ میں نے ان کی طرف نظر دوڑائی تو مجھے شدت سے احساس ہوا کہ ان کے جسم کی رگ رگ پارے کی طرح تھرک رہی ہے لیکن بڑی بڑی آنکھیں پورے جسم سے الگ تھلگ نظر آتی ہیں جیسے اس استخوانی چہرے پر انہیں مصنوعی طور پر چسپاں کر دیا گیا ہو۔

کاغذات کو سنبھالنے کے بعد منٹو صاحب نے ٹائپ رائٹر کا ڈھکنا بند کرتے ہوئے کہا۔ ''میں

پچھلے تین دنوں سے اس کمرے سے باہر نہیں نکلا ہوں۔ ان دنوں میں متواتر کام کرتا رہا ہوں۔ ''چچا سام کے نام'' دو خط لکھے ہیں۔ دیوان سنگھ مفتون کا کیریکٹر اسکیچ لکھا ہے اور تم لوگوں کے آنے سے پہلے ایک ڈرامہ ٹائپ کر رہا تھا۔

''ٹائپ —؟'' میری زبان سے بے اختیار نکل گیا۔

''ہاں بھئی — میں بیک وقت سوچ بھی رہا تھا اور ٹائپ بھی کر رہا تھا اور ہاں وہ تو میں بھول ہی گیا۔ میرے ایک دوست نے میری کہانیوں پر ایک لمبا چوڑا مضمون انگریزی میں لکھا ہے اس دوران اس کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ ارے ہاں نریش! سنو تم بھی میرے بارے میں کوئی نظم وظم لکھ دو نا۔ میرے بہت سے احباب میری فرمائش پر ان دنوں میرے متعلق لکھ رہے ہیں۔ ذاتی طور پر مجھے شاعری سے کوئی لگاؤ نہیں۔ لیکن یہ ضرور چاہتا ہوں کہ میرے شاعر دوست بھی میرے بارے میں اظہار خیال کریں۔ میں نظم ونثر کے ایسے تمام مضامین کو اکٹھا کر رہا ہوں جو میرے متعلق لکھے گئے ہیں۔ اور ہاں یار! تم لوگوں نے یہ تو بتایا ہی نہیں کچھ پیو و یو گے؟''

اور بلوری شیشوں کے پیچھے منٹو کی دونوں بڑی بڑی آنکھوں کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر میں نے کہا۔

''نہیں۔ نہیں مہربانی۔''

''چلو تو ٹھیک ہے۔ ہاں تو کیا بات تھی۔ کیا کہہ رہا تھا میں۔ ارے ہاں بھئی! میں اپنے بارے میں تمام ادیب دوستوں کی رائیں جمع کر رہا ہوں اور آئندہ ماہ تک اپنی جوبلی منا رہا ہوں۔ کیوں کیسا خیال ہے۔ دیکھو زیادہ خرچ کرنے کے تو قابل نہیں ہوں لیکن چائے وائے کا انتظام ضرور ہو جائے گا۔ تم اس تاریخ تک تو یہاں ٹھہرو گے ہی نا۔ ارے ٹھہر جانا کیا ہے۔ آغا خان کی طرح میں ہیرے جواہرات میں تو کیا تُلوں گا لیکن میری جوبلی میں میرے دوستوں کو مجھے کم از کم پینوں سے ضرور تولنا چاہیے۔''

''اور وہ پین پارکر کے ہونے چاہئیں۔'' نثار نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں یہ تو ٹھیک کہا تم نے۔'' میز پر رکھے ہوئے اپنے پارکر کے قلم کو ہاتھ میں لیتے ہوئے منٹو نے کہا۔

''پارکر واقعی مجھے پسند ہے۔ ارے! تم لوگ سگریٹ نہیں پی رہے ہو یہ غریب ڈبیہ تمہارا منہ دیکھ رہی ہے۔''

سگریٹ کی ڈبیا کو میری طرف بڑھاتے ہوئے منٹو نے کہنا شروع کیا۔'' ''دیکھو یار قہر خدا کا۔ گولڈ

فلیک کے سگریٹ ہی پاکستان میں [illegible]

نہیں دیکھتے کہ یہ گولڈ فلیک کے سگریٹ ہیں۔ بلیک اینڈ وائٹ کے نہیں۔"

اتنے میں صفیہ کمرے میں داخل ہوئیں اور منٹو کے چہرے پر متانت کی جھالرسی تن گئی۔

"صفیہ ان سے ملو۔ یہ نریش کمار شاد ہیں۔ اُردو کے شاعر۔ دہلی سے آئے ہیں۔"

ہاں ہاں دہلی سے آئے ہیں انہوں نے بتایا تھا۔" صفیہ بجھی بجھی مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھتی ہوئی منٹو کے ساتھ کے کوچ میں بیٹھ گئیں اور منٹو نے نہ جانے کیا سوچ کر ایک دم سوالات کی جھڑی لگا دی۔

"ارے نریش بھئی! تم نے بتایا نہیں کیا حال ہے دہلی کا۔ دہلی والوں کا۔ تمہارے ترقی پسندوں کا۔ کرشن چندر کا۔ سردار بہادر علی جعفری کا۔ یار بڑے مزے کے لوگ ہیں وہاں کیوں صفیہ؟ نریش تم بمبئی نہیں گئے اِدھر۔ خدا کی قسم بمبئی بھی عجیب شہر ہے۔ عروس البلاد بمبئی، لاہور میں رہ رہ کر بمبئی یاد آتا ہے۔ یہاں تو میں بمبئی کی چلتی پھرتی یاد بن کر رہ گیا ہوں۔ تم نے میرے وہ سکیچ پڑھے ہیں۔ "گنجے فرشتے" جو میں نے بمبئی کی فلمی شخصیتوں کے بارے میں لکھے ہیں۔ کیا خیال ہے تمہارا کیسے ہیں اور ہاں وہاں ادیبوں کی حالت کیسی ہے۔ پچھلے دنوں 'شاہراہ" کے یوسف بھی یہاں آئے ہوئے تھے۔ کیا رائے ہے تمہاری، کیسے آدمی ہیں؟ سُنا ہے پارٹیشن کے پیٹ سے ہندوستان میں بڑے نئے نئے پبلشر پیدا ہوئے ہیں۔ اور سالے حرام کا مال سمجھ کر کچھ لئے دئے بغیر میری کتابوں کو دھڑا دھڑ چھاپے چلے جا رہے ہیں۔ مجھے جانا پڑے گا خود جانا پڑے گا۔ صفیہ! دیکھنا تم ہندوستان میں خود جا کر ایک ایک پبلشر سے نپٹوں گا۔ سعادت حسن منٹو پیسہ چھوڑنے والا نہیں۔ اپنی رائلٹی کی پائی پائی وصول کروں گا بے ایمانوں سے۔ ارے ہاں یاد آیا۔ کیا نام ہے اس رسالے کا۔ دیکھو ابھی یاد آتا ہے۔ آریہ۔ آریہ۔ ہاں آریہ گزٹ نہیں نہیں آریہ ورت اور اس کے مالک کا کیا نام ہے۔ ارے بھئی اس نے مجھے پچاس روپے بھجوائے تھے اور وہ بھی ایسے وقت میں جب میں بے حد ضرورت مند تھا۔ پچھلے دنوں ہسپتال میں داخل ہو گیا تھا نا۔ ان دنوں کی بات کر رہا ہوں۔ ہسپتال کی زندگی بھی عجیب زندگی ہے۔ اس ماحول سے بھی میں نے کچھ کہانیوں کا مواد حاصل کیا ہے۔"

صفیہ خاموشی سے اٹھ کر چلی گئیں۔ منٹو صاحب بھی ایک لمحے کے لئے سلسلۂ کلام کو منقطع کرتے ہوئے کھوسے گئے اور دوسرے ہی لمحے صفیہ کے پیچھے پیچھے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

اور مجھے ۳۶ لکشمی منشن میں بیٹھے بیٹھے دہلی کے اردو بازار کا خیال آ گیا جہاں اسرار الحق مجاز بھی اپنی نیم دیوانگی کے عالم میں ملنے والوں سے بالکل اسی طرح دیر دیر تک بے سروپا باتیں کرتا رہتا تھا۔

''پچھلے دنوں منٹو صاحب پاگل ہو گئے تھے نا''۔۔۔ میں نے نثار سے پوچھا۔ اور پھر اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر ایک اور سوال کر دیا۔ ''غالباً اس وقت منٹو صاحب نے پی رکھی ہے۔''

''اس وقت۔۔۔'' نثار نے مسکراتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ''اس وقت تو کیا آج کل ہم نے جب بھی دیکھا ہے بھائی جان کو اسی رنگ میں دیکھا ہے۔ نہ جانے ایسے عالم میں منٹو صاحب......''

اور منٹو کے اچانک آ جانے سے نثار نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی اور منٹو کوچ میں دھنستے ہوئے کہنے لگے۔

''نریش! تمہیں شاید معلوم نہیں کہ اپنے کسی مضمون کا معاوضہ میں خود نہیں لے سکتا۔ کسی کتاب کی رائلٹی بھی خود وصول نہیں کر سکتا۔ اپنی تمام کتابوں کے حقوق میں نے صفیہ کے نام محفوظ کر دیئے ہیں۔ کسی رسالے کے دفتر سے میں اس وقت اپنی کہانی کا معاوضہ وصول نہیں کر سکتا، جب تک صفیہ کا اجازت نامہ میرے پاس نہ ہو۔ اب میری کہانیوں کے چار مجموعے بیک وقت زیرِ طبع ہیں۔ مضامین کا مجموعہ بھی عنقریب مارکیٹ میں آئے گا۔ بڑا مزے دار نام رکھا ہے اس مجموعہ کا۔۔۔ سُنو تو دل پشوری ہو جائے گا۔

''اوپر نیچے اور درمیان۔'' کیوں کیسا نام ہے؟''

''السلام علیکم۔''

اچانک ایک دراز ریش مولانا کی گونج دار آواز ایک دھماکے کے ساتھ پھٹی اور ان کی قیادت میں ''السلام علیکم منٹو صاحب، منٹو صاحب السلام وعلیکم'' کی گردان کرتے ہوئے کئی چھوٹے بچے کمرے میں داخل ہو گئے۔

''لاحول ولا۔ کیا آفت ہے''۔ منٹو نے جھلّاتے ہوئے کہا۔ ''وعلیکم السلام بھئی، وعلیکم السلام'' اور مولانا صاحب کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''آئیے۔ آئیے تشریف لائیے۔''

''اچھا اب اجازت دیجئے منٹو صاحب۔'' میں نے کہا۔

''کہاں جا رہے ہو نریش!'' منٹو نے چیختے ہوئے کہا۔ ''میاں صاحب ان سے ملئے یہ میرے ہندوستانی دوست ہیں۔ چلو تم بھی نریش ہمارے ساتھ ذرا تفریح ہی رہے گی کیوں میاں صاحب۔؟''

اور ہم سب کو میاں صاحب کے ساتھ لے کر منٹو صاحب لکشمی منشن کے پارک میں پہنچ گئے۔ وہاں بہت سے بچے اور ان کے والدین پہلے سے جمع تھے۔ کرسیِ صدارت پر بیٹھتے ہی منٹو صاحب نے مسکراتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

''مجھے آج کے اس جلسے میں اس لئے بلایا گیا ہے کہ میں اُن بچّوں میں انعام تقسیم کروں جو کھیلوں میں اوّل رہے ہیں۔ اگرچہ مجھے یہ معلوم نہیں ہے کہ بچّوں نے کون کون سے ایسے کھیل کھیلے ہیں۔ بہر حال سب سے پہلے میں دو روپے کا ایک انعام اپنی طرف سے اس بچّے کو دینا چاہتا ہوں۔''

بچوں کے ساتھ ساتھ ان کے والدین بھی حیرت زدہ ہو کر منٹو صاحب کی طرف دیکھنے لگے۔

''دیکھو پاکستان ایک آزاد مملکت ہے۔'' منٹو صاحب نے نئے سرے سے سلسلۂ کلام کا آغاز کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔'' پاکستانی بچّے اس مملکت کے مستقبل کی امانت ہیں۔ تم سب کو بے باک غیور اور راست باز ہونا چاہئے۔ ہاں تو میں مبلغ دو روپے کا ایک انعام اس بچّے کو پیش کروں گا جس نے گلی ڈنڈا کھیلتے ہوئے اپنی گلّی سے پرسوں میری کھڑکی کا شیشہ توڑ ڈالا ہے۔''

مجمع کی سنجیدگی اور حیرانی ایک دم قہقہوں میں ڈوب گئی۔

''دیکھو گھبرانے یا ہنسنے کی بات نہیں ہے۔ جس بچّے نے بھی شیشہ توڑا ہے وہ سامنے آکر یہ انعام لے سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ وعدہ کرے کہ آئندہ اپنی گلّی سے کسی مکان کی کھڑکی کا شیشہ نہیں توڑے گا۔''

چند منٹوں تک جب کوئی بچہ اپنے آپ کو اس انعام کا مستحق ثابت نہ کر سکا تو منٹو نے باری باری اور جلدی جلدی مختلف کھلاڑی بچّوں کو انعام تقسیم کرنے شروع کر دیئے۔ اس ہنگامے سے فارغ ہو کر خیمے سے باہر نکلتے ہوئے منٹو نے مجھے علیحدہ لے جا کر پوچھا۔

''تمہارے پاس کچھ پیسے ہیں۔؟''

''کیوں کتنے پیسوں کی ضرورت ہے۔'' میں نے جیب سے بٹوہ نکالتے ہوئے کہا۔

''مجھے نہیں بھئی وائن مرچنٹ کو ضرورت ہے۔ بیس پچیس کے لگ بھگ کام چل جائے گا۔''

''ہاں ہاں کوئی بات نہیں۔''

''اور منٹو نے سڑک پر جاتے ہوئے ایک خالی تانگے کو فوراً رکوالیا اور اگلی سیٹ پر کوچ کی طرح

اکڑوں بیٹھ گئے۔ میں اور نثار پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے راستے میں میں نے پوچھا۔

''منٹو صاحب پی کہاں جائے گی۔؟''

''گھر میں اور کہاں۔ وہ جو پہلے شراب خانے تھے وہ اب نذر پاکستان ہو گئے۔''

''مگر آپ کے مکان میں ۔۔۔؟'' میں نے ڈرتے ڈرتے اپنے اندیشے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''کہیں صفیہ بھابی برہم نہ ہو جائیں۔''

''ارے نہیں میاں ۔۔۔ پندرہ سال گزارے ہیں اس کے ساتھ۔ میں اسے بہتر سمجھتا ہوں۔ کوئی بات نہیں ایسی۔''

وائن مرچنٹ کی دوکان زیادہ دور نہیں تھی۔ جوں ہی تانگہ رکا۔ منٹو ہمیں دوکان کے اندر لے گیا۔ دوکان کا سیلز مین منٹو سے کافی بے تکلف تھا۔ بوتل منٹو نے اپنے ہاتھ میں لے لی اور قیمت ادا کرنے کے بعد جب ہم باہر نکلنے لگے تو اس نے مذاق سے کہا۔

''منٹو صاحب! میرا خیال ہے اب آپ پرمٹ بنوا ہی لیجئے۔''

''ہاں تمہارا خیال واقعی نیک ہے۔ لیکن یہ ثواب کا کام تم خود ہی کیوں نہیں کرتے۔ میرے نام سے پرمٹ بنوالو اور میرے مرنے کے بعد اس پرمٹ کو میرے ساتھ ہی قبر میں دفن کر دینا تا کہ غریب سعادت حسن منٹو کی عاقبت خراب نہ ہو۔ اس دنیا میں تو تمہاری عنایت سے اس کی ضرورت نہیں پڑی۔ لیکن کیا خبر اللہ تعالیٰ کی اسلامی سلطنت میں اس کے بغیر کام نہ چلے۔''

سیلز مین کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔

''آپ بھی خوب چیز ہیں منٹو صاحب!''

اور ہم اس ''خوب چیز'' کو ساتھ لے کر پھر لکشمی منشن میں پہنچ گئے۔ منٹو کے کمرے میں ایک صاحب پہلے ہی سے ان کے منتظر تھے۔ منٹو نے جلدی سے ہمیں ایک دوسرے سے متعارف کرایا۔ وہ خوش پوش نوجوان کسی متمول خاندان کا چشم و چراغ، کالج کا طالب علم اور منٹو کے خاص عقیدت مندوں میں سے تھا۔ منٹو نے کوچ میں دھنستے ہوئے اپنے ملازم کو آواز دی جو خالی گلاس لے آیا۔ اور سوڈے کی جگہ ہم پانی سے کام چلانے لگے۔ وہ خوش پوش نوجوان اور نثار شراب کے زیادہ عادی نہیں تھے۔ دو پیگ پینے کے بعد

وہ صرف سگریٹ پینے لگے۔ میں دھیرے دھیرے اور بہت کم مقدار میں پی رہا تھا۔ کیونکہ یہ خیال میرے دماغ سے چھپکلی کی طرح چمٹا ہوا تھا کہ میں غیر ملکی ہوں۔ شراب پینے کا پرمٹ میرے پاس نہیں ہے اور اس شغل کے بعد مجھے یہاں سے کافی دور مصری شاہ میں قتیل شفائی کے مکان تک پہنچنا ہے۔ جہاں مقیم ہوں لیکن منٹو صاحب غیر معمولی سرعت سے پی رہے تھے اور بے شمار موضوعات پر بے محابا اور بے تامل بولے جارہے تھے۔ بیک وقت بہت سی یادوں، بہت سے خیالوں اور بہت سی چیزوں نے ان کے مضطرب دماغ میں کھلبلی سی مچا رکھی تھی۔ لیکن ہر موضوع کی تان بالآخر وہ اپنی ذات پر ہی توڑتے تھے۔

''نریش! تم کبھی کبھی نثر میں بھی تو لکھتے ہو۔ تمہارے لکھے ہوئے ''سرخ حاشیے'' بیسویں صدی میں میری نظر سے گزرے تھے۔ ان میں تم نے میرا ذکر بھی تو کیا ہے۔ ''سرخ حاشئے'' بطرز ''سیاہ حاشیے'' مگر یار! تم صرف شعر وعر ہی لکھا کرو۔ تمہاری نظموں کا ایک مجموعہ بھی میں نے دیکھا تھا۔ نہ جانے کیا نام ہے اس کا۔ ارے وہی جس کے ڈسٹ کور پر فراق گورکھپوری نے اپنی رائے لکھی ہے۔ یہ فراق بھی خوب حضرت ہیں مجھے ایک دفعہ ان کا کوئی خط موصول ہوا جس کا میں جواب نہ دے سکا آپ نے ایک اور خط لکھا کہ منٹو صاحب! آپ ہمارے خط کا جواب کیوں دینے لگے۔ آپ ہندوستان اور پاکستان کے سب سے بڑے نخش نگار جو ٹھہرے۔ اور ہاں بھئی عدم کو تو تم جانتے ہونا۔ سچ سچ بتانا اس کی غزلیں تمہیں کیسی لگتی ہیں۔ میں ویسے شعر وشاعری سے بہت کم دلچسپی لیتا ہوں لیکن میرے پاس عدم کی دو تین کتابیں ہیں۔ نہ جانے یہ اپنی غزلوں میں بار بار 'خلوص' کا لفظ کیوں استعمال کرتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کے اپنے اندر خلوص کا فقدان ہے۔ ندیم قاسمی بڑا پُرخلوص انسان ہے خدا کا شکر ہے کہ ظہیر کاشمیری یہ بات نہیں سن رہا ورنہ ابھی ہیگل اور مارکس کے فلسفے کی قینچی سے بے چارے قاسمی کے خلوص کی دھجیاں بکھیر دیتا۔ اور اس کے بعد بین الاقوامی ادبی تحریکوں پر ایک پُرزور اور طویل تقریر بھی جھاڑتا اور شراب کا سارا مزہ کرکرا ہو جاتا۔ میں پوچھتا ہوں یہ بین الاقوامی ادبی تحریکیں ہیں کیا۔ ایک سرے سے ڈھونگ۔ ارے سعادت حسن منٹو خود ایک بین الاقوامی تحریک ہے۔ تم نے میری کہانیاں پڑھی ہیں نا نریش۔ اندازاً کتنی کہانیاں پڑھی ہوں گی۔ میرا خیال ہے سبھی کہانیاں پڑھی ہوں گی۔ سبھی نہیں تو بہت سی ضرور پڑھی ہوں گی۔ اور اب یہ بتاؤ کہ دنیا بھر کے ادب میں تمہیں کون کون سے افسانہ نگار پسند ہیں۔ چیخوف، موپساں، سمرسٹ ماہم، گورکی، ٹالسٹائی میں تمہیں کون

کون سے افسانہ نگار پسند ہیں۔ چیخوف، موپساں، سمرسٹ ماہم، گورکی اور ہنری چلو دو چار نام اور شامل کردو۔ میری بہترین اور منتخب کہانیوں کی تعداد ان سب کی منتخب اور بہترین کہانیوں سے کسی لحاظ سے کم نہیں۔ کیوں میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا۔ بولتے کیوں نہیں؟۔"

ہم سب منٹو کی غصیلی، ضدی اور سرکش طبیعت سے اچھی طرح واقف تھے۔ اس لئے سب نے مشترکہ طور پر اس کی تائید کی۔ شراب کا نشہ بتدریج منٹو کے حواس کو اپنی گرفت میں لے رہا تھا۔ اور انہوں نے مزے میں آکر پنجابی شاعری کا ذکر چھیڑ دیا۔

"یار تم نے وہ "ترنجن" دیکھی ہے۔ احمد راہی کی پنجابی نظموں کا مجموعہ۔ اس کے شروع میں پنجابی ہی میں میں نے اپنی رائے لکھی ہے۔ نریش! کیا لئے پھرتے ہو اپنی غزل وزل کو۔ سنو تمہیں کچھ پنجابی بولیاں سناتا ہوں۔ تمہارے شاعروں کے فلک تک ایسی بولیاں نہیں لکھ سکتے۔ ان کے بھاری بھرکم دیوانوں پر ایک ایک بول بھاری ہے۔"

اور اس کے بعد منٹو کے حیرت انگیز حافظے کا ایک نیا دروازہ کھل گیا۔ اور یکے بعد دیگرے پنجاب کے تمدن اور پنجابی کسان کی زندگی کے زبانوں میں ڈھلی ہوئی بہت سی حسین وجمیل بولیاں اس دروازے سے باہر نکلنے لگیں۔ منٹو صاحب ہر بولی کے پس منظر کو اُجاگر کر کے اس کے رنگ وروپ اور اس کی سج دھج کو دوبالا کر دیتے تھے۔ یہ سلسلہ نہ جانے کب تک جاری رہتا اگر منٹو کو یہ احساس نہ ہو جاتا کہ شراب ختم ہو چکی ہے۔ اپنے گلاس کو خالی دیکھ کر ان کی نظریں بھی خالی سی ہو گئیں۔ حافظے کے دروازے بھی بند ہو گئے۔ اور وہ کسی آٹومیٹک مشین کی طرح بولتے بولتے رُک گئے۔

منٹو صاحب مجھے کافی دور جانا ہے۔ اب مجھے اجازت دیجئے۔" میں نے اس خاموشی کی شہ پا کر دبے لفظوں میں کہا۔ منٹو جیسے چیختے ہوئے بولے۔

"نہیں تم ابھی نہیں جاؤ گے۔"

"تمہارے ساتھ تو تمہاری گاڑی ہے نا۔؟" وہ خوش پوش طالب علم کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھنے لگے۔ "پٹرول تو ہوگا۔ چلو کرنل صاحب کے ہاں چلتے ہیں۔"

میں نے دبے لفظوں میں دوبارہ رخصت چاہنے کی کوشش کی لیکن منٹو صاحب نے میری بات سنی ان سُنی

کرتے ہوئے باہر آکر مجھے کار میں دھکیل دیا۔ کار میں بیٹھتے ہی منٹو نے کار سے متعلق ہی ایک واقعہ سنانا شروع کیا۔

ایک رات اسی طرح کسی دوست کی کار میں عدم اور میں دونوں بیٹھے ہوئے تھے اور ہم دونوں خوب پیے ہوئے تھے۔ راستے میں کار کی لائٹ خراب ہوگئی ایک چوراہے پر ٹریفک کے سپاہی نے جب کار کو روکنے کا اشارہ کیا تو ڈرائیور کوشش کے باوجود اسے روک نہ سکا تو معلوم ہوا کہ کار کی بریکیں بھی ٹھیک کام نہیں کر رہی ہیں۔ دس بارہ گز کی دوری پر جب کار رکی تو ڈرائیور چالان کے اور عدم لاہور میں بغیر پرمٹ کے شراب پینے کے جرم کے خیال سے پریشان اور خوفزدہ ہوگئے۔ میں کار سے اُتر کر لپک کر سپاہی کے پاس پہنچا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہے میں نے بڑے طمطراق سے کہا۔

ارے! تمہارے ایس، پی کی کوٹھی کدھر ہے۔؟

اچانک ایس۔ پی کا نام سن کر سپاہی حواس باختہ ہوگیا۔ میں نے اس کی کمزوری کو بھانپتے ہوئے کڑک کر کہا۔

''ارے تم سپاہی ہو کر سپرنٹنڈنٹ کی کوٹھی سے واقف نہیں ہو۔ یہیں کہیں تو ہے۔'' سپاہی نے بہت بے چارگی کے ساتھ کہا۔

''حضور میں نیا آدمی ہوں اس لئے نہیں جانتا'' اور میں اسے پھٹکارتے ہوئے کار میں واپس آگیا اور ڈرائیور کو فوراً چلنے کے لئے کہہ دیا۔''

''اس کار کی بھی تو بریکیں خراب نہیں ہیں۔؟'' یہ واقعہ سن کر بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔

''اوہو کیسے آدمی سے پالا پڑا ہے۔ پورے لطیفے کا ستیہ ناس کر دیا۔ ارے نریش کمار شاد! خدا کی قسم تمہارا نام نراش کمار ناشاد ہونا چاہیے تھا۔'' اور منٹو کی اس بات پر ہم سب ہنسنے لگے۔

کار پوری تیزی سے رواں دواں تھی۔ رات کے ساڑھے نو بج چکے تھے (ہندوستان کے دس) شہر کی سڑکیں قریب قریب سنسان ہو چکی تھیں۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا تو میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ کار لاہور چھاؤنی کی فوجی بارکوں کے قریب سے گزر رہی تھی۔ میں نے اپنی جیب میں اپنے پاسپورٹ کو ٹٹولتے ہوئے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔

''منٹو صاحب! غضب ہوگیا۔''

منٹو صاحب نے چونکتے ہوئے پوچھا۔" کیوں خیریت تو ہے۔؟"

" آپ تو مجھے لاہور چھاؤنی میں لے آئے۔" میں نے سہمے سہمے لہجے میں آہستہ سے کہنا شروع کیا۔" اس وقت میں پیئے ہوئے ہوں۔ اور پھر لاہور کی پولس کو اطلاع دیئے بغیر کسی دوسرے مقام پر جا بھی نہیں سکتا اور پھر یہ فوجی علاقہ ہے۔ میرا تو دل کانپ رہا ہے۔"

" تمہارا دل ٹھیک کانپ رہا ہے۔" منٹو صاحب نے نہایت ہمدردانہ الفاظ میں کہا۔" تو اب کیا کیا جائے۔ تمہارے خیال میں۔"

" میرے خیال میں تو واپس چلنا چاہئے۔"

" لیکن ہمارا مقصد کیوں کر پورا ہوگا۔؟"

" آپ وہیں منگوا کر پی لیتے۔ یہاں پینا تو خطرے سے خالی نہیں۔ اور میں تو خیر یہاں شراب کی ایک بوند تک نہیں پی سکتا۔"

" ارے پینا کس دوزخی کا مقصد ہے۔"؟

" تو اور کیا چاہتے ہیں آپ۔؟"

" تمہیں لاہور چھاؤنی کے تھانے میں گرفتار کروانا۔" منٹو نے نہایت متانت سے جواب دیا۔

میں کوشش کے باوجود منٹو کے اس مذاق پر نہ ہنس سکا۔ اس ماحول میں ڈر محسوس کر رہا تھا کہ کہیں منٹو کا یہ مذاق حقیقت کی شکل اختیار نہ کر لے۔ خدا خدا کر کے جب کار کرنل صاحب کی کوٹھی تک پہنچی تو معلوم ہوا کہ وہ صبح سے عیال و اطفال کے ساتھ کسی عزیز کی شادی کے سلسلے میں راولپنڈی چلے گئے ہیں۔ منٹو نے سر پیٹ لیا۔ ایک دو ملازموں سے کینٹین سے رم کی بوتل لانے کے لئے بھی کہا۔ لیکن کوئی رضامند نہ ہوا۔ ایک آدھ گھنٹے کی جھک جھک کے بعد ناکام و نامراد واپس آنا پڑا۔

کار چلتی رہی اور منٹو صاحب گم سم بیٹھے رہے۔ ان کے گرم گرم متحرک ذہن میں جیسے جملوں کی سب چنگاریاں ایک دم بجھ گئیں۔ ان کی یہ خاموشی اس وقت......... اگرچہ ہم سب کو گراں گزر رہی تھی۔ لیکن ہم سب خاموش تھے۔ کیونکہ سب سمجھ رہے تھے کہ کرنل صاحب راولپنڈی چلے گئے ہیں۔ وائن مرچنٹ کی دوکان بند ہو چکی ہے۔ چھاؤنی کی کسی کینٹین سے بھی رم نہیں مل سکتی۔ اور منٹو صاحب کا نشہ ٹوٹ رہا ہے۔

شراب جو منٹو صاحب کی مضمحل زندگی کے چراغ میں تیل کا کام دیتی ہے اس وقت کہیں سے دستیاب نہیں ہوسکتی۔ کار اسٹیشن کے سامنے سے گزری تو منٹو صاحب چُپ رہے۔ مصری شاہ کے دروازے میں داخل ہوئی جب بھی منٹو صاحب ایک لفظ نہیں بولے۔ کار قتیل صاحب کے مکان کے سامنے رکی تو میں نیچے اُترا اور منٹو صاحب کو شب بخیر کہنے کے بعد رخصت ہوتا ہی چاہتا تھا کہ منٹو خود ہی کار سے نیچے اُتر کر ذرا دور ایک بجلی کے کھمبے کے پاس جاکر مجھ سے کہنے لگے۔

''معاف کرنا نریش۔ میں نے آج بڑے کمینہ پن کا ثبوت دیا ہے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ میں خود تمہیں پینے کی دعوت دیتا مگر جیب میں پیسے نہیں تھے۔ میں نے صفیہ سے بھی کہا تھا لیکن۔ تاہم مجھے افسوس ہے کہ تمہیں مدعو کرنے کے بجائے الٹا تم سے خرچ کرا دیا۔ خدا کی قسم سعادت حسن منٹو بڑا رذیل آدمی ہے۔''

میں دوپہر سے اب تک زیادہ تر خاموش ہی رہا تھا۔ لیکن منٹو صاحب نے یہ الفاظ کچھ ایسے انداز میں کہے تھے کہ اُن کی پوری زندگی کا درد اُن میں سمٹ کر آ گیا تھا۔ میں چپ نہ رہ سکا۔ میرا دل بھر سا آیا۔ میں ان کی تشفی کے لئے کچھ کہنا چاہتا تھا کہ منٹو صاحب نے پھر اپنی بڑی بڑی وحشت ناک آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ وہ آنکھیں جنہوں نے زندگی کے ان گنت مشاہدوں کا زہراب پیا تھا جیسے جانتی تھیں کہ میں کیا کہنے والا ہوں۔ اُنہوں نے مجھے کچھ کہنے سے روک دیا جیسے وہ آنکھیں کہہ رہی ہوں منٹو صاحب کی رذالت کے کرب کو ہم بھی سمجھتی ہیں۔ تم بھی جانتے ہو۔ پھر کہنے کی کیا ضرورت ہے۔

اس خیال سے کہ منٹو صاحب آج اس دُنیا میں نہیں ہیں۔ میرے دماغ میں لاہور کی اس رات کا اندھیرا اُمنڈ آتا ہے۔ اور اس اندھیرے میں ننھے منے جگنوؤں کی طرح اس آخری ملاقات کی یادیں کسی تسلسل کے بغیر ٹمٹمانے لگتی ہیں۔ تاریکی کی ان گھنی لہروں میں منٹو صاحب کے مسخ شدہ دُھندلے خط و خال اُبھرنے ڈوبنے لگتے ہیں۔۔ ان کی موٹی موٹی وحشت ناک آنکھیں مجھے بار بار گھورتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں جیسے اس کھوکھلے سماج اور اس کی انسان کُش اخلاقی قدروں کا منہ چڑاتی ہوئی کہہ رہی ہوں۔

''خدا کی قسم سعادت حسن منٹو بڑا رذیل آدمی ہے۔ بڑا رذیل آدمی ہے۔ بڑا رذیل۔''

☆☆☆

سید اکمل علیمی

منٹو کے آخری ایام

18 جنوری 1955ء اردو ادب کی تاریخ کا ایک غم انگیز دن ہے۔ اس روز ہمارے سماج کے مہیب دیوؤں سے لڑنے والا نحیف و نزار منٹو موت کے راکشش سے شکست کھا گیا اور جب اس کی ہمیشہ مضطرب رہنے والی روح اس کے لڑکھڑاتے جسم سے پرواز کر چکی، تو لوگ دبی زبان سے کہہ رہے تھے۔

☆ ایک جینئس مر گیا۔

☆ ایک مجاہد چل بسا۔

☆ بیسویں صدی کا مقبول عام ادیب انتقال کر گیا۔

☆ اردو افسانے کی موت واقع ہو گئی۔

سعادت حسن منٹو کی اپنی زندگی کی کہانی اس کی عمر بھر کی تحریروں سے کہیں زیادہ دل دوز ہے۔ اس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ ایک عظیم ناول کے ابواب کا روپ دھار سکتا ہے۔ لیکن اس کی زندگی کے آخری ایام حیرت انگیز طور پر زیادہ تیز رفتار، زیادہ مضطرب اور زیادہ متحرک تھے۔

اس کی موت سے چند روز پیشتر۔۔۔ ایک سہ پہر کو میں اور استاد دامن بیڈن روڈ کی اس گمنام سی گلی میں داخل ہوئے جس میں ایشیا کا یہ عظیم فن کار مقیم تھا۔ اس کا مکان ایک بڑے مکان کا حصہ ہے جو تین کمروں پر مشتمل ہے۔

دامن مجھ سے کہہ رہا تھا کہ منٹو ہماری سوسائٹی کے لئے پنجابی زبان میں افسانہ لکھے گا۔ مجھے یہ توقع نہ تھی لیکن دامن کو منٹو سے اپنے برادرانہ تعلقات کا گھمنڈ تھا اور اسی گھمنڈ کے سرور میں اس کے مکان کی جانب بڑھ رہا تھا۔

ہم منٹو کے مکان پر پہنچے، تو باجی صفیہ نے خندہ پیشانی سے استقبال کرتے ہوئے بتایا

کہ ''سعادت صاحب (وہ اپنے رفیق حیات کو اسی طرح پکارتی تھیں) گھر میں نہیں ہیں۔''

استاد دامن نے کہا کہ ''ان کو میرا پیغام دے دیجئے گا کہ اس جمعہ کو آپ پنجابی کلچرل سوسائٹی کے ادبی جلسہ میں اپنا پنجابی افسانہ پڑھیں گے۔'' باجی کو تعجب ہوا' اور انہوں نے وعدہ کیا۔

''میں خود ان کو ساتھ لے کر آؤں گی۔''

اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ دونوں دامن کی شاعری کو بے حد پسند کرتے تھے۔ منٹو کہا کرتا تھا کہ استاد دامن پنجابی زبان کا سب سے بڑا شاعر ہے اور مجھے اس لئے عزیز ہے کہ وہ ہماری تہذیب و معاشرت کا ترجمان ہے۔ اس لحاظ سے وہ پنجاب کے تمام اردو ادیبوں سے آگے ہے۔

اخبارات میں اعلان کر دیا گیا۔ سوسائٹی کے اس اجلاس میں سعادت حسن منٹو اپنا پنجابی افسانہ سنائیں گے۔

جمعہ کو کچھ سوچ کر ساڑھے تین بجے میں اس کے مکان پر پہنچ گیا۔ وہ صوفے پر بیٹھا ہوا دور سے نظر آ رہا تھا اور اپنے معمول کے مطابق اپنے گھر آنے والے کو اشتیاق بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو اس نے پنجابی افسانے کے بارے میں اپنی جھنجھلاہٹ کا اظہار کرنا شروع کر دیا:۔

> ''او۔ یار۔ دو گھنٹے سے بیٹھا ہوں۔ تمہاری سوسائٹی کے لئے افسانہ لکھنا چاہتا ہوں۔ افسانے تو بے شمار میرے سامنے ناچتے پھرتے ہیں۔ مگر میں ان کو پنجابی زبان کا لباس پہنانے سے اپنے آپ کو معذور پاتا ہوں۔''

یہ سن کر میرا چہرہ اُتر گیا۔ لیکن اس نے میری پریشانی کو فوراً بھانپ لیا اور سگریٹ کی ڈبیا میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولا:۔

''تم سمجھتے ہو کہ میں افسانہ پڑھوں گا نہیں؟ (میں ذرا سنبھلا) افسانے کو گولی مارو۔ میں تمہارے اجلاس میں چلوں گا اور ضرور کچھ پڑھوں گا۔''

میں اس ''کچھ'' کے تصور میں ڈوبنے والا تھا کہ وہ بول اٹھا:

''میں تقریر کروں گا تم فکر نہ کرو۔''

اس روز میں نے منٹو سے اس کی صحت کے بارے میں استفسار کیا، تو اس نے انتہائی بیزاری کا اظہار کیا اور بات کو دوسری طرف لے گیا:۔

''یار میں آدمی ہوں یا کیا ہوں۔ ایمان سے اتنی محنت تو کوئی بے ایمان بھی نہیں کرتا۔ رات کے دو بجے سے اب تک دو افسانے لکھ چکا ہوں۔ اب تمہارے لئے فکر کر رہا تھا اور اگر تم نہ آتے تو شاید لکھ مارتا۔''

پھر اس نے اپنی مصروفیت کا حال سنایا:

''کل میں نے گورنمنٹ کالج کی ''بزم اقبال'' میں افسانہ پڑھا تھا۔ آج انجینئرنگ کالج کی ''بزم ادب'' میں افسانہ پڑھنا تھا۔ پاس کچھ نہیں تھا تو رات کے دو بجے اٹھ کر لکھا۔''

وہ اس تحریر کی سی روانی سے گفتگو نہیں کر سکتا تھا۔ ایک ایک لفظ گویا مخاطب کی طرف پھینکتا تھا، گرتا، پڑتا، لڑھکتا ہوا۔ ''صبح کالج کے لڑکے ٹیکسی میں لے گئے تھے۔ وہاں افسانہ پڑھا۔ یار وہاں کا ایک لطیفہ سنو:۔

''محفل برخاست ہونے کے بعد مجھ سے کہنے لگے ''منٹو صاحب! ہم نے آپ کے اعزاز میں چائے کا انتظام کیا ہے۔ چائے پیتے جائیے۔''

وہ تمسخر کے انداز میں ہنسا

''اکمل مجھے منٹو سے کہنے لگے'' چائے پیو۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ ''میں چائے نہیں پیا کرتا۔ یہ دو پیسے کا کم پانی میرے کام کا نہیں۔'' وہ منہ کھولے سوچ رہے تھے کہ منٹو چائے کیوں نہیں پیتا'' میں انہیں اشارہ کر رہا تھا کہ میں کچھ اور پیتا ہوں جو اس وقت بھی میرے چسٹر کی دائیں جیب میں موجود ہے۔''

آہ! یہ وہی آتش سیال تھی جو اردو ادب کے ایک معمار، دوستوں کے ایک مخلص دوست، بیوی کے ایک محبوب خاوند اور تین بچیوں کے شفیق باپ کو بہا کر گوشۂ قبر میں لے گئی۔ آج اس عظیم انسان کے غم میں دل خون کے آنسو روتا ہے۔ جس کے بارے میں اس کے ایک عزیز دوست نے کہا تھا کہ:

''منٹو غلیظ جوہڑوں میں کود پڑا۔ مگر جب وہ باہر نکلا تو اس کی مٹھیوں میں بیش بہا لعل تھے!''

منٹو نے بڑے کرب سے مجھے بتایا کہ دو تین افسانے روز لکھنے ''پڑتے ہیں'' کہتے ہوئے اس نے

ایت بے بسی کا لہجہ اختیار کرلیا۔

یہ اس ملک کی نحوست ہے کہ ایک ایسا ادیب بھی روٹی کو ترستا ہے جس نے ہمارے پورے عاشرے کو ایک نئے معاشرتی شعور، اور انسانوں کو دیکھنے کے لئے ایک نئے نقطۂ نگاہ سے روشناس کیا س کے فن پاروں کو لے کر ان تمام مغربی ادیبوں کو چیلنج کر سکتے ہیں جو زندگی اس معیار پر بسر کر رہے یں جہاں ہماری نگاہ تک نہیں جا سکتی۔

منٹو نے مجھ سے پوچھا ''جلسہ کتنے بجے ہے؟''

''چار بجے'' میں نے جواب دیا۔

''اچھا تو چلو، ذرا ایک کام کرلیں۔'' وہ اندر گیا، کپڑے بدلے اور پھر آ گیا۔ ''یار وہ صفیہ بھی جانا چاہتی ہے۔ مگر وہ کہاں ہے؟'' اس نے نوکر کو آواز دی۔

''دیکھو! بی بی آئے تو اسے بتا دینا کہ ہم وائی ایم سی اے گئے ہیں۔''

میرے پاس سائیکل تھی۔ میں منٹو کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ مگر وہ اکیلا نہیں جانا چاہتا تھا۔

''تم سائیکل یہیں رکھ دو۔ ہم تانگہ پر چلیں گے۔''

سڑک پر آئے۔ ایک تانگہ کھڑا تھا۔ کوچوان و بیشتر کوچوان منٹو کو جانتے ہیں ایک افسانہ نویس کی حیثیت سے نہیں ایک ''سواری'' کی حیثیت سے کوچوان نے منٹو کو سلام کیا اور وہ تانگہ کی طرف بڑھنے ہی والا تھا کہ وہیں ایک پروفیسر، میں ان کا نام نہیں لوں گا۔ خدا انہیں صراطِ مستقیم دکھائے۔ بڑے جید استاد ہیں، آ نکلے جو منٹو سے بہت قریب ہیں۔

منٹو آج شہنشاہ تھا۔ اس نے صبح سے دو مرتبہ شراب پی تھی اور ایک بوتل ابھی اس کے گھر میں پڑی تھی۔ آج وہ اپنے دوست کو بھول نہیں سکتا تھا۔ تانگے والے سے کہا۔ تم ہمارا انتظار کرو۔ وہ تعظیم بجالایا اور ہم پھر منٹو کے مکان پر آ گئے۔ منٹو پہلے داخل ہوا۔ پھر میں اور پروفیسر ابھی باہر تھے کہ منٹو نے اندر سے آواز دی۔

''بے خطر چلے آؤ۔ آج ۔۔۔۔۔ وہ ۔۔۔ کوئی نہیں ہے گھر میں۔''

پروفیسر اندر گئے۔ ایک پیگ پیا اور ہم باہر آ کر تانگے پر سوار ہو گئے تانگہ ایبک روڈ کی طرف بڑھ رہا تھا اور منٹو پروفیسر سے کہہ رہا تھا ''یہ معاملہ ہے میری جیب میں۔ ابھی چلتے ہیں ۔۔۔ کیا نام ہے

اس کا۔۔۔چلو نہ فیصلہ کرو۔۔۔اس کے پاس چلتے ہیں۔دیکھئے کیا دیتا ہے یہ۔۔۔منٹو کو لوگوں کے نام اور شعر یاد نہیں رہتے تھے۔وہ کوشش کرتا تھا کہ نام یاد آئے۔مگر ناکام رہتا،تو ''چلو دفعہ کرو''، کہہ کر اپنی جھنجھلاہٹ دور کر لیتا۔

شعروں کے معاملے میں بھی اس کا رویہ بڑا ظالمانہ تھا۔کسی موقعہ پر اس کا جی چاہتا کہ کسی شعر کا حوالہ دے اور پھر وہ یوں ہکلانے لگتا ''وہ جو داغ نے کہا ہے کہ عمر اپنی جو اسی طور سے گزری غالب اور جب شعر پورا یاد نہ آیا تو بولا ''چلو دفعہ کرو۔''

اس نے جیب سے ایک مسودہ نکالا۔ننھے ننھے حرفوں میں لکھا ہوا عنوان تھا ''کوڑے کے ڈھیر'' یہ افسانہ اسی روز ایک ناشر کے حوالے کیا گیا تھا۔۔اور منٹو سے اس تحریر کا معاوضہ طے ہوا ''گیارہ روپے''

آپ دیکھیں گے۔ایک کتاب عنقریب چھپ کر آئے گی۔اس میں منٹو کا یہ افسانہ ''کوڑے کے ڈھیر'' بھی شامل ہوگا اور ناشر یہ اشتہار دے گا:۔

''مرحوم منٹو کی آخری پیش کش ''کوڑے کے ڈھیر'' جس کو لکھتے لکھتے وہ خود ڈھیر ہو گیا۔'' وغیرہ وغیرہ۔

دقت یہ تھی کہ منٹو کو اس شخص کا نام یاد نہیں تھا۔یہی کہتا تھا کہ ''اس کے منہ پر داڑھی ہے وہ گیبرڈین کی شیروانی پہنتا ہے۔وہ ٹھگنا سا ہے۔مگر اس طائفے میں تو ہر فرد اسی حلیے کا ہے۔ایک فرد سے پتہ چلا کہ اس حلیے کا آدمی آپ کو ڈی۔پی۔آئی کے دفتر میں ملے گا۔

ہم سررشتۂ تعلیم کے دفتر میں پہنچے۔باہر ناشروں کی چمکیلی کاریں کھڑی تھیں۔ان میں منٹو کا تانگہ بھی داخل ہو گیا۔سب ناشر باہر پاس لے رہے تھے۔گورے چٹے رنگ،لال لال منہ، چشمے، شیروانیاں،توندیں،شلواریں،غرور،گھمنڈ،نخوت اور ان سب کے درمیان منٹو کھڑا تھا۔ہر ناشر اس سے ''لمبے لمبے ہاتھ'' کر کے ملتا تھا۔

جلسے کا وقت قریب تھا،اور منٹو کو افسانے کا معاوضہ ابھی تک نہیں ملا تھا۔اس نے ساری جدوجہد ترک کی اور تانگے والے سے کہا ''وائی۔ایم۔سی۔اے چلو۔''

ہم لوگ بورڈ روم میں پہنچے تو ساڑھے چار بج چکے تھے۔کمرہ لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔لوگ منٹو کی صورت دیکھ کر لہلہا اٹھے۔منٹو کے چہرے پر میری اور اس کی اپنی پریشانی عیاں تھی۔میرے ساتھیوں

نے مجھے قہر آلود نگاہوں سے دیکھا، اور آج کی محفل کے صدر مولانا عبدالمجید سالک نے مجھے ڈانٹ پلائی۔ ''بھئی کارکنوں کو تو وقت پر آجانا چاہیے۔'' میں نے منٹو کی طرف مظلومانہ طور پر دیکھا اور وہ فوراً ڈھال بن کر آگے آگیا اور بے آواز قہقہوں میں سب کو مطمئن کر دیا۔

استاد دامن نظم پڑھ رہا تھا ''کالے بادل'' منٹو نے دامن کو مجبور کر کے مزید تین چار نظمیں سنیں۔ اب منٹو کی اپنی باری آئی۔ اس نے پہلے تو اپنا افسانہ نہ لکھ سکنے کی معذرت کی اور پھر اپنی تقریر کا عنوان بتایا۔

''پنجابی بولیاں''

لوگ چونکنے ہو گئے۔ منٹو نے پنجابی شاعری خصوصاً ''بولیوں'' کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے شروع کر دیے۔ وہ اپنی تحریروں میں کبھی اس جرم کا مرتکب نہیں ہوا۔ مگر آج وہ پنجابی ادب سے اپنی بے پناہ عقیدت کی بنا پر یہ سب کچھ کر رہا تھا۔ اس نے بولیاں پڑھنا شروع کر دیں۔ ''بولیاں'' جن میں حسن تھا، جن میں جوانی تھی، عشق تھا اور عورت کا وہ جاندار تصور تھا جو دنیا بھر کے کسی ادب کو بہت کم نصیب ہوا۔

منٹو ہر بولی پر مختصر سا تبصرہ کرتا اور پھر کوئی عنوان تجویز کر کے ''بولی'' سنا دیتا۔

اسکینڈل

کوٹھے کوٹھے آ ٹھمکے تینوں بنتو دا یاد کھاواں

Possession

میرا یار سی سرو دا بوٹا وہڑے وچ لا رکھدی

اور اسی طرح وہ سناتا چلا گیا چند ایک یاد رہ گئی ہیں:

جتھے لچھی پیر دھردی اوتھے اگدا سرد وا بوٹا

کدی چندریے ہاک نہ ماریں چوڑے والی بانہہ کڈ کے

میرے یار نوں مندانہ بولیں میری بھاویں گت پٹ گئیں

تیری میری ایک جندڑی تینوں تاپ چڑھے میں ہوں کاں

جٹی نہا کے چھپڑو چوں نکلی سلفے وی لاٹ ورگی

منجی کرے لگر دی چھانویں چن اج ساری رات دا

مولانا عبدالمجید صاحب نے فراغ دلی سے اس کی اجازت دے دی۔ آج ان کی تمام نقاہت،، تمام گھمبیرتا منٹو کے سیل تقریر میں بہہ گئی تھی اور منٹو نے ایک بولی پڑھی۔۔۔لوگ سٹ پٹا گئے۔لیکن منٹو گویا ایک روحانی تسکین محسوس کرر ہا تھا۔

اس نے ایک گمنام پنجابی شاعر کی حقیقت بیانی اور جرأتِ اظہار کا اظہار کر کے گویا خود اس مقام کو پالیا تھا۔

منٹو کی بولیاں سن کر استاد دامن کی بھی رگ شعریت پھڑ کی۔اور آن واحد میں وائی۔ایم۔سی۔اے کا بورڈ روم شالا مار کا میلہ چراغاں ہو کر رہ گیا۔

منٹو اور دامن میں مقابلہ شدید ہوتا جا رہا تھا۔منٹو کا حافظہ آج غیر معمولی قوت کا ثبوت دے رہا تھا اور دامن تو خود شاعر تھا۔بالآخر یہ معاملہ ختم ہوا اور میدان منٹو کے ہاتھ رہا۔کیونکہ منٹو کی بولیاں دامن کی بولیوں سے زیادہ ترش اور زیادہ تیز بلکہ تیزابی تھیں۔

پروگرام کا ابھی ایک آئیٹم باقی تھا۔مگر منٹو ہم لوگوں کو اپنی''انتہائی شدید'' مجبوریوں کا حوالہ دیتے ہوئے لڑکھڑاتا ہوا باہر نکل گیا۔وہ پروفیسر بھی اس کے ساتھ تھے۔

اگلے دن مجھے اپنا سائیکل لینے کے لئے پھر لکشمی بلڈنگ کے عقب میں جانا پڑا۔منٹو گھر میں اکیلا تھا۔ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں،آج اس کا چہرہ بھی زرد تھا اور اس کی آنکھوں میں بسنت پھول رہی تھی۔اتنے میں باجی صفیہ باہر سے آگئیں۔وہ کسی عزیز کو دیکھنے کے لئے پاگل خانے گئی تھیں۔

منٹو پاگل خانے کا ذکر لے بیٹھا اور مجھے بتایا کہ'' پاگل خانے میں صرف پاگلوں کو جانا چاہئے۔ میں نے وہاں جا کر سخت غلطی کی۔ صاحب مجھ سے تو یوں سلوک کرنے لگے۔ جیسے میں۔۔۔لیکن صاحب میں نے دو ہاتھ دکھائے تو وہ ٹھیک ہوئے۔یار! وہاں کسی مریض کو ازار بند استعمال کرنے کی اجازت نہیں۔ مجھے ان پاجاموں سے سخت نفرت تھی۔پھر اس نے پاگل خانے کے مقاصد اور اس کے فرائض پر ایک طویل تقریر کی اور پھر اٹھ کر تیار ہو گیا۔میں نے برآمدے میں سے اپنا سائیکل اُٹھایا تو مجھے پوچھنے لگا۔

''یہ سائیکل تمہارا ہے؟''

میں نے کہا ''کل تم نے تو رکھوایا تھا۔''

''لو میں سمجھا شاید کسی۔۔۔۔دھوبی کا ہے۔ یہ دیکھو اس کا فرنٹ کیریئر ویسا ہی تو ہے۔''

میں نے آزردہ ہو کر کہا ''یہاں کتابیں بھی تو رکھی جا سکتی ہیں۔''

اس نے فوراً بات کا رخ بدل دیا بلکہ سائیکل کے ''کثیفے'' سے سائیکل کا لطیفہ پیدا کر دیا:۔

''لطیفہ ہی سمجھ اس کو یار۔ ایک مرتبہ میں نشے میں کسی سڑک پر جا رہا تھا۔ میرے پاس نیا سائیکل تھا۔ کیا نام تھا اس کے ماڈل کا۔۔۔آ آ آ چلو دفعہ کرو۔ سائیکل پنکچر ہو گیا۔ میں نے وہیں سڑک پر بیٹھنے والے ایک مستری کو پنکچر لگانے کے لئے دے دیا اور کہا کہ تھوڑی دیر کے بعد آ کر لے جاؤں گا اس روز میں پتہ نہیں کہاں سے کہاں جا نکلا۔ اور اس کے بعد مجھے یاد نہیں ہے کہ وہ مستری کس جگہ بیٹھا تھا۔ سائیکل پر سواری کرتے کرتے سوچتا ہو گا کہ عجیب ہونق انسان ملا۔ دو آنے میں دو سو کا سائیکل چھوڑ گیا۔''

''اور ایک سائیکل میری یہیں سے کوئی اُٹھا کر لے گیا۔ دن دہاڑے یار'' میری ساس، بیوی سب لوگ اندر بیٹھے تھے وہ آیا اور لے گیا۔ مجھے کوئی افسوس نہیں۔ اس کے ہاتھ کی صفائی کی داد دیتا ہوں۔''

منٹو کی باتیں، اس کی کہانی بہت طویل ہے۔ یہ حقیقت اس کے افسانوں سے کہیں زیادہ دلدوز ہے۔ وہ مجھے 17 جنوری کی دوپہر کو بھی نظر آیا۔ گورنمنٹ کالج ہال کے سامنے تانگے میں بیٹھا تھا اور دو لڑکوں کو بلا رہا تھا میں آنکھیں بچا کر نکل آیا۔ میری جیب خالی تھی۔ میں منٹو کی حالت کو سمجھ رہا تھا اور مجھے افسوس ہے کہ میں نے منٹو کو اتنے عظیم فن کار کو۔۔۔۔زندگی کے آخری چوبیس گھنٹوں میں بھی دوستوں کی جیب پر بار بنتے ہوئے دیکھا، اور اس سے بڑھ کر قلق یہ کہ میں خود اس کی مدد نہ کر سکا۔

شاید وہ زندگی کے آخری چند گھنٹوں میں بہت زیادہ پینا چاہتا تھا۔ اس نے 17 کی صبح کو پی۔ دوپہر کو بھی پی، اور رات کو بھی پیتا رہا اور جب صبح اٹھا تو پھر بھی باز نہ آیا اور آخر اس کا جگر کٹ گیا اور موت کے فرشتے نے اسے اس دنیا سے اٹھا لیا۔

اس کے بھتیجے نے کہا ہے:۔

''منٹو کو زیادہ غموں نے گھیرا ہے، اس نے اتنی زیادہ شراب پی اور اس نے جتنی زیادہ شراب پی، اسے اتنے ہی زیادہ غموں کا سامنا کرنا پڑا اور یہ تسلسل لامتناہی صورت اختیار کر گیا اور بالآخر اس کش مکش نے ہمارے سب سے زیادہ محبوب ادیب کو ہم سے چھین لیا۔''

منٹو نے اپنے آخری ایام میں بڑے متنوع خیالات اپنے سامنے جمع کر لئے تھے۔ اب وہ زندگی کے ہر پہلو پر لکھنے لگا تھا۔ چچا سام کے نام خطوط پوری عالمی سیاست پر اثر انداز ہو رہے تھے۔ یہ خطوط وزراء کی لمبی چوڑی تقریروں سے زیادہ پر تاثیر تھے۔ اب تمام مکاتب فکر کے لوگ اس کی جانب متوجہ ہو رہے تھے لیکن اس نے خود ہم سب کی جانب سے منہ پھیر لیا۔

☆☆☆

منٹو ماموں کی موت

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ منٹو ماموں میانی صاحب کے قبرستان سے اُٹھ کر گھر چلے آئے تو میں ان سے کیا کہوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ میں ان کی حیاتِ ثانی کے معجزے کو نظر انداز کر کے ان سے صرف اتنا کہوں گا۔ ''منٹو صاحب، آپ نے آج تک جتنی غیر ذمہ دارانہ حرکتیں کی ہیں ان میں سب سے زیادہ غیر ذمہ دارانہ حرکت آپ کی موت تھی۔''

بہاول پور میں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان کرکٹ کا دوسرا میچ ہو رہا تھا اور میں ڈرنگ اسٹیڈیم میں بیٹھا طالع یار خاں کو میچ کا چشم دید حال نشر کرنے میں مدد دے رہا تھا کہ لاہور سے میرے نام ایک ٹرنک کال آئی اور مجھے بتایا گیا کہ آج صبح سعادت حسن منٹو کا انتقال ہو گیا۔ میں فوراً غم سے بے قابو نہیں ہو گیا بلکہ مجھ میں شدید برافروختگی پیدا ہوگئی۔ مجھے منٹو ماموں پر انتہائی شدید غصہ آ رہا تھا کہ وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ یہ سلوک کس طرح کر سکتے ہیں؟ لیکن میں نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ اور جب میں بولا تو میری آواز سے غیر معمولی تشویش نمایاں تھی۔ میں نے پوچھا ''کہاں انتقال ہوا؟'' جواب ملا ''گھر پر۔'' اس جواب سے مجھے بڑا اطمینان ہوا۔ کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ اچانک گھر سے باہر کسی اور مقام پر موت سے ہم آغوش نہ ہو گئے ہوں۔ عین ممکن تھا کہ کسی تانگے پر، کسی ریستوران میں، کسی پبلشر کے دفتر میں بیٹھے بیٹھے یا کسی فلم اسٹوڈیو میں انہیں اچانک موت آ گئی ہو......

جب میں اپنی جگہ پر واپس گیا تو میچ کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرنے والے ساتھیوں نے اشاروں سے پوچھا کہ کیا بات تھی۔ میں نے ایک کاغذ پر یہ جملہ لکھ دیا۔ ''امپائر نے سعادت حسن منٹو کو آخر آؤٹ دے ہی دیا۔ آج صبح ان کا انتقال ہو گیا۔''

منٹو ماموں کو آؤٹ دینے کے لئے امپائر سے کئی بار اپیلیں کی جا چکی تھیں لیکن ہر بار اپیل مسترد

... میں سے ایک خواہش یہ بھی تھی۔ اپنی موت سے ایک دن پہلے انہوں نے ایک ریستوران میں اپنے دوستوں سے کہا تھا۔ ''حامد جلال کو واپس آ جانے دو، میں اسی کے ساتھ ٹسٹ میچ میں حنیف کا کھیل دیکھنے جاؤں گا۔''

ان کی دوسری خواہش اس بے یار و مددگار عورت کی موت پر افسانہ لکھنے کی تھی جس کی برہنہ لاش گجرات میں سڑک کے کنارے پائی گئی تھی۔ اخباروں میں شائع ہونے والی اطلاعات کے مطابق اس عورت اور اس کی ننھی سی بچی کو بس کے اڈے سے اغوا کیا گیا اور نصف درجن کے قریب ہوس پرستوں نے اپنی بہیمانہ خواہشات کی تکمیل کی اور جب وہ کڑکڑاتی سردی میں ان کے چنگل سے نکل کر بھاگی تو اس کے جسم پر لباس کا ایک تار بھی نہ تھا چنانچہ دونوں ماں بیٹی نے منجمد کر دینے والی سردی میں دم توڑ دیا۔ اس المیہ سے منٹو ماموں بے حد متاثر ہوئے تھے۔ اسی روز شام کو گجرات سے کچھ لوگ ان کے پاس آئے تھے اور انہوں نے حادثہ کی مزید تفصیلات بتائی تھیں۔ اس سے ان میں ضرور اشتعال اور ہیجان پیدا ہوا ہوگا اور میرا خیال ہے کہ اس کے بعد منٹو ماموں نے معمول سے زیادہ شراب پی لی ہوگی جو ان کے لئے مہلک ثابت ہوئی۔

وہ کافی شام گزرنے کے بعد گھر واپس آئے، تھوڑی دیر بعد انہیں خون کی قے ہوئی۔ میرے چھ سالہ بچے نے جو ان کے قریب ہی کھڑا تھا، خون کی دھاریوں کی طرف انہیں متوجہ کیا تو انہوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ کچھ نہیں یہ تو پان کی پیک ہے۔ انہوں نے اسے یہ تاکید بھی کر دی کہ وہ اس کا کسی سے ذکر نہ کرے۔ اس کے بعد انہوں نے حسب معمول کھانا کھایا اور سو گئے۔ گھر بھر میں کسی کو وہم و گمان بھی نہ تھا کہ کوئی بات خلاف معمول ہوئی ہے۔ کیونکہ میرے لڑکے نے منٹو ماموں کا راز کسی پر ظاہر نہیں کیا تھا۔ ممکن ہے خود منٹو ماموں کو بھی اس کے متعلق کوئی تشویش نہ ہوئی ہو۔ یوں بھی وہ گھر والوں کو ایسے معاملات سے بے خبر رکھنا ہی پسند کرتے تھے کیونکہ ہر طرف سے شراب ترک کرنے کا مطالبہ شروع ہو جاتا تھا۔

رات کا پچھلا پہر تھا کہ انہوں نے اپنی بیوی کو اٹھا کر بتایا کہ وہ شدید درد محسوس کر رہے ہیں اور اب تک بہت سا خون ضائع ہو چکا ہے۔ان کا خیال تھا کہ ان کا جگر پھٹ گیا ہے۔ان کی بیوی نے جب یہ دیکھا کہ وہ اس صورت حال کا تن تنہا مقابلہ نہیں کر سکتیں تو انہوں نے گھر کے دوسرے لوگوں کو جگایا اور انہیں موت کے منہ سے نکالنے کی جدو جہد شروع ہو گئی۔ اس سے پہلے کئی شدید علالتوں کے بعد وہ شفایاب ہو چکے تھے اس لئے کسی کو یہ خیال تک نہیں ہو سکتا تھا کہ اب وہ صرف چند گھنٹوں کے مہمان ہیں۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ انہیں آؤٹ دینے کے لئے امپائر کی انگلی اسی وقت سے فضا میں بلند ہونی شروع ہو گئی تھی۔ جب منٹو ماموں کو خون کی پہلی قے آئی تھی۔

منٹو ماموں کے آخری لمحات کے متعلق میں نے جو کچھ سنا ہے، اس سے میں یہی اندازہ لگا سکا ہوں کہ کافی دیر تک انہیں خود بھی یقین نہیں تھا کہ ان کا وقت اب آ گیا ہے۔ڈاکٹر کے انجکشن وغیرہ لگانے کے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک وہ مایوس نہیں ہوئے تھے۔لیکن اس علاج کے بعد بھی ان کی حالت خلاف معمول نہیں سنبھلی، ان کی نبض برابر ڈوبتی گئی اور درد میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔خون کی قے بھی بند نہیں ہوئی۔صبح کو ڈاکٹر نے تجویز پیش کی کہ منٹو ماموں کو ہسپتال پہنچا دیا جائے۔

اس وقت منٹو ماموں کے ہوش وحواس بالکل بجا تھے اور ہسپتال کا نام سُنتے ہی بول اٹھے" اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ مجھے ہسپتال نہیں لے جاؤ اور یہیں سکون سے پڑا رہنے دو۔"

گھر کی عورتوں کے لئے یہ منظر نا قابلِ برداشت تھا۔انہوں نے رونا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر منٹو ماموں فوراً مشتعل ہو گئے اور اُنہوں نے غضب ناک آواز میں کہا۔" خبردار جو کوئی رویا۔" یہ کہہ کر انہوں نے اپنا منہ رضائی سے بند کر لیا۔

منٹو کا یہ اصلی روپ تھا۔ جس شخص کی زندگی کا کوئی گوشہ آج تک دُنیا کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہا تھا وہ کس طرح برداشت کر سکتا تھا کہ لوگ اُسے مرتا ہوا دیکھیں۔منٹو ماموں مجسم غیظ وغضب بنے ہوئے تھے۔معلوم نہیں وہ اپنے آپ سے ناراض تھے یا شراب سے۔۔۔۔جو ان کی قبل از وقت موت کی ذمہ دار تھی۔

ایمبولینس آنے سے پہلے صرف ایک یا دو بار انہوں نے اپنے منہ سے رضائی ہٹائی۔اُنہوں نے کہا" مجھے بڑی سردی لگ رہی ہے، اتنی سردی شاید قبر میں بھی نہیں لگے گی۔ میرے اوپر اور رضائیاں

ڈال دو۔'' کچھ دیر توقف کے بعد ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک نمودار ہوئی۔

انہوں نے آہستہ سے کہا۔ ''میرے کوٹ کی جیب میں ساڑھے تین روپے پڑے ہیں۔ ان میں کچھ اور پیسے ملا کر تھوڑی سی وہسکی منگا دو......''

شراب کے لئے ان کا اصرار جاری رہا اور ان کی تسلی کے لئے پوّا منگا لیا گیا۔ انہوں نے بوتل کو بڑی عجیب اور آسودہ نگاہوں سے دیکھا اور کہنے لگے ''میرے لئے دو پیگ بنا دو۔'' اور یہ کہتے ہوئے درد اور شدید تشنجی دورے کے باعث وہ کانپ سے اُٹھے۔

منٹو ماموں کی آنکھوں میں اس وقت اپنے لئے رحم کا کوئی شائبہ موجود نہ تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کا وقت آ پہنچا ہے لیکن ایک بار بھی اور ایک لمحے کے لئے بھی انہوں نے اپنے اوپر جذباتیت نہیں طاری ہونے دی۔ انہوں نے اپنے بچوں اور یا کسی کو اپنے پاس نہیں بلایا۔ وہ نگاہِ واپسیں یا وصیت کے کبھی قائل نہیں تھے۔ ان جیسی شخصیتوں کے لئے زندگی اور موت کے درمیان حد فاصل بہت ہی مبہم اور غیر واضح ہوتی ہے اور یہی ہونا بھی چاہئے، کیونکہ ان کی زندگی اور روح تو پہلے ہی ان کے جسم سے ان کی کتابوں میں منتقل ہو چکی ہوتی ہے۔ وہاں پہنچ کر انہیں غیر فانی ہونے کا یقین ہو جاتا ہے۔ وہاں وہ ابد تک زندہ رہتے ہیں۔ ہنستے بولتے رہتے ہیں۔ محبت کرتے رہتے ہیں۔

بستر مرگ پر منٹو ماموں نے شراب کے سوا کوئی اور چیز نہیں مانگی۔ انہیں بہت پہلے معلوم ہو چکا تھا کہ شراب ان کی جانی دشمن ہے اور وہ اسے موت کا ہم معنیٰ سمجھنے لگے تھے، جس پر جسمانی فتح کسی صورت میں ممکن نہیں ہے، جس طرح موت کے آگے کوئی انسان پیش نہیں پا سکتا اسی طرح منٹو ماموں شراب کے سامنے بالکل بے بس ہوتے تھے۔ لیکن ان کی فطرت چونکہ ہمیشہ سے باغیانہ تھی اس لئے انہوں نے موت سے بھی بغاوت کی تھی۔ انہیں شکست سے بھی سخت نفرت تھی خواہ وہ موت کے ہاتھوں ہی کیوں نہ ہو اور یہی وجہ ہے کہ وہ موت سے تنہائی میں آنکھیں چار کرنا چاہتے تھے۔ جہاں کوئی انہیں مرتا نہ دیکھ سکے۔ جہاں کوئی ان کی شکست کا نظارہ نہ کر سکے۔

ان سے کم درجے کا آدمی ایک ڈرامائی موت کا اہتمام کرتا تاکہ اس کے مرنے کے بعد لوگ اس کا چرچا کریں۔ اس پر مضمون لکھے جائیں اور اس کے اعزا و احباب کہہ سکیں کہ اس کی زندگی ضرور ایسی تھی جسے ہم پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن مرنے سے پہلے وہ منفعل ہو گیا تھا اور اچھا آدمی بن گیا تھا۔ لیکن منٹو

ماموں ریاکار نہیں تھے۔انہوں نے اس خواہش کا سختی سے مقابلہ کیا۔ان کی موت کے وقت صرف ایک پہلو ڈرامائی تھا یعنی شراب طلب کرنے کا منظر۔لیکن اس کا فائدہ بھی مرکزی کردار کو پہنچ سکتا تھا کیونکہ اس کا صحیح مفہوم صرف وہی سمجھ سکتا تھا۔

میں اس وقت موجود ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے ذہن کو ایک حد تک میرے سامنے بے نقاب کر دیتے۔اور یہ کچھ مشکل بھی نہ تھا کیونکہ انہیں صرف اتنا کہنے کی ضرورت تھی۔سانپ اور انسان کی کہانی نہ بھولنا۔میں اپنے سر کو اثبات میں جنبش دیتا اور شراب کا آخری جام انہیں پینے کو دے دیتا۔صرف یہی ایک جملہ ہر بات واضح کرنے کے لئے کافی ہوتا۔سانپ اور انسان کی کہانی صرف اتنی تھی کہ ایک آدمی نے اپنے دوستوں کے منع کرنے کے باوجود ایک زہریلا سانپ پال رکھا تھا اور ایک دن سانپ نے اپنا سارا زہر اس کے جسم میں اُتار دیا۔تو اس نے بھی سانپ کو پکڑ لیا اور اس کا سر کاٹ کر پھینک دیا۔

ایمبولینس جیسے ہی دروازے پر آکر کھڑی ہوئی انہوں نے شراب کا پھر مطالبہ کیا۔ایک چمچہ وہسکی ان کے منہ میں ڈال دی گئی۔لیکن ایک قطرہ مشکل سے ان کے حلق سے نیچے اُتر سکا ہوگا۔باقی شراب ان کے منہ سے گر گئی اور ان پر غشی طاری ہوگئی۔زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ انہوں نے اپنے ہوش وحواس کھوئے تھے۔انہیں اسی حالت میں ایمبولیس میں لٹا دیا گیا۔

ایمبولینس ہسپتال پہنچی اور ڈاکٹر انہیں دیکھنے کے لئے اندر گئے تو منٹو ماموں مر چکے تھے۔دوبارہ ہوش میں آئے بغیر راستے ہی میں ان کا انتقال ہو چکا تھا۔

☆☆☆

سعادت حسن منٹو

منٹو اپنے ہمزاد کی نظر میں

انتقال سے چند ماہ پہلے منٹو نے یہ مضمون اپنے بارے میں لکھا تھا۔ اس وقت اس کی نوعیت اور تھی۔ لیکن اب یہ آواز دوسری دنیا سے آتی معلوم ہوتی ہے۔ ''ہم اکٹھے ہی پیدا ہوئے اور خیال ہے کہ اکٹھے ہی مریں گے۔ لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ سعادت حسن مرجائے اور منٹو نہ مرے''۔ سعادت حسن کا یہ خیال غلط نکلا، قیاس صحیح ثابت ہوا۔ اکٹھے پیدا ہونے والے اکٹھے نہیں مرتے ہیں۔ منٹو کا صرف ہمزاد اس دنیا سے رخصت ہوا ہے۔

منٹو کے متعلق اب تک بہت کچھ لکھا اور کہا جاچکا ہے۔ اس کے حق میں کم اور خلاف زیادہ۔ یہ تحریریں اگر پیش نظر رکھی جائیں تو کوئی صاحب عقل، منٹو کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم نہیں کرسکتا۔ میں یہ مضمون لکھنے بیٹھا ہوں، اور سمجھتا ہوں کہ منٹو کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرنا بڑا کٹھن کام ہے۔ لیکن ایک لحاظ سے آسان بھی ہے اس لئے کہ منٹو سے مجھے قربت کا شرف حاصل رہا ہے۔ اور سچ پوچھئے تو منٹو کا میں ہمزاد ہوں۔

اب تک اس شخص کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن میں اتنا سمجھتا ہوں کہ جو کچھ ان مضامین میں پیش کیا گیا ہے حقیقت سے بالاتر ہے۔ بعض اسے شیطان کہتے ہیں، بعض گنجا فرشتہ...... ذرا ٹھہرئیے میں دیکھ لوں کہیں وہ کم بخت یہیں سن تو نہیں رہا۔ نہیں نہیں، ٹھیک ہے، مجھے یاد آگیا کہ یہ وہ وقت ہے جب وہ پیا کرتا ہے۔ اس کی شام کو چھ بجے کے بعد کڑوا شربت پینے کی عادت ہے۔

ہم اکٹھے ہی پیدا ہوئے اور خیال ہے کہ اکٹھے ہی مریں گے۔ لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ سعادت

حسن مرجائے اور منٹو نہ مرے۔ اور ہمیشہ مجھے یہ اندیشہ بہت دکھ دیتا ہے۔ اس لئے کہ میں نے اس کے ساتھ اپنی دوستی نباہنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ اگر وہ زندہ رہا اور میں مر گیا تو ایسا ہوگا کہ انڈے کا خول تو سلامت ہے اور اس کے اندر کی زردی اور سفیدی غائب ہوگئی ہے۔

اب میں زیادہ تمہید میں جانا نہیں چاہتا۔ آپ سے صاف کہے دیتا ہوں کہ منٹو ایسا وَن ٹو آدمی میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا جسے اگر جمع کیا جائے تو وہ تین بن جائے۔ مثلث کے بارے میں اس کی معلومات کافی ہیں۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ ابھی اس کی تثلیث نہیں ہوئی۔ یہ اشارے ایسے ہیں جو صرف بافہم سامعین ہی سمجھ سکتے ہیں۔

یوں تو منٹو کو میں اس کی پیدائش ہی سے جانتا ہوں۔ ہم دونوں اکٹھے ایک ہی وقت ۱۱ مئی ۱۹۱۲ء کو پیدا ہوئے لیکن اس نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ وہ خود کو کچھوا بنائے رکھے۔ جو ایک دفعہ اپنا سر اور گردن اندر چھپالے تو آپ لاکھ ڈھونڈتے رہیں تو اس کا سراغ نہ ملے۔ لیکن میں بھی آخر اس کا ہمزاد ہوں۔ میں نے اس کی ہر جنبش کا مطالعہ کر ہی لیا۔

لیجئے۔ اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہ خرذات افسانہ نگار کیسے بنا؟ تنقید نگار بڑے لمبے چوڑے مضامین لکھتے ہیں۔ اپنی ہمہ دانی کا ثبوت دیتے ہیں۔ شوپن ہار، فرائڈ، ہیگل، نطشے، مارکس کے حوالے دیتے ہیں مگر حقیقت سے کوسوں دور رہتے ہیں۔

منٹو کی افسانہ نگاری دو متضاد عناصر کے تصادم کا باعث ہے۔ اس کے والد خدا انہیں بخشے بڑے سخت گیر تھے، اور اس کی والدہ بے حد نرم دل۔ ان دو پاٹوں کے اندر پس کر یہ دانۂ گندم کس شکل میں باہر نکلا ہوگا، اس کا اندازہ آپ کر سکتے ہیں۔

اب میں اس کی اسکول کی زندگی کی طرف آتا ہوں۔ بہت ذہین لڑکا تھا اور بے حد شریر۔ اس زمانے میں اس کا قد زیادہ سے زیادہ ساڑھے تین فٹ ہوگا۔ وہ اپنے باپ کا آخری بچہ تھا۔ اس کو اپنے ماں باپ کی محبت تو میسر تھی لیکن اس کے تین بڑے بھائی جو عمر میں اس سے بہت بڑے تھے اور ولایت میں تعلیم پا رہے تھے، ان سے اس کو کبھی ملاقات کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ اس لئے کہ وہ سوتیلے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ اس سے ملیں۔ اس سے بڑے بھائیوں ایسا سلوک کریں۔ یہ سلوک اسے اس وقت نصیب ہوا جب دنیائے ادب اُسے بہت بڑا افسانہ نگار تسلیم کر چکی تھی۔

اچھا اب اس کی افسانہ نگاری کے متعلق سنئے۔ وہ اوّل درجے کا فراڈ ہے۔ پہلا افسانہ اس نے بعنوان "تماشہ" لکھا جو جلیانوالہ باغ کے خونیں حادثہ سے متعلق تھا۔ یہ اس نے اپنے نام سے نہ چھپوایا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پولس کی دست برد سے بچ گیا۔

اس کے بعد اس کے متلون مزاج میں ایک لہر پیدا ہوئی کہ وہ مزید تعلیم حاصل کرے۔ یہاں اس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس نے انٹرنس کا امتحان دو بار فیل ہو کر پاس کیا تھا، وہ بھی تھرڈ ڈویژن میں اور آپ کو یہ سن کر بھی حیرت ہوگی کہ وہ اردو کے پرچے میں ناکام رہا۔

اب لوگ کہتے ہیں کہ وہ اردو کا بہت بڑا ادیب ہے اور میں یہ سن کر ہنستا ہوں۔ اس لئے کہ اردو ادب بھی اسے نہیں آتی۔ وہ لفظوں کے پیچھے یوں بھاگتا ہے، جیسے کوئی جال والا شکاری تتلیوں کے پیچھے۔ وہ اس کے ہاتھ نہیں آتیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تحریروں میں خوب صورت الفاظ کی کمی ہے۔ وہ لٹھ مار ہے۔ لیکن جتنے لٹھ اس کی گردن پہ پڑے ہیں اس نے بڑی خوشی سے برداشت کئے ہیں۔

اس کی لٹھ بازی عام محاورے کے مطابق جاٹوں کی لٹھ بازی نہیں ہے۔ وہ بنوت اور پھکیت ہے۔ وہ ایک ایسا انسان ہے جو صاف اور سیدھی سڑک پر نہیں چلتا۔ بلکہ تنے ہوئے رسّے پر چلتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اب گرا...... لیکن وہ کم بخت آج تک کبھی نہیں گرا۔ شاید گر جائے اوندھے منہ...... کہ پھر نہ اُٹھے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ مرتے وقت وہ لوگوں سے کہے گا کہ میں اسی لئے گرا تھا کہ گراوٹ کی مایوسی ختم ہو جائے۔

میں اس سے پیشتر کہہ چکا ہوں کہ منٹو اوّل درجے کا فراڈ ہے۔ اس کا مزید ثبوت یہ ہے کہ وہ اکثر کہا کرتا ہے کہ وہ افسانہ نہیں سوچتا خود افسانہ اسے سوچتا ہے۔ یہ بھی ایک فراڈ ہے۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ جب اسے افسانہ لکھنا ہوتا ہے تو اس کی وہی حالت ہوتی ہے جب کسی مرغی کو انڈا دینا ہوتا ہے۔ لیکن وہ یہ انڈا کہیں چھپ کر نہیں دیتا۔ سب کے سامنے دیتا ہے۔ اس کے دوست یار بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس کی تین بچیاں شور مچا رہی ہوتی ہیں اور وہ اپنی مخصوص کرسی پر اکڑوں بیٹھا انڈے دیئے جاتا ہے جو بعد میں چوں چوں کرتے افسانے بن جاتے ہیں۔ اس کی بیوی اس سے بہت نالاں ہے۔ وہ اس سے اکثر کہا کرتی ہے کہ تم افسانہ نگاری چھوڑ دو۔ کوئی دکان کھول لو۔ لیکن منٹو کے دماغ میں جو دکان کھلی ہے، اس میں منیاری کے سامان سے کہیں زیادہ سامان موجود ہے۔ اس لئے وہ اکثر سوچا کرتا ہے۔ اگر میں نے

کبھی کوئی اسٹور کھول لیا تو ایسا نہ ہو کہ وہ کولڈ اسٹوریج یعنی سردخانہ بن جائے جہاں اس کے تمام تر خیالات اور افکار منجمد ہو جائیں۔

میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں، اور مجھے ڈر ہے کہ منٹو مجھ سے خفا ہو جائے گا۔ اس کی ہر چیز برداشت کی جاسکتی ہے مگر خفگی برداشت نہیں کی جاسکتی۔ خفگی کے عالم میں وہ بالکل شیطان بن جاتا ہے، لیکن صرف چند منٹوں کے لئے۔ اور وہ چند منٹ، اللہ کی پناہ......۔

افسانہ لکھنے کے معاملے میں وہ نخرے ضرور بگھارتا ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں اس لئے...... کہ اس کا ہمزاد ہوں...... کہ وہ فراڈ کر رہا ہے...... اس نے ایک دفعہ خود لکھا تھا کہ اس کی جیب میں بے شمار افسانے پڑے ہوئے ہیں۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ جب اسے افسانہ لکھنا ہوگا، تو یہ رات کو سوچے گا۔...... اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔ صبح پانچ بجے اٹھے گا اور اخباروں سے کسی افسانے کا رس چوسنے کا خیال کرے گا۔ لیکن اسے ناکامی ہوگی۔ پھر وہ غسل خانے میں جائے گا۔ وہاں وہ اپنے شوریدہ سر کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرے گا کہ وہ سوچنے کے قابل ہو سکے۔ لیکن ناکام رہے گا۔ پھر جھنجھلا کر اپنی بیوی سے خواہ مخواہ کا جھگڑا شروع کر دے گا۔ یہاں سے بھی ناکامی ہوگی، تو باہر پان لینے کے لئے چلا جائے گا۔ پان اس کی ٹیبل پر پڑا رہے گا لیکن افسانے کا موضوع اس کی سمجھ میں پھر بھی نہیں آئے گا۔ آخر وہ انتقامی طور پر قلم یا پنسل ہاتھ میں لے گا اور ۷۸۶ لکھ کر جو پہلا فقرہ اس کے ذہن میں آئے گا اس سے افسانے کا آغاز کر دے گا۔

بابو گوپی ناتھ، ٹوبہ ٹیک سنگھ، ہتک، ممی، موذیل، یہ سب افسانے اس نے اسی فراڈ طریقہ سے لکھے ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ لوگ اسے بڑا غیر مذہبی اور فحش انسان سمجھتے ہیں، اور میرا بھی خیال ہے کہ وہ کسی حد تک اس درجہ میں آتا ہے۔ اس لئے کہ اکثر اوقات وہ بڑے گہرے موضوعات پر قلم اٹھاتا ہے اور ایسے الفاظ اپنی تحریر میں استعمال کرتا ہے جن پر اعتراض کی گنجائش بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ جب بھی اس نے کوئی مضمون لکھا، پہلے صفحے کی پیشانی پر ۷۸۶ ضرور لکھا جس کا مطلب ہے بسم اللہ۔ اور یہ شخص جو اکثر خدا سے منکر نظر آتا ہے، کاغذ پر مومن بن جاتا ہے۔ یہ وہ کاغذی منٹو ہے جسے آپ کاغذی باداموں کی طرح صرف انگلیوں ہی میں توڑ سکتے ہیں، ورنہ وہ لوہے کے ہتھوڑے سے بھی ٹوٹنے والا آدمی نہیں۔

اب میں منٹو کی شخصیت کی طرف آتا ہوں۔ جو چند القاب ہیں، بیان کئے دیتا ہوں۔ وہ چور

ہے، جھوٹا ہے، دغاباز ہے اور مجمع گیر ہے۔

اس نے اکثر اپنی بیوی کی غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کئی کئی سو روپے اڑائے ہیں۔ ادھر آٹھ سو لا کے دیئے اور چور آنکھ سے دیکھتا رہا کہ اس نے کہاں رکھے ہیں اور دوسرے دن اس میں سے ایک سبزہ غائب کر دیا اور اس بیچاری کو جب اپنے اس نقصان کی خبر ہوئی تو اس نے نوکروں کو ڈانٹنا پیٹنا شروع کر دیا۔

یوں تو منٹو کے متعلق مشہور ہے کہ وہ راست گو ہے لیکن میں اس سے اتفاق کرنے کے لئے تیار نہیں۔ وہ اوّل درجے کا جھوٹا ہے۔ شروع شروع میں اس کا جھوٹ اس کے گھر چلا جاتا تھا۔ اس لئے کہ اس میں منٹو کا ایک خاص ٹچ ہوتا تھا لیکن بعد میں اس کی بیوی کو معلوم ہو گیا کہ اب تک مجھ سے خاص معاملہ کے مطابق جو کچھ کہا جاتا تھا...... جھوٹ تھا۔

منٹو جھوٹ بقدر کفایت بولتا ہے لیکن اس کے گھر والے مصیبت ہے کہ اب یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اس کی ہر بات جھوٹی ہے۔ اس تل کی طرح جو کسی عورت نے اپنے گال پر سرمے سے بنا رکھا ہے۔

وہ ان پڑھ ہے۔ اس لحاظ سے کہ اس نے کبھی مارکس کا مطالعہ نہیں کیا، فرائڈ کی کوئی کتاب آج تک اس کی نظر سے نہیں گزری۔ ہیگل کا وہ صرف نام ہی جانتا ہے، ہیولک ایلس کو وہ صرف نام سے جانتا ہے۔ لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ لوگ...... میرا مطلب ہے تنقید نگار، یہ کہتے ہیں کہ وہ ان تمام مفکروں سے متاثر ہے۔ جہاں تک میں جانتا ہوں، منٹو کسی دوسرے شخص کے خیال سے متاثر ہوتا ہی نہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ سمجھانے والے سب چغد ہیں...... دنیا کو سمجھانا نہیں چاہئے اس کو خود سمجھنا چاہئے۔

خود کو سمجھا سمجھا کر وہ ایک ایسی سمجھ بن گیا ہے جو عقل و فہم سے بالاتر ہے۔ بعض اوقات ایسی اوٹ پٹانگ باتیں کرتا ہے کہ مجھے ہنسی آتی ہے۔ میں آپ کو پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ منٹو جس پر فحش نگاری کے سلسلے میں کئی مقدمے چل چکے ہیں بہت طہارت پسند ہے، لیکن میں یہ بھی کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ ایک ایسا پاانداز ہے جو خود کو جھاڑتا پھٹکتا رہتا ہے۔

☆☆☆

پروفیسر شمس الحق عثمانی

من کہ سعادت حسن منٹو...

(بقلم خود)

گیارہ مئی سنہ اُنیس سو بارہ سے اٹھارہ جنوری سنہ اُنیس سو پچپن تک؛ بیالیس سال آٹھ مہینے چار دن، سعادت حسن منٹو کا دورِ حیات بھی ہے اور، برصغیر سمیت، دنیا کے بیشتر خطوں میں سیاسی و معاشرتی افراتفری کا عہد بھی۔

سعادت حسن منٹو اپنے دور کا حساس ترین بیرومیٹر تھا— وہ اپنے دُور و نزدیک زندگی کرنے والوں کے ظاہر و باطن سے ٹکراتی ہواؤں کو، اپنی ذات سے گزار گزار کر، اُن کی شدتوں اور کثافتوں کو بھی اور اُن کی نزاکتوں اور لطافتوں کو بھی لفظوں کے وسیلے سے آشکارا کر رہا تھا۔ اُس کے لفظوں نے معانی کی ترسیل کے لیے اردو نثر کی تقریباً تمام اصناف کو برتا: افسانہ، ڈراما، ناول، فیچر، خاکہ، مضمون، تبصرہ اور خطوط؛ جو تقاضا معانی کا ہُوا۔

اِن اصناف پر نگاہ کرنے والے بعض ادب فہموں نے سعادت حسن کو منٹو سے جدا تصور کرتے ہوئے اُس کی شخصی اور ادبی زندگی کو سمجھنا چاہا۔ والدہ، بہنیں اور صفیہ بیگم اُس کو بھلے ہی سعادت کہتی رہی ہوں اور گھر باہر کی دنیا: منٹو— مگر، آج جس حد تک بھی اُس کی معاشرتی زندگی اور تصانیف کی معنویت کو سمجھا گیا، صرف اُس کے پیشِ نظر بھی یہ تصور محلِ نظر ہے کہ سعادت حسن: معاش و معاشرت سے دوچار شخص تھا اور منٹو: فکر و فن کا شناور۔ تا حال منکشف منٹو معنویت ہی یہ باور کرانے کو کافی ہے کہ سعادت حسن منٹو کے حرف حرف میں اُس کی شخصیت بھی کھپی ہے اور فن کاری بھی۔ یہ اُس کی اختصار پسندی کا سر چڑھا جادو ہے کہ اُس سے لگاؤ یا لاگ رکھنے والے، حینِ حیات سے تا حال، منٹو کا مطلب پورا سعادت حسن منٹو لیتے ہیں۔

منٹو اور سعادت حسن میں متصوّر دوئی کا ایک سبب، شاید اُسی کے وہ کچھ جملے بنے ہیں جن کے ماقبل و مابعد پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ ''منٹو'' نامی مضمون کے تیسرے پارے کا یہ آغاز تو بارہا نقل ہوا:

ہم اکٹھے ہی پیدا ہوئے اور خیال ہے کہ اکٹھے ہی مریں گے۔ لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ سعادت حسن مر جائے اور منٹو نہ مرے، اور ہمیشہ مجھے یہ اندیشہ بہت دکھ دیتا ہے...''

لیکن بعد کے درجِ ذیل اختتامی جملے نقل، توضیح اور فکر سے غالباً تا حال محروم ہیں:

''... اسی لیے میں نے اس کے ساتھ اپنی دوستی نباہنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ اگر وہ زندہ رہا اور میں مر گیا تو ایسا ہوگا کہ انڈے کا خول تو سلامت ہے اور اس کے اندر کی زردی اور سفیدی غائب ہوگئی ہے۔''(۱)

ایک تشبیہ کے ذریعے سعادت حسن کو منٹو کی وہ متاعِ باطن قرار دینا جس کی بقا و حفاظت سے ہی اُس کی جہدِ حیات عبارت رہی اور دستخط میں تا حیات پورا پورا سعادت حسن منٹو ثبت کرنا، دلائل ہیں کہ وہ دو لخت نہیں تھا۔

سعادت حسن منٹو کی غیر منقسم وحدت میں جھانکنے کے لیے، صیغۂ واحد متکلم پر مبنی اُس کی غیر افسانوی تحریروں کا یہ روزن، یہ اسمبلاژ: اُس کے سوانحی کوائف، جان و تن کے رنگ ڈھنگ، دکھ سکھ، زندگی اور فن سے اُس کی وسیع و عمیق وابستگیوں کو درشانے کے لیے ہے۔ اُس کی سانس اور قلم رُکے تقریباً اٹھاون برس بعد بھی یہ اسمبلاژ، بس چھوٹا سا روزن شاید اِس باعث ہے کہ اجتماعی اردو ذہن و حواس کی آنکھ سعادت حسن منٹو کے لیے بس روزن بھر ہی وا ہو پائی ہے۔

...میری پیدائش، پنجاب کے تجارتی مرکز امرتسر میں ۱۱ مئی ۱۹۱۲ کو ہوئی۔

کھاتے پیتے گھر میں بچوں کی تربیت بہت خوب ہو جاتی ہے لیکن میں اپنے گھریلو معاملات کی پیچیدگیوں میں کچھ اِس (بُری) طرح سے گھرا ہوا تھا کہ امرتسر میں بمشکل انٹرنس کا امتحان پاس کر سکا۔

میرا ابتدائی دور اگرچہ خوش اثر تھا لیکن قبلہ ام والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد خاندانی حالات کے مدِ نظر چند دشواریاں آ گئیں جن سے بخوبی عہدہ برآ ہونا مجھ ایسے صغر سن کے لیے حد سے

زیادہ مشکل تھا۔ اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ طبیعت میں آوارگی کی نمود ہو چکی تھی لیکن سایۂ پدری کا سر سے اٹھ جانا مجھے اپنی حیثیت جانچنے کا داعی ہُوا۔

والدہ محترمہ سے اجازت حاصل کرے (کرکے) اکنافِ کشمیر میں بغرض بحالیِ صحت گیا۔ بہُوت میں کچھ مدت قیام کیا۔ طبیعت میں رنگینیوں نے جھلک دکھائی۔ دل کو مضبوط کیا کہ کسی قیمت پر اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے دنیا اور دنیا والوں کو اپنی طرف جھکاؤں گا۔

گھر لوٹا تو والدہ ماجدہ سے حصولِ تعلیم کا ارادہ بیان کیا چنانچہ علی گڑھ میں بغرضِ استفادہ بھیجا گیا۔ چند بچپن کی آزادیِ طبع، کچھ آب وہوا کی ناموافقت نے بستر علالت پر لٹا دیا۔ چاروناچار تعلیم پانے سے اجتناب کیا۔ امرتسر واپس آنے پر کتاب بینی کا شوق بدستور بڑھتا گیا۔ چنانچہ یہ بات کہہ دینے میں مجھے کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ میں نے روسی ادب میں زیادہ دلچسپی لینا شروع کر دی۔

اسی اثنا میں مجھے اکثر اردو اخبارات میں خدمتِ زبان سر انجام دینے کا اتفاق ہوا۔ بسا اوقات میرے مضامین کو سراہا گیا بلکہ بعض احباب (نے) میری حوصلہ بندی کے لیے تعریفی جملے بھی کہے جن سے مری خواہشِ انشا پردازی میں معتد بہ اضافہ ہوا۔

میں آج اُن مضامین کو نیم جاں محسوس کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ صاحبِ نظر احباب نے میری حوصلہ افزائی کے لیے میرے مضامین کو سراہا۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں اپنی تحاریر کے ساتھ کسی دوسرے شغل سے بھی مطمئن نہیں اور اگر اسے مبالغے پر محمول نہ کیا جائے تو آج بھی اپنی کسی کوشش پر مطمئن نہیں ہوں۔ بہ فحوائے ع

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

اس میں کوئی کلام نہیں کہ میں نے ہر اُس پرزۂ کاغذ تک سے فائدہ اٹھایا جس میں کسی بنیے نے بیکار دیکھ کر سودا باندھ کر مجھے دیا۔

میں نے (مجھے) مغربی اور مشرقی ادیبوں کی سیکڑوں کتابیں پڑھنے کا اتفاق ہوا لیکن کوئی ایسی کتاب دستیاب نہ ہو سکی جس سے میرے تشنہ مذاق کو طمانیت حاصل ہوتی۔

میں نے کئی ایک کتابیں خود لکھ دیں۔ کئی افسانے، کئی ڈرامے اور متعدد مضامین ریڈیو کے ذریعے سے نشر کیے گئے۔ اصحاب اور عوام کی طرف سے مجھے پے در پے خطوط موصول ہوئے۔ میری تعریفوں

کے انبار لگا دیے گئے۔ بعض عقیدت مندوں نے تو مجھے اول صف کے ادیبوں میں لا کر کھڑا کر دیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں آج بھی اپنے دل میں اطمینان نہیں پاتا...'' (۲)

...میں کیوں لکھتا ہوں؟ یہ ایک ایسا ہی سوال ہے کہ میں کیوں کھاتا ہوں۔ میں کیوں پیتا ہوں لیکن اس لحاظ سے مختلف ہے کہ کھانے اور پینے پر مجھے روپے خرچ کرنا پڑتے ہیں اور جب لکھتا ہوں تو مجھے نقدی کی صورت میں کچھ خرچ نہیں کرنا پڑتا۔ پر جب گہرائی میں جاتا ہوں تو پتا چلتا ہے کہ یہ بات غلط ہے۔ اس لیے کہ میں روپے کے بل بوتے ہی پر لکھتا ہوں۔

اگر مجھے کھانا پینا نہ ملے تو ظاہر ہے کہ میرے قویٰ اس حالت میں نہیں ہوں گے کہ میں قلم ہاتھ میں پکڑ سکوں۔ ہو سکتا ہے، فاقہ کشی کی حالت میں دماغ چلتا رہے، مگر ہاتھ کا چلنا تو ضروری ہے۔ ہاتھ نہ چلے تو زبان ہی چلنی چاہیے۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ انسان کھائے پیے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتا۔

لوگ فن کو اتنا اونچا رتبہ دیتے ہیں اس کے ڈانڈے ساتویں آسمان سے ملا دیتے ہیں۔ مگر کیا یہ حقیقت نہیں کہ یہ ارفع و اعلیٰ شے ایک سوکھی روٹی کی محتاج ہے۔

میں لکھتا ہوں، اس لیے کہ مجھے کچھ کہنا ہوتا ہے۔ میں لکھتا ہوں، اس لیے کہ میں کچھ کما سکوں، تاکہ میں کچھ کہنے کے قابل ہو سکوں۔

روٹی اور فن کا رشتہ بظاہر عجیب سا معلوم ہوتا ہے، لیکن کیا کیا جائے کہ خداوند تعالیٰ کو یہی منظور ہے۔ وہ خود کو ہر چیز سے بے نیاز کہتا ہے۔ یہ غلط ہے۔ وہ بے نیاز اور بے احتیاج ہرگز نہیں ہے۔ اس کو عبادت چاہیے اور عبادت بڑی ہی نرم و نازک روٹی ہے، بلکہ یوں کہیے کہ چپڑی ہوئی روٹی ہے، جس سے وہ اپنا پیٹ بھرتا ہے۔

سعادت حسن منٹو لکھتا ہے، اس لیے کہ وہ خدا جتنا بڑا افسانہ ساز اور شاعر نہیں۔ یہ اس کا عجز ہے جو اس سے لکھواتا ہے۔ (۳)

منٹو کے متعلق اب تک بہت کچھ لکھا اور کہا جا چکا ہے۔ اس کے حق میں کم اور خلاف زیادہ۔ یہ تحریریں اگر پیشِ نظر رکھی جائیں تو کوئی صاحب عقل، منٹو کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم نہیں کر سکتا۔ میں یہ مضمون لکھنے بیٹھا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ منٹو کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرنا بڑا کٹھن کام ہے۔ لیکن ایک لحاظ سے آسان بھی ہے اس لیے کہ منٹو سے مجھے قربت کا شرف حاصل رہا ہے اور سچ پوچھیے تو منٹو

کا میں ہمزاد ہوں۔

اب تک اس شخص کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن میں اتنا سمجھتا ہوں کہ جو کچھ ان مضامین میں پیش کیا گیا ہے حقیقت سے بالاتر ہے۔ بعض اسے شیطان کہتے ہیں، بعض گنجا فرشتہ — ذرا ٹھہریے، میں دیکھ لوں کہیں وہ کم بخت سُن تو نہیں رہا— نہیں نہیں، ٹھیک ہے۔ مجھے یاد آ گیا کہ یہ وہ وقت ہے جب وہ پیا کرتا ہے۔ اس کو شام کے چھ بجے کے بعد کڑوا شربت پینے کی عادت ہے۔

ہم اکٹھے ہی پیدا ہوئے اور خیال ہے کہ اکٹھے ہی مریں گے۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سعادت حسن مر جائے اور منٹو نہ مرے، اور ہمیشہ مجھے یہ اندیشہ بہت دکھ دیتا ہے۔ اسی لیے میں نے اس کے ساتھ اپنی دوستی نباہنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ اگر وہ زندہ رہا اور میں مر گیا تو ایسا ہوگا کہ انڈے کا خول تو سلامت ہے اور اس کے اندر کی زردی اور سفیدی غائب ہو گئی ہے۔

اب میں زیادہ تمہید میں جانا نہیں چاہتا۔ آپ سے صاف کہے دیتا ہوں کہ منٹو ایسا ون ٹو آدمی میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا، جسے اگر جمع کیا جائے تو وہ تین بن جائے۔ مثلث کے بارے میں اس کی معلومات کافی ہیں۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ ابھی اس کی تثلیث نہیں ہوئی۔ یہ اشارے ایسے ہیں جو صرف بافہم سامعین ہی سمجھ سکتے ہیں۔

یوں تو منٹو کو میں اس کی پیدائش ہی سے جانتا ہوں۔ ہم دونوں اکٹھے ایک ہی وقت ۱۱ مئی سنہ ۱۹۱۲ کو پیدا ہوئے۔ لیکن اس نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ وہ خود کو کچھوا بنائے رکھے، جو ایک دفعہ اپنا سر اور گردن اندر چھپا لے تو آپ لاکھ ڈھونڈتے رہیں، اس کا سراغ نہ ملے۔ لیکن میں بھی آخر اس کا ہمزاد ہوں، میں نے اس کی ہر جنبش کا مطالعہ کر ہی لیا۔

لیجیے اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہ خرذات افسانہ نگار کیسے بنا؟ تنقید نگار بڑے لمبے چوڑے مضامین لکھتے ہیں۔ اپنی ہمہ دانی کا ثبوت دیتے ہیں۔ شوپن ہار، فرائڈ، ہیگل، نٹشے، مارکس کے حوالے دیتے ہیں مگر حقیقت سے کوسوں دور رہتے ہیں۔

منٹو کی افسانہ نگاری دو متضاد عناصر کے تصادم کا نتیجہ ہے۔ اس کے والد خدا انھیں بخشے، بڑے سخت گیر تھے اور اس کی والدہ بے حد نرم دل۔ ان دو پاٹوں کے اندر پس کر یہ دانۂ گندم کس شکل میں باہر نکلا

ہوگا، اس کا اندازہ آپ کرسکتے ہیں۔ (۴)

آج سے چند برس پہلے میری زندگی میں ایک ایسا دن آیا کہ مجھے اپنی ناداری کا احساس ہوا۔ اِس احساس نے مجھے بہت پریشان کیا لیکن میں نے سنبھل [کر] اپنے اندر کا جائزہ لیا کہ دیکھوں میری رہی سہی جائیداد کیا ہے۔ بیتے ہوئے دنوں کا ایک انبار لگا تھا۔ اُن میں کچھ دن ایسے تھے [جو؟] بہت اُجلے تھے اور کچھ ایسے تھے کہ اُن کی تاریکی پر چاند سے محروم راتیں بھی رشک کرتیں۔ کچھ واقعات تھے بڑے میٹھے اور کچھ ایسے کڑوے کہ اگر آج میں اُنہیں لکھ دوں تو کاغذ کی زبان تھوکتی تھوکتی تھک جائے مگر اُن کی کڑواہٹ دُور نہ ہو۔ ایک جگہ میرا اخلاص سہا بیٹھا تھا۔ دوسری جگہ میری طبیعت کی تیزی، اضطراب کی حالت میں کھڑی تھی — کام کی ایک چیز بھی نہ تھی — میرا مطلب ایسی چیز سے ہے جو کہ اِس دنیا میں میرے کام آتی۔

میں جب اچھی طرح دیکھ بھال کر چکا اور کام کی ایک چیز بھی مجھے اپنے اندر نظر نہ آئی تو میں مایوس ہو گیا۔ مایوسی کی اُس حالت میں ہمیشہ کے لیے میں اپنے مکان کا دروازہ بند کرنے ہی والا تھا کہ مجھے ایک کمزور آواز سنائی دی۔ کوئی کہہ رہا تھا: ''میں تمہارے کام آسکتا ہوں۔''

میں نے پوچھا: ''تم کون ہو؟''

جواب ملا: ''میں افسانہ ہوں۔''

''میں نے حیرت سے پوچھا: ''افسانہ؟ — تم کہاں چھپے بیٹھے تھے؟ — نہیں، پہلے یہ بتاؤ تم میرے اندر داخل کیسے ہوئے؟''

افسانہ کمزور آواز میں بولا: ''میں اندر کیسے داخل ہوا، اس کی مجھے خبر نہیں، البتہ اتنا جانتا ہوں کہ بہت دیر سے تمہارے اندر ایک اندھیری کوٹھری میں قید ہوں — قیاس کہتا ہے کہ میری پیدائش یہیں اِسی اندھیرے میں ہوئی ہے۔''

افسانے کی باتیں مجھے دلچسپ معلوم ہوئیں۔ اندھیری کوٹھری میں سے نکال کر، میں اُسے ذرا روشنی میں لایا تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے اُس کو اپنا ہم شکل پایا۔ ''بھئی تم تو میرے ہم شکل نکلے — کہو، کہو تمہیں کیا کہنا ہے؟''

افسانے کے لبوں پر ایک پتلی سی مسکراہٹ تیری: ''مجھے بہت کچھ کہنا ہے لیکن میری قوتِ گویائی

کمزور ہے، پھر بولی [illegible]

چلے جاتے تو جانتے ہو، کیا ہوتا؟''

میں نے بے پروائی سے پوچھا: ''کیا ہوتا؟''

جواب ملا: ''ایک بہت بڑی جائیداد سے تم محروم ہو جاتے۔''

میں ہنس دیا: ''جائیداد!''

آواز آئی: ''تمہاری جائیداد میں ہوں — مجھے سنبھالو اور اپنے مصرف میں لاؤ — مجھے باہر نکالو اور میری نمائش کرو — تمہارے حساس دل کی دھڑکنوں نے مجھے اپنی گود میں کھلایا ہے — تمہارے اخلاص نے مجھے اپنا دودھ پلایا ہے — تمہاری زندگی کے بیتے ہوئے دن، مجھے جھولا جُھلاتے رہے ہیں — تمہاری طبیعت کا اضطراب، میرا بستر ہے — میں اگر تمہارے اندر سے نکل جاؤں تو تمہاری مثال اُس سیپی کے مانند ہوگی جس میں سے موتی باہر لڑھک جائیں — اِدھر آؤ مجھے سہارا دو، میں باہر نکلنا چاہتا ہوں۔''

— میں افسانہ نگار بن گیا — بُرے دنوں نے مجھے اچھا افسانہ نگار بنا دیا... (۵)

اگر یہ پوچھا جائے کہ میں افسانہ کیوں لکھتا ہوں تو اس کا جواب حاضر ہے۔ میں افسانہ اول تو اس لیے لکھتا ہوں کہ مجھے افسانہ نگاری کی، شراب کی طرح، لت پڑ گئی ہے۔

میں افسانہ نہ لکھوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں نے کپڑے نہیں پہنے، یا میں نے غسل نہیں کیا، یا میں نے شراب نہیں پی۔ میں افسانہ نہیں لکھتا، حقیقت یہ ہے کہ افسانہ مجھے لکھتا ہے۔ میں بہت کم پڑھا لکھا آدمی ہوں۔ یوں تو میں نے بیس سے اوپر کتابیں لکھی ہیں لیکن مجھے بعض اوقات حیرت ہوتی ہے کہ یہ کون ہے جس نے اس قدر اچھے افسانے لکھے ہیں... (٦)

...جس روز آپ کا خط ملا، میرا موڈ بہت اچھا تھا۔ آپ کے تعریفی الفاظ سے مجھے ذرا وہ ہو گیا — میں لوگوں سے کہا کرتا ہوں کہ میں اپنی تعریف سے خوش نہیں ہوتا لیکن یہ سب جھوٹ ہے۔ آپ نے میرے افسانوں کی تعریف کی تو واللہ میں مخمور سا ہو گیا مگر کسی سے کہیے گا نہیں کہ مجھ میں یہ کمزوری ہے۔

کل رات سے میرا موڈ ٹھیک نہیں۔ طبیعت پر ایک بوجھ سا محسوس کر رہا ہوں۔ ایک عجیب و غریب تکان سی طاری ہے۔ میں اس اضمحلال کا سبب جانتا ہوں مگر اس سبب کے پیچھے اتنی چیزیں کارفرما ہیں کہ

کل اُس جگہ پہنچا ہوا ہوں جہاں سے یقین اور انکار میں تمیز نہیں ہو سکتی۔ جہاں آپ سمجھتے بھی ہیں اور نہیں بھی سمجھتے۔ بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دنیا ساری کی ساری مٹھی میں چلی آئی ہے اور بعض اوقات یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہم ہاتھی کے جسم پر چیونٹی کی طرح رینگ رہے ہیں۔ یہ ایک ایسا Complex ہے جو لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتا۔ اس سے روح اور دماغ کو سخت تکلیف پہنچ رہی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔

میں یہ چاہتا ہوں کہ میرے پاس ایک ایسا سوئچ بورڈ (Switch Board) آجائے جس سے میں حسبِ خواہش روشنیاں پیدا کر سکوں۔ جس وقت چاہوں گھپ اندھیرا کر دوں اور جس وقت چاہوں روشنی کا سیلاب بہا دوں۔ کیا ایسی چیز مل جائے گی؟ — کچھ کہا نہیں جا سکتا!

کچھ بھی ہو مجھے اطمینان نصیب نہیں ہے۔ میں کسی چیز سے مطمئن نہیں ہوں ہر شے میں مجھے ایک کمی سی محسوس ہوتی ہے۔ میں خود اپنے آپ کو نامکمل سمجھتا ہوں۔ مجھے اپنے آپ سے کبھی تسکین نہیں ہوتی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں جو کچھ ہوں، جو کچھ میرے اندر ہے، وہ نہیں ہونا چاہیے، اُس کے بجائے کچھ اور ہی ہونا چاہیے۔

عشق و محبت کے متعلق سوچتا ہوں تو صرف شہوانیت ہی نظر آتی ہے۔ عورت کو شہوت سے الگ کر کے میں یہ دیکھتا ہوں کہ وہ پتھر کی ایک مورتی رہ جاتی ہے۔ مگر یہ ٹھیک بات نہیں، میں جانتا ہوں، نہیں میں جاننا چاہتا ہوں، کہ پھر آخر کیا ہے؟ — کیا ہونا چاہیے؟ — اگر یہ نہیں تو پھر اور کیا ہوگا؟

لیکن میں عورتوں کے بارے میں وثوق سے کچھ کہہ بھی تو نہیں سکتا۔ مجھے اُن سے ملنے کا اتفاق ہی کہاں ہوا ہے۔ عورت کا وہ تصور جو ہم لوگ اپنے دماغ میں قائم کرتے ہیں ٹھیک نہیں ہو سکتا — کس قدر افسوسناک چیز ہے کہ عورتوں کے ہمسائے ہو کر بھی ہم اُن کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کر سکتے۔ لعنت ہے ایسے ملک پر جو عورتوں کو ہم سے ملنے کے لیے روکے! — مگر — مگر کیا —؟ کچھ بھی نہیں! — سب بکواس ہے۔ (۷)

میں آج کل بے حد مصروف ہوں، بال اتنے بڑھے ہوئے ہیں، مگر ان کو ہلکا کرنے کا وقت ہی نہیں مل رہا — اللہ رحم کرے۔ میری طبیعت بھی چند دنوں سے سخت مکدر رہو رہی ہے۔ اس کی وجہ

غیر شاعرانہ ماحول ہے۔

میری شادی؟ —— میری شادی ابھی مکمل طور پر نہیں ہوئی۔ صرف 'نکاحیا' گیا ہوں۔ میری بیوی لاہور کے ایک کشمیری خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اُس کا باپ مر چکا ہے، میرا باپ بھی زندہ نہیں۔ وہ ہمیشہ چشمہ لگاتی ہے، میں بھی چشمہ لگاتا ہوں، وہ گیارہ مئی کو پیدا ہوئی، میں بھی گیارہ مئی ہی کو پیدا ہوا تھا، اس کی ماں چشمہ لگاتی ہے، میری والدہ بھی چشمہ لگاتی ہے [؟ ہیں]، اس کے نام کا پہلا حرف ایس ہے، میرے نام کا پہلا حرف بھی ایس ہے۔ ہم میں اتنی چیزیں Common ہیں۔ بقایا حالات کے متعلق میں خود کچھ نہیں جانتا۔ پہلے وہ پردہ نہیں کرتی تھی، مگر جب سے اُس پر میرا حق ہوا ہے، اُس نے پردہ کرنا شروع کر دیا ہے (صرف مجھ سے)۔(۸)

...۲۶ تاریخ ماہِ حال [اپریل ۱۹۳۹] کو میری شادی ہو رہی ہے۔(۹)

وہ لوگ جو میری زندگی کے اندر جھانک کر دیکھنا چاہتے ہیں اُن کی خاطر میں اپنی شادی کی داستان بیان کرتا ہوں۔ یہ من وعن نہیں ہوگی، کیونکہ بعض اوقات [واقعات؟] مجھے مصلحتاً گول کرنے پڑیں گے۔

میں پہلے اس حادثے کا عقبی منظر پیش کرتا ہوں تاکہ اس کی تفصیلات ابھر آئیں: سنہ مجھے یاد نہیں۔ غالباً بارہ تیرہ برس پہلے جب علی گڑھ یونیورسٹی سے مجھے اس لیے باہر نکال دیا گیا تھا کہ مجھے دق کا عارضہ لاحق ہے، میں اپنی بہن سے کچھ روپیہ لے کر صحت درست کرنے کی خاطر 'بٹوت' (جموں اور کشمیر کے درمیان ایک گاؤں) چلا گیا۔ یہاں تین مہینے قیام کرنے کے بعد میں واپس اپنے شہر امرتسر میں آیا تو مجھے معلوم ہوا کہ میری بہن کا لڑکا فوت ہو گیا ہے (وہ بمبے میں بیاہی ہوئی تھی۔ چند روز امرتسر رہ کر واپس بمبے چلی گئی تھی)۔

یہاں پر میں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں والد کے سائے سے محروم تھا۔ بہن کی شادی پر جو جمع پونجی موجود تھی۔ وہ میری سادہ لوح اور نیک دل ماں نے میری بہنوئی کے حوالے کر دی تھی۔ اب یہ حالت ہو گئی تھی کہ ہم دوسروں کے محتاج تھے۔ میرے دو بڑے بھائی ہمیں چالیس روپے ماہوار دیا کرتے تھے۔

امرتسر آتے ہی میرا دل و دماغ سخت مضطرب ہو گیا۔ جی چاہتا تھا کہیں بھاگ جاؤں، یا خودکشی کر لوں۔ مضبوط ارادے کا مالک ہوتا تو یقیناً میں نے خود کو ہلاک کر لیا ہوتا، اسی لیے جب بمبے سے ہفتہ

وار' مصور' کے مالک مسٹرنذیر نے مجھے خط لکھا کہ میں بمبے آ کر ان کے پرچے کی ادارت سنبھال لوں، تو میں نے فوراً بوریہ بستر باندھا اور بمبے چل دیا۔ میں نے یہ بھی نہ سوچا کہ والدہ امرت سر میں اکیلی رہ جائے گی [جائیں گی؟]۔

مسٹرنذیر نے مجھے چالیس روپے ماہوار پر نوکر رکھ لیا۔ جب میں ان کے دفتر میں سونے لگا تو انھوں نے کرایے کے طور پر دو روپے تنخواہ میں سے کاٹنا شروع کر دیے۔ اس کے بعد جب انھوں نے مجھے امپیریل فلم کمپنی میں بحیثیت منشی یعنی مکالمہ نگار چالیس روپے ماہوار پر ملازم کرا دیا تو میری تنخواہ آدھی یعنی بیس روپے کر دی جس میں سے دو روپے، دفتر کو رہائش کے لیے استعمال کرنے کے سلسلے میں کاٹے جاتے رہے...

جب میں 'فلم سٹی' میں ملازم ہوا تھا تو میں نے 'مصور' کے دفتر میں رہائش چھوڑ کر پاس ہی ایک نہایت ہی غلیظ چالی (بلڈنگ) میں ایک کھولی (کمرہ) نو روپے ماہوار پر لے لی تھی۔ اس میں اس قدر کھٹمل تھے، کہ چھت پر سے بارش کے قطروں کی طرح گرتے تھے۔

اس دوران میں میری والدہ بمبے آ گئی تھیں اور اپنی لڑکی کے پاس قیام پذیر تھیں، جب پہلی بار وہ مجھ سے ملنے کے لیے اس غلیظ کھولی میں آئیں، تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

میرے اور میرے بہنوئی کے تعلقات کشیدہ تھے۔ اب اسے خدا بخشے مگر اس کا کردار بہت ہی خراب تھا۔ میں چونکہ نکتہ چینی کرتا تھا، اس لیے اس نے اپنے گھر میں میرا داخلہ بند کر دیا تھا اور میری بہن پر یہ پابندی عائد کر دی تھی کہ وہ مجھ سے نہیں مل سکتی۔

میں اپنی ماں کے آنسوؤں کا ذکر کر رہا تھا۔ جو اس لیے اُن کی آنکھوں سے نکلے تھے کہ ان کا بیٹا جو ناز و نعم میں پلا تھا، اب زمانے کی گردش سے ایسی غلیظ جگہ میں رہتا ہے، اس کے پاس کپڑے نہیں، رات کو مٹی کے تیل کا لیمپ جلا کر کام کرتا ہے، ہوٹل میں روٹی کھاتا ہے۔

وہ جب تک روتی رہیں، میں شدید قسم کی دماغی اور روحانی اذیت میں مبتلا رہا۔ جو دن گزر چکے ہیں، ان کی یاد میرے نزدیک ہمیشہ فضول رہی ہے اور پھر رونے دھونے کا کیا مطلب ہے۔ مجھے ہمیشہ آج سے غرض رہی ہے، گزری ہوئی کل یا آنے والی کل کے متعلق میں نے کبھی نہیں سوچا، جو ہونا تھا ہو گیا، جو ہونے والا ہے ہو جائے گا۔

رونے سے فارغ ہوکر میری والدہ نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا: ''سعادت تم زیادہ کیوں نہیں کماتے؟''

...میں نے بات کو ہنسی مذاق میں ٹالنے کی کوشش کی: ''بی بی جان! میں جو کچھ کماتا ہوں، میری ذات کے لیے کافی ہے— گھر میں بیوی ہوتی تو پھر آپ دیکھتیں، میں کیسے کماتا ہوں، کمانا کوئی مشکل کام نہیں، آدمی اعلیٰ تعلیم کے بغیر بھی ڈھیروں روپیہ حاصل کرسکتا ہے۔''

یہ سن کر والدہ نے اچانک مجھ سے یہ سوال کیا: ''شادی کرو گے؟''

میں نے ایسے ہی کہہ دیا: ''ہاں— کیوں نہیں!''

''تو اس اتوار کو تم 'ماہم' آؤ۔ فٹ پاتھ پر کھڑے رہنا۔ میں تمھیں دیکھ کر نیچے آجاؤں گی۔'' والدہ نے یہ کہہ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''تمھاری شادی کا بندوبست ہوجائے گا— انشاءاللہ— لیکن دیکھو، اپنے بال کٹوا کے آنا۔''

میں نے بال نہ کٹوائے۔ رات کو میں نے اپنے کینوس شو پر پالش کردیا تھا، ڈبل ریٹ پر دھلوائی ہوئی سفید پتلون پہن کر میں اتوار کی صبح کو 'ماہم' میں 'اینگ لیٹومینشنز' کے پاس فٹ پاتھ پر کھڑا تھا۔ والدہ تیسری منزل کے فلیٹ کی بالکنی پر میری منتظر تھیں۔ انھوں نے مجھے دیکھا تو نیچے آئیں اور مجھے ساتھ چلنے کو کہا۔

بیس پچیس گز کے فاصلے پر ایک بلڈنگ تھی— 'جعفر ہاؤس'— والدہ نے اس کی دوسری منزل کے ایک فلیٹ کا دروازہ کھٹکھٹایا جو نوکرانی نے کھولا، ہم اندر داخل ہوئے۔

والدہ زنانے میں چلی گئیں۔ میرا استقبال ایک گورے چٹے ادھیڑ عمر کے آدمی نے کیا۔ مردانے میں بڑی محبت اور بڑے خلوص کے ساتھ بٹھایا، اور فوراً بے تکلف ہوگئے۔ آپ نے مجھ سے اور میں نے ان سے ایک دوسرے کے مشاغل کے متعلق معلومات حاصل کیں۔

وہ گورنمنٹ کے ملازم تھے۔ پولیس محکمے میں 'فنگر پرنٹ اسپیشلسٹ'۔ تنخواہ واجبی تھی۔ کئی بچوں کے باپ تھے۔ ریس اور فلش کے رسیا۔ کراس ورڈ پزلز بڑی باقاعدگی سے حل کرتے تھے مگر کوئی انعام حاصل نہیں کرسکے تھے۔

میں نے ان کو اپنے سارے حالات بتادے۔ یہ بھی کہہ دیا کہ ایسی فلم کمپنی میں ملازم ہوں جہاں تنخواہ

نہیں ملتی، صرف سانس کی آمد و رفت جاری رکھنے کے لیے کبھی کبھی ایڈوانس کے طور پر کچھ مل جاتا ہے۔

مجھے تعجب ہے کہ میں نے جب اُن کو یہ بتایا کہ ایسی پتلی حالت میں بھی ہر شام کو بیئر کی ایک بوتل ضرور پیتا ہوں تو انھوں نے برا نہ مانا۔

میری بات کو انھوں نے بڑے غور سے سنا۔ جب میں جانے کے لیے اٹھا تو ملک حسن صاحب، میری کتابِ زندگی کے تمام ضروری اوراق کا مطالعہ کر چکے تھے۔

جب ہم وہاں سے نکلے تو والدہ نے مجھے بتایا کہ یہ لوگ افریقہ سے آئے ہیں۔ تمھارے بھائیوں کو اچھی طرح جانتے ہیں (انھوں نے دس بارہ برس مشرقی افریقہ میں بیرسٹری کی تھی) ان کے ہاں ایک لڑکی ہے جس کا بیاہ کرنا چاہتے ہیں۔ کئی رشتے آ چکے ہیں مگر ان کو پسند نہیں آئے۔ اصل میں کوئی کشمیری گھرانا چاہتے ہیں— میں نے ان سے تمھاری بات کی ہے اور کوئی بات پوشیدہ نہیں رکھی۔

رہی سہی جو کسر رہ گئی تھی وہ والدہ نے پوری کر دی تھی۔ لیکن میں سوچنے لگا کہ یہ سلسلہ کیا ہے۔ اگر وہ لوگ مان گئے۔ حالانکہ مجھے اس کا یقین نہیں تھا۔ اس لیے کہ مجھ میں ایسی کوئی بات نہیں تھی کہ وہ مجھے اپنی لڑکی دیتے۔ تو کیا سچ مچ مجھے شادی کرنا پڑے گی اور پھر ڈھیروں روپے کمانا پڑیں گے۔

ملک صاحب نے مجھے دوسرے اتوار کو کھانے پر مدعو کیا تھا۔ میں حسبِ وعدہ وہاں پہنچا تو انھوں نے میری بڑی آؤ بھگت کی...

دو تین اتواروں کے بعد جب میں ان لوگوں میں گھل مل گیا تو میری والدہ نے مجھے بتایا کہ انھوں نے میرا رشتہ قبول کر لیا ہے، جب میں نے سنا تو چکرا گیا۔ میں تو شادی کے اس قصے کو صرف ایک مذاق سمجھ رہا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے قطعاً یقین نہیں تھا کہ مجھے کوئی ہوش مند انسان اپنی لڑکی دے گا۔ میرے پاس تھا ہی کیا۔ انٹرنس پاس۔ وہ بھی تھرڈ ڈویژن میں۔ اور ملازمت ایسی جگہ جہاں تنخواہ کی بجائے ایڈوانس ملتا تھا— اور پیشہ فلم۔ اخبار نویسی۔ ایسے لوگوں کو شریف آدمی کب منہ لگاتے ہیں...

میں سخت پریشان ہوا، میں یہ خبر سننے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ میرا دماغی توازن اُس وقت اور بھی بگڑ گیا جب والدہ نے کہا کہ انھوں نے بات پکی کر دی ہے۔ میں نے ان سے کچھ نہ کہا اور دن رات اٹھتے بیٹھتے اس سوچ میں غرق رہنے لگا کہ مصیبت جو میں نے خود مول لی ہے اس سے نجات کیسے ہو گی— بہت سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اب سوچ بچار بالکل فضول ہے۔ ہر چہ بادا باد،

کہہ کر مجھے اپنی کشتی اس منجدھار میں ڈال دینی چاہیے۔

میں نے فیصلہ تو کرلیا، مگر نکاح کی رسم کے لیے روپیہ کہاں سے آئے۔ یہ سوال بہت ہی پریشان کرنے والا تھا۔ کمپنی سے اب ایڈوانس ملنا بھی بند ہو گیا تھا۔ ادھر والدہ نے تاریخ مقرر کر دی تھی۔

میں نے کئی مرتبہ سوچا کہ بمبے سے بھاگ جاؤں، لیکن کسی غیر مرئی طاقت نے میرے پاؤں جکڑ رکھے تھے۔ ایک ہی صورت تھی کہ میں سیٹھ آرڈیشر سے ملوں اور اُن سے اپنے نکاح کے اخراجات کے لیے کچھ روپے مانگوں۔

کمپنی کی طرف میرے قریب قریب ڈیڑھ ہزار روپے نکلتے تھے۔ اگر یہ مل جاتے تو مجھے میرا سب تردّد دور ہو جاتا بلکہ عیش ہو جاتے۔

میں آرڈیشر صاحب سے ملا۔ ان کو اتنی فرصت نہیں تھی کہ میری داستان غور سے سنتے۔ ٹہلتے ٹہلتے جو کچھ میں نے کہا بدرجۂ مجبوری سنا۔ آخر میں مجھ سے کہا: ''دیکھو، کمپنی کی جو حالت ہے، وہ تم جانتے ہو، اگر حالت اچھی ہوتی تو ہم تمھاری شادی خود کر دیتے۔''

یہ صحیح ہے کہ جب کمپنی کی حالت اچھی تھی تو وہ اپنے ملازموں کی بے دریغ مالی امداد کیا کرتے تھے۔ بڑے مخیّر تھے مگر اب ان کا ہاتھ اس قدر تنگ تھا کہ انھیں اس احساس سے بڑی الجھن ہوتی تھی کہ وہ کسی سوالی کی مدد نہیں کر سکتے۔

میری مایوسی کا اندازہ آپ لگا سکتے ہیں۔ میں چلنے لگا تو انھوں نے مجھے آواز دی اور پاس بلا کر کہا: ''میں صرف اتنا کر سکتا ہوں کہ تمھیں ضروری چیزیں لے دوں — جاؤ حافظ جی کو بلا لاؤ۔''

میں حافظ جی کو ان کے پاس لے کر گیا تو انھوں نے دکانوں کا پتہ ان کو بتایا۔ ایک چٹ پر کچھ لکھ کر دیا اور کہا: ''منشی منٹو کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ اور جو کچھ اسے چاہیے لے دو۔''

میں حافظ جی کے ساتھ ہو لیا۔ ہم موٹر میں ایک بزاز کی دکان پر پہنچے۔ وہاں سے دو ساڑیاں لیں، سیٹھ آرڈیشر کے ذاتی اکاؤنٹ میں۔ دوسری دکان جوہری کی تھی۔ وہاں سے ایک آدمی میرے ساتھ کر دیا گیا کیونکہ میں چاہتا تھا کہ لڑکی خود اپنے لیے زیور پسند کرے۔

میں اور جوہری کا آدمی دونوں جعفر ہاؤس پہنچے، لڑکی کی والدہ کو جن کو میں خالہ جان کہتا تھا، جوہری

کا زیور) ایک پینڈنٹ، دو طلائی چوڑیاں پسند کیں۔ میں نے خالہ جان پر بہت زور دیا کہ وہ چند اور زیورات بھی رکھ لیں، مگر وہ مجھ پر زیادہ بوجھ ڈالنا نہیں چاہتے تھے، کاش میں نے ان سے یہ کہہ دیا ہوتا کہ خالہ جان ایسا موقع مجھے پھر کبھی نہیں ملے گا، مجھے کمپنی سے ڈیڑھ ہزار روپیہ لینا ہے۔ جاتے چور کی لنگوٹی نہ چھوڑیے۔ مگر افسوس کہ اُس رقم سے صرف چار پانچ سو روپے ہی وصول ہوئے کیونکہ کمپنی میرے نکاح ہونے کے فوراً بعد مرحوم ہو گئی۔

اب نذیر صاحب نے میری ماہوار تنخواہ پھر چالیس روپے کر دی، جس سے کچھ ڈھارس ہوئی کہ شام کو بیئر کا سلسلہ جاری رہے گا۔

نکاح میرے لیے، ظاہر ہے کہ بہت مہلک ثابت ہوا، کمپنی سے جو روپیہ لینا تھا وہ الگ غرق ہوا اور گھٹنا الگ زخمی ہوا۔

اِس کی داستان بھی سن لیجیے۔ بمبے میں دوست تھا نہ کوئی عزیز، بہن تھی، لیکن وہاں میرا حقہ پانی بند تھا، مجھے سارے کام خود ہی کرنا تھے۔ چند آدمیوں کو اطلاع دینا تھی کہ میرا نکاح ہو رہا ہے، چھوہارے اور الائچی دانے خریدنا تھے، بال کٹوانے تھے اور بس پر سوار ہو کر محاذ پر جانا تھا۔

شاہ جہاں محل ہوٹل کے مالک سیّد فضل شاہ کو رسمِ نکاح میں شرکت کرنے کی دعوت دے کر جب لوٹ رہا تھا تو پتھریلے فرش پر میرا پاؤں پھسلا، اس زور سے گرا کہ بے ہوش ہو گیا۔

میں زندگی میں صرف تین مرتبہ بے ہوش ہوا ہوں: سب سے پہلے اپنے نکاح پر سید فضل شاہ (مرحوم) کو دعوتِ شرکت دینے پر، دوسری مرتبہ اپنی والدہ کی اچانک موت پر، پھر اپنے لڑکے کی وفات پر۔

یہ گر کر بے ہوش ہو جانا بھی اچھا شگون نہیں تھا۔ چوٹ اس قدر شدید تھی کہ جب مجھے ہوش آیا اور میں سیڑھیاں اترنے لگا تو میری مضروب ٹانگ نے چلنے سے انکار کر دیا۔ بڑی مشکل سے مارکیٹ تک پہنچا۔ درد اس قدر تھا کہ ہر قدم پر بلبلا اٹھتا۔

خیر، چھوہارے اور الائچی دانے لیے اور ماہم پہنچا۔ جعفر ہاؤس کی سیڑھیاں افتاں و خیزاں طے کیں اور نکاح کی محفل میں جا پہنچا۔ پندرہ بیس اشخاص موجود تھے، میں گاؤ تکیے کا سہارا لے کر بیٹھ گیا۔

ٹیسیں پی کران کاحکم ماننا ہی پڑا۔

ایجاب وقبول کی رسم ختم ہوئی تو میری جان میں جان آئی۔ ٹانگ سیدھی کی، درد کے کئی اور گھونٹ پیے، مبارک بادیں وصول کیں اور لنگڑاتا لنگڑاتا اپنے گھر پہنچا۔ مٹی کے تیل کا لیمپ روشن کیا اور کھٹملوں بھری کھاٹ پر دراز ہو کر سوچنے لگا کہ آیا سچ مچ میرا نکاح ہو گیا ہے — میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ جیب میں چھوہارے اور الایچی دانے ہونے اور گھٹنے کی چوٹ کے باوجود مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ میری زندگی کا اتنا بڑا حادثہ وقوع پذیر ہو چکا ہے۔

میں قریب قریب شادی شدہ تھا۔ فرق بس صرف اتنا تھا کہ میری بیوی میری نو روپے ماہوار کی کھولی میں موجود نہیں تھی۔ قانون کی رو سے میں جب بھی چاہتا اسے اپنے ساتھ چلنے کو کہہ سکتا تھا، لیکن اتنی ہمت کہاں تھی۔ اُسے کھلاتا کہاں سے، سامنے والے ایرانی کے ہوٹل سے اور وہ بھی ادھار! رکھتا کہاں؟ کھولی میں تو ایک زائد کرسی کے لیے بھی جگہ نہیں تھی۔

ظاہر ہے کہ بیویاں نہاتی بھی ہیں مگر وہاں تو کوئی غسل خانہ ہی نہیں تھا۔ دو منزلہ بلڈنگ تھی جس میں چالیس کھولیاں تھیں۔ ان سب کے ساکنوں کے باہم استعمال کے لیے صرف دو غسل خانے تھے، جن کے دروازے معلوم نہیں کب کے غائب ہو چکے تھے، مجھے اس احساس سے بڑی الجھن ہوتی تھی کہ میرا نکاح ہو گیا ہے اور ایک لڑکی کے ساتھ، آج نہیں تو کل، مجھے شوہر کی حیثیت سے زندگی گزارنا ہوگی۔ اس سے قبل میں نے ایسا کوئی تجربہ نہیں کیا تھا۔ مجھے قطعاً معلوم نہیں تھا کہ بیوی کیا ہوتی ہے اور شوہر کیا ہوتا ہے۔

میری زندگی میں دو تین لڑکیاں ضرور آئی تھیں مگر وہ نوکرانیاں تھیں۔ ان سے میرا تصادم ایسے ہی ہوا تھا جیسے سڑک پر راہ چلتے دو اندھے ایک دوسرے سے ٹکرائیں اور چٹکیوں میں اس تصادم سے فراغت حاصل کر کے اپنی اپنی راہ لیں۔ میں بڑی ایمان داری سے محسوس کر رہا تھا کہ میں اور سب کچھ بن سکتا ہوں لیکن شوہر نہیں بن سکتا۔ یہ مضمون نویسی اور افسانہ نگاری والا معاملہ نہیں تھا۔

وقت گزرتا گیا۔ میں نے کوشش کی اور سروج مووی ٹون نامی فلم کمپنی میں ایک سو روپے ماہوار پر ملازم ہو گیا۔ یہ کمپنی تو شاید میری آمد کی منتظر تھی۔ ابھی دو ماہ بھی نہ گزرے ہوں گے کہ اس کا دِوالیا پٹ گیا۔ اب تو مجھے یقین ہو گیا کہ میرا نکاح میرے لیے بہت منحوس ثابت ہوا ہے۔

کے نام سے نئی فلم کمپنی کھڑی کر دی۔

اس کے لیے میں نے دوسری فلمی کہانی 'کیچڑ' کے عنوان سے لکھی جو بعد میں 'اپنی نگریا' جیسے بے ڈھنگے اور بے تکے نام سے پیش ہوئی اور کامیاب رہی۔

یہ فلم ابھی نصف بھی تیار نہیں ہوا تھا کہ مارواڑی سیٹھ، چاندی کے سٹّے میں اپنی ساری دولت گنوا بیٹھے، حتیٰ کہ اپنی شاندار موٹر بھی جس کا رنگ بے داغ سفید تھا۔ میں نے اس کا رشتہ بھی اپنے نکاح سے جوڑا، مجھے یقین تھا کہ چند دنوں میں ہی اس نئی کمپنی کا دِوالیا ضرور پٹے گا لیکن نانو بھائی ڈیسائی نے کسی نہ کسی طرح، اِدھر اُدھر سے قرض لے کر فلم مکمل کر ہی لیا...

اُدھر والدہ نے میرے سسرال کے اصرار پر رخصتی کی تاریخ مقرر کر دی۔ ایک برس کے قریب ہو گیا تھا نکاح ہوئے۔ وہ لوگ انتظار کرتے کرتے تنگ آ گئے تھے۔ مجھے کوئی جلدی نہیں تھی، بلکہ یوں کہیے کہ میری دلی خواہش تھی کہ رخصتی کی نوبت ہی نہ آئے۔ میں بہت خائف تھا کہ مجھ سے گھر بار نہیں چلایا جا سکے گا اور ایک شریف لڑکی کی ساری عمر، بغیر کسی قصور کے، عذاب میں کٹے گی مگر دن مقرر ہو چکا تھا جو میرے لیے روزِ قیامت تھا۔

ہفتہ وار 'مصور' کی حالت بہت اچھی ہو گئی تھی۔ اب اس کا دفتر بہتر جگہ پر منتقل ہو چکا تھا۔ ٹیلی فون موجود تھا۔ مسٹر نذیر کے پاس ایک چھوٹی سی کار تھی جس میں وہ اِدھر اُدھر گھوم کر اشتہار فراہم کرتے تھے۔

ہم دونوں کی رہائش اب اُس دفتر میں تھی، میں ہر اتوار ماہم جاتا، کبھی کبھی دروازے کی درزوں میں سے اپنی بیوی کو ایک آدھ جھلک دیکھ لیتا اور رات کا کھانا کھا کر جب واپس گھر جاتا تو سوتے وقت اپنے آپ پر لعنت بھیجتا کہ میں نے کیوں شادی کا کھیل کھیلا جبکہ مجھے اس میں اس قدر پھسڈی نکلنا تھا مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن، والا معاملہ تھا۔

رخصتی کی تاریخ میں جب صرف دس روز باقی رہ گئے تھے تو میں چونکا۔ ایک دم اٹھا اور دفتر کے پاس ہی یعنی اسی بلڈنگ میں ایک فلیٹ پینتیس روپے ماہوار پر لے لیا۔ چالیس مجھے مسٹر نذیر سے ملتے تھے۔ میں نے اُن سے کہہ دیا کہ ہر ماہ کرایہ ادا کر دیا کریں۔ اب گویا مجھے پانچ روپے ماہوار پر اپنا اور اپنی بیوی

کا شک سے صاف کیے اور تالا لگا کر سینے میں ایک موہوم امید لیے نانو بھائی ڈیسائی کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی کہانی کے معاوضے اور تنخواہوں کے بقایا کا تقاضا کیا۔ سیٹھ صاحب نے مجھے صاف جواب دے دیا کہ وہ مجھے ایک ڈیڑھیا (پیسہ) بھی نہیں دے سکتے۔

میں نے جب ٹکا سا جواب سنا تو میں بھنا گیا۔ غصے میں آ کر میں نے سیٹھ کو گالیاں تک دیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے باہر نکال دیا گیا۔ میں نے فوراً بابوراؤ پٹیل (ایڈیٹر فلم انڈیا) کو ٹیلی فون کیا۔ سارا ماجرا سنا کر میں نے ان سے کہا کہ اگر نانو بھائی نے میرا حساب نہ چکایا تو میں بھوک ہڑتال کر دوں گا۔ میرا یہ فیصلہ اٹل تھا۔

بابوراؤ جو میری ہٹ سے واقف تھا، بہت مضطرب ہوا۔ اس نے فوراً نانو بھائی کو ٹیلی فون کیا اور اُس سے کہا کہ اگر منٹو نے بھوک ہڑتال شروع کی تو سارا پریس اس کا ساتھ دے گا۔ اس لیے اسے چاہیے کہ فوراً اس کے ساتھ سمجھوتا کر لے۔

ٹیلی فون پر تو کوئی فیصلہ نہ ہوا۔ لیکن جب بابوراؤ، نانو بھائی سے اس کے دفتر میں ملا تو مجھے بلایا گیا۔ نانو بھائی نے مجھ سے معافی مانگی، میں نے اُس سے۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ میں آدھی رقم پر راضی ہو جاؤں اس لیے کہ کمپنی کی حالت نازک ہے۔

مجھے نو سو روپے کا ایک پوسٹ ڈیٹڈ چیک دیا گیا۔ چند روز گزرنے کے بعد جب میں نے نانو بھائی ڈیسائی کو ٹیلی فون کیا کہ تاریخ آ گئی ہے اور میں چیک کیش کرانے جا رہا ہوں تو اس نے کہا پہلے مجھ سے ملو۔

میں اس سے ملا تو اس نے مجھ سے بڑے دکھ بھرے لہجے میں کہا کہ بینک میں روپیہ نہیں ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں پانچ سو روپے نقد پر راضی ہو جاؤں؟ میں فوراً راضی ہو گیا۔ حالانکہ میری حق حلال کی کمائی کے اٹھارہ سو روپوں میں سے پہلے نو سو ہوئے اور اب پانچ سو، لیکن میں مجبور تھا۔ رخصتی میں اب صرف چار روز باقی تھے۔

میں نے کمپنی کی موٹر لی، مگر اس میں صرف پٹرول پمپ تک جانے کے لیے پٹرول تھا۔ میں نے

اپنی گرہ سے پٹرول ڈلوایا اور ڈرائیور سے کہا: ''سیدھے مارکیٹ چلو۔'' پانچ سو روپے جیب میں تھے۔ میں نے ان سے اپنی دلہن کے لیے ساڑیاں وغیرہ خریدیں ــــ جب گھر پہنچا تو جیب قریب قریب خالی تھی اور گھر تو بالکل خالی تھا۔ ٹوٹی ہوئی کرسی تک نہ تھی۔

میرے وہاں ایک بزرگ تھے: حکیم محمد ابو طالب اشک عظیم آبادی، بڑے مرنجاں مرنج آدمی تھے۔ میں نے جب ان سے ذکر کیا کہ دلہن لا رہا ہوں مگر گھر خالی ہے تو وہ مجھے فرنیچر کی ایک دکان پر لے گئے۔ اس کا مالک ان کو اچھی طرح جانتا تھا۔ چنانچہ مجھے آسان قسطوں پر کچھ سامان مل گیا۔ مثال کے طور پر: لوہے کی اسپرنگوں والی دو چار پائیاں، برتن وغیرہ رکھنے کی ایک الماری۔ ایک سنگار میز (یہ سیکنڈ ہینڈ تھی) ایک لکھنے والا میز، اپنے لیے ایک کرسی وغیرہ وغیرہ۔

جب میں نے یہ سامان فلیٹ میں سجانے کی کوشش کی تو مجھے بڑی مایوسی ہوئی، دو جہازی سائز کے کمرے تھے، ان میں یہ فرنیچر دکھائی ہی نہیں دیتا تھا چنانچہ میں نے دو مونڈھے خریدے اور وہ بھی ایک کونے میں جما دیے جو دوسرے فرنیچر کی طرح گم ہو گئے۔

اِدھر اُدھر سے مجھے جو چیز ملی، میں نے کہیں نہ کہیں ٹکا دی۔ ہر چیز ٹکانے کے بعد، میں کمرے پر نظر ڈالتا اور اپنے آپ کو فریب دینے کی کوشش کرتا کہ اب فلیٹ بھرا بھرا نظر آتا ہے۔

روزِ محشر آخر آن پہنچا۔ صبح مصور کے دفتر میں بیٹھا تھا ــــ والدہ اب میرے پاس آ گئی تھیں۔ اُن سے میں یہ کہہ کر آیا تھا کہ برات کا بندوبست کرنے جا رہا ہوں۔

مسٹر نذیر نے مختلف لوگوں کے نام رقعے بھیج دیے تھے۔ جن میں سے اکثر فلم لائن سے وابستہ تھے۔ میری برات گویا ایک فلمی برات تھی۔ میاں کاردار، ڈائرکٹر گنجالی، اُس زمانے کے مشہور ایکٹر: ای بلی موریا اور ڈی بلی موریا، نور محمد چارلی اور مرزا اشرف؛ بابو راؤ پٹیل اور پہلے رنگین فلم کی ہیروئن پدما دیوی؛ یہ سب شریک ہو رہے تھے۔

بابو راؤ پٹیل کو جب معلوم ہوا تھا کہ منٹو کے گھر میں صرف اس کی ماں ہے جسے اکیلی مہمانوں کی خاطر تواضع کرنا پڑے گی تو اس نے پدما دیوی کو ہمارے ہاں بھیج دیا تھا کہ وہ میری والدہ کا ہاتھ بٹائے۔

میں نے کرایے پر کرسیاں منگوائی تھیں اور پاس والے ایرانی ریستوراں سے وِمٹو کی بوتلیں۔ اس پر جو خرچ اٹھتا وہ میں اطمینان سے ادا کر سکتا تھا۔ اس لیے مجھے اس طرف سے کوئی تردّد لاحق نہیں تھا۔

وہ بے چاری میری مدد کرنے سے مجبور تھی۔ اس کے شوہر نے تو اس کی اجازت [illegible]
کی رسم میں شریک ہوتی اور اپنے بھائی کو دولہا بنا ہوا دیکھتی۔ پھر بھی اس نے مجھ سے کہا: ''سعادت، میں تمھارے واری جاؤں۔ ذرا کی ذرا اپنی موٹر میرے گھر کے سامنے روکنا — میں تمھیں دیکھنا چاہتی ہوں۔''
میں نے اور زیادہ گفتگو نہ کی۔ کیونکہ وہ بہت زیادہ جذباتی ہو رہی تھی۔ ٹیلی فون کا سلسلہ منقطع کرنے کے بعد میں اٹھا اور پڑوس کے سیلون سے بال کٹوائے۔ حمام میں غسل کیا۔ یہ سب ادھار۔
شام تک میں نے سگریٹ کی ساری ڈبیا پھونک ڈالی۔ اب میری جیب میں صرف ایک ماچس تھی۔ وہ بھی آدھی۔

کپڑے تبدیل کر کے میں نے وہ سوٹ پہنا جو مجھے سسرال سے ملا تھا۔ ٹائی باندھی۔ آئینے میں جب میں نے اپنی شکل دیکھی تو ایک کارٹون سا نظر آیا۔ میں خوب ہنسا۔

بتیاں جلنے سے پہلے سارے براتی جمع ہو گئے۔ پدما دیوی اور میری والدہ نے سب کی خاطر تواضع کی۔ اس کے بعد یہ قافلہ جو دس پندرہ موٹروں پر شامل [؟مشتمل] تھا، ماہم کی طرف روانہ ہوا۔

میں نانو بھائی ڈیسائی کی موٹر میں تھا۔ بغیر سہرے کے، سر سے ننگا۔ بالوں کی لمبائی معقول تھی۔ جب ہم جعفر ہاؤس کے قریب پہنچے تو میں نے ڈرائیور سے کہا: ''تھوڑی دور آگے لے جائیے۔'' باہر فٹ پاتھ پر میری بہن کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ جب اس نے میرے سر پر محبت کا ہاتھ پھیرا، دعائیں اور مبارک باد دی تو میں جلدی سے واپس موٹر میں بیٹھ گیا اور ڈرائیور سے کہا کہ بیک کرے۔

خالہ جان نے اوپر کھلے ٹیرس پر دعوت کا انتظام کیا تھا جو بہت اچھا تھا۔ رفیق غزنوی، ڈائرکٹر نندا اور آغا خلش کاشمیری کے درمیان بڑی پُرلطف نوک جھونک ہوتی رہی، سب نے ڈٹ کر کھایا کیونکہ کھانا بہت عمدہ اور لذیذ تھا۔ کشمیریوں کی روایت کے عین مطابق۔

کھانا کھانے کے بعد خوش گپیاں شروع ہوئیں۔ آغا خلش صاحب نے ایک پُر مزاح نظم پڑھی جو انھوں نے فی البدیہہ کہی تھی، یہ سلسلہ ختم ہوا تو مجھے نیچے بلایا گیا اور دلہن کے [دلہن کو میرے؟] سپرد کر دیا گیا۔

یہ سب مجھے ایک خواب سا معلوم ہوتا ہے۔ دماغ میں جانے کتنے خیالات تلے اوپر آ رہے تھے، دلہن میرے ساتھ تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور لرزاں آواز میں کہا: ''چلو بھئی۔''

ہم نیچے اُترے، بلی موریا نے اپنی کار پیش کی۔ والدہ میرے ساتھ تھیں، پہلے انھوں نے دلہن کو بٹھایا، اس کے بعد آپ بیٹھیں، پھر مجھے اندر آنے کو کہا۔ وہ میرے اور دلہن کے درمیان تھیں۔ گھٹنوں پر مخملیں جز دان میں لپٹا ہوا قرآن تھا۔ میری اور دلہن کی گردن ہاروں سے لدی پھندی تھی۔ موٹر اسٹارٹ ہوئی تو والدہ نے زیرِ لب کوئی آیت پڑھنا شروع کر دی۔ میں اب کسی قدر سنبھل چکا تھا، میرا جی چاہتا تھا کہ دلہن سے ذرا چھیڑ خانی کروں مگر — والدہ بیچ میں بیٹھی تھیں اور پھر کلام پاک پڑھ رہی تھیں۔ میری شدید خواہش وہیں کی وہیں سرد ہوگئی۔

مجھے معلوم نہیں راستہ کیسے اور کتنے عرصے میں کٹا۔ بس ایک دم گھر آ گیا۔ وہ بلڈنگ جو بہت پرانی وضع کی تھی جس کی ساخت میں لکڑی زیادہ اور اینٹیں کم استعمال ہوئی تھیں۔ اس کے متعلق مشہور تھا کہ کسی زمانے میں یہ بمبے کا بڑا عالیشان ہوٹل ہوا کرتا تھا، اسے ہز ہائی نس سر آغا خاں نے ایک دوست سے شرط میں جیتا تھا۔

والدہ دلہن کے ساتھ اوپر فلیٹ میں چلی گئیں۔ میں نے اپنے دوستوں کا شکریہ ادا کیا۔ اتنے میں مرزا مشرف اس ٹرک میں آن پہنچا جس میں دلہن کا جہیز تھا: کھانے کا میز، کرسیاں، اسپرنگوں والا پلنگ، تپائیاں، صوفہ سیٹ اور صندوق وغیرہ وغیرہ۔

یہ اسباب اتروایا تو مرزا مشرف کا ٹرک والے سے کرایے پر جھگڑا ہو گیا جو کافی دیر تک جاری رہا، مرزا مشرف نے اپنے مسخرے پن کا جی بھر کے مظاہرہ کیا۔ آخر جب یہ جھگڑا نپٹا اور سارا سامان فلیٹ میں پہنچ گیا اور عارضی طور پر ادھر اُدھر ٹکا دیا گیا تو مرزا مشرف نے جاتے ہوئے میرے کان میں کہا: ''منٹے دیکھو، ہماری ناک نہ کٹ جائے کہیں!''

میں تھک کر چور چور تھا۔ حلق سوکھ کے لکڑی ہو رہا تھا۔ اس لیے مسخرے مرزا کے اس مذاق کا کوئی

جواب نہ دے سکا— دوسرے ...
ہو چکا ہے، اس احساس سے مجھے بہت اطمینان حاصل ہوا۔ مجھے باہر بالٹی میں ایک رسی سی
جس پر پوتڑے اور کلوٹ ٹنگے ہوئے تھے۔ (۱۰)

اس سے قبل آپ کو ایک خط لکھ چکا ہوں جس میں میں نے آپ کو لڑکے کی پیدائش سے مطلع کیا
تھا۔ میں ان دنوں بہت پریشان رہا۔ بچے کی طبیعت ایکا ایکی خراب ہوگئی، اسے پیچش کی شکایت تھی۔
اس مرض نے اتنا طول پکڑا کہ اس کی زندگی اور موت کا سوال پیدا ہوگیا۔ دس روز تک اس کی حالت
خراب رہی، اب کچھ افاقہ ہے اور صفیہ بچے سمیت ہسپتال سے واپس آگئی ہے۔ پھر بھی بچہ کمزور ہے۔
اس کا علاج جاری ہے۔ اللہ اپنا فضل کرے۔ (۱۱)

بچہ جس کا نام اس کی ماں نے عارف رکھا ہے ایک مہینے سے علیل ہے، ہم سب پریشان ہیں۔ اس
کے خون میں کچھ خرابی پیدا ہوگئی ہے جس کے باعث پھوڑے پھنسیاں نکل رہے ہیں۔ علاج باقاعدہ
جاری ہے۔ اللہ اپنا فضل کرے۔ (۱۲)

ساری رات عارف نے جگائے رکھا۔ اب سر میں درد ہے۔ معافی چاہتا ہوں۔ (۱۳)

صفیہ آداب عرض کرتی ہے۔ عارف رو رہا ہے۔
اُس کی ماں چاہتی ہے کہ وہ پیشاب کرے مگر وہ کسی کے کہنے پر پیشاب کرنا پسند نہیں کرتا۔ اب
چپ ہوگیا ہے۔ (۱۴)

عارف چیچک کا ٹیکہ لگوانے کے باعث بیمار ہے۔ میں جی رہا ہوں۔ (۱۵)

چونکہ میری صحت اکثر خراب رہتی تھی اس لیے میں نے بمبے چھوڑ دیا ہے اور اب یہاں [آل انڈیا
ریڈیو، دہلی میں] ایک سو پچاس روپے ماہوار پر چلا آیا ہوں۔ آپ کو یہ سن کر تو ضرور خوشی ہوئی ہوگی کہ
چند دنوں ہی میں میری صحت بہت اچھی ہوگئی ہے۔ (۱۶)

میرا عارف صرف دو دن بیمار رہ کر کل رات کے گیارہ بجے اِرون ہسپتال میں مر گیا۔ (۱۷)

آپ سے کوئی غلطی یا 'گستاخی' نہیں ہوئی۔ یہ سارا قصور میرے اضمحلال کا ہے کہ جو کئی دنوں سے
مجھ پر طاری ہے۔ آج کل میں بہت سست ہوگیا ہوں۔ بمبے کی زندگی اور یہاں کی زندگی میں زمین و
آسمان کا فرق ہے۔ وہاں میں دوست نما دشمنوں سے الگ تھلگ تھا لیکن یہاں ایسے بے شمار لوگوں سے

نہ لکھنے کا۔

آپ سے میں کبھی بدظن نہیں ہوسکتا اور اگر کبھی بدظن ہو بھی جاؤں تو اس سے آپ کو کوئی نقصان پہنچنے کا احتمال نہیں ہوگا۔

مجھے معاف کر دیجیے کہ میری خاموشی سے آپ کو صدمہ ہوا۔ میں آپ کو نہیں بھول رہا۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ میں خود اپنے آپ کو بھولنے کی کوشش کر رہا ہوں۔(۱۸)

یہ دلی بہت بری جگہ ہے، خدا کی قسم اس نے مجھ پر جمود طاری کر دیا ہے۔ بمبئی میں تھا تو کتنی جلدی خطوں کا جواب تمھیں مل جاتا تھا۔ یہاں خود تو خطوں کا جواب نہیں دیتا لیکن خطوں کا انتظار ضرور کرتا ہوں۔ آج کل میرے دماغ کی بہت بری حالت ہے۔ اللہ اپنا رحم کرے۔(۱۹)

میرے بمبے میں آنے کے متعلق تم نے ضرور کسی نے کسی ذریعے سے ساری بات سن لی ہوگی اس لیے میں اسے دہرانا نہیں چاہتا۔(۲۰)

آپ کا محبت نامہ ملا۔ مجھے آپ کے خلوص پر نہ پہلے کبھی شک تھا اور نہ اب ہے اگر میرے دل میں ذرہ برابر میل بھی آپ کی طرف سے موجود ہوتا تو مجھ سے پہلے آپ کو شاید اس کا علم ہو جاتا۔ میرے دل کی کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی اور نہ میں کسی بات کو چھپانا چاہتا ہوں۔

چند روز ہوئے جب کہ صفیہ بستر علالت پر پڑی تھی، دیوندر ستیارتھی کا ٹیلی فون آیا۔ میں نے اس کو گالیاں دیں۔ میرے دل میں اس کے متعلق جو خیالات بھی تھے ان کا اظہار کر دیا اور اس سے کھلے لفظوں میں کہہ دیا کہ میں تم سے ملنا نہیں چاہتا۔ اس نے اس کے بعد کمال ڈھٹائی سے دو تین مرتبہ فون کیا لیکن میں نے اپنا ارادہ تبدیل نہ کیا بلکہ اُس کی اس ڈھٹائی نے مجھے اور متنفر کر دیا۔ اگر وہ جواب میں مجھے گالیاں دیتا اور اس حملے کا جواب دیتا جو میں نے اس پر کیا تھا تو بہت ممکن ہے میں خود اس کے پاس جا کر اپنے یہاں مہمان ٹھہرالیتا۔ صفیہ نے فون پر میری تمام باتیں سنیں، مجھے برا بھلا کہا لیکن میں نے اس سے کہا کہ میں دل میں نفرت رکھتے ہوئے زبان پر پیار محبت کے الفاظ نہیں لاسکتا۔

یہ واقعہ میں نے اس لیے بیان کیا کہ اگر مجھے آپ سے کوئی شکایت ہوتی تو میں نے بے کھٹکے اس کا اظہار کر دیا ہوتا۔

... ہوں۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے پرہیز نہیں کیا۔ اب تو یہ وقت آ گیا ہے کہ پرہیز کا لفظ ہی میری ڈکشنری سے غائب ہو گیا ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ زندگی اگر پرہیز میں گزاری جائے تو بھی قید ہے، اگر بد پرہیزیوں میں گزاری جائے تو بھی قید۔ کسی نہ کسی طرح ہمیں اِس اونی جراب کے دھاگے کا ایک سرا پکڑ کر اسے ادھیڑتے جانا ہے اور بس۔ میں اپنا کام آدھے سے زیادہ کر چکا ہوں۔ باقی آہستہ آہستہ کروں گا۔ اس لیے کہ میں بہت جلد مرنا نہیں چاہتا۔ جس روز مجھے معلوم ہو گیا کہ میں کیا ہوں تو میں موت کو بلانے میں کوئی پس و پیش نہ کروں گا۔

میری زندگی ایک دیوار ہے، جس کا پلستر میں ناخنوں سے کھرچتا رہتا ہوں۔ کبھی چاہتا ہوں کہ اس کی تمام اینٹیں پراگندہ کر دوں، کبھی یہ جی میں آتا ہے کہ ملبے کے ڈھیر پر ایک نئی عمارت کھڑی کروں۔ اسی اُدھیڑ بن میں لگا رہتا ہوں۔ دماغ ہر وقت کام کرنے کے باعث تپتا رہتا ہے، میرا نارمل درجۂ حرارت ایک ڈگری زیادہ ہے، جس سے آپ میری اندرونی تپش کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

میں بہت کچھ لکھنا چاہتا ہوں مگر نقاہت ـــ وہ مستقل تھکاوٹ جو میرے اوپر طاری رہتی ہے، کچھ کرنے نہیں دیتی۔ اگر مجھے تھوڑا سا سکون بھی حاصل ہو تو میں وہ بکھرے ہوئے خیالات جمع کر سکتا ہوں جو برسات کے پتنگوں کی مانند اڑتے رہتے ہیں مگر ـــ اگر اگر ـــ کرتے کرتے ہی کسی روز مر جاؤں گا اور آپ بھی یہ کہہ کر خاموش ہو جائیں گے ''منٹو مر گیا'' ـــ منٹو تو مر گیا، صحیح ہے ـــ مگر افسوس اس بات کا

اگر کوئی صاحب میرے ساتھ وعدہ کریں کہ وہ میرے دماغ میں سے نکالے گئے کیڑے کو
ایک بوتل میں ڈال دیں گے تو منٹو آج مرنے کو تیار ہے۔ منٹو، منٹو کے لیے زندہ نہیں ہے — مگر اس سے کسی کو کیا؟ — منٹو ہے کیا بلا؟...(۲۲)

مجھ میں بحیثیت ایک انسان کے بے حد کمزوریاں ہیں اس۔ لیے مجھے ہر وقت ڈر رہتا ہے کہ یہ کمزوریاں دوسروں کے دل میں میرے متعلق نفرت پیدا کرنے کا موجب نہ ہوں اور اکثر اوقات ایسا ہوا ہے کہ انہی کمزوریوں کے باعث مجھے کئی صدمے اٹھانے پڑے ہیں۔ میں اس تلخ حقیقت کے پیش نظر شاید آپ سے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ آپ میرے متعلق کوئی رائے مرتب نہ کریں۔(۲۳)

...مجھ میں جو چیز آپ کو پسند آئی ہے اور جسے آپ خلوص کا نام دیتے ہیں اُس کو میں اپنی نا قابلِ اصلاح کمزوری یقین کرتا ہوں۔ ایسی کمزوری جو میری صحت، میری روح پر برا اثر کرنے کا موجب بنی رہی ہے۔

حضرت اختر شیرانی سے آپ کو عقیدت ہے، کسی سے عقیدت رکھنا بری بات نہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آپ غایت درجہ سادہ لوح ہیں اور ہڈیوں کے گودے تک جذباتی — ذرا لطف دیکھیے کہ میں آپ پر تنقید کر رہا ہوں اور میں خود آپ سے کہیں بڑھ کر جذباتی ہوں۔

'بے گناہ' چند معمولی اسقام کے باوصف بہت اچھا افسانہ تھا۔ خیالات وافکار کی تشکیل میں سادگی تھی جو میکسم گورکی مرحوم کے افسانوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ 'بے گناہ' پڑھ کر آپ کو ایک تعریفی خط لکھ کر میں خاموش ہو جاتا مگر چونکہ میں ایک عرصے سے اپنے وجود کو 'تورگنیف' کے الفاظ میں، چھکڑے کے پانچویں بے معنی پہیے کے مانند فضول سمجھتا ہوں اس لیے میں نے چاہا کہ کسی کے کام آسکوں۔ کھائی میں پڑی ہوئی اینٹ اگر کسی دیوار کی چنائی میں کام آسکے تو اس سے بڑھ کر وہ اور کیا چاہ سکتی ہے۔(۲۴)

...تمھارے دونوں خط ملے۔ سوچ رہا ہوں کہ تم میں اتنا اخلاص کیوں ہے؟ — میں ڈرتا ہوں۔ اندھیرے میں رہنے والا زیادہ تیز روشنی کو دیکھنے کی تاب نہیں رکھتا۔ تمھارا خط مجھے ڈرا دیتا ہے۔ کیا کروں، عمر بڑھنے کے ساتھ مجھ میں بچپن آتا جاتا ہے۔ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب میں گھٹنوں کے بل چلوں گا اور تتلا تتلا کے باتیں کروں گا۔ لوگ پھیلتے ہیں، میں سکڑ رہا ہوں۔

زندگی کے جن ادوار سے میں گزر رہا ہوں اس پر نظر کرنے کی میرے پاس فرصت نہیں۔ کئی اسٹیشن آتے ہیں جن پر میری زندگی کی گاڑی ٹھہرتی ہے مگر میں تھکاوٹ سے چور، سفر کے آغاز ہی سے تنگ آیا ہوا، وہ بورڈ ہی نہیں پڑھ سکتا جس سے مجھے اسٹیشن کا نام معلوم ہو جائے۔ عجب حالت ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا اور سمجھ میں آئے بھی کیسے جبکہ سمجھنے کی فرصت ہی نہیں۔

کرشن چندر کہتے ہیں میں ان کے لیے نیا افسانہ لکھوں— جی چاہتا ہے ان کو اپنا تازہ فوٹو کھنچوا کر بھیج دوں۔ آنکھوں والے اسے دیکھ کر کئی نئے افسانے پڑھ لیں گے۔ (۲۵)

آپ کا خط پڑھ کر معلوم ہوا کہ پنڈت کرپارام نے آپ کو میرے متعلق ایک مفصل خط لکھا ہے۔ ان کی بڑی مہربانی ہے کہ آپ کو انھوں نے میرا دوست سمجھا اور مجھے اس بات سے بھی حوصلہ ہوتا ہے کہ انھوں نے مجھے فراموش نہیں کیا۔ پنڈت جی سے میرا تعارف مسٹر نذیر کی معرفت ہوا تھا۔ 'مصور' سے علاحدہ کر دیے جانے پر مجھے اس بات کا اندیشہ پیدا ہوا تھا کہ پنڈت جی بھی مجھ سے چھن گئے ہیں۔ ایک بار خلش صاحب سے مسٹر نذیر کے تعلقات خراب ہو گئے تھے تو اسی بنا پر پنڈت جی نے خلش صاحب کو ایک چچوڑی ہوئی ہڈی سمجھ کر پھینک دیا تھا۔ میرے دل میں ایسا خیال کیوں پیدا ہوا اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ آج کل جب کہ مسٹر نذیر سے خلش صاحب کا ملاپ ہو گیا ہے جو کہ اتنا ہی حیرت خیز ہے جتنا کہ روس اور جرمنی کا سیاسی اتحاد ہے، پنڈت جی کے دوستانہ تعلقات پھر سے خلش صاحب کے ساتھ قائم ہو گئے ہیں۔ اس کے لیے میں پنڈت جی کو مورد الزام قرار نہیں دیتا کیونکہ وہ دوستی کو گزوں سے ناپتے ہیں۔ میری دوستی، نذیر صاحب کی دوستی کے مقابلے میں کئی میل کم تھی۔ اس لیے میں سمجھا کہ پنڈت جی نے ایک ہی جھٹکے میں میری دوستی کی گردن علاحدہ کر دی ہوگی۔ مگر آپ کے خط سے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ میں ابھی تک ان کے اندر زندہ ہوں— یہ میرے حقیر اخلاص کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ ہے، ورنہ پنڈت جی کے سینے میں تو ایک قبرستان آباد ہوگا۔

پنڈت جی فوج میں رہ چکے ہیں اس لیے وہ ہر شے کو فوجی نظر سے دیکھتے ہیں۔ جب وہ کسی سے دوستی کرتے ہیں تو فوجی خطوط پر اور جب کسی سے دشمنی اختیار کرتے ہیں تو اُن کے دماغ میں مورچہ بندی کا خیال آجاتا ہے۔ وہ بے قصور ہیں اور میں بھی بے قصور ہوں۔ میں نے اُن کو اپنا دوست نہیں سمجھا اس لیے کہ وہ ان حدود سے گزر چکے ہیں جبکہ میری عمر کے آدمی اُن کو اپنا دوست بناتے۔ میں نے اُن کو اپنا

رہبر قرار دیا۔ ایک بار جب اُنھوں نے والدہ مرحومہ سے کہا تھا "سعادت میرا بچہ ہے" تو میں وہاں سے اٹھ کر بالکونی میں چلا گیا تھا کہ میری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر میری کمزوری کا اُن کو پتہ چل جائے گا۔ میں دل ہی دل میں ایک خاص قسم کا سرور محسوس کرتا تھا۔ مجھے اُن کی بہت سی باتوں سے اختلاف رہتا تھا مگر میں نے ہمیشہ جبر کیا اور اپنے دل کی سلطنت پر اُن کو ڈکٹیٹر بنا کر بٹھا دیا۔ دنیا جانتی ہے کہ پنڈت کرپارام صاحب مجھے عزیز تھے اور اب بھی عزیز ہیں، لیکن ایک حادثے سے میرے اندر انقلاب سا برپا ہو گیا ہے اور میں خود کو کسی قدر تبدیل کر چکا ہوں۔ یہی تبدیلی شاید پنڈت جی کو پسند نہیں آئی۔

'مصور' سے میں چار برس تک منسلک رہا۔ اس دوران میں ہر کام میں نے ایماندارانہ طور پر کیا۔ مسٹر نذیر یا پنڈت کرپارام جی ان چار برسوں کے ڈھیر میں سے ایک دن بھی ایسا کرید کر نہیں نکال سکتے جس کے ساتھ میرا اخلاص چمٹا ہوا نہ ہو۔ مصور کو میں نے اپنا سمجھا۔ نذیر صاحب کو بھی میں نے اپنے دل میں جگہ دی، لیکن ایکا ایکی، مجھ سے بات چیت کیے بغیر، مجھے تحریری نوٹس ملا جس نے کئی راتوں کی نیند مجھ پر حرام رکھی۔ یہ نوٹس ملنے پر میرے دل و دماغ میں کیسا ہلڑ مچا، میں بیان نہیں کر سکتا۔ فلموں کی کومنٹری لکھنے کا کام مجھے نذیر صاحب نے دلوایا تھا وہ بھی مجھ سے چھین لیا گیا۔ ایک سو بیس روپے ماہوار کی آمدن مجھ سے کسی نامعلوم گناہ کے باعث علاحدہ کر دی گئی۔ میں نے ہوش سنبھالا اور بابوراؤ پٹیل کے پاس گیا۔ اُس کو میں نے نوٹس دکھا کر کہا: "تمھیں ایک ایڈیٹر کی ضرورت تھی، میں اس وقت بیکار ہوں، کیا تمھیں میری خدمات درکار ہیں، میں ساٹھ روپے مہینے پر کام کروں گا۔" سودا منظور ہو گیا۔ اس کے بعد کرپارام جی سے میری ملاقات ہوئی۔ ان کے یہ الفاظ بستر مرگ پر بھی مجھے یاد رہیں گے: "میرا خیال تھا کہ نوٹس ملتے ہی تم اور صفیہ میرے پاس آؤ گے اور ہم کوئی مصالحت کی صورت پیدا کر لیں گے مگر تم نہ آئے اور بابوراؤ پٹیل کے پاس چلے گئے۔" خدا کرے کہ پنڈت جی کا وقار قائم رہے۔ اُن کو شاید یہ معلوم نہیں تھا کہ بعض آدمی ایسے بھی ہوتے ہیں جو ایک سو بیس روپے کھو دینے پر بھی بھیک نہیں مانگتے۔ مجھے جب زبانی پیغام دینے کے بجائے نوٹس دیا گیا تو میں کیوں کسی کے پاس جاتا۔ جب میرے جذبات کی قدر ہی نہیں کی گئی تو میں کیوں انھیں اور پائمال کراتا — پنڈت جی مجھ پر تمام عمر کوئی جرم عائد نہیں کر سکتے اس لیے کہ میں مجرم نہیں ہوں۔ مجھے اس بات کا دعویٰ ہے کہ اگر وہ میرے سامنے بیٹھ کر گفتگو کریں تو گفتگو کے بعد وہ مجھے اٹھا کر چوم لیں — خدا کی قسم میں اُن کو رُلا سکتا ہوں۔ مجھ میں انتقام

بولوں گا کہ ان کے کان بہرے ہو جائیں۔ انھوں نے مجھے بہت دکھ دیا ہے۔ وہ بہت سمجھدار ہیں مگر ان کی عقل مندی ملاحظہ ہو کہ خلش سے، مجھے نوٹس ملنے کے دوسرے روز ہی، کہتے ہیں: ''بھئی مجھے سعادت کے بیس روپے دینا ہیں''— یہ کیا ہے؟— اس ایک بات نے میرے دل پر نہایت ہی برا اثر کیا۔ پنڈت جی کے دل میں روپوں کا خیال 'مصور' سے میری علاحدگی پر کیوں آیا؟— کیا یہ ثابت نہیں کرتا کہ اُن کا ضمیر محور سے ہٹ چکا تھا۔

مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت جی اور میرے درمیان دوستی کا جو رشتہ تھا وہ صرف 'مصور' ہی کے صفحات پر تھا۔ مصور سے میں علاحدہ ہوا اور وہ بھی مجھ سے علاحدہ ہو گئے۔

میں نذیر صاحب سے پوچھ چکا ہوں۔ وہ بتا نہیں سکے کہ انھوں نے مجھے کیوں علاحدہ کیا لیکن انھوں نے اتنا ضرور کہا ہے کہ میرے اخلاص پر انھیں کامل بھروسا ہے۔ اب کرپارام جی پوچھوں گا کہ بھئی آپ نے میری دوستی کو کس بنا پر طلاق دی ہے؟ مجھے یقین ہے کہ وہ وجہ نہیں بتا سکیں گے اس لیے کہ کوئی وجہ ہے ہی نہیں اور اگر ہے تو وہ اتنی مبہم ہے جو صرف کرپارام جی ہی سمجھ سکتے ہیں۔ میں آپ سے کیا عرض کروں— اتنے واقعات ہیں کہ خط میں درج نہیں کیے جا سکتے۔ جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں پنڈت جی سے مجھے عقیدت تھی، میں نے کبھی یہاں رہ کر خود کسی کام کے لیے کوشش نہیں کی بلکہ مسٹر نذیر اور مسٹر کرپا رام پر بھروسا رکھا۔ اب کہ میں بالکل اکیلا ہوں، کیا وہ چاہتے ہیں کہ میں کچھ نہ کروں اور ڈوب کے مر جاؤں؟ اگر میں نے شادی نہ کی ہوتی تو بخدا میں اُن کو خوش کرنے کے لیے یہ بھی کر دیتا اور ہمیشہ کے لیے اپنی موت کی تختی ان کے گلے میں لٹکا دیتا مگر میں مجبور ہوں۔

کرپارام جی کبھی تخلیے میں سوچیں تو انھیں معلوم ہو جائے گا کہ میں کسی سے برائی کر ہی نہیں سکتا۔ البتہ وہ کر سکتے ہیں، وہ اس کے اہل ہیں۔ وہ اپنی طبیعت خوش کرنے کے لیے جس کا چاہے گلا گھونٹ سکتے ہیں— میں نے ابھی اتنا تجربہ حاصل نہیں کیا جتنا کہ پنڈت جی کر چکے ہیں، ممکن ہے کہ دس بارہ برس کے بعد مجھ میں بھی یہ بات پیدا ہو جائے۔ اُس وقت میں ان سے زیادہ اچھی طرح بات کر سکوں گا مگر اب کہ میرے اندر صرف جذبات ہی جذبات ہیں، میں سوائے آنسوؤں کے ان کی خدمت میں اور کچھ پیش نہیں کر سکتا، یہ آنسو انہی کے عنایت کردہ ہیں۔

مجھ سے بعض لوگوں کے خلاف لکھنے کے لیے کہا گیا، میں نے لکھا اس لیے کہ وہ مجھے خود بھی ناپسند تھے، لیکن میں اب دیکھتا ہوں کہ پنڈت جی اُن کے ساتھ گھل مل کر رہتے ہیں۔ میں ان لوگوں کا دشمن ہوں مگر وہ دوست ہیں۔ میں اس پر رشک نہیں کرتا بلکہ افسوس کرتا ہوں۔ وہ یوں اپنا الو سیدھا کرتے ہیں اور میں.... پنڈت جی سے کہیے کہ وہ کبھی میری پوزیشن پر بھی غور کریں۔ میں اگر چاہوں تو اُن بے وقوفوں کو اتنا خوش کر سکتا ہوں کہ پنڈت جی ساری عمر میں نہیں کر سکتے، لیکن مصیبت یہ ہے کہ میں خود عبرت ناک حد تک بیوقوف ہوں۔

میں نے اگر دورنگی زندگی بسر کرنا شروع کی تو مجھے یقین ہے کہ میں زیادہ کامیاب رہوں گا کیونکہ میں یہ کام بھی اخلاص کے ساتھ کروں گا مگر مصیبت یہ ہے کہ وہ دن ہی نہیں آتا جب ایسی زندگی بسر کرنے کی خواہش میرے اندر پیدا ہو۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ نذیر صاحب یا کرپارام صاحب مجھ پر ناراض کس وجہ سے ہیں۔ کیا میں نے ان کی کوئی جائیداد غصب کر لی ہے یا میں نے کبھی ان کو قتل کرنے کی کوشش کی ہے۔ آخر میرا کوئی جرم بھی ہو۔ گو میں یہ پسند نہیں کرتا کہ خود کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کر دوں۔ مگر میں یہ بھی کرنے کے لیے تیار ہوں۔ چلیے میں مجرم ہی سہی، اب کرپارام جی اور ان کے دوست کرسیوں پر بیٹھیں اور مجھ پر جرم ثابت کریں۔ کیا ان میں اتنی جرأت ہے؟— ان سے پوچھیے۔

وہ میرے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکتے۔ اگر وہ کچھ کہہ سکتے ہیں تو صرف یہ کہ سعادت شراب پیتا ہے۔ سعادت شراب پیتا ہے اس لیے کہ شراب صرف میرے جسم کو نقصان پہنچاتی ہے روح کو نہیں۔ کرپارام جی نے تو میری روح کو تکلیف پہنچائی ہے۔

میں بے حد ذکی الحس ہوں۔ میں نے سارے کا سارا سعادت ان کی میلی جھولی میں ڈال دیا مگر اُس کے بدلے میں انھوں نے کرپارام کا صرف ایک ٹکڑا مجھے دیا۔ مجھے اس کا گلہ ہے۔ جب میں کسی سے دوستی کرتا ہوں تو مجھے اس بات کی توقع ہوتی ہے کہ وہ اپنا آپ میرے حوالے کر دے گا۔ دوستی کرنے کے معاملے میں میرے اندر یہ ایک زبردست کمزوری ہے جس کا علاج مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب آپ نے اپنی دوستی کا ہاتھ میری طرف بڑھایا تھا تو میں نے آپ سے کئی بار کہا تھا کہ آپ مجھے دوست نہ بنائیں، صرف اسی کمزوری کے باعث میں نے آپ سے درخواست کی تھی۔ اب بھی میری

آپ سے یہی درخواست ہے۔ ندیم صاحب معاف فرمائیے گا، قصور سے ایڈیٹر (غیر ضروری باتوں کی طرح) علاحدہ کر دیے جانے پر اب میرے دل میں بہت تلخی پیدا ہوگئی ہے، میں اب ہر وقت سہا سا رہتا ہوں کہ ممکن ہے کسی روز آپ بھی میرے ساتھ یہی سلوک نہ کریں — مجھے تو یہ بھی ڈر رہتا ہے کہ کہیں میرے اپنے ہاتھ پاؤں مجھ سے باغی نہ ہو جائیں۔ اللہ رحم کرے۔

مجھے معلوم نہیں پنڈت جی نے آپ کو کیا لکھا ہے، لیکن اگر دنیا میں ایمان واقعی کام کی چیز ہے تو اُس سے کام لے کر آپ انھیں بتائیے کہ میں نے ان کے بارے میں آپ کو کبھی کچھ لکھا ہے؟ — جو کچھ انھوں نے آپ کو لکھا ہے مجھے ہرگز نہ بتائیے گا۔ میں اپنے آپ کو اور دکھی کرنا نہیں چاہتا۔ کرپا رام جی میں اتنا دل گردہ نہیں کہ وہ آگے بڑھ کر میرے دکھ اٹھا کر اپنے کاندھے پر رکھ لیں۔ خدا ان کو ہمیشہ سکھی رکھے اور اگر وہ مجھے مشکلات میں دیکھ کر ہی خوش رہ سکتے ہیں تو میری دعا ہے کہ میں ہمیشہ مشکلات میں پھنسا رہوں۔ لیکن کرپا رام جی سے میں کبھی بھیک نہیں مانگوں گا۔

میں ایک بار پھر عرض کرتا ہوں کہ مجھے نہ کرپا رام جی سے دشمنی ہے اور نہ مسٹر نذیر سے۔ میں اول تو ان کو نقصان پہنچا ہی نہیں سکتا، اس کا خیال تک میرے دماغ میں نہیں آئے گا، لیکن میں اس بھونڈے سلوک کا تذکرہ یقیناً کرتا رہوں گا جو نذیر صاحب اور پنڈت کرپا رام جی نے میرے ساتھ کیا۔ دنیا کی کوئی طاقت مجھے یہ سچی بات کہنے سے نہیں روک سکتی۔

کرپا رام جی مجھے اپنی زبان سے بیٹا کہہ چکے ہیں، کیا انھوں نے اپنے دوست نذیر صاحب سے یہ پوچھنے کی زحمت گوارا کی کہ سعادت کا قصور کیا ہے اور اگر انھوں نے پوچھا تو کیا نذیر صاحب نے سچی بات اُن سے کہی؟

مجھے کچھ معلوم نہیں کہ میں کیا لکھ رہا ہوں لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ پنڈت کرپا رام جی میرے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے۔ وہ مجھے بالکل نہیں سمجھ سکے۔ میں اُن کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔

میں نے پنڈت جی کے بارے میں اب تک جو کچھ بھی 'کارواں' میں لکھا ہے، خدا کی قسم کسی شخص کی اکساہٹ پر نہیں لکھا۔ کرپا رام صاحب سے پوچھیے کہ وہ ناکام ڈائرکٹروں کا راگ کیوں الاپ رہے ہیں۔ اس کے پیچھے کون سا جذبہ کارفرما ہے؟ — مجھے اس بات کا دعویٰ ہے کہ وہ اگر اپنی تمام طاقتیں صرف کر دیں تو بھی وہ مضامین کے ذریعے سے یا زبانی، ہرگز ثابت نہیں کر سکتے کہ وہ ناکام ڈائرکٹروں

'موویز' کے کالم بھرتے رہتے ہیں۔ وہ کیوں خواہ مخواہ ایک ایسی چیز پر قلم اٹھاتے ہیں جس میں وہ خود کو حق بجانب ثابت نہیں کر سکتے۔ انڈسٹری کا درد ان کے دل میں اتنا ہی ہے جتنا کہ بابوراؤ پٹیل کے دل میں۔ یہ صاف باتیں ہیں اور پنڈت جی اس سے انکار نہیں کر سکتے۔

درد مجھ ایسے آدمی کے دل میں ہو سکتا ہے جس کی زندگی کا سارا دارومدار صرف مشقت پر ہے۔ میں محنت کرتا ہوں۔ سیاسی پہلوانی نہیں کرتا۔ پنڈت کرپارام جی اور مسٹر نذیر دونوں سیاسی پہلوان ہیں۔ میری بات یاد رکھیے گا، ان دونوں میں ایک نہ ایک روز ضرور کشتی ہوگی — میں اس اکھاڑے سے باہر ہوں اور کوشش کروں گا کہ ہمیشہ باہر ہی رہوں۔

آخر پنڈت جی مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟ — کیا میں محنت نہ کروں؟ — کیا میں بھیک مانگنا شروع کر دوں۔ کیا میں دوسروں کے خلاف یوں ہی مضامین کا تانتا باندھ دوں۔ کیا میں لوگوں کی خوشامد شروع کر دوں۔ کیا میں اپنے گلے میں غلامی کا طوق ڈال لوں؟ — کیا میں سارا دن ایک در سے دوسرے در تک پھرتا رہوں؟ — مجھے بتائیں تو سہی کہ میں کیا کروں؟

کرپارام جی کی ایک اور طفلانہ حرکت ملاحظہ ہو۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے آپ میرے بہت قائل تھے۔ ایک صاحب سے جو کہ اپنی اسٹوری کا منظرنامہ لکھنا چاہتے تھے، آپ نے میری سفارش کی اور بہت سارو پیہ دلوانے کا وعدہ کیا مگر اب انھوں نے خلش صاحب سے کہا ہے: ''منٹو کو اب میں کام نہیں دے رہا — فلاں شخص کو دوں گا'' — بھئی پنڈت جی! آپ کسی کو بھی دیں مگر خلش صاحب کو یہ کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ جب مسٹر نذیر نے خلش صاحب کو اپنے پاس بلا لیا تھا تو میں خوش ہوا تھا۔ اب اگر وہ یہ کام کسی اور کو دے دیں گے تو مجھے رنج نہیں ہوگا البتہ رنج اس بات کا ہے کہ انھوں نے ایسی بات کہی۔

وہ مجھے روپے پیسوں میں کیوں تولتے ہیں؟ — مجھے ان سے اتنی محبت نہیں ہے جتنی کہ مجھے اُس تخیل سے ہے جو کہ دوستی کے متعلق میرے دماغ میں موجود ہے۔ وہ جو چاہیں کریں، میرے رویے میں ہرگز ہرگز فرق نہیں آئے گا۔ میں اپنے آپ کو ذلیل بنانا نہیں چاہتا۔

ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر کرپارام جی کو کوئی بات ناگوار گزرتی ہے تو کیا کسی دوسرے کو نہیں گزر سکتی۔ اگر وہ کسی شے کو ناپسند کرنے پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر سکتے ہیں تو کیا دوسرا نہیں

کر سکتا۔ اگر وہ کسی آدمی کے خلاف زہر اگل سکتے ہیں تو کیا دوسرا نہیں اگل سکتا۔ اگر پنڈت جی خاص مصلحتوں کے پیش نظر کسی کو بانس پر چڑھا سکتے ہیں تو کیا دوسرا نہیں چڑھا سکتا۔ کیا وہ مجھے بتا سکتے ہیں کہ ان کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟

میں نے اب تک ان کے متعلق جو کچھ بھی لکھا ہے آپ کی نظروں سے گزرا ہوگا۔ بتایئے اس میں کیا برائی ہے۔ میں ان کی کسی بات سے اختلاف نہیں رکھتا لیکن بات صرف یہ ہے کہ وہ خود محسوس کرتے ہیں کہ جو کچھ وہ لکھ رہے ہیں اخلاص پر مبنی نہیں ہے۔ یہی احساس ان کو مجبور کرتا ہے کہ وہ میرے خلاف لوگوں سے کچھ کہیں اور اسی احساس نے انھیں مجبور کیا کہ وہ آپ کو خط لکھیں۔

وہ دنیا سے کسی قسم کا بھی سلوک کریں مجھے اُس کی پروا نہیں۔ وہ جانیں اور ان کا کام۔ لیکن میرے ساتھ انھیں امتیازی سلوک روا رکھنا ہوگا اس لیے کہ وہ اپنے منہ سے مجھے بیٹا کہہ چکے ہیں۔ میں بہت ضدی بچہ ہو گیا ہوں۔ طفل تسلیوں سے اب میں نہیں بہلوں گا۔ انھیں اپنے قصور ماننا ہوں گے تا کہ مجھے اطمینان نصیب ہو اور میرے اندر جو انقلاب کا طوفان پیدا ہو رہا ہے ٹھنڈا ہو جائے۔ ان کی بے رخی نے مجھے بہت دکھ پہنچایا ہے۔ بخدا بہت دکھ پہنچایا ہے۔ میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔ خدا میری اور ان کی دونوں کی حالت پر رحم کرے۔

کرپا رام جی سے کہیے کہ وہ مجھ سے ملیں۔ اُن کی شان میں فرق نہیں آئے گا یا مجھ سے کہیں میں اُن سے ملاقات کروں مگر ایسی جگہ جہاں دس پندرہ آدمی موجود ہوں تا کہ سب کے روبرو ہم باتیں کر سکیں۔ (۲۶)

...ایک فلمی افسانہ سوچ رہا ہوں جس کا عنوان 'پڑوس' ہوگا۔ دس پندرہ روز سے مغز کھپا رہا ہوں مگر اس کے لیے افتتاحیہ سین ہی دماغ میں نہیں آتا۔ اسی الجھن میں بیماری سی محسوس ہونے لگی ہے۔ اس افسانے کا موضوع ہندو مسلم اتحاد کا عقبی منظر ہوگا۔ یعنی وہ تمام عناصر بیان کیے جائیں گے کہ جو اتحاد کے درمیان حائل ہوتے ہیں۔ چونکہ مسجد اور مندر میں ان دونوں قوموں کا ملاپ محال ہے اس لیے میں نے ایک ایسا پلیٹ فارم ڈھونڈا ہے جہاں یہ دونوں مل سکتے ہیں یا ملتے رہتے ہیں۔ وہ پلیٹ فارم ویشیا کا مکان ہے جو نہ مندر ہے اور نہ مسجد۔ بس اسی مکان پر میں اپنے سارے افسانے کا بوجھ ڈالنا چاہتا ہوں۔ (۲۷)

...آپ یہ سن کر خوش ہوں گے کہ میں نے 'کیچڑ' مکمل کر لیا ہے۔ جو کچھ میں چاہتا تھا اُس کا ۳/۴

MUD میں آپ کو بہت سی ایسی چیزیں نظر آئیں گی۔ 'نیا قانون' کے استاد منگو کی جھلک آپ کو نتھو کے کیریکٹر میں ملے گی۔ پھر میں نے اپنے ہر کیریکٹر کو اُس کی برائیوں اور اچھائیوں سمیت پیش کیا ہے۔ اگر یہ اسٹوری فلمائی گئی اور ڈائرکشن اُس چیز کو برقرار رکھ سکی جو میرے سینے میں ہے تو میرا خیال ہے کہ آپ میرے MUD میں سارا ہندوستان دیکھ لیں گے۔ (۲۸)

یہاں فلمستان والوں سے میں قریب قریب ناراض ہو چکا ہوں۔ لاہور میں ایک فلم ساز مجھے ایک ہزار روپے ماہوار دینے کے لیے تیار ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ چلا جاؤں۔ فکر اور مفتی کو میں نے اسی سلسلے میں محبت بھرے طویل اور تازہ (تازہ پہلے، طویل درمیان میں اور محبت بھرے آخر میں — معاف کیجیے گا!) خط لکھے تھے۔ (۲۹)

...ان دنوں دماغ عجیب حالت میں ہے۔ کوئی کہتا ہے یہیں رہو، کوئی کہتا ہے نہیں لاہور چلے آؤ، ایک صاحب ہیں وہ فرماتے ہیں تم کہیں بھی جاؤ لیکن تمھیں میرے لیے پھر واپس بمبے آنا ہی پڑے گا — ایک طرف یہاں کا مکان چھوڑنے اور سارا فرنیچر بیچنے کا سوال درپیش ہے، دوسری طرف لاہور میں رہائش کے بندوبست کا مسئلہ۔ خدا کے لیے مجھے معاف کیجیے۔ میں لاہور آ گیا تو ہر مہینے آپ کو ایک افسانہ دے دیا کروں گا۔ میرے دماغ کی جیبیں ابھی خالی نہیں ہوئیں۔ (۳۰)

بمبئی چھوڑ کر کراچی سے ہوتا ہوا غالباً سات یا آٹھ جنوری سنہ ۱۹۴۸ء کو یہاں لاہور پہنچا۔ تین مہینے میرے دماغ کی عجیب و غریب حالت رہی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کہاں ہوں۔ بمبئی میں ہوں۔ کراچی میں اپنے دوست حسن عباس کے گھر بیٹھا ہوں یا لاہور میں ہوں جہاں کئی ریستورانوں میں قائدِ اعظم فنڈ جمع کرنے کے سلسلے میں رقص و سرود کی محفلیں اکثر جمتی تھیں۔

تین مہینے تک میرا دماغ کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پردے پر ایک ساتھ کئی فلم چل رہے ہیں۔ آپس میں گڈمڈ — کبھی بمبئی کے بازار اور اس کی گلیاں۔ کبھی کراچی کی چھوٹی چھوٹی تیز رفتار ٹریمیں اور گدھا گاڑیاں اور کبھی لاہور کے پرشور ریستوراں — سمجھ میں نہیں آتا تھا میں کہاں ہوں — سارا دن کرسی پر بیٹھا خیالات میں کھویا رہتا۔ آخر ایک دن چونکا کیونکہ جو روپیہ میں بمبئی سے اپنے ساتھ لایا تھا کچھ تو گھر میں اور کچھ گھر سے کچھ دور کلفٹن بار میں جذب ہو چکا تھا — اب مجھے قطعی طور

میں نے سوچنا شروع کیا کہ اب کیا

کاروبار قریب قریب مفلوج ہو چکا ہے۔ جن فلم کمپنیوں کے بورڈ نظر آتے ہیں وہ ان بورڈوں ہی تک
محدود ہیں — بہت تشویش ہوئی — الاٹمنٹوں کا بازار گرم تھا۔ مہاجر اور غیر مہاجر دھڑا دھڑ اپنے اثر و
رسوخ سے کارخانے اور دکانیں الاٹ کرا رہے تھے۔ مجھے مشورہ دیا گیا مگر میں نے اس لوٹ کھسوٹ
میں حصہ نہ لیا۔

انہی دنوں معلوم ہوا کہ فیض احمد فیض اور چراغ حسن حسرت مل کر ایک روزنامہ جدید خطوط پر شائع
کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ میں ان حضرات سے ملا۔ اخبار کا نام 'امروز' تھا جو آج ہر ایک کی زبان پر
ہے۔ پہلی ملاقات پر اخبار کی 'ڈمی' تیار کی جا رہی تھی۔ دوسری ملاقات ہوئی تو 'امروز' کے غالباً چار پرچے
نکل چکے تھے۔ اخبار کی گٹ اَپ دیکھ کر جی بہت خوش ہوا۔ طبیعت میں اکساہٹ پیدا ہوئی کہ لکھوں لیکن
جب لکھنے بیٹھا تو دماغ کو منتشر پایا۔ کوشش کے باوجود ہندوستان کو پاکستان سے اور پاکستان کو ہندوستان
سے علاحدہ نہ کر سکا۔ بار بار دماغ میں یہ الجھن پیدا کرنے والا سوال گونجتا: کیا پاکستان کا ادب علاحدہ
ہوگا — اگر ہوگا تو کیسے ہوگا۔ وہ سب کچھ جو سالم ہندوستان میں لکھا گیا تھا اس کا مالک کون ہے — کیا
اس کو بھی تقسیم کیا جائے گا — کیا ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کے بنیادی مسائل ایک جیسے نہیں — کیا
اُدھر اردو بالکل ناپید ہو جائے گی۔ یہاں پاکستان میں اردو کیا شکل اختیار کرے گی — کیا ہماری اسٹیٹ
مذہبی اسٹیٹ ہے — اسٹیٹ کے تو ہم ہر حالت میں وفادار رہیں گے مگر کیا ہمیں حکومت پر نکتہ چینی کی
اجازت ہوگی — آزاد ہو کر کیا یہاں کے حالات فرنگی عہدِ حکومت کے حالات سے مختلف ہوں گے۔

گرد و پیش جدھر بھی نظر ڈالتا تھا انتشار ہی انتشار دکھائی دیتا تھا۔ کچھ لوگ بے حد خوش تھے۔ کیونکہ
ان کے پاس ایک دم دولت آ گئی تھی۔ لیکن اس خوشی میں بھی انتشار تھا۔ جیسے وہ بکھر کر ایک دن ہوا
ہو جانے والی ہے — اکثر مغموم و متفکر تھے کیونکہ وہ لُٹ پٹ کر آئے تھے — مہاجروں کے کیمپ دیکھے۔
یہاں خود انتشار کے رونگٹے کھڑے دیکھے۔ کسی نے کہا اب تو حالات بہت بہتر ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے کی
حالت دیدنی تھی۔ میں سوچنے لگا اگر یہ حالات کی بہتری ہے تو ابتری معلوم نہیں کیسی ہوگی — غرض کہ

دوسرے نے عالمِ نزع سے مصروفِ پیکار تھی۔ دو دھارے بہہ رہے تھے: ایک زندگی کا دھارا، ایک موت کا۔ ان کے درمیان خشکی تھی جس پر گرسنگی و تشنگی، شکم سیری و بلانوشی ساتھ ساتھ چلتی تھیں ــــ!

فضا پر مردنی طاری تھی۔ جس طرح گرمیوں کے آغاز میں آسمان پر بے مقصد اڑتی ہوئی چیلوں کی چیخیں اداس ہوتی ہیں اسی طرح 'پاکستان زندہ باد' اور 'قائد اعظم زندہ باد' کے نعرے بھی کانوں کو اداس اداس لگتے تھے۔

ریڈیو کی لہریں اقبال مرحوم کا یک آہنگ کلام شب و روز اپنے کاندھوں پر اٹھا اٹھا کر تھک اور اکتا گئی تھیں۔ فیچر پروگرام کچھ اس قسم کے ہوتے تھے کہ مرغیاں کس طرح پالی جاتی ہیں۔ جوتے کیسے بنائے جاتے ہیں۔ فنِ دباغت کیا ہے۔ رفیوجی کیمپوں میں کتنے آدمی آئے اور کتنے گئے۔

قریب قریب تمام درخت ننگے بچے تھے ــــ سردیوں سے بچنے کے لیے غریب مہاجرین نے ان کی چھال اتار کر اپنی کھال گرم کی تھی۔ ٹہنیاں کاٹ کر پیٹ کی آگ ٹھنڈی کی تھی۔ ان ننگے بچے درختوں سے فضا اور بھی دل شکن حد تک اداس ہو گئی تھی۔

بلڈنگوں کی طرف دیکھتا تھا تو ایسا محسوس ہوتا تھا سوگ میں ہیں۔ ان کے مکیں بھی ماتم زدہ تھے۔ بظاہر ہنستے تھے۔ کھیلتے تھے۔ کوئی کام مل جاتا تھا تو وہ بھی کرتے تھے مگر گویا یہ سب کچھ خلا میں ہو رہا تھا۔ ایک ایسے خلا میں جو لبالب ہونے پر بھی خالی تھا۔

میں اپنے عزیز دوست احمد ندیم قاسمی سے ملا۔ ساحر لدھیانوی سے ملا۔ ان کے علاوہ اور لوگوں سے بھی ملا۔ سب میری طرح ذہنی طور پر مفلوج تھے۔ میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ یہ جو اتنا زبردست بھونچال آیا ہے شاید اس کے کچھ جھٹکے آتش فشاں پہاڑ میں اٹکے ہوئے ہیں۔ باہر نکل آئیں تو فضا کی نوک پلک درست ہو گی۔ پھر صحیح طور پر معلوم ہو سکے گا کہ صورتِ حالات کیا ہے۔

سوچ سوچ کر میں عاجز آ گیا تھا۔ چنانچہ آوارہ گردی شروع کر دی۔ بے مطلب سارا دن گھومتا رہتا خود خاموش رہتا لیکن دوسروں کی سنتا رہتا ــــ بے ہنگم باتیں۔ بے جوڑ دلیلیں۔ خام سیاسی مباحثے ــــ اس آوارہ گردی سے یہ فائدہ ہوا کہ میرے دماغ میں جو گرد و غبار اُڑ رہا تھا آہستہ آہستہ بیٹھ گیا...(۳۱)

سرکار نے ہائی کورٹ میں اپیل دائر کر رکھی ہے۔ مقدمے کی ساعت ابھی تک نہیں ہوئی)

اس دوران میں مجھ پر جو گزری اس کا کچھ حال آپ کو میری کتاب 'ٹھنڈا گوشت' کے دیباچے بعنوان 'زحمتِ مہرِ درخشاں' میں مل سکتا ہے۔ دماغ کی کچھ عجیب سی کیفیت تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ لکھنا چھوڑ دوں یا احتساب سے قطعاً بے پروا ہو کر قلم زنی کرتا رہوں۔ سچ پوچھیے تو طبیعت اس قدر کھٹی ہو گئی تھی کہ جی چاہتا تھا کہ کوئی چیز الاٹ ہو جائے تو آرام سے کسی کونے میں بیٹھ کر چند برس قلم اور دوات سے دور رہوں۔ دماغ میں خیالات پیدا ہوں تو انھیں پھانسی کے تختے پر لٹکا دوں۔ الاٹ منٹ میسر نہ ہو تو بلیک مارکٹنگ شروع کر دوں، یا ناجائز طور پر شراب کشید کرنے لگوں۔ آخرالذکر کام میں نے اس لیے نہ کیا کہ مجھے اس بات کا خدشہ تھا کہ ساری شراب میں خود پی جایا کروں گا۔ خرچ ہی خرچ ہو گا، آمدن ایک پیسے کی بھی نہ ہو گی۔ بلیک مارکٹنگ اس لیے نہ کر سکا کہ سرمایہ پاس نہ تھا۔ ایک صرف الاٹ منٹ ہی تھی جو کارآمد ثابت ہو سکتی تھی۔ آپ کو حیرت ہو گی مگر یہ واقعہ ہے کہ میں نے اس کے لیے کوشش کی۔ پچاس روپے حکومت کے خزانے میں جمع کرا کے میں نے درخواست دی کہ میں امرت سر کا مہاجر ہوں۔ بیکار ہوں۔ اس لیے مجھے کسی پریس یا سنیما میں حصہ الاٹ فرمایا جائے۔

درخواست کے چھپے ہوئے فارم تھے۔ ایک عجیب و غریب قسم کا سوالیہ تھا۔ ہر سوال اس قسم کا تھا جو اس امر کا طالب تھا کہ درخواست کنندہ پیٹ بھر کے جھوٹ بولے۔ اب یہ عیب مجھ میں شروع سے رہا ہے کہ جھوٹ بولنے کا سلیقہ نہیں ہے۔ میں نے الاٹ منٹ کرانے والے بڑے بڑے گھاگوں سے مشورہ کیا تو انھوں نے کہا کہ تمھیں جھوٹ بولنا ہی پڑے گا۔ میں راضی ہو گیا۔ لیکن جب چھپے ہوئے فارم کی خالی جگہیں بھرنے لگا تو روپے میں صرف دو یا تین آنے جھوٹ بول سکا اور جب انٹرویو ہوا تو میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ صاحب جو کچھ درخواست میں ہے بالکل جھوٹ ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ میں ہندوستان میں کوئی بہت بڑی جائیداد چھوڑ کے نہیں آیا۔ صرف ایک مکان تھا اور بس۔ آپ سے میں خیرات کے طور پر کچھ نہیں مانگتا۔ میں بزعمِ خود بہت بڑا افسانہ نگار تھا لیکن اب مجھے محسوس ہوا کہ یہ کام

اپنی افسانہ نگاری سے سبک سر ہوتا ہوں اور صرف اتنا چاہتا ہوں کہ حکومت مجھے کوئی ایسی چیز الاٹ کر دے جس کے لیے مجھے کام کرنا پڑے اور اُس کام کی اجرت کے طور پر مجھے پانچ چھ سو روپیہ ماہوار مل جایا کرے۔

حیرت ہے کہ میری اس گفتگو کا اثر ہوا۔ قریب تھا کہ مجھے کسی برف خانے میں کوئی حصہ الاٹ ہو جائے کہ بورڈ کے ممبروں سے کسی نے کہہ دیا: تم لوگ یہ کیا غضب کر رہے ہو یہ شخص جس کا نام سعادت حسن منٹو ہے، ترقی پسند ہے۔ چنانچہ یک قلم میری درخواست مسترد کر دی گئی۔

اِدھر یہ ہوا، اُدھر ترقی پسند مصنفین نے رجعت پسند قرار دے کر میرا حقہ پانی بند کر دیا — یہ بھی خوب لطیفہ رہا...(۳۳)

مجھے آپ افسانہ نگار کی حیثیت سے جانتے ہیں اور عدالتیں ایک فحش نگار کی حیثیت سے، حکومت مجھے کبھی کمیونسٹ کہتی ہے اور کبھی ملک کا بہت بڑا ادیب، کبھی میرے لیے روزی کے دروازے بند کیے جاتے ہیں، کبھی کھولے جاتے ہیں، کبھی مجھے غیر ضروری انسان قرار دے کر 'مکان باہر' کا حکم دیا جاتا ہے، کبھی موج میں آ کر یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ نہیں تم 'مکان اندر' رہ سکتے ہو۔ میں پہلے بھی سوچتا تھا، اب بھی سوچتا ہوں کہ میں کیا ہوں، اس ملک میں جسے دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت کہا جاتا ہے، میرا کیا مقام ہے میرا کیا مصرف ہے۔

آپ اسے افسانہ کہہ لیجیے، مگر میرے لیے یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ میں ابھی تک خود کو اپنے ملک میں جسے پاکستان کہتے ہیں اور جو مجھے بہت عزیز ہے، اپنا صحیح مقام تلاش نہیں کر سکا۔ یہی وجہ ہے کہ میری روح بے چین رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں کبھی پاگل خانے میں اور کبھی ہسپتال میں ہوتا ہوں۔

میں کچھ بھی ہوں، بہر حال مجھے اتنا یقین ہے کہ میں انسان ہوں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ مجھ میں برائیاں بھی ہیں اور اچھائیاں بھی۔ میں سچ بولتا ہوں لیکن بعض اوقات جھوٹ بھی بولتا ہوں۔ نمازیں نہیں پڑھتا لیکن سجدے میں نے کئی دفعہ کیے ہیں۔ کسی زخمی کتے کو دیکھ لوں تو گھنٹوں میری طبیعت خراب رہتی ہے لیکن مجھے ابھی تک اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ میں اُسے اٹھا کر اپنے گھر لے آؤں اور اس کا علاج معالجہ کروں، کسی دوست کو مالی مشکلات میں گرفتار دیکھتا ہوں تو میرے دل کو بہت دکھ ہوتا ہے۔ لیکن میں نے

اکثر ایسے موقعوں پر اُس دوست کی مالی امداد نہیں کی، اس لیے کہ مجھے شراب خریدنا ہوتی تھی۔ مجھے کسی اپاہج لڑکی سے ملنے کا اتفاق ہو تو میرے دل و دماغ میں طوفان برپا ہو جاتا ہے۔ میں اپاہج بن کر اس کی جگہ اختیار کر کے گھنٹوں سوچتا ہوں، اس کی زندگی کے المیے کے متعلق غور و فکر کرتا ہوں، پھر معاً تہیہ کرتا ہوں کہ میں اس سے شادی کرلوں گا۔ مگر یہ تہیہ فوراً غائب ہو جاتا ہے جب میں اس کا ذکر اپنی بیوی سے کرتا ہوں۔

میں افسانہ نگار ہوں۔ میرے تخیلات کی پرواز بہت اونچی ہے لیکن افسوس ہے کہ اونچا اڑ کر پھر ایسا گرتا ہوں کہ پاتال کی انتہائی گہرائیوں تک پہنچ جاتا ہوں اور وہاں اوندھے منہ پڑا سوچتا ہوں کہ جب گرنا ہی تھا تو اُڑنے کا تکلف کیوں کیا۔ لیکن شاید چھوٹے چھوٹے حادثے جو ہم چھوٹے بندوں کی لغزشوں کے باعث ظہور پذیر ہوتے ہیں، مجھے بے حد متاثر کرتے ہیں۔ میں کیلے یا خربوزے کے [وہ؟] چھلکے کبھی برداشت نہیں کر سکتا جو سڑک پر پڑے ہوتے ہیں۔ مجھے اُن لوگوں کی کم عقلی پر رونا آتا ہے جن سے یہ بے پروائی سرزد ہوتی ہے۔

مجھے پھر رونا آتا ہے، جب میں دیکھتا ہوں کہ لوگ اپنے گھر کے چوہے پکڑتے ہیں اور دوسرے محلّے میں چھوڑ آتے ہیں، اپنے گھر کا کوڑا کرکٹ نکالتے ہیں اور جھاڑو سے اپنے ہمسائے کے دروازے کے ساتھ لگا دیتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ یہ سب حماقتیں تعلیم کی کمی کی وجہ سے ہیں۔ جب متفقہ طور پر یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے تو پھر یہ کیا حماقت ہے کہ تعلیم عام نہیں کی جاتی۔ کیا اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ لوگ جن کے ہاتھ میں عوام کو تعلیم دینے کا کام ہے خود تعلیم یافتہ نہیں۔

میں جھنجھلا جھنجھلا جاتا ہوں، جب میں سوچتا ہوں کہ ہمارے حکّام پرلے درجے کے غافل ہیں۔ ایک شخص وزیر بنتا ہے تو اس کے گھر کی طرف جو سڑک جاتی ہے اس پر ہر روز چھڑکاؤ شروع ہو جاتا ہے، اس کی صفائی کا خیال ہر دارو غے کو رکھنا پڑتا ہے لیکن وہ مقامات جہاں صفائی اور چھڑکاؤ کی اشد ضرورت ہے ان کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا۔

ایک وزیر کا حلق گرد و غبار کے باعث خراب ہو جائے یا دوسرے وزیر کو مچھر کاٹ لے، اس سے کیا ہوتا ہے۔ وہ سیکڑوں اور ہزاروں بچے جو گندی موریوں کی تعفّن آمیز فضا میں رہتے ہیں وہ ان وزیروں

سے کہیں زیادہ اہم ہیں — کیونکہ یہی وہ مخلوق ہے جو جنگ کے میدانوں میں اپنے سینے پر گولیاں کھاتی ہے اور فتح و شکست کا فیصلہ کرتی ہے۔

یہ باتیں اتنی واضح اور صاف ہیں کہ ہر شخص جانتا ہے حتیٰ کہ ہمارے حکام بھی۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ افراط و تفریط کیوں ہر جگہ مسلط نظر آتی ہے۔ میں تو بعض اوقات ایسا محسوس کرتا ہوں کہ حکومت اور رعایا کا رشتہ، روٹھے ہوئے خاوند اور بیوی کا رشتہ ہے، بظاہر ہے لیکن درحقیقت کچھ بھی نہیں۔

مجھے بحیثیت افسانہ نگار یہ رشتہ بہت دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ اگر آپ بھی تھوڑی دیر کے لیے غور کریں تو بے شمار دلچسپیاں آپ کو اس میں مل جائیں گی۔ بیوی اپنی من مانی کرتی ہے، شوہر اپنی من مانی، دونوں حقوقِ زوجیت ادا نہیں کرتے لیکن اس کے باوجود زن و شوہر ہیں، آپس میں نکمی باتوں پر جھگڑے ہوتے ہیں، شریک دیکھتے ہیں اور ہنستے ہیں مگر ان کا رشتہ جوں کا توں بودار ہتا ہے۔

حکومت اور رعایا کے باہمی اختلاط سے (جبری اختلاط کہنا صحیح ہوگا) بچے پیدا ہوتے ہیں لیکن بڑے سیفٹی ایکٹ اور آرڈی نینس قسم کے جن کی شکل و شباہت حکومت سے ملتی ہے نہ رعایا سے۔ میں ان کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتا، سوائے اس کے کہ یہ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔

میری سمجھ سے بہت سی چیزیں بالاتر ہیں۔ میں امریکہ کی زر پرستانہ ملک گیری کی ہوس کو سمجھ سکتا ہوں۔ مجھے روس کے ہتھوڑے، اور اس کی درانتی کے نشان کا اصل مفہوم سمجھ میں آ جاتا ہے لیکن یہاں میرے ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے میرے فہم و ادراک سے بالاتر ہے۔ ہوسکتا ہے کہ جو کچھ آج میری نظروں کے سامنے ہو رہا ہے، بہت اونچا ہو لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بہت نیچا ہو۔ بہرحال مجھے اس بات کا ہمیشہ افسوس رہے گا کہ مجھے سمجھانے والا کوئی نہیں ملا۔

امریکہ سے جو فوجی امداد لینے کا معاہدہ ہو رہا ہے اُس کو ایک افسانہ نگار کیا سمجھے گا۔ ترکی سے پاکستان کا جو معاہدہ ہوا ہے اُس پر ایک کہانی لکھنے والا کیا تبصرہ کرسکتا ہے۔ وہ یہ بھی نہیں پوچھ سکتا کہ لیاقت علی خاں کے قتل کی تفتیش کا کیا حشر ہوا۔ اس کو یہ سوال کرنے کی بھی جرأت نہیں ہوسکتی کہ لیاقت علی خاں کے قاتل کو کیا سزا ہوئی کہ آخر وہ بھی انسان تھا جو موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ لیکن وہ یہ تو پوچھ سکتا ہے کہ وہ دو گڑھے جو تار گھر کے اس طرف چوک میں، میکلوڈ روڈ کی طرف جانے والی سڑک کے آغاز پر کھدے ہوئے تھے اُن کا کیا مطلب تھا۔

تمھیں کیوں اعتراض نہیں ہے جب کہ ہمیں ہے...

یوں تو ہمارے اردگرد بے شمار گڑھے ہیں جن کو پُر کرنے کے لیے عمرِ خضر درکار ہے لیکن میں اُن دو گڑھوں کی بات کر رہا تھا جو تار گھر کے اس طرف اُس سڑک کے آغاز پر کھودے گئے تھے یا خود بخود کھد گئے جو رات کی نیم تاریکی میں کارپوریشن، لوگوں کی نگاہوں سے چھپائے رکھتی تھی۔

پاکستان میں اپنا صحیح مقام میں ابھی تک معلوم نہیں کر سکا۔ لیکن بزعم خود یہ سمجھتا ہوں کہ میری شخصیت بہت بڑی ہے۔ اردو ادب میں میرا نام بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے (یہ خوش فہمی نہ ہو تو زندگی اور بھی اجیرن ہو جائے) اسی لیے چند روز پہلے مجھے اُن گڑھوں کی اہمیت معلوم ہوئی جو بظاہر غیر ضروری معلوم ہوتے تھے لیکن درحقیقت بہت ضروری تھے۔

غیر ضروری اس لیے تھے کہ ان کے بغیر بھی لوگ زخمی ہو سکتے تھے، یہ نہ ہوتے جب بھی یہاں شکست و ریخت کا سلسلہ جاری رہتا، ضروری اس لیے تھے کہ ان کی موجودگی سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ کارپوریشن کے بغیر بھی کام چل سکتا ہے۔

عرصہ ہوا، مجھے محکمۂ آبادکاری کی طرف سے یہ نوٹس موصول ہوا تھا کہ تم غیر ضروری آدمی ہو اس لیے وہ مکان جو تمھیں الاٹ کیا گیا ہے خالی کر دو۔ میرا خیال ہے کہ یہ نوٹس بالکل غیر ضروری تھا۔ اس لیے کہ جب تک سڑکوں پر غیر محفوظ گڑھے موجود ہیں، غیر ضروری انسانوں کو انخلا کا حکم دینے کا سوال بہت مضحکہ خیز ہے۔

کہ میکلوڈ روڈ کی طرف سے بیڈن روڈ چلنا چاہیے کہ راستے میں پھلوں کی دکان آتی ہے جہاں سے میں عموماً اپنی بچیوں کے لیے مالٹے وغیرہ لیا کرتا ہوں۔

تانگے نے جب تار گھر کے اس طرف میکلوڈ روڈ کا رخ کیا تو رات کے دھندلکے میں دفعتاً مجھے دو بڑے بھیانک گڑھے نظر آئے، مجھے حیرت ہے کہ یہ کیسے دکھائی دیے اس لیے کہ مجھے اندھ راتا کا مرض ہے۔ مجھے رات کے اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ میں ایک دم چلّایا۔ کوچوان نے میری چیخ سن کر باگیں کھینچیں۔ گھوڑا کچھ اس طرح رکا کہ تانگا دو گز پیچھے چلا گیا۔

اگر گھوڑے کا قدم ایک فٹ آگے بڑھ جاتا تو معلوم نہیں کیا ہوتا۔ تانگے والے نے مجھے ہزار ہزار دعائیں دیں کہ اس کا گھوڑا اپاہج ہونے سے بچ گیا اس۔ لیے کہ سو قدم کے فاصلے پر ایک شکستہ تانگا پڑا تھا جس کا گھوڑا زخمی حالت میں کراہ رہا تھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ پاکستان کا سب سے بڑا افسانہ نگار بچ گیا۔ اُس وقت مجھے قوم کے نقصان کا خیال تھا۔ یہ احساس مطلق نہیں تھا کہ میری بیوی ہے، میری تین بچیاں ہیں۔ مجھے اُس وقت صرف یہ خیال تھا کہ میں قوم کا سرمایہ ہوں جو تباہ و برباد ہونے سے بچ گیا ہے حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ میری موت ایک غیر ضروری انسان کی موت ہوتی۔ چند عزیزوں اور دوستوں کی آنکھیں ضرور نمناک ہوتیں مگر اس ملک کی ایک آنکھ بھی آنسو سے بھر نہ آتی جس کا سرمایہ میں خود کو سمجھتا ہوں (۳۴)

میرا ملک ہندوستان سے کٹ کر کیوں بنا، کیسے آزاد ہوا، یہ تو آپ کو اچھی طرح معلوم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں خط لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں کیونکہ جس طرح میرا ملک کٹ کر آزاد ہوا اسی طرح میں کٹ کر آزاد ہوا ہوں اور چچا جان! یہ بات تو آپ جیسے ہمہ داں عالم سے چھپی ہوئی نہیں ہونی چاہیے کہ جس پرندے کو پر کاٹ کر آزاد کیا جائے گا اُس کی آزادی کیسی ہوگی۔ خیر اس قصے کو چھوڑیے۔

میرا نام سعادت حسن منٹو ہے اور میں ایک ایسی جگہ پیدا ہوا تھا جو اَب ہندوستان میں ہے۔ میری ماں وہاں دفن ہے، میرا باپ وہاں دفن ہے، میرا پہلا بچہ بھی اُسی زمین میں سو رہا ہے لیکن اب وہ میرا وطن نہیں، میرا وطن اب پاکستان ہے جو میں نے انگریزوں کے غلام ہونے کی حیثیت میں پانچ چھ مرتبہ دیکھا تھا۔

میں پہلے سارے ہندوستان کا ایک بڑا افسانہ نگار تھا۔ اب پاکستان کا ایک بڑا افسانہ نگار ہوں۔ میرے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ لوگ مجھے عزت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ سالم ہندوستان میں مجھ پر تین مقدمے چلے تھے۔ یہاں پاکستان میں ایک، لیکن اِسے ابھی بنے کے برس ہوئے ہیں۔

انگریزوں کی حکومت بھی مجھے فحش نگار سمجھتی تھی، میری اپنی حکومت کا بھی میرے متعلق یہی خیال ہے۔ انگریزوں کی حکومت نے مجھے چھوڑ دیا تھا لیکن میری اپنی حکومت مجھے چھوڑتی نظر نہیں آتی۔ عدالتِ ماتحت نے مجھے تین ماہ قید بامشقت اور تین سو روپے جرمانے کی سزا دی تھی۔ سیشن میں اپیل کرنے پر میں بری ہو گیا۔ مگر میری حکومت سمجھتی ہے کہ اس کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے چنانچہ اب اس نے ہائی کورٹ میں اپیل کی ہے کہ سیشن کے فیصلے پر نظر ثانی کرے اور مجھے قرار واقعی سزا دے — دیکھیے عدالتِ عالیہ کیا فیصلہ دیتی ہے۔

میرا ملک آپ کا ملک نہیں، اس کا مجھے افسوس ہے۔ اگر عدالتِ عالیہ مجھے سزا دے دے تو میرے ملک میں ایسا کوئی پرچہ نہیں جو میری تصویر چھاپ سکے، میرے تمام مقدموں کی روداد کی تفصیل چھاپ سکے۔

میرا ملک بہت غریب ہے، اس کے پاس آرٹ پیپر نہیں ہے، اس کے پاس اچھے چھاپے خانے نہیں ہیں۔ اس کی غربت کا سب سے بڑا ثبوت میں ہوں۔ آپ کو یقین نہیں آئے گا چچا جان! بیس بائیس کتابوں کا مصنف ہونے کے بعد بھی میرے پاس رہنے کے لیے اپنا مکان نہیں۔ اور یہ سن کر تو آپ حیرت میں غرق ہو جائیں گے کہ میرے پاس سواری کے لیے کوئی پیکارڈ ہے نہ ڈوج، سکینڈ ہینڈ موٹر کار بھی نہیں۔

مجھے کہیں جانا ہو تو سائیکل کرایے پر لیتا ہوں، اخبار میں اگر میرا کوئی مضمون چھپ جائے اور سات روپے فی کالم کے حساب سے مجھے بیس پچیس روپے مل جائیں تو میں تانگے پر بیٹھتا ہوں اور اپنے یہاں کی کشید کردہ شراب بھی پیتا ہوں۔ یہ ایسی شراب ہے کہ اگر آپ کے ملک میں کشید کی جائے تو آپ اُس ڈسٹلری کو ایٹم بم سے اڑا دیں کیونکہ ایک برس کے اندر اندر ہی یہ خانہ خراب انسان کو نیست و نابود کر دیتی ہے...(۳۵)

عرصہ ہوا میں نے آپ کی خدمت میں ایک خط ارسال کیا تھا — آپ کی طرف سے تو اس کی کوئی

نہیں، شام کو میرے غریب خانے پر تشریف لائے، اُن کے ساتھ ایک سودیشی نوجوان بھی تھے، اُن صاحبان سے جو گفتگو ہوئی وہ میں مختصراً بیان کر دیتا ہوں۔

اُن صاحب سے انگریزی میں مصافحہ ہوا۔ مجھے حیرت ہے چچا جان کہ وہ انگریزی بولتے تھے، امریکی نہیں جو میں ساری عمر نہیں سمجھ سکتا۔

بہرحال ان سے آدھ پون گھنٹہ باتیں ہوئیں۔ وہ مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئے، جس طرح ہر امریکی، پاکستانی یا ہندوستانی سے مل کر خوش ہوتا ہے — میں نے بھی یہی ظاہر کیا کہ مجھے بڑی مسرت ہوئی ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مجھے سفید فام امریکنوں سے مل کر کوئی راحت یا مسرت نہیں ہوتی...

بات کہاں سے نکلی تھی، کہاں چلی گئی — میں اس کی معذرت نہیں چاہتا کہ آپ ایسی ہی تحریر پسند کرتے ہیں۔

کہنا یہ تھا کہ آپ کے وہ صاحب جو یہاں کے قونصل خانے سے وابستہ ہیں، میرے پاس تشریف لائے اور مجھ سے درخواست کی کہ میں ان کے لیے ایک افسانہ لکھوں۔ میں بہت متحیر ہوا۔ اس لیے کہ مجھے انگریزی میں لکھنا آتا ہی نہیں۔ میں نے ان سے عرض کی: ''جناب میں اردو زبان کا رائٹر ہوں — میں انگریزی لکھنا نہیں جانتا۔''

انھوں نے فرمایا: ''مجھے اردو میں چاہیے — ہمارا ایک پرچہ ہے جو اردو میں شائع ہوتا ہے۔''

میں نے اس کے بعد مزید تفتیش کی ضرورت نہ سمجھی اور کہا: ''میں حاضر ہوں۔''

اور خدا واحد و ناظر ہے کہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ آپ کے کہنے پر تشریف لائے ہیں۔ آپ نے انھیں میرا وہ خط پڑھا دیا تھا جو میں نے آپ کو لکھا تھا۔

خیر، اس قصے کو چھوڑیے — جب تک پاکستان کو گندم کی ضرورت ہے میں آپ سے کوئی گستاخی نہیں کر سکتا — ویسے بحیثیت پاکستانی ہونے کے (حالانکہ میری حکومت مجھے اطاعت گزار نہیں سمجھتی) میری دعا ہے کہ خدا کرے کبھی آپ کو بھی باجرے اور 'بنک سنک کے ساگ' کی ضرورت پڑے اور میں اگر اس وقت زندہ ہوں تو آپ کو بھیج سکوں۔

اب سنیے کہ اُن صاحب نے جن کو آپ نے بھیجا تھا مجھ سے پوچھا: ''آپ ایک افسانے کے کتنے

ابھی تک نصیب نہیں ہوا۔

لیکن اُس روز میں نے ایک مبتدی کے طور پر جھوٹ بولا اور ان سے کہا: ''میں ایک افسانے کے لیے دو سو روپے لوں گا۔''

اب حقیقت یہ ہے کہ یہاں کے ناشر مجھے ایک افسانے کے لیے زیادہ سے زیادہ چالیس پچاس روپے دیتے ہیں۔ میں نے 'دو سو روپے' تو کہہ دیا لیکن مجھے اس احساس سے اندرونی طور پر سخت ندامت ہوئی کہ میں نے اتنا جھوٹ کیوں بولا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔

لیکن چچا جان مجھے سخت حیرت ہوئی، جب آپ کے بھیجے ہوئے صاحب نے بڑی حیرت سے (معلوم نہیں، وہ مصنوعی تھی یا اصلی) فرمایا: ''صرف دو سو روپے — کم از کم ایک افسانے کے لیے پانچ سو روپے تو ہونے چاہییں!''

اب میں حیرت زدہ ہو گیا کہ ایک افسانے کے لیے پانچ سو روپے! — یہ تو میرے خواب و خیال میں بھی نہیں آ سکتا تھا — لیکن میں اپنی بات سے کیسے ہٹ سکتا تھا — چنانچہ میں نے چچا جان، ان سے کہا: ''صاحب دیکھیے، دو سو روپے ہی ہوں گے — بس اب آپ اس کے متعلق زیادہ گفتگو نہ کیجیے۔''

وہ چلے گئے — شاید اس لیے کہ وہ سمجھ چکے تھے کہ میں نے پی رکھی ہے — وہ شراب جو میں پیتا ہوں، اس کا ذکر میں اپنے پہلے خط میں کر چکا ہوں۔

چچا جان، مجھے حیرت ہے کہ میں اب تک زندہ ہوں — حالانکہ مجھے پانچ برس ہو گئے ہیں، یہاں کا کشیدہ زہر پیتے ہوئے — میرا خیال ہے اگر آپ یہاں تشریف لائیں تو میں آپ کو یہ زہر پیش کروں گا۔ اُمید ہے آپ بھی میری طرح حیرت انگیز طور پر زندہ رہیں گے اور آپ کی پانچ آزادیاں بھی سلامت رہیں گی۔

خیر — اس قصے کو چھوڑیے — دوسرے روز صبح سویرے جبکہ میں برآمدے میں شیو کر رہا تھا۔ آپ کے وہی صاحب تشریف لائے۔ مختصری بات چیت ہوئی۔ انھوں نے مجھ سے فرمایا: ''دیکھیے دو سو کی رٹ چھوڑیے — تین سو لے لیجیے۔''

''میں نے آپ سے سو روپے زیادہ وصول لیے ہیں۔۔۔ لیکن یہ ...
وہ آپ کی مرضی کے مطابق نہیں ہوگا۔ اِس کے علاوہ اُس میں کسی قسم کے ردّ و بدل کا حق بھی میں آپ کو نہیں دوں گا۔''

وہ چلے گئے۔۔۔ پھر نہیں آئے۔ چچا جان! اگر آپ کے پاس پہنچے ہوں اور انھوں نے آپ کو کوئی رپورٹ پہنچائی ہو تو ازراہِ کرم اپنے پاکستانی بھتیجے کو اس سے ضرور مطلع فرماویں۔

میں وہ تین سو روپے خرچ کر چکا ہوں۔ اگر آپ واپس لینا چاہیں تو میں ایک روپیہ ماہوار کے حساب سے ادا کر دوں گا...(۳۶)

بہت مدت کے بعد آپ کو مخاطب کر رہا ہوں۔ میں دراصل بیمار تھا۔ علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز تھا ساقی۔ مگر معلوم ہوا کہ یہ محض شاعری ہی شاعری ہے۔ معلوم نہیں ساقی کس جانور کا نام ہے۔ آپ لوگ تو اُسے عمر خیام کی رباعیوں والی حسین، فتنہ ادا اور عشوہ طراز معشوقہ کہتے ہیں جو بلور کی نازک گردن صراحیوں سے، اُس خوش قسمت شاعر کو جام بھر بھر کے دیتی تھی۔ مگر یہاں تو کوئی مونچھوں والا بدشکل لونڈا بھی اس کام کے لیے نہیں ملتا۔

یہاں سے حسن بالکل رفو چکر ہو گیا ہے۔ عورتیں پردے سے باہر تو آئی ہیں مگر انھیں دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ وہ پردے کے پیچھے ہی رہتیں تو اچھا تھا۔ آپ کے میکس فیکٹر نے ان کا حلیہ اور بھی مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔۔۔ آپ مفت گندم بھیجتے ہیں، مفت لٹریچر بھیجتے ہیں، مفت ہتھیار بھیجتے ہیں، کیوں نہیں آپ سو دو سو ہٹیٹ امریکی لڑکیاں یہاں روانہ کر دیتے جو ساقی گری کے فرائض بطریقِ احسن انجام دیں۔

میں اپنی بیماری کا ذکر کر رہا تھا۔۔۔ اس کا باعث وہی خانہ ساز شراب تھی۔۔۔ اللہ اس خانہ خراب کا خانہ خراب کرے، زہر ہے لیکن نہایت خام قسم کا...

تین مہینے ہسپتال میں رہا ہوں۔ جنرل وارڈ میں تھا۔ مجھے وہاں آپ کی کوئی امریکی امداد نہ ملی میرا خیال ہے آپ کو میری بیماری کی کوئی اطلاع نہیں ملی۔ ورنہ آپ ضرور وہاں سے دو تین پٹیاں ٹیرامائی سین کی روانہ کر دیتے اور ثوابِ دارین حاصل کرتے۔

سے کوئی دلچسپی نہیں، آخر:

کس کس کی حاجت روا کرے کوئی

ہماری پچھلی مرحوم گورنمنٹ تھی، جنگ شروع ہوئی تو انگریز بہادر نے فردوسیِ اسلام حفیظ جالندھری کو سونگ پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ کا ڈائریکٹر بنا کر ایک ہزار روپیہ ماہوار مقرر کر دیا۔ پاکستان بنا تو اُس کو صرف ایک کوٹھی اور شاید ایک پریس الاٹ ہوا۔ اب بے چارہ اخباروں میں اپنا رونا رو رہا ہے کہ ترانہ کمیٹی نے اس کو نکال باہر کیا۔ حالانکہ سارے پاکستان میں اکیلا وہی شاعر ہے جو دنیا کی اِس سب سے بڑی اسلامی سلطنت کے لیے قومی ترانہ لکھ سکتا ہے اور اُس کی دھن بھی تخلیق کر سکتا ہے۔

اُس نے اپنی انگریز بیوی کو طلاق دے دی ہے، اس لیے کہ انگریزوں کا زمانہ ہی نہیں رہا۔ اب سنا ہے کسی امریکی بیوی کی تلاش میں ہے۔ چچا جان! خدا کے لیے اس کی مدد کیجیے، ایسا نہ ہو کہ غریب کی عاقبت خراب ہو۔

آپ کے یوں تو لاکھوں اور کروڑوں بھتیجے ہیں لیکن مجھ ایسا بھتیجا آپ کو ایٹم بم کی روشنی میں بھی کہیں نہیں ملے گا۔ قبلہ کبھی اِدھر بھی توجہ کیجیے، بس آپ کی ایک نظرِ التفات کافی ہے۔ صرف اتنا اعلان کر دیجیے کہ آپ کا ملک (خدا اُسے رہتی دنیا تک سلامت رکھے) صرف اُسی صورت میں میرے ملک کو (خدا اِس کے شراب کشید کرنے والے کارخانوں کو نیست و نابود کرے) فوجی امداد دینے کے لیے تیار ہوگا اگر سعادت حسن منٹو آپ کے حوالے کر دیا جائے۔

یہاں میری وقعت ایک دم بہت بڑھ جائے گی۔ میں اس اعلان کے بعد شمع معمے اور ڈائریکٹر معمے حل کرنا بند کر دوں گا۔ بڑی بڑی شخصیتیں میرے غریب خانے پر آئیں گی۔ میں آپ سے بذریعہ ہوائی ڈاک، ٹھیٹ امریکی مسکراہٹ منگوا کر اپنے ہونٹوں پر لگالوں گا اور اُس کے ساتھ اُن کا استقبال کروں گا...(۳۷)

...معاف کیجیے گا، میں اس وقت عجیب مخمصے میں گرفتار ہوں۔ میرے پچھلے خط کی رسید مجھے ابھی تک نہیں ملی، کیا وجہ ہے؟ ـــ یہ میرا اچھا خط تھا۔ میں نے خود پوسٹ کرایا تھا۔ حیرت ہے کہاں گم ہو گیا...
جہاں تک میں سمجھتا ہوں ساری کارستانی روس کی ہے اور اس میں بھارت کا بھی ہاتھ ہے۔ پچھلے

دنوں لکھنؤ میں آپ کے اِس برخوردار بھتیجے پر ایک 'سمپوزیم' ہوا تھا، اُس میں کسی نے کہا کہ میں آپ کے امریکہ کے لیے اپنے پاکستان میں زمین ہموار کر رہا ہوں۔

کتنی تُچی بات ہے، ابھی تک آپ نے بل ڈوزر تو بھیجے نہیں اور یہ ساری دنیا جانتی ہے۔ میں بھارت کے اُس عقل کے اندھے سے پوچھتا ہوں کہ میں امریکہ کے لیے پاکستان میں زمین کس چیز سے ہموار کر رہا ہوں؟— اپنے سر سے؟

میری باتیں بہت دیر کے بعد آپ کی سمجھ میں آتی ہیں، صرف اس لیے کہ آپ ہائیڈروجن بموں کے تجربات میں مصروف ہیں۔ آپ کو دین کا ہوش ہے نہ دنیا کا۔ قبلہ ان بموں کو چھوڑیے!— یہ کوئی معمولی بات نہیں کہ میرا اچھا خط، کمیونسٹ بالا بالا لے اُڑیں۔

میرے بس میں ہوتا تو میں ان شرارت پسندوں کے ایسے کان اینٹھتا کہ بلبلا اٹھتے، مگر مصیبت یہ ہے کہ میں — اب میں آپ کو کیا بتاؤں، یہاں کے سارے بڑے بڑے کمیونسٹ میرے دوست ہیں۔ مثال کے طور پر احمد ندیم قاسمی، سبطِ حسن، عبداللہ ملک (حالانکہ مجھے اس سے نفرت ہے، بڑا گھٹیا قسم کا کمیونسٹ ہے) فیروز الدین منصور، احمد راہی، حمید اختر، نازش کاشمیری اور پروفیسر صفدر۔

چچا جان، میں اِن لوگوں کے سامنے چوں نہیں کر سکتا، اس لیے کہ میں ان سے آئے دن قرض لیتا رہتا ہوں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مقروض قرض خواہ کے سامنے کچھ بول نہیں سکتا۔ آپ نے مجھے قرض تو کبھی نہیں دیا۔ البتہ شروع شروع میں جب میں نے آپ کو پہلا خط لکھا تھا تو اُس سے متاثر ہو کر آپ نے خیر سگالی کے طور پر مجھے مالی امداد بھیجی تھی، یعنی تین سو روپے دیے تھے۔ اور میں نے آپ کے اس جذبے سے متاثر ہو کر دل میں عہد کر لیا تھا کہ عمر بھر آپ کا ساتھ دوں گا۔ مگر آپ نے میرے اس جذبے کی داد نہ دی اور مالی امداد کا سلسلہ بند کر دیا۔

پیارے چچا جان! مجھے بتایئے کہ مجھ سے کون سا گناہ سرزد ہوا ہے کہ آپ مجھے سزا دے رہے ہیں۔ لاہور میں جو آپ کا دفتر ہے اُس کے چپڑاسی بھی مجھ سے سیدھے منہ بات نہیں کرتے۔ دو تین جونیئر افسر جو میرے پاکستانی بھائی ہیں اُن میں آپ نے ایسے سرخاب کے پر لگا دیے ہیں کہ وہ میرا نام سنتے ہی مجھے گالیاں دینا شروع کر دیتے ہیں۔

آخر میرا قصور؟— میں نے اگر خلوص نیتی سے تسلیم کیا کہ آپ نے میری مالی امداد کی ہے تو اس

میں انھوں نے کیا قباحت دیکھی۔ بھارت کو آپ کروڑوں ڈالر دے چکے ہیں، وہ تسلیم کرتا ہے۔ میرے پاکستان کو آپ نے مفت گندم بھیجا، یہ غریب بھی تسلیم کرتا ہے۔ کراچی میں ہم لوگوں نے اونٹوں کا جلوس نکالا اور با قاعدہ اشتہار بازی کی کہ آپ نے ہم پر بہت بڑا کرم کیا ہے۔ یہ جدا بات ہے کہ آپ کا بھیجا ہوا گندم ہضم کرنے کے لیے ہمیں اپنے معدے امریکیانے پڑے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا، آپ بھارت کو اربوں ڈالر قرض دے رہے ہیں، پاکستان کو فوجی امداد دینے کا بھی آپ نے وعدہ کیا ہے لیکن میرا وظیفہ کیوں نہیں لگا دیتے۔ لوگ کیا کہیں گے کہ پاکستان کے اتنے بڑے افسانہ نگار کو صرف تین سو روپلّیاں دے کر آپ نے ہاتھ روک لیا۔ یہ میری ہتک ہے اور آپ کی بھی۔ اگر آپ وظیفہ نہیں دینا چاہتے تو نہ دیں۔ قرض میں کیا مضائقہ ہے، ازراہِ کرم فوراً ایک لاکھ ڈالر مجھے قرض دے ڈالیے تاکہ میں اطمینان کے دو سانس لے سکوں۔

آغا خاں کو تو آپ جانتے ہی ہوں گے کیونکہ وہ بھی بہت بڑا سرمایہ دار ہے، اُس کی حال ہی میں پلیٹی نم جُبلی منائی گئی تھی۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میری بھی ایک جُبلی ہو جائے۔ آپ میرے پیارے پیارے، بہت ہی پیارے چچا ہیں۔ آپ سے جو چلے نہ بگھاروں تو کیا اپنے ملک کے وزیر اعظم محمد علی صاحب سے بگھاروں گا — خدا کے لیے میری ایک جُبلی کر ڈالیے تاکہ قبر میں میری روح بے چین نہ رہے۔

پاکستان — میرا پاکستان، اپنے فن کاروں کی قدر دانی میں غافل نہیں۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ مجھ سے جو زیادہ حق دار ہیں ان کی فہرست بہت لمبی ہے۔ پچھلے دنوں میری حکومت نے خان بہادر محمد عبدالرحمان چغتائی کے لیے پانچ سو روپے ماہوار تاحیات کا وظیفہ مقرر کیا، خان بہادر صاحب اللہ کے فضل سے صاحب جائیداد ہیں اس لیے وہ مجھ سے کہیں زیادہ مستحق تھے۔ اس کے بعد خان بہادر ابوالاثر حفیظ جالندھری صاحب کے لیے بھی تاحیات اتنا ہی وظیفہ منظور کیا گیا، اس لیے کہ وہ بھی صاحبِ ثروت ہیں۔

میری باری خدا معلوم کب آئے گی، اس لیے کہ میں الاٹ شدہ مکان میں رہتا ہوں جس کا کرایہ بھی میں ادا نہیں کر سکتا۔

بہت سے مستحق اصحاب پڑے ہیں۔ مثال کے طور پر میاں بشیر احمد بی۔ اے، آکسن، مدیر ماہنامہ 'ہمایوں' (سابق سفیر ترکی) سید امتیاز علی تاج، مسٹر اکرام پی سی ایس، فضل احمد کریم فضلی وغیرہ وغیرہ، ان کا نمبر پہلے آتا ہے اس لیے کہ ان کو کسی وظیفے کی احتیاج نہیں۔ لیکن میری حکومت کا دل صاف ہے، وہ

خدمات دیکھتی ہے دولت نہیں دیکھتی۔

ویسے میں نے کون سا اتنا بڑا کام کیا ہے جو اِن لوگوں کو چھوڑ کر میری حکومت اپنی توجہ میری طرف منعطف کرے اور ایمان کی بات تو یہ ہے کہ میں صرف اس بل بوتے پر کہ میں آپ کا بھتیجا ہوں آپ سے درخواست کر رہا ہوں کہ میری کوئی جُبلی کر ڈالیے۔

میری زندگی کے دن بہت کم ہیں۔ آپ کو دکھ تو ہوگا مگر میں کیا کہوں، اس اختصار کا باعث آپ کی ذاتِ شریف ہے۔ اگر آپ کو میری صحت کا خیال ہوتا تو آپ اور کچھ نہیں تو کم از کم وہاں سے الزبتھ ٹیلر ہی کو میرے پاس بھیج دیتے کہ وہ میری تیمارداری کرتی، معلوم نہیں آپ کیوں اتنی غفلت برت رہے ہیں، کیا آپ میری موت چاہتے ہیں؟...(۳۸)

فارغ مجھے نہ جان کہ مانندِ صبح و مہر
ہے داغِ عشق زینتِ جیبِ کفن ہنوز

جی چاہتا ہے آج آپ سے — اپنی تحریریں پڑھنے والوں سے، تمام 'مقدمائی اور دیباچائی' تکلفات برطرف رکھ کے باتیں کروں۔ یوں تو میرے افسانوں، ڈراموں اور نیم افسانوی مضمونوں میں بھی اکثر ایسی باتیں ہوتی ہیں جن کا تعلق براہِ راست میرے دل و دماغ کے اُس خانے سے ہوتا ہے جو عام طور پر انسان کی اپنی ذات کے لیے مخصوص ہوتا ہے لیکن اُن پر چوکھٹا چونکہ افسانے کا ہوتا ہے اس لیے آپ انھیں اُسی شکل میں دیکھتے رہے ہیں۔

آج میرا دل بہت افسردہ ہے۔ ایک عجیب سا اضمحلال اس پر چھایا ہوا ہے۔ چار ساڑھے چار برس پہلے جب میں نے اپنے دوسرے وطن بمبئی کو خیر باد کہی تھی تو میرا دل اسی طرح مغموم تھا۔ مجھے وہ جگہ چھوڑنے کا صدمہ تھا جہاں میں نے اپنی زندگی کے بڑے پُر مشقت دن گزارے تھے۔ اُس خطۂ زمین نے مجھ ایسے آوارہ اور خاندان کے دھتکارے ہوئے انسان کو اپنے دامن میں جگہ دی تھی۔ اُس نے مجھ سے کہا تھا: تم یہاں دو پیسے روزانہ پر بھی خوش رہ سکتے ہو اور دس ہزار روپے روزانہ پر بھی۔ اگر تم چاہو تو دونوں صورتوں میں دنیا کے مغموم ترین انسان کی زندگی بسر کر سکتے ہو۔ یہاں تم جو چاہو کرو، تمہاری عیب جوئی کوئی نہیں کرے گا۔ یہاں تمھیں کوئی ناصح بھی نہیں ملے گا۔ ہر کٹھن کام تمھیں خود کرنا ہوگا۔ اپنی زندگی کا ہر اہم فیصلہ تمھیں خود ہی کرنا پڑے گا۔ تم فٹ پاتھ پر رہو یا کسی عالیشان محل میں اس

پاکستان میں موجود ہوں۔ یہاں سے کہیں اور چلا گیا تو وہاں بھی موجود رہوں گا۔ میں چلتا پھرتا بمبئی ہوں۔ جہاں بھی قیام کروں گا وہیں میرا اپنا جہان آباد ہو جائے گا۔

بمبے چھوڑنے کے بعد میں افسردہ تھا۔ میرے وہاں دوست تھے جن کی دوستی پر مجھے ناز ہے۔ وہاں میری شادی ہوئی۔ وہیں میرا پہلا بچہ ہوا۔ دوسرے نے بھی اپنی زندگی کا پہلا دن وہیں شروع کیا۔ میں نے وہاں چند روپوں سے لے کر ہزاروں لاکھوں تک کمائے اور خرچ کیے۔ مجھے اُس سے محبت تھی اور آج بھی ہے۔

ملک کے بٹوارے سے جو انقلاب برپا ہوا اُس سے میں ایک عرصے تک باغی رہا اور اب بھی ہوں لیکن بعد میں اس خوفناک حقیقت کو میں نے تسلیم کرلیا مگر اس طرح کہ مایوسی کو میں نے اپنے پاس تک نہ آنے دیا۔

میں نے اُس خون کے سمندر میں غوطہ لگایا جو انسان نے انسان کی رگوں سے بہایا تھا اور چند موتی چن کر لایا، عرقِ انفعال کے، مشقت کے جو اُس نے اپنے بھائی کے خون کا آخری قطرہ بہانے میں صرف کی تھی؛ اُن آنسوؤں کے جو اس جھنجھلاہٹ میں کچھ انسانوں کی آنکھوں سے نکلے تھے کہ وہ اپنی انسانیت کیوں ختم نہیں کر سکے — یہ موتی میں نے اپنی کتاب 'سیاہ حاشیے' میں پیش کیے۔

میں انسان ہوں، وہی انسان جس نے انسانیت کی عصمت دری کی تھی، جس نے فنا کو بادۂ ہر جام بنایا تھا، جس نے دوسری اجناس کی طرح انسان کے گوشت پوست کو دکانوں میں سجا سجا کر بیچا تھا، میں وہی انسان ہوں جس نے پیغمبری کا رتبہ حاصل کیا اور میں وہی انسان ہوں جس نے پیغمبروں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے — مجھ میں وہ تمام کمزوریاں اور خوبیاں موجود ہیں جو دوسرے انسانوں میں ہیں۔ یقین مانیے کہ مجھے اُس وقت دکھ ہوا، بہت بڑا دکھ، جب میرے چند ہم عصروں نے میری اس کوشش کا مضحکہ اڑایا، مجھے لطیفہ باز، یاوہ گو، سنکی، نامعقول اور رجعت پسند کہا گیا۔ میرے ایک عزیز دوست نے تو یہاں تک کہا کہ میں نے لاشوں کی جیبوں میں سے سگریٹ کے ٹکڑے، انگوٹھیاں اور اسی قسم کی دوسری

چیزیں نکال نکال کر جمع کی ہیں۔ اُس عزیز نے میرے نام ایک کُھلی چٹھی بھی شائع کی، وہ بڑی آسانی سے مجھے خود دے سکتے تھے۔ اُس میں بھی انھوں نے 'سیاہ حاشیے' کی تضحیک میں کھلے طور پر قلمکاری کی۔

میں انسان ہوں، مجھے غصہ آیا۔ میں نے اُس عالم میں اس کیچڑ کے جواب میں ایسی کیچڑ تیار کی جو بہت دیر تک میرے نام نہاد نقادوں کے چہروں پر جمی رہتی۔ لیکن میں نے سوچا اور محسوس کیا کہ ایسا کرنا غلطی ہے۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دینا انسان کی خصلت ہے، اس میں کوئی شک نہیں۔ لیکن خاموش رہنا اُس کی دانش مندی ہے، اُس کا تحمل ہے، اُس کی بُردباری ہے۔

مجھے غصہ تھا۔ اس کا نہیں کہ الف نے مجھے کیوں غلط سمجھا۔ مجھے غصہ تھا اس بات کا کہ الف نے محض فیشن کے طور پر ایک سقیم و عقیم تحریک کی انگلی پکڑ کر، بیرونی سیاست کے مصنوعی ابرو۔ کے اشارے پر، میری نیت پر شک کیا اور مجھے اُس کسوٹی پر پرکھا جس پر صرف 'سرخی' ہی سونا تھی۔

مجھے غصہ تھا کہ اِن لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ یہ کیسے ترقی پسند ہیں جو تنزل کی طرف جاتے ہیں۔ یہ ان کی سرخی کیسی ہے جو سیاہی کی طرف دوڑتی ہے۔ یہ ان کی مزدور دوستی کیا ہے جو مزدور کو پسینہ بہانے سے پہلے ہی مزدوری کے مطالبے پر اکسار ہی ہے۔ یہ ان کی سرمائے کے خلاف محنت کی مبارزت کس قسم کی ہے کہ یہ خود سرمائے سے مسلح ہونا چاہتے ہیں اور اپنے محبوب ہتھیار درانتی اور ہتھوڑا اپنے مخالفوں کے ہاتھ میں دے رہے ہیں۔ یہ ان کا ادب میں کس قسم کا اجتہاد ہے کہ غزل کو مشین اور مشین کو غزل بنانے کے منصوبے سوچے جا رہے ہیں۔

مجھے غصہ تھا ان کے آئے دن کے منشوروں پر، ان کی طویل طویل قراردادوں پر، ان کے مختلف بیانوں پر جن کا مسالہ براہِ راست روس کے کریملن سے بمبئی کی کھیت واڑی میں آتا تھا اور وہاں سے میکلوڈ روڈ پہنچتا تھا۔ روس کے فلاں شاعر نے یہ کہا ہے — روس کے فلاں افسانہ نگار کا یہ بیان ہے — روس کے فلاں دانشور نے یہ دانش مندانہ بات کہی ہے — مجھے غصہ آتا تھا۔ یہ لوگ اُس خطہ ارض کی بات کیوں نہیں کرتے جس پر کہ خود سانس لیتے ہیں۔ اگر ہم نے دانش ور پیدا کرنے بند کر دیے ہیں تو اس بانجھ پن کا علاج کیا سرخ تخم ریزی ہی باقی رہ گیا ہے۔

مجھے غصہ تھا اس لیے کہ میری بات کوئی بھی نہیں سنتا تھا۔ تقسیم ملک کے بعد ملک میں افراط و تفریط کا عالم تھا۔ جس طرح لوگ مکان اور ملیں الاٹ کروا رہے تھے اسی طرح وہ بلند مقاموں پر بھی قبضہ کرنے

کی جدوجہد میں مصروف تھے۔
حالات وہ نہیں رہیں گے جو پہلے تھے۔ پرانی پگڈنڈیاں بڑی سڑکیں بنیں گی یا ان کا وجود ہی مٹ جائے
گا، اس کے متعلق وثوق سے اُس وقت کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ غیر کی حکومت اور اپنوں کی حکومت میں
کیا فرق ہوگا، اس کے بارے میں بھی حتمی طور پر کوئی قیاس آرائی نہیں ہو سکتی تھی۔ فضا کیسی ہوگی اور اُس
میں خیالات واحساسات کی صحیح نشوونما کیونکر ہوگی، ریاست اور حکومت سے فرد اور جماعت کا رشتہ کیسا ہوگا؛
یہ ایسی باتیں تھیں جن پر انتہائی غور وفکر کی ضرورت تھی۔ یہ کام ایسا تھا جس میں ہمیں بیرونی نسخوں پر عمل نہیں
کرنا چاہیے تھا۔ لیکن افسوس کہ ہمارے نام نہاد دانش وروں نے بڑی جلدی بازی سے کام لیا اور قیادت
کے شوق میں اپنا نیم رس جو ہر پیال میں ڈال دیا جہاں وہ عدم نگہداشت کے باعث گلنے سڑنے لگا۔

ادب کے ان ترقی پسند ٹھیکے داروں نے پہلے فیصلہ کیا کہ ان کی جماعت کا کوئی رکن سرکاری پرچے
میں کام کرے گا نہ اُس کے لیے لکھے گا۔ میں نے اس کی مخالفت کی اور ان کو سمجھایا کہ یہ اقدام صریحاً غلط
ہے۔ غلط ہی نہیں بلکہ مضحکہ خیز ہے اس لیے کہ یہ فیصلہ اُس احتمال پر چغلی کھاتا تھا جو ترقی پسند مصنّفین کی
جماعت کو اپنے ارکان کی غیر ثابت قدمی کے متعلق تھا یا ہو سکتا تھا۔ اس کے علاوہ ایسا فیصلہ تو فریقِ مخالف
کی طرف سے ہونا چاہیے تھا۔ لیکن میں اُسے بھی بے ہودہ قرار دیتا کیونکہ کوئی بھی سرکار صرف وہی چیز
منتخب کرے گی جو اُس کی منشا کے مطابق ہو۔

ہماری سرکار نے بھی چنانچہ یہی مضحکہ خیز بات کی مگر کچھ دیر کے بعد، جب کہ ترقی پسند اپنی عدم
تعاون کی قرارداد کا ڈھول کافی اونچے سروں میں پیٹ چکے تھے۔ ریڈیو کے نشریات اور سرکاری پرچوں
کے اوراق ترقی پسندوں کے افکار کے لیے بند کر دیے گئے۔ بعد میں کچھ ترقی پسند 'امرت دھارا ایکٹ'
کے تحت جیل میں ٹھونس دیے گئے۔ حکومت حماقت کا دوسرا نام ہے۔ اس لیے جو حماقتیں پے در پے اس
سے ترقی پسندوں کو خاموش کرنے کے سلسلے میں سرزد ہوئیں میں ان پر تبصرہ کرنا نہیں چاہتا۔

مجھے افسوس ہے کہ احمد ندیم قاسمی اور ظہیر کاشمیری وغیرہ جو بڑے بے ضرر قسم کے انسان ہیں جن کی
دماغی اور جسمانی ساخت لفظِ سازش کے صحیح معنوں کی متحمل نہیں ہو سکتی، بیکار جیل میں ڈالے گئے۔ ایک
کو بھائی بنانے کا شوق ہے دوسرے کو بہنیں۔ معلوم نہیں دونوں کے اِس معصوم شغل میں سیاسی ردِعمل کی
شرارت حکومت کو کہاں سے نظر آ گئی۔

غصے میں آ کر، بغیر سوچے سمجھے، حکومت نے اِن لوگوں کو جیل میں ڈال دیا۔ ایسے نائی کے سپرد کر دیا گیا جو اِن کا حلیہ بگاڑ کے رکھ دے گا۔ کچھ دیر کے بعد جب یہ رہا ہو کر آئیں گے تو کون کہہ سکتا ہے کہ یہ کس قسم کی مخلوق ہوں گے، سر سے پاؤں تک منڈے ہوں گے، یا ان پر بال ہی بال ہوں گے۔ غازی کہلائیں گے یا شہید، لیڈر بن جائیں گے یا بازار میں مجمعے لگا کر دوائیاں بیچیں گے۔ شاعری اور افسانہ نگاری سے توبہ کر لیں گے یا اس پر مردِ تسمہ پا کی طرح سوار ہو جائیں گے۔ اس میں تضحیک کا کوئی پہلو نہیں، اگر مجھے جیل میں ٹھونسا جاتا تو میں اپنے متعلق بھی یہی کہتا۔ بلکہ اس سے کچھ زیادہ۔ اس لیے کہ میں بہت ذکی الحس ہوں۔

حکومت اور ترقی پسند مصنّفین کی جماعت دونوں احساسِ کمتری کا شکار ہوئے۔ مجھے اس کا افسوس تھا اور اب بھی ہے۔ زیادہ افسوس ترقی پسندوں کا تھا جنھوں نے خواہ مخواہ سیاست کے پھٹے میں اپنی ٹانگ اڑائی۔ ادب اور سیاست کا جوشاندہ تیار کرنے والے یہ عطائی، کریملن کے تجویز کردہ نسخے پر عمل کر رہے تھے۔ مریض جس کے لیے یہ جوشاندہ بنایا جا رہا تھا، اُس کا مزاج کیسا ہے، اُس کی نبض کیسی ہے؛ اس کے متعلق کسی نے غور نہ کیا۔ نتیجہ جو ہوا وہ آپ کے سامنے ہے کہ آج سب ادب کے جمود کا رونا رو رہے ہیں۔

میرا دل آج بہت افسردہ ہے کہ وہ پرچے جو ترقی پسند مصنّفین کی جماعت کے نمائندے تھے اُنھیں اپنے ناخداؤں کے ساتھ کئی الٹی سیدھی زقندیں لگانا پڑیں اور آخر میں اپنے تمام مشوروں، اپنے تمام بیانوں اور اپنی تمام قراردادوں کو کاغذ پر سے کھرچنا پڑا اور اُن ادیبوں کا دوبارہ تعاون حاصل کرنے کے لیے کئی تاویلیں اور کئی معذرتیں پیش کرنا پڑیں جن کو یہ اپنی سیاہ فہرست میں داخل کر چکے تھے اور اپنی طرف سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ملعون و مطعون قرار دے چکے تھے۔

میرا دل آج بہت افسردہ ہے۔ جب میں سرکار سے عدم تعاون کا فیصلہ کرنے والوں کو اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کرتے دیکھتا ہوں۔ انھوں نے کیوں نہ سوچا کہ انسان کی جدوجہد کے وسیع دائرے میں سب سے اہم جدوجہد پیٹ کی ہے۔ ہماری ہمتِ مردانہ، یزداں پر کمنڈ ڈال سکتی ہے، ہمارے جنون کے دشت میں جبریل ایک زبوں صید ہو سکتا ہے، گو یہ چھپی ہوئی حقیقت نہیں کہ ہمیں پیٹ کی خاطر بعض اوقات کسی اُلّو کے پٹھے نواب کی مدح سرائی بھی کرنا پڑتی ہے۔ یہ انسان کا بہت بڑا المیہ ہے لیکن یہ المیہ

ہی انسان کا دوسرا نام ہے۔

میرے دل میں اب سارا غصہ افسردگی میں تبدیل ہو گیا ہے۔ میں بہت ملول اور مغموم ہوں۔ جو کچھ میں نے دیکھا ہے اور جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں اُس سے میری افسردگی مضمحل ہوتی جا رہی ہے۔ میری موجودہ زندگی مصائب سے پُر ہے۔ دن رات مشقت کرنے کے بعد بمشکل اتنا کماتا ہوں جو میری روز مرہ کی ضروریات کے لیے پورا ہو سکے۔ یہ تکلیف دہ احساس ہر وقت مجھے دیمک کی طرح چاٹتا رہتا ہے کہ اگر آج میں نے آنکھیں میچ لیں تو میری بیوی اور تین کم سن بچیوں کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ میں فحش نویس، دہشت پسند، سنکی، لطیفے باز اور رجعت پسند سہی لیکن ایک بیوی کا خاوند اور تین لڑکیوں کا باپ ہوں — اِن میں سے اگر کوئی بیمار ہو جائے اور موزوں و مناسب علاج کے لیے مجھے در در کی بھیک مانگنی پڑے تو مجھے بہت کوفت ہوتی ہے۔ میرے دوست بھی ہیں جو مجھ سے زیادہ مفلوک الحال ہیں۔ بروقت اگر میں ان کی مدد نہ کرسکوں تو مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ دنیوی معاملات میں، اگر میں کسی کا یا اپنا سر جھکا ہوا دیکھوں تو خدا کی قسم مجھے دکھ ہوتا ہے۔ لیکن جب میں سوچتا ہوں اگر میری موت کے بعد میری تحریروں پر ریڈیو اور لائبریریوں کے دروازے کھول دیے گئے اور میرے افسانوں کو وہی رتبہ دیا گیا جو اقبال مرحوم کے شعروں کو دیا جا رہا ہے تو میری روح سخت بے چین ہوگی۔ میں اِس بے چینی کے پیشِ نظر اُس سلوک سے بے حد مطمئن ہوں جو اب تک مجھ سے روا رکھا گیا ہے۔ خدا مجھے اُس دیمک سے محفوظ رکھے جو قبر میں میری سوکھی ہڈیاں چاٹے گی۔

میں آج بہت افسردہ ہوں، جب میں اپنے گرد و پیش نبض شناسوں کو یہ کہتے سنتا ہوں کہ ادب پر جمود طاری ہو گیا ہے، ادب انحطاط پذیر ہے، ادب ایک تعطل میں گرفتار ہے؛ یہ گفتار ''اسلام خطرے میں ہے!'' کی گفتارِ لایعنی سے ملتی جلتی ہے۔ ادب قائم بالذات ہے جس طرح کہ اسلام ہے۔ قوت کبھی انحطاط پذیر نہیں ہوتی، اس پر کبھی جمود یا تعطل طاری نہیں ہوتا۔ ایٹم کی قوت اِس کے انکشاف سے پہلے بھی موجود تھی اور اس کے انکشاف کے بعد بھی موجود رہے گی، اس کے غلط استعمال یا اس کے عدمِ استعمال کا یہ مطلب نہیں ہوگا کہ وہ نحیف ہو گئی ہے، جاں بلب ہے، یا مر گئی ہے۔

ادب اُسی قوت، اُسی توانائی، اُسی آب و تاب سے زندہ ہے جس طرح کہ وہ منصۂ شہود پر آنے سے پہلے زندہ تھا۔ اُس پر جمود اور تعطل طاری ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ہمارا اپنا جمود اور تعطل

ادب کا راستہ اختیار کرنا غلط ہے۔ [illegible]
راستوں پر گامزن ہونا بھی غلطی ہے۔

سوویٹ روس کے ادب کا لاکھ ڈھنڈورا پیٹا جائے مگر یہ حقیقت ہے کہ وہ دوغلی تحریریں جو وہاں لاکھوں ٹن کاغذوں پر چھپتی ہیں، ادب نہیں ہیں، ہرگز نہیں ہیں۔ ادب ہے، یا کوئی اور شے ہے، جس کا ایک نمونہ روسی ادیبوں کی حالیہ تحریروں کی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

ادب پر کسی کی اجارہ داری ہوئی ہے نہ ہوگی۔ یہ کوئی ایسا کام نہیں جسے ٹھیکے پر دے کر کرالیا جائے۔ ''ادب پر جمود طاری ہے'' یہ ایک ڈھکوسلا ہے۔ ''اسلام خطرے میں ہے'' کی قسم کا۔ اسے کھڑا کرنے والے بھی وہی ہیں جو آج سے چند ماہ پیشتر ممٹیوں پر چڑھ کر پکارتے رہے ہیں کہ ترقی پسند مصنفین نے تقسیم ہند کے بعد ادب کی لاج رکھ لی ہے۔ غریب مر رہا تھا، مگر انھوں نے اپنا خون دے کر اسے زندہ کردیا ہے — حیرت ہوتی ہے کہ اتنی جلدی، ان کے گنتی کے چند ارکان کے مقید ہونے کے فوراً بعد، ادب کی زندگی پھر کیوں خطرے میں پڑ گئی؟

میں آج بہت افسردہ ہوں — پہلے مجھے ترقی پسند تسلیم کیا جاتا تھا۔ بعد میں ایک دم مجھے رجعت پسند بنادیا گیا، اور اب فتوے دینے والے سوچ رہے ہیں اور پھر سے تسلیم کرنے کے لیے آمادہ ہورہے ہیں کہ میں ترقی پسند ہوں — اور فتووں پر اپنے فتوے دینے والی سرکار مجھے ترقی پسند یقین کرتی ہے۔ یعنی ایک 'سرخا' — ایک کمیونسٹ، کبھی کبھی جھنجھلا کر مجھ پر فحش نگاری کا الزام لگادیتی ہے اور مقدمہ چلادیتی ہے۔ دوسری طرف یہی سرکار اپنی مطبوعات میں یہ اشتہار دیتی ہے کہ سعادت حسن منٹو ہمارے ملک کا بہت بڑا ادیب اور افسانہ نگار ہے جس کا قلم گذشتہ ہنگامی دور میں بھی رواں دواں رہا — میرا افسردہ دل لرزتا ہے کہ متلون مزاج سرکار خوش ہوکر، ایک تمغہ میرے کفن سے ٹانک دے گی جو میرے داغِ عشق کی بہت بڑی توہین ہوگی۔ (۳۹)

میری قبر کا کتبہ

یہ

لوح

سعادت حسن منٹو

کی

قبر کی ہے

جو اب بھی سمجھتا ہے کہ اُس کا نام

لوحِ جہاں پہ

حرفِ مکرّر نہیں تھا

پیدائش ۱۱رمئی ۱۹۱۲ء وفات ۱۸رجنوری ۱۹۵۵ء (۴۰)

حواشی

(۱)سعادت حسن منٹو کا یہ مضمون اوّلاً اُن کی کتاب ''سرکنڈوں کے پیچھے'' میں شائع ہوا تھا جس میں مضمون سے قبل تیرہ افسانے شامل ہیں۔ یہ کتاب حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی نے ''باجازت محمد طفیل صاحب مالک ادارہ فروغ اردو لاہور...'' شائع کی تھی مگر اس پر سنہ اشاعت درج نہیں۔ اس سے قبل مطبوعہ ''سڑک کے کنارے'' (سنہ ۱۹۵۳ء) اور اس کے بعد مطبوعہ ''پھندنے'' (جنوری ۱۹۵۵ء) کے پیشِ نظر، قیاس ہے کہ یہ کتاب منٹو کے ''انتقال سے چند ماہ پہلے'' منظرِ عام پر آئی ہوگی۔

رسالہ ''افکار'' کراچی کے منٹو نمبر (مارچ، اپریل ۱۹۵۵ء) میں یہی مضمون بعنوان ''منٹو اپنے ہمزاد کی نظر میں'' شامل ہے۔ عنوان غالباً ادارے کا قائم کردہ ہے۔ مدیر نے اس پر درج ذیل سرنامہ تحریر کیا ہے:

> انتقال سے چند ماہ پہلے منٹو نے یہ مضمون اپنے بارے میں لکھا تھا۔ اُس وقت اس کی نوعیت اور تھی۔ لیکن اب یہ آواز دوسری دنیا سے آتی معلوم ہوتی ہے۔ ''ہم اکٹھے ہی پیدا ہوئے اور خیال ہے کہ اکٹھے ہی مریں گے۔ لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ سعادت حسن مر جائے اور منٹو نہ مرے۔'' سعادت حسن کا یہ خیال غلط نکلا، قیاس صحیح ثابت ہوا۔ اکٹھے پیدا ہونے والے اکٹھے نہیں مرتے ہیں۔ منٹو کا صرف ہمزاد اس دنیا سے رخصت ہوا ہے۔ (ادارہ افکار)

(۲) ''سوانح حیات: سعادت حسن منٹو'' مجلّہ ''دریافت'' سالانہ۔ شمارہ چار، ستمبر دو ہزار پانچ (نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجیز، اسلام آباد) صص: ۳۱ تا ۳۲

مذکورۂ بالا مجلّے میں ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن نے یہ سوانح ''منٹو کی ایک اہم نو دریافت خودنوشت سوانحی تحریر'' کے زیرِ عنوان، تقریباً چار صفحات پر مشتمل تحقیقی وضاحت کے ساتھ، شائع کرائی۔ ڈاکٹر معین نے لکھا ہے کہ ادارہ فیروز سنز، لاہور نے ''ایک انتخاب کے لیے متعدد صاحبِ طرز اہلِ قلم سے اپنے خیالات لکھ بھیجنے، نیز اپنی تصویر عطا کیے جانے کی تحریک کی تھی۔'' (ص: ۲۹) اس ضمن میں ادارے نے ایک عمومی مکتوب ستمبر ۱۹۴۳ میں اہلِ قلم کو ارسال کیا تھا جس کی تائید اور پیروی میں شوکت تھانوی نے بھی اپنے بعض احباب کو توجہ دلائی۔ شوکت تھانوی نے ۱۵ نومبر ۱۹۴۳ کو تائیدی مکتوب ارسال کیا تھا۔

ادارہ فیروز سنز کے عمومی مکتوب اور شوکت تھانوی کے تائیدی خط کے پیشِ نظر سیّد معین الرحمٰن کا قیاس ہے کہ اِن سوانحی حالات کو ''سال ۱۹۴۳ء کے اواخر کی تحریر خیال کرنا چاہیے۔'' (ص: ۳۱) ڈاکٹر معین نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''میرے علم اور نظر کی حد تک یہ خودنوشت حالات، ادارہ فیروز سنز لاہور سے چھپنے والے کسی انتخاب یا تذکرے میں جگہ نہیں پا سکے۔'' (صص: ۳۰ تا ۳۱)

[illegible] کے ساتھ منٹو نے ایک [illegible] خط ادارہ [illegible] کے ڈاکٹر عبدالوحید کے نام تحریر کیا تھا
جو حسب ذیل ہے:

بخدمت محترمی عبدالوحید صاحب

علاوہ بریں معروض خدمت ہوں کہ فی الحال میرے پاس کوئی فوٹو موجود نہیں ہے۔
میں آج کل بمبئی کے ایک فلمی ادارے 'فلمستان' میں معقول مشاہرے پر ملازم ہوں
اگرچہ دل کو اطمینان نصیب نہیں۔ مصروفیتوں کے مدنظر جلد تر تصویر نہ بھیج سکوں گا۔
لہٰذا فی الحال معذرت خواہ ہوں۔

نیاز مآل
سعادت حسن منٹو

(۳) اقتباس از مضمون'' میں کیوں لکھتا ہوں'' مشمولہ'' نوادراتِ منٹو'' (مرتبہ: محمد سعید، لاہور، ۲۰۰۹ء) ص: ۵۳۔ یہ مضمون پہلی بار جریدہ سویرا، لاہور، شمارہ ۱۵۔۱۶، مئی ۱۹۵۴ (صص: ۲۹۸ تا ۲۹۹) میں شائع ہوا۔

(۴) ''منٹو''۔ مشمولہ'' سرکنڈوں کے پیچھے'' (حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی) صص: ۲۲۳ تا ۲۲۵۔

(۵) ''دیباچہ'' مشمولہ'' منٹو کے افسانے'' اشاعتِ اول، ۱۹۴۰ء۔ منقول از'' پورا منٹو'' جلد ایک، مرتب: شمس الحق عثمانی (اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۳ء) صص: ۳۶۵ تا ۳۶۶۔

(۶) میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں۔ مشمولہ'' اوپر نیچے اور درمیان'' (گوشۂ ادب، لاہور۔ بار سوئم ۱۹۸۴ء) ص: ۳۹۸

(۷) ندیم کے نام خط نمبر ۲۱۔ مشمولہ'' آپ کا سعادت حسن منٹو (منٹو کے خطوط)'' مرتب: محمد اسلم پرویز (بلیک ورڈس پبلی کیشنز، تھانے۔ جنوری ۲۰۱۲) صص: ۵۴ تا ۵۵۔ مورخہ: جنوری ۱۹۳۹ء، از بمبئی۔
اِس کتاب میں شامل ۱۰۷ خطوط میں سے ۹۱ خط، وہ ہیں جو منٹو نے احمد ندیم قاسمی کے نام سنہ ۱۹۳۷ء سے سنہ ۱۹۴۸ء تک تحریر کیے تھے۔ جنھیں قاسمی صاحب نے'' منٹو کے خطوط — ندیم کے نام'' سے سنہ ۱۹۶۲ء میں یکجا کیا تھا۔ اسی سال یہ مجموعہ ادارہ کتاب نما، لاہور۔ شائع ہوا۔ قاسمی صاحب نے موصولہ خطوط پر ان کا زمانہ تحریر، منٹو کے لکھے اپنے پتے کے نیچے، قوسین میں درج کیا ہے جو اکثر و بیشتر صرف ماہ و سال پر مشتمل ہے۔
مرتبِ اسمبلا ژ نے، قارئین کی آسانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے، محمد اسلم پرویز کی ترتیب کو پیشِ نظر رکھا ہے کیونکہ ندیم صاحب کا مرتبہ مجموعہ انتہائی کم یاب ہے۔ محمد اسلم نے خطوط پر نمبر شمار کا اضافہ کیا ہے لہٰذا اقتباسات کے حوالوں میں ندیم کے نام خط اور صفحے کا نمبر درج کیا گیا ہے، علاوہ ازیں ماہ و سال، تاریخ اور

مقام بھی۔

(۸) ندیم کے نام خط نمبر ۱۵، ص: ۳۶۔ مورخہ: ستمبر ۱۹۳۸ء از بمبئی۔

(۹) ندیم کے نام خط نمبر ۲۵، صص: ۶۱ تا ۶۲۔ مورخہ: اپریل ۱۹۳۹ء از بمبئی۔

(۱۰) میری شادی۔ مشمولہ ''اوپر نیچے اور درمیان''۔ صص ۳۹ تا ۶۰۔

(۱۱) ندیم کے نام خط نمبر ۴۴، ص: ۹۱۔ مورخہ: مئی ۱۹۴۰ء از بمبئی۔

(۱۲) ندیم کے نام خط نمبر ۴۷، ص: ۹۵۔ مورخہ: جولائی ۱۹۴۰ء از بمبئی۔

(۱۳) ندیم کے نام خط نمبر ۴۷، ص: ۹۷۔ مورخہ: جولائی ۱۹۴۰ء از بمبئی۔

(۱۴) ندیم کے نام خط نمبر ۵۷، ص: ۱۱۹۔ مورخہ: ستمبر ۱۹۴۰ء از بمبئی۔

(۱۵) ندیم کے نام خط نمبر ۶۱، ص: ۱۲۴۔ مورخہ: اکتوبر ۱۹۴۰ء از بمبئی۔

(۱۶) ندیم کے نام خط نمبر ۶۵، ص: ۱۲۸۔ مورخہ: جنوری ۱۹۴۱ء از دہلی۔

(۱۷) ندیم کے نام خط نمبر ۶۶، ص: ۱۲۸۔ مورخہ: اپریل ۱۹۴۱ء از دہلی۔

(۱۸) ندیم کے نام خط نمبر ۷۷، ص: ۱۳۷۔ مورخہ: اپریل ۱۹۴۲ء از دہلی۔

(۱۹) ندیم کے نام خط نمبر ۷۹، ص: ۱۳۸۔ مورخہ: ستمبر ۱۹۴۲ء از بمبئی۔

(۲۰) ندیم کے نام خط نمبر ۸۰، ص: ۱۴۰۔ مورخہ: ۵ نومبر ۱۹۴۲ء از بمبئی۔

(۲۱) ندیم کے نام خط نمبر ۸۴، صص: ۱۴۵ تا ۱۴۶۔ مورخہ: مئی ۱۹۴۳ء از بمبئی۔

(۲۲) ندیم کے نام خط نمبر ۲۳، صص: ۵۸ تا ۵۹۔ مورخہ: فروری ۱۹۳۹ء از بمبئی۔

(۲۳) ندیم کے نام خط نمبر ۸، ص: ۳۷۔ مورخہ: ۱۰ رمئی ۱۹۳۷ء از بمبئی۔

(۲۴) ندیم کے نام خط نمبر ۵، ص: ۳۲۔ مورخہ: اپریل ۱۹۳۷ء از ناسک شہر۔

(۲۵) ندیم کے نام خط نمبر ۲۷، صص: ۶۳ تا ۶۴۔ مورخہ: جون ۱۹۳۹ء از بمبئی۔

(۲۶) ندیم کے نام خط نمبر ۵۶، صص: ۱۱۰ تا ۱۱۷۔ مورخہ: ۲۳ رستمبر ۱۹۴۰ء از بمبئی۔

(۲۷) ندیم کے نام خط نمبر ۳۸، ص: ۸۲۔ مورخہ: جنوری ۱۹۴۰ء از بمبئی۔

(۲۸) ندیم کے نام خط نمبر ۲۲، ص: ۵۷۔ مورخہ: جنوری ۱۹۳۹ء از بمبئی۔

(۲۹) ندیم کے نام خط نمبر ۹۰، ص: ۱۵۳۔ مورخہ: فروری ۱۹۴۷ء از بمبئی۔

(۳۰) ندیم کے نام خط نمبر ۹۰، ص: ۱۵۳۔ مورخہ: فروری ۱۹۴۷ء از بمبئی۔

(۳۱) زحمتِ مہرِ درخشاں، تاریخِ تکمیل: ۲۹ راگست ۱۹۵۰ء۔ ٹھنڈا گوشت (مکتبۂ جدید، لاہور، ۱۹۵۰ء) صص: ۱۱ تا ۱۵۔

(۳۲) ٹھنڈا گوشت۔ ص: ۱۶۔

(۳۳) گنجے فرشتے (اختتامیہ)۔ گنجے فرشتے (مکتبہ شعروادب، لاہور) صص: ۳۳۷ تا ۳۳۹۔

(۳۴) دوگز ھے۔ مشمولہ اوپر نیچے اور درمیان۔ صص:۲۳۱تا۲۳۹۔

(۳۵) چچا سام کے نام ایک خط۔ مشمولہ اوپر نیچے اور درمیان۔ صص:۱۵۵تا۱۵۷۔ مورخہ:۱۶دسمبر۱۹۵۱ء، ازلاہور۔

(۳۶) چچا سام کے نام دوسرا خط۔ مشمولہ اوپر نیچے اور درمیان۔ صص:۱۷۵تا۱۸۳۔ ازلاہور۔

(۳۷) چچا سام کے نام تیسرا خط۔ مشمولہ اوپر نیچے اور درمیان۔ صص: ۱۹۵ تا ۱۹۸۔ مورخہ: ۱۵/مارچ ۱۹۵۴ء، ازلاہور۔

(۳۸) چچا سام کے نام ساتواں خط۔ مشمولہ اوپر نیچے اور درمیان۔ صص:۲۴۵تا۲۵۰۔ مورخہ:۱۴/اپریل ۱۹۵۴ء، ازلاہور۔

(۳۹) جیبِ کفن، تاریخِ تکمیل:۲۸/اکتوبر۱۹۵۱۔ یزید (مکتبہ شعروادب، لاہور) صص:۱۹۹تا۲۱۲۔

(۴۰) سعادت حسن منٹو — حیات اور کارنامے۔ ڈاکٹر برج پریمی (مرزا پبلی کیشنز، سری نگر، ۱۹۸۶ء) صص:۳۷۸تا۳۷۹۔

☆☆☆

مآخذات

۱۔ سعادت حسن منٹو — نصر اللہ خان — سعادت حسن منٹو: ایک لیجنڈ مرتبہ ہمایوں اشرف ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۰۷ء

۲۔ رحم دل دہشت پسند — ابو سعید قریشی — نقوش، لاہور منٹو نمبر ۱۹۵۴ء

۳۔ سعادت حسن منٹو — کرشن چندر — سعادت حسن منٹو: ایک لیجنڈ مرتبہ ہمایوں اشرف ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۰۷ء

۴۔ منٹو میرا دوست میرا دشمن — عصمت چغتائی — نقوش، لاہور منٹو نمبر ۱۹۵۴ء

۵۔ منٹو میرا دشمن — اوپندر ناتھ اشک — نقوش، لاہور منٹو نمبر ۱۹۵۴ء

۶۔ منٹو — شاہد احمد دہلوی — سعادت حسن منٹو: ایک لیجنڈ مرتبہ ہمایوں اشرف ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۰۷ء

۷۔ منٹو کی چند یادیں — احمد ندیم قاسمی — نقوش لاہور منٹو نمبر ۱۹۵۴ء

۸۔ سعادت حسن منٹو — بلونت گارگی — منٹو کے بہترین افسانے از اطہر پرویز چودھری اکیڈمی لاہور

۹۔ میرا پیارا دوست منٹو — راجہ مہدی علی خان مشمولہ — منٹو میرا دوست از کیول دھیر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۱۴ء

۱۰۔ بدزبان — علی سردار جعفری — منٹو کیا تھا — مولفہ: غلام زہرا لاہور ۲۰۰۳ء

۱۱۔ چند یادیں — شورش کاشمیری — منٹو کیا تھا — مولفہ: غلام زہرا لاہور ۲۰۰۳ء

۱۲۔ منٹو صاحب — محمد طفیل — منٹو کیا تھا — مولفہ: غلام زہرا لاہور ۲۰۰۳ء

۱۳۔ منٹو اور میں — مہدی علی صدیقی — منٹو کیا تھا — مولفہ: غلام زہرا لاہور ۲۰۰۳ء

۱۴۔ ایک زندگی ایک طوفان منٹو — میرزا ادیب — رسالہ تکمیل بھیونڈی ۲۰۱۰ء

۱۵۔ اٹھاؤ بوتل اور چلو منٹو کے پاس — ابراہیم جلیس — منٹو کیا تھا مولفہ: غلام زہرا لاہور ۲۰۰۳ء

۱۶۔ خالی بوتل بھرا ہوا دل — کرشن چندر — منٹو کیا تھا — مولفہ: غلام زہرا لاہور ۲۰۰۳ء

۱۷۔ سعادت حسن منٹو احمد ندیم قاسمی میرے ہمسفر از احمد ندیم قاسمی
ساقی بک ڈپو دہلی ۲۰۰۳ء
۱۸۔ منٹو میرا دوست محمد اسداللہ (کتاب) آتش فشاں پبلی کیشنز لاہور ۱۹۹۱ء
۱۹۔ سعادت حسن منٹو ابوالحسن نغمی (کتاب) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۱۳ء
۲۰۔ منٹو سے آخری ملاقات نریش کمار شاد مشمولہ منٹو میرا دوست از کیول دھیر
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۱۴ء
۲۱۔ منٹو کے آخری ایام سید اکمل علیمی منٹو کیا تھا مولفہ غلام زہرا لاہور ۲۰۰۳ء
۲۲۔ منٹو ماموں کی موت حامد جلال نقوش لاہور منٹو نمبر ۱۹۵۴ء
۲۳۔ منٹو اپنے ہمزاد کی نظر میں منٹو سعادت حسن منٹو: ایک لیجینڈ مرتبہ ہمایوں اشرف
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۰۷ء
۲۴۔ من کہ سعادت حسن منٹو پروفیسر شمس الحق عثمانی مشمولہ: غالب اور منٹو
پروفیسر شمس الحق عثمانی غالب اکیڈمی، دہلی ۲۰۱۳ء